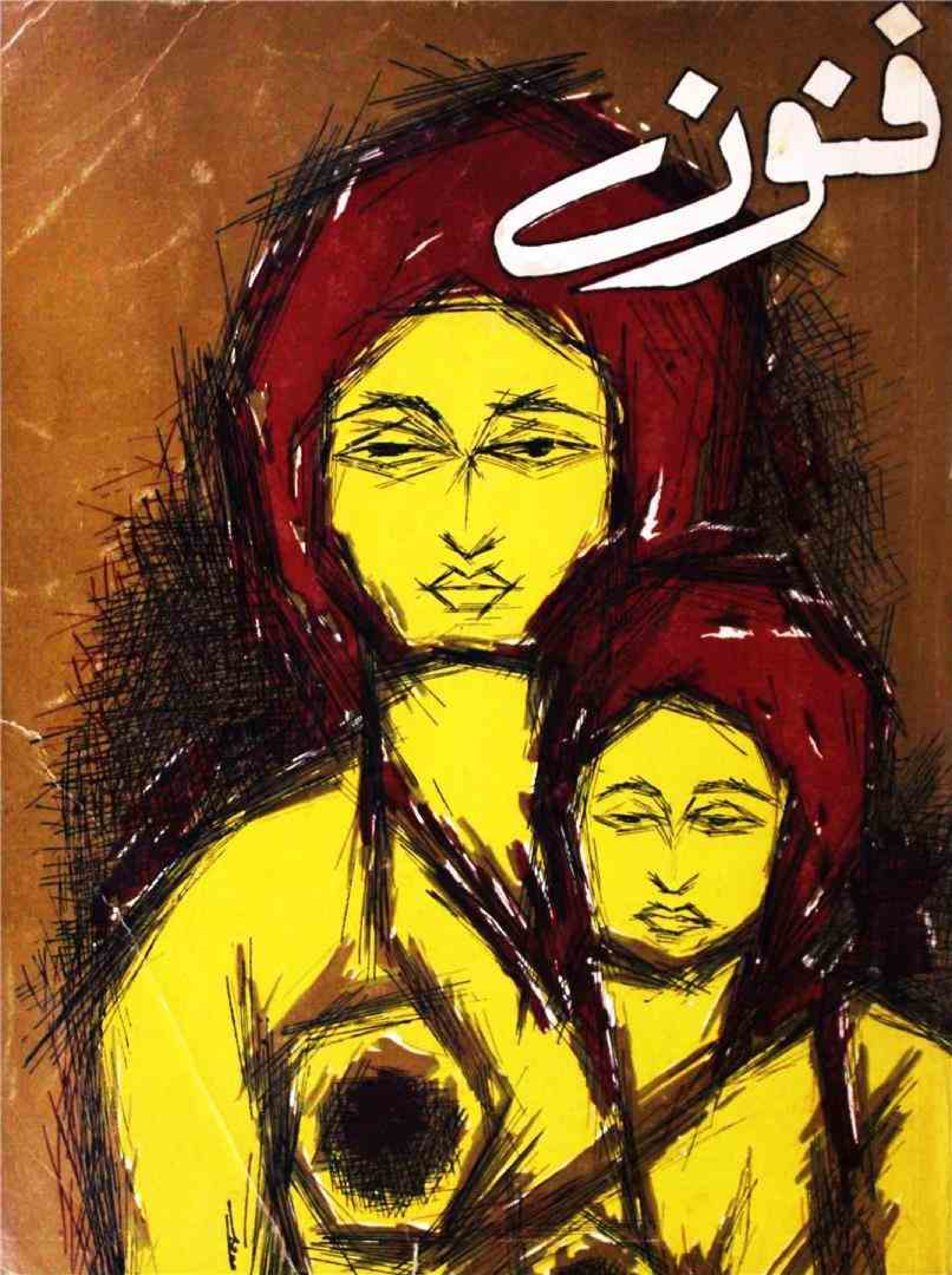

فنون

رجسٹرڈ نمبر ل ۶۵۶۹ ٹیلیفون: ۶۹۵۸۰

فنون

خاص سہ ماہی شمارہ

۸

ادارہ

احمد ندیم قاسمی حبیب اشعر دہلوی

منتظمین
موجد

جلد: ۵ مئی، جون ۶۷ ۱۹ء شمارہ: ۱،۲

سالانہ چندہ ۱۲ روپے غیر ممالک سے: ۲۵ روپے

قیمت فی پرچہ (اشاعت خاص ۸) ۳ روپے ۵۰ پیسے

مقام اشاعت: ۴۷ - انار کلی - لاہور (مغربی پاکستان)

مندرجات

سرورق ——— عمل : مرجد
مستقبل ——— فوٹو : اسد علی
بیگم عطیہ فیضی ———
سعادت حسن منٹو ——— عمل : مرجد
میراجی ———

حرفِ اوّل — ادارہ — ۱۳

طویل نظمیں

کوئی ایسی طرزِ طواف	مختار صدیقی	۱۴
کشن بی بی	احمد فراز	۲۴

نظمیں

دِل اور میں	ظہور نظر	۳۱
میلادِ بہار	ادا جعفری	۳۲
آپ بیتی	ادا جعفری	۳۳
سایہ	مصطفیٰ زیدی	۳۴
حرفِ سادہ و رنگین	منیر نیازی	۳۵
رِشتے	احمد ظفر	۳۶
خزاں	احمد ظفر	۳۷
نروان سے پہلے	جمیل ملک	۳۸
نروان	جمیل ملک	۳۹
دائرہ	شاذ تمکنت	۴۰
ایک شام	تابش صدیقی	۴۱
سرسراہٹ	امین راحت چغتائی	۴۲
جنسی	پروین سید فنا	۴۳
فریب	پروین سید فنا	۴۳
ریت	محمد علوی	۴۴
پہلا خدا	محمد علوی	۴۴
شہرِ استخواں	ادیب سہیل	۴۵
دوام	رحمان فراز	۴۶
رفتگاں	رحمان فراز	۴۷
رفتگاں کی منازل کی تکریم	ریاض مجید	۴۸
نظر کے تقاضوں کو پہچاننے کی سزا	ریاض مجید	۴۸
بے بسی	لیلیٰ عطاء اللہ	۴۹
شیشوں کا شہر	سبط نبی صمیم	۵۰
رِشتہ	شبی فاروق	۵۰
کرب	احمد ندیم قاسمی	۵۱

مقالات

دادِ سخن	ڈاکٹر سید عبداللہ	۵۲
روحِ عصر	سید علی عباس جلالپوری	۵۵
ایک تازہ ادبی مسئلہ	ڈاکٹر وزیر آغا	۵۸
میراجی کی کتابِ پریشاں	فتح محمد ملک	۶۱
تنقید کی اخلاقی اقدار	منیر احمد شیخ	۷۳
اِقبال کا اصل کارنامہ	ممتاز احمد	۷۶
اکبرِ اعظم کا دوسرا ملک الشعراء (۲)	ڈاکٹر نبی احمد	۸۰
اُردو میں ہمزہ کا استعمال	ڈاکٹر سید محمد عقیل	۸۷
ہمارا تہذیبی ورثہ	ڈاکٹر نزاکت جہاں تیموری	۹۳

سائنس

اِرتقائے انساں	ڈاکٹر نذیر احمد	۱۰۰
نفسیات — ایک سائنس	ڈاکٹر محمد اجمل	۱۰۳

رفتگاں

عطیہ فیضی	متین بہائف	۱۰۵

نذرِ شکیب	افضل منہاس	۱۰۷
شکیب کی منفرد غزل	اقبال منہاس	۱۰۸
ایک اور شہید	انور رشید	۱۱۵
فنونِ لطیفہ		
پاپ آرٹ	دیویند راسر	۱۱۸
کشمیری فنون پر مغربی اور ایرانی اثرات	ہدایت اللہ اختر	۱۲۱
برٹش میوزیم میں ایشیائی مخطوطات	محمد ایوب اولیاء	۱۲۴
مذاکرہ		
تجرید کی معنویت اور تفہیم کا مسئلہ	قاضی عبدالقادر	۱۲۶
غزلیں		
فراق گورکھپوری		۱۳۲
فراق گورکھپوری		۱۳۳
فیض احمد فیض		۱۳۴
فارغ بخاری		۱۳۵
قتیل شفائی		۱۳۶
قتیل شفائی		۱۳۷
ادا جعفری		۱۳۸
افضل پرویز		۱۳۹
مظفر علی سید		۱۴۰
مظفر علی سید		۱۴۱
صہبا اختر		۱۴۲
صہبا اختر		۱۴۳
سجاد باقر رضوی		۱۴۴
سجاد باقر رضوی		۱۴۵
صادق نسیم		۱۴۶
صادق نسیم		۱۴۷
جاوید شاہین		۱۴۸
محمد عدیل		۱۴۹
محسن احسان		۱۵۰
محسن احسان		۱۵۱

سیف زلفی	۱۵۲
سیف زلفی	۱۵۳
تخت سنگھ	۱۵۴
کشور ناہید	۱۵۵
اسلم انصاری	۱۵۶
اسلم انصاری	۱۵۷
سلیم شاہد	۱۵۸
بشیر احمد بشیر	۱۵۹
جون ایلیا	۱۶۰
انور شعور	۱۶۱
اقبال ساجد	۱۶۲
صمد انصاری	۱۶۳
صدیق افغانی	۱۶۴
صدیق افغانی	۱۶۵
ریاض مجید	۱۶۶
ریاض مجید	۱۶۷
گوہر ہوشیارپوری	۱۶۸
فضیل جعفری	۱۶۹
زاہد فارانی	۱۷۰
زاہد فارانی	۱۷۰
کیفی جامپوری	۱۷۱
کیفی جامپوری	۱۷۱
ظفر ابن متین	۱۷۲
ظفر ابن متین	۱۷۲
اختر انصاری اکبرآبادی	۱۷۳
ناصر صدیقی	۱۷۳
ارشد ملتانی	۱۷۴
مسعود جاوید	۱۷۴
روحی کنجاہی	۱۷۵
روحی کنجاہی	۱۷۵

شمیم حنفی		۱۷۶
شمیم حنفی		۱۷۶
خالد احمد		۱۷۷
خالد احمد		۱۷۷
خالد شیرازی		۱۷۸
خالد شیرازی		۱۷۸
عبداللہ جاوید		۱۷۹
عبداللہ جاوید		۱۷۹
احمد ندیم قاسمی		۱۸۰
افسانے		
گواہی	الطاف فاطمہ	۱۸۱
نئے پیمانے	مسعود مفتی	۱۹۰
آگہی کے ویرانے	ام عمارہ	۱۹۵
نوشتۂ دیوار	نکہت حسن	۲۱۰
اعتراف	حسین شاہد	۲۲۰
دائرے	سعیدہ احسان	۲۲۸
یہ خانہ بدوش لوگ	کمال مصطفیٰ	۲۳۳
ڈاکٹر سعدی	نورالحسن ہاشمی	۲۳۷
دریافت	نگہت مرزا	۲۴۹
پتھر	قیوم راہی	۲۵۵
ٹھشاوالا	عشرت نقوی	۲۶۰
ضد	لیلیٰ عطاءاللہ	۲۶۶
کروٹ	یعقوب ناسک	۲۷۱
مکالمہ		
فن شناس	شمع پرویز	۲۷۵
ڈرامہ		
ویرانہ	اصغر بٹ	۲۷۸
سفر نامہ		
سواتی مہم (۳)	محمد خالد اختر	۳۰۲

منٹو کی یاد میں		
منٹو (نظم)	سید فیضی	۳۱۳
صفیہ بھابی	شہزاد احمد	۳۱۴
باغی	ظہور الحسن ڈار	۳۱۷
منٹو اور طوائف	آغا بابر	۳۲۰
منٹو اپنی موت کے دس سال بعد	خالد حسن	۳۲۲
منٹو صاحب	احمد شریف	۳۲۷
طنز و مزاح		
ایک مقروض کی وصیت (نظم)	ایوب صابر	۳۲۹
موٹاپا	ارشد میر	۳۳۰
وقت کے حمام میں (نظم)	مظفر حنفی	۳۳۲
اختلافات		
	جابر علی جابر	۳۳۴
	خالد احمد	۳۳۵
	زاہد فارانی	۳۳۶
تبصرے		
درد آشوب	فتح محمد ملک	۳۳۸
دو پاٹن کے بیچ	محمد کاظم	۳۴۰
جرمنی نامہ	محمد کاظم	۳۴۶
اسلامی ریاست	محمد کاظم	۳۵۰
نئے ناولوں کی کھیپ دو دو چراغ محفل، کیا وہ آج رہی تھی، قربانی، دیدۂ تر، انگار، نوشاد، داغوں کی بہار	محمد خالد اختر	۳۵۲
الف	سیف زلفی	۳۵۷
مثنویات حالی	آغا سہیل	۳۶۱
مغرب کے تنقیدی اصول	آغا سہیل	۳۶۲
جب لوہا پگھلتا ہے	آغا سہیل	۳۶۳
پاگل پن کے پانچ دورے پنجابی کے صوفی شاعر کافیاں شاہ حسین (پنجابی) کافیاں شاہ حسین (انگریزی)، پنجابی ادب (شاہ حسین نمبر)، حقیقت الفقراء	حسین شاہد	۳۶۴
جاوید نامہ	ادارہ	۳۶۶




عطیہ بیگم فیضی



سعادت حسن منٹو

عمل : موجد



بشکریہ ضیا جالندھری

میرا جی

ندیم

حرفِ اوّل

فنون کے سہ ماہی نمبروں کی بروقت اشاعت کے عزمِ راسخ کو اب کے اخباری کاغذ (نیوز پرنٹ) کی نایابی اور اس کے بعد گرانی نے شکست دی۔ ابتک کاغذ کی قیمتیں معمول پر نہیں آئیں۔ فنون اور دوسرے معیاری ادبی رسائل کے لئے یہ قیمتیں ناقابلِ برداشت ہیں تو ساتویں رسالے کی اشاعت میں تاخیر بھی ناقابلِ برداشت ہے۔ (دونوں میں) سے ایک کو برداشت کرنا ضروری تھا، سو "فنون" کی سہ ماہی اشاعتِ خاص پیشِ خدمت ہے۔

کاغذ کی مشکل

ہم قارئین اور معاونین سے اس تاخیر کے معذرت خواہ ہیں اور ملکی مصنوعات کو اہلِ ملک تک پہنچانے کے ذمہ دار حضرات سے شاکی ہیں کہ بڑے بڑے اشاعتی ادارے تو شاید کاغذ کی نایابی اور گرانی کو اتنی شدت سے محسوس نہ کرتے ہوں مگر یہ صورتِ حال ادبی رسائل کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن جاتی ہے۔ بازار میں قیمتیں من مانا عروج حاصل کرتی رہتی ہیں اور کسی کو توفیق نہیں ہوتی کہ وہ اس کا تدارک کرے اور صارف کو سدھائے یا پھر ایک دفتری بیان ہی جاری کر دیا جائے کہ ملکی ضروریات سے کہیں زیادہ کاغذ تیار کرنے والے کارخانے کو کاغذ مہیا کرنے کے سلسلے میں یکایک کیا دقتیں پیش آ گئی ہیں۔ پاکستان میں انجمن ادبی رسائل کے نام کا ایک ادارہ بھی ہوتا تھا۔ "فنون" کو اس ادارے کی رکنیت کی عزت حاصل نہیں ہے مگر اسے مذکورہ انجمن سے یہ پوچھنے کا حق تو شاید حاصل ہے کہ کاغذ کے اس شدید بحران کے دنوں میں اس انجمن نے اپنے وجود کا کیا ثبوت مہیا کیا ہے اور کیا اس کی سرگرمیاں صرف انتخابات اور عہدوں کی تقسیم تک محدود ہیں۔ کم سے کم لاہور سے شائع ہونے والے بیشتر ادبی و علمی رسائل کو کاغذ کی اس نایابی اور گرانی نے بے طرح پریشان کر رکھا ہے اور انجمنیں ایسے ہی حالات کے مقابلے کے لئے قائم کی جاتی ہیں۔

اس مشکل کا حل

یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ "فنون" کو کاغذ حاصل کرنے یا مقررہ قیمتوں پر حاصل کرنے میں دشواری پیش آئی ہو۔ قریب قریب ہر اشاعت پر ہمیں ایسے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑا ہے اور اس مشکل کا کوئی سبب سوائے اس کے ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کھلنا نیوز انڈسٹری نے مغربی پاکستان میں اپنا کوئی ذخیرہ قائم کرنے کی ضرورت کم محسوس نہیں کی۔ وہ سامان کراچی پر جہازوں کے لنگر انداز ہونے میں ذرا سی تاخیر مغربی پاکستان کے تمام شہروں میں کاغذ کے بازاروں میں تہلکہ مچا دیتی ہے۔ متعلقہ حکام سے استدعا ہے کہ وہ اس صورتِ حال کے حتمی سدِباب کی کوئی سبیل سوچیں اور ادبی رسالوں کو باقاعدگی سے جاری رہنے کا موقع بخشیں۔

بیگم عطیہ فیضی

گزشتہ دنوں ہماری تہذیب و ثقافت کی ایک مجسم تصویر کو جس کا نام بیگم عطیہ فیضی تھا، موت نے ہم سے چھین لیا۔ بیگم عطیہ فیضی کے انتقال کے بعد ہی اہلِ ملک پر یہ انکشاف ہوا کہ ان کی شخصیت کتنی ہمہ جہت اور ہمہ رنگ تھی۔ پنجابی کے معروف شاعر اور اردو کے مشہور صحافی منو بھائی نے بیگم عطیہ فیضی کے انتقال پر اخبارِ جہاں میں جو اک مرثیہ نثر میں لکھا تھا وہ اخبارِ مذکور کے شکریے کے ساتھ "فنون" میں شامل کیا جا رہا ہے کہ ہماری صحافت میں اس سے زیادہ موثر ماتم شاید ہی کسی تہذیبی شخصیت کا ہوا ہو۔

شاہد احمد دہلوی

یہ پرچہ پریس میں بھیجا جا چکا تھا جب اردو زبان و ادب کی ایک ہمہ گیر شخصیت شاہد احمد دہلوی کے انتقال کی خبر ملی۔ ہم شاہد احمد مرحوم کے متعلقین کے ساتھ اس غم میں برابر کے شریک ہیں کہ یہ غم پاکستان کی پوری تہذیبی زندگی کا غم ہے۔

شاہد لطیف

اردو کے ایک ذہین افسانہ نگار اور فلمی ہدایت کار شاہد لطیف بھی گزشتہ دنوں بمبئی میں انتقال کر گئے۔ ہمیں اس حادثے پر مرحوم کی بیگم عصمت چغتائی صاحبہ سے دلی ہمدردی ہے۔ آئندہ شمارے کا ایک حصہ بچھڑنے والے ان دونوں دوستوں کے لئے وقف کیا جائے گا۔

مختار صدیقی

کوئی ایسی طرزِ طواف ـــــ

پہلا تابلو

عرفات

دن کی یہ خیرہ کُن اس دھوپ
اُجالوں کی جنوں خیز چمک ہے
رات کی چیرتی ٹھنڈک کی نموُ دشمنی

صحرا سازی

آبِ کم یاب سے اس دیس کی محرومی
ہر اک رُت کی خزاں پردازی!
خاروخس مُردہ، یہ بے برگ و نوا ٹیلے فسردہ
بہ زمیں افتادہ!
خاک بھی زرد و زبُوں حال، تو ہر سنگ بھی بدرنگ یہاں
ریت تک جھلسی ہوئی بھوُری، کہیں حدِ نظر تک
کوئی بستی نہ نشانِ جادہ!
پست کہساروں کے یہ سلسلے
میداں میں
ڈھلانوں پہ
نشیبوں میں بچھی کنکریں
ویرانی و نکبت کا یہ بے آب خرابہ
نہ گلستاں ہے نہ صحرا زادہ!!

ریگ و صرصر کا یہی وحشتِ بلا ہے

جسے ٹھکرایا گیا مخزنِ خیر!

فلسفے آتے ہیں — رُکتے ہیں یہاں

تازگیٔ جہاں کے لیے!

حلِ مشکل میں کسی حیلۂ آساں کے لیے!

اور پرو بالیٔ ارماں کے لیے!!

(۲)

وقوفِ عرفات

تو بتو ریت کے بے پایاں سمندر پہ اُبھرتے ہیں حباب!

اور — ہر رنگ

ہر اک نسل

ہر اک عمر کا یہ جمِ غفیر —

اپنے ہی خیموں کی صورت — یہ کفن پوش ہجوم!

اپنے ہی ڈیروں، قناتوں کی طنابیں — یہ لوگ

اپنی عمروں کے ہر اک درد کی

بوسیدہ کتابیں — یہ لوگ!

اپنی ہر ایک دُعا، اور مناجاتِ مجسّم

نہ یہ گویا نہ یہ خاموش ہجوم!

اپنے ہی سجدوں کی بے تاب — جبینیں — یہ لوگ!

اپنی دُنیاؤں کے خود آسماں

خود عجزِ تمنّا کی زمینیں — یہ لوگ

ہر طرف پھیلا — رُکا

بڑھ نہ سکا

ٹھوکریں کھاتا رہا

خود ہی — نہ یہ بے ہوش نہ باہوش ہجوم!

نہ یہ بےحس نہ یہ پُرجوش ہجوم!
یہ نہ بھوکا نہ شکم سیر
نہ پیاسا، نہ بلانوش ہجوم!
یہ قناتوں کی طنابیں!
یہ ہر اک درد کی بوسیدہ کتابیں —— یہ لوگ
یہ مناجات کے سجدوں کی جبینیں —— یہ لوگ
عاجزی اور ندامت کی زمینیں —— یہ لوگ

(۳)

دن کی صرصر زدہ اور خشمگیں گھڑیاں
نہ گزرتی نہ ٹھہرتی گھڑیاں!
کائنات اور وجود اور زماں سے
نہ الگ اور نہ مربُوط
نہ زندہ ہی، نہ مرتی گھڑیاں!
خیموں اور لوگوں کی
یہ اوّلیں اور آخریں گھڑیاں
نہ بگڑتی، نہ سنورتی گھڑیاں!
سہ پہر تک رہیں آباد ——
یہ صرصر میں نہ ڈوبتی، نہ اُبھرتی گھڑیاں!
سہ پہر تک رہیں آباد —
مگر اُن کی تپش اور تمازت میں نہ کچھ آیا زوال!
ہر گھڑی ایک عجب صبر
عجب چین
عجب منّت و زاری سے رہی
کیسی بحال، اور نہال، اور چونچال!

(۴)

اس قیامت پہ مگر طرفہ سکوں ہے طاری
دیسے، ہر سمت فضاؤں میں تھی فریاد و فغان و زاری!
کردہ ناکردہ گناہوں پہ وہ گریہ بھی
کراہوں کی بھی پردہ داری
دل کے ارمانوں کی آوازیں گلوگیر
تمناؤں کے بوجھ بھاری!
نسلوں اور عمروں کے، زخموں کے لیے
راحتِ مرہم کی طلب
اور ندامت کی جگر افگاری
اپنے فردا میں نئی زیست سے جینے کی
نئی موت سے مرنے کی نئی تیاری

دُوسرا تابلو

مزدلفہ کی رات

موتیوں اور ہیروں سے بھی پیاری اُجلی چاندنی!!
جھلملاتی ریت کی پہنائیاں، خنکی سے چُور!
سائے لٹ چھٹکائیں، ان میں قند کے موتی پروتی چاندنی!
کوہ و صحرا کے پرانے زنگ دھوتی ان میں رنگ اپنا سموتی چاندنی!
اس تھکے انبوہ کی رُوحوں پہ برقِ طور ہوتی چاندنی!!
نرم جھونکے کس قدر آسودہ ــــ کتنے ناصبور!
نسلوں اور عمروں کی راتوں میں کہیں آتی ہے
ایسی شام
یہ راتوں کی رات!
پہلے ایسا دن بھی گزرے
یہ دنوں کا دن۔ازل آثار دن!

پھر کہیں آئے گی

ایسی روح میں بستی ابد انجام

یہ راتوں کی رات!

دل میں اس کا حُسن، اس کا نور بھر لو ——— (دیکھو اب رونا نہیں)

اب گئے دن

اور نئے دن رات بھی، شاداب کر لو ——— (یہ بھین کھونا نہیں)

اس سکوں اس چین کی رعنائیوں میں

خوب جی بھر کر سنور لو ——— (اس جگہ کچھ جاگنا سونا نہیں)

اور رتجی کی کنکریں چُننے کو

گرد و پیش کی بھی کچھ خبر لو ——— (یہ خزانہ ہیں مگر ہیرے نہیں سونا نہیں)

لاکھوں ہاتھوں ناخنوں میں

شعلہ افشاں اک تڑپ!

کنکریں چننی ہیں ———

کھودو اور کھودو!

رات کو چاہے سحر کرنا پڑے

ریت کی ہر تہہ کو چاہے سنگِ سر کرنا پڑے!!

کنکریں چُن کر ——— انھیں دھونا بھی ہے

گننا بھی ہے

کنکریں پُوری بھی کرنی ہیں!

یہ صحرا ہو تہ و بالا

یہاں پاتال کو چاہے خبر کرنا پڑے!!

پچھلی شب آئی

نو بجے، تیز تاروں کے دمکتے قافلے!

روح میں رچنے لگا ہے کوئی انجانا گداز
چھپ کے ہلکوروں سے اب کچھ راز کی باتیں کرو!
کیسے پربستہ ہو
— کچھ تو حسرتِ پرواز کی باتیں کرو!!

باتیں —

اے کہ میرے دل میں تیری پاک تنویریں بھی ہیں
میں نے ہر بُت جو بنایا اس کی تصویریں بھی ہیں
میری کایا کے کھنڈر پر ثبت ہے تیری بقا
روح کی ویرانیوں میں تیری تعمیریں بھی ہیں

تیری راہ کا یہی ناز ہے، جو چلا سو آبلہ پا چلا
تجھے پا کے بھی یہی کر سکا، کہ وہ اپنے آپ سے جا ملا

مری زندگی کے تمام مرحلے آج میری نظر میں ہیں
مرے کیف و کم کے معاملے اسی شب کی راہ گزر میں ہیں

اسی ریت کا، اسی رات کا کوئی ذرّہ کوئی گھڑی ملے
تو یہ کائنات ہو نعرہ زن کہ تجلیاں مرے بَر میں ہیں

کبھی رنج کوئی کُٹا بھی ہے کبھی درد دل سے مٹا بھی ہے
اے خدائے چارہ گری بتا کہ تو درد بھی ہے دوا بھی ہے

غمِ جاں تو میری سزا سہی، غمِ عشق دل کی خطا بھی ہے
ترا کھینچنا، ہم سے روا بھی ہے کہ تو حسن بھی ہے خدا بھی ہے

رمیِ جمار

اور اب دن کا ہر اک لمحہ
ہجوم اور شیاطین پہ برستے کنکر

کیسے فرسودہ و سنگیں ہیں یہ شیطان
عجب ساکت و بے بس بھی نظر آتے ہیں
اَن گھڑ بھی ہیں —
پھر بھی مری صدیوں میں بسے ہیں! — توبہ!
مرے اور اک کی توبہ
مرے اندیشۂ چالاک کی توبہ
مری دانش مری حکمت کی الٰہی توبہ!!

تیسرا تابلو

طوافِ حرم

ماندہ مخلوق کا دم آ گیا آنکھوں میں
تھکی جانیں وعاؤں میں ہوئی ہیں لرزاں!
اب ترا گھر — ترا کعبہ تیری مخلوق پہ ہے سایہ کناں!

یہ سیہ ریشمی ملبوس میں لپٹا ہوا
یہ سارے جہانوں میں اکیلا کمرا!
سادگی اور حشم کا یہ انوکھا نقشا!
کبریائی کی جلالت کا
خدائی کی کرامت کا
ہر اک قدرت و شفقت کا ازل سے قبلہ!
اس کے سائے میں کوئی مشرق و مغرب نہیں
ہر سمت و جہت ہی ہے یہی اور اُسی کا جلوہ!
پھیرے پھرتی ہوئی
احرام میں جکڑی ہوئی
دیوانگی — پل پل اُمڈی

آپا دھاپی کے ہر اک پاٹ ہیں
پستی ہوئی فرزانگی ــــ پل پل امڈی
نفسا نفسی کی قیامت میں وطہتی ہوئی شرمندگی ــــ پل پل امڈی
حلقۂ بیم میں اک سنگ کو اب چومتی
پھیروں کے نئے پھیرنئے گھیر میں
چکراتی ہوئی - بندگی پل پل امڈی!
لغزشوں اور خطاؤں پہ دعا ساز ــــ یہ تُو
اپنے گناہوں کا در باز ــــ یہ میں!
اپنی ندامت کا کھلا راز ــــ یہ وہ!!
اور ــــ دیوارِ حرم سے یہ لپٹتے ہوئے
روتے ہوئے
یہ ــــ تُو بھی یہیں
میں بھی یہیں
وہ بھی یہیں!!

مقامِ ابراہیم

سجدہ گہ فرشِ حرم بھی ہے
ترا اور مرا جسم بھی ہے
پاؤں بھی' احرام بھی ہیں
سجدۂ شکر ادا کر کے یہاں لطف و عنایات کو ارزاں کرلیں
جسموں اور روحوں کو اس چشمۂ رحمت سے گلستاں کرلیں
جلوے اتنے ہیں کہ اب حیرتِ جلوہ نہ رہی
سجدے اتنے ہیں کہ اب طاقتِ سجدہ نہ رہی

سعی صفا و مروہ

ایک ماں تھی جو انھی ٹیلوں میں دوڑی تھی
کہ مل جائے ذرا سا پانی

اب یہاں صدیوں سے ہر دوڑتا ابھرو تو زمزم سے ہے سیراب
پہ تھمتا نہیں آنکھوں سے اُمڈتا پانی !
آفرینش کی گواہی ہے یہ اب !
اور جنم دان کی یہ شرط ہے اب !
جو بھی زمانے ہوں وہ دنیاؤں کی حد تک دوڑیں !
صدیاں یاں مائیں بنیں اور ابد تک دوڑیں !

چوتھا تابلو

احن شوقاً الی دیارِ ....

اور اب آنکھوں میں بسنے لگیں،
اِک راہ بتاتی راہیں
حیرتوں کو ترے جلووں سے ملاتی
تو کبھی کچھ نہ دکھاتی راہیں
میری رگ رگ میں دھڑکتی ہوئی
تقدیر کی شاہراہ بناتی راہیں
یہ وہ راہیں ہیں جہاں پاؤں نہیں
پائے مژہ سے چلنا سفرِ شوق کے آداب میں ہے
یہ وہ راہیں ہیں، جہاں اندھی تمازت کا وبال
بادپائی کے لیے حیلۂ نایاب میں ہے
یہ وہ راہیں ہیں جہاں گر کے نہ اُٹھنا ہی رہا عین حیات
یہ وہ راہیں ہیں، کہ ہر خم میں کہانی ہے
تو ہر ذرّے میں بات
یہ وہ راہیں ہیں جو منزل نہیں
منزل سے مگر کم بھی نہیں
یہ وہ راہیں ہیں کہ جو تا بہ حرم جاتی ہیں

اور ان میں دم رم بھی نہیں
یہ وہ راہیں ہیں جو کعبے سے پلٹ آتی ہیں
یثرب کو نکل جاتی ہیں
اور ان میں کوئی پیچ، کوئی خم بھی نہیں
اور ان راہوں میں ہیں —— گنبدِ خضرا کے الوہی انوار
رُوح کھنچ آتی ہے آنکھوں میں، کہتاں ہے سینہ
اشک بے ساختہ بہ نکلے ہیں —— یہ قلبِ تپاں
یوں دھڑک اُٹھا ہے —— پھر جیسے نہ دھڑکے گا کبھی

جسمِ اطہر کی یہ آرام گہہ عرش نشاں
سجدہ گہِ ہفت نماں
گنبدِ سبز کا یہ دائرۂ یمن وسعادت
یہ سپہرِ رحمت!
یہ زمیں، نورِ نبوّت کی امیں
خلوتِ حضرت —— یہ زمیں
یہی مقصودِ جہاں ہے
یہی اعلیٰ
یہی اولیٰ
یہی اکبر
تو یہی امینِ رحمت —— یہ زمین!!

احمد فراز

کشن بی بی

تو جب
ہمبر شٹ کے قاتل پہاڑوں کی صلیبوں سے اُتر آئے
تو یہ جانا
کہ ہم دشتِ عدم کو پار کر آئے
ہر اک کے پاؤں چھلنی، جسم شل
اعضا تھکن سے چوُر
لیکن سب
ہراسِ مرگ سے بے جان — بے حس تھے
سبھی یوں زرد رُو جیسے
ابھی تک آسمانوں کے سفر سے لوٹ کر
روحیں نہیں آئیں
چلو ہم سب کے سب زندہ ہیں
جیسے بھی ہیں، یکجا ہیں
ضیاؔ، باسطؔ، سعیدؔ اور میں

ہمارا میزباں کب سے، نہ جانے
گھر کے دروازے کھلے چھوڑے
سبک شہتیر کے پُل پر ہمارا منتظر تھا
اس کو یہ معلوم تھا

؎ کافرستان کی خوبصورت وادی

ہم اجنبی مہماں
سیاحت کے لیے کن مشکلوں سے
ہفت خواں طے کر کے
اس وادی میں آئیں گے

چناروں کے بلند اشجار
انگوروں کی بیلیں
چار سُو سبزہ
ہوائیں بید مشک و عود و مُرکی خوشبوؤں سے چُور بوجھل
طائرانِ خوشنما و خوش نوا ــــ بے کل
سبک رفتار چشموں کی تہوں میں
پتھروں کا نیلم و یاقوت سا جھل مل
ادھر کچھ دور بزغالوں کے گلّے
نوجواں چرواہیوں کے دودھیا چہروں کی صورت
برف سے شفاف و دل آرا
فضا حیرت فزا ــــ سحر آفریں دنیا
"مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را"

ہمارا میزباں مفلس تھا
لیکن شام کو خوانِ ضیافت دیکھ کر ہم
خس بدنداں تھے
کشادہ طشت میں بزغالہ بریاں
بعلک میں آبِ تاک
اور کشتیوں میں ڈھیر سیبوں کے
الاؤ کی دہکتی آگ کتنی گرم

کتنی خوب صورت تھی

مگر ہم منتظر اس پل کے تھے
جب کافرستاں کی جواں پریاں
زمینی خلد کی حُوریں
دف و مردنگ کی تھاپوں پہ رقصاں
اپنے محبوبوں کی فرقت کے
نشیلے گیت گائیں گی

الف لیلا کے شہزادوں کی صورت
ہم میں ہر اک
اس طلسماتی فضا کے سحر میں گم تھا

بتانِ آذری کا رقص جاری تھا
سیہ ملبوس میں لپٹے ہوئے
مرمر کے بُت
مہتاب سے پیکر
سبھی باہوں میں باہیں ڈال کر زنجیر کی صورت
کماں کی شکل میں جُنباں
کہ جیسے دیوتاؤں کے رتھوں کی گھوڑیاں
وحشت سے پاکوباں
دف و دتامہ و مردنگ کے آہنگ میں
آہستہ آہستہ
کھنکتے قہقہے، مجوب آوازیں بھی
شامل ہو گئیں آخر

کہ جیسے ان گنت سازوں میں
پائلیں چھنک اُٹھیں
سبھی غارت گرِ تمکین و ہوش و دشمنِ ایماں
ہر اک فتنہ گرِ دوراں
مگر وہ سر گروہِ نازنیناں
غیرتِ ناہید
جانِ حلقۂ خوباں
کشن بی بی
قد و قامت ۔ قیامت
جنبشیں ۔ جادو
بدن ۔ طوفاں

ضیا کردار میں گوتم
مجسّم صدق و ایثار و وفا
درد آشنا و نفس کش ہمدم
لہو اس کا بھی اس شعلے نے گرمایا
مگر سب ساتھیوں سے کم

بتانِ آذری رقصاں
مگر با سطؔ جو اک فنکار
لیکن شکوہ سنجِ زندگی ہر دم
قلم اس کا دُر افشاں دگہر تحریر
لیکن خود تہی داماں
شکستہ دل
خود اپنے فن سے، اپنے آپ سے نالاں

یہاں دنیا کے غم بھولا ہوا
بسمل
ہر اک پیکر پہ سو سو جان سے قرباں

سعید اک کم نظر، جذبات کا پُتلا
مہندس
اور فقط جسموں کا سوداگر
جو اپنے ساتھیوں سے بھی چھپا کر ساتھ لایا تھا
کئی تحفے
ملمع کی ہوئی انگوٹھیاں
جھوٹے نگوں کے ہار
دل آویز آویزے
کسی ماہر شکاری کی طرح
اپنی کمند و دام ، تازاں
ہر اک پر سحر طاری تھا
بتانِ آذری کا رقص جاری تھا

ضیا حیرت میں گم
باسط زخود رفتہ
سعید افسوں زدہ
مَیں بُت!

کشن بی بی کے لب
کلیوں کی صورت نیم وا
اور ہم فقط
آدانہ کی خوشبو سے پاگل

لذتِ معنی سے نامحرم
"زبانِ یار کیلاشی و ما از حرف بیگانہ"

(ہمارے میزباں نے ترجمانی کی)
کشن بی بی یہ کہتی ہے ——

"— مرے محبوب، تُو اک دستۂ مُرّ ہے
کہ جو راتوں کو میری چھاتیوں کے درمیاں
خوشبو لٹاتا ہے
مری ہمجولیو!
بستی کے سارے نوجوانوں میں
مرا محبوب پیارا
جس طرح بن کے درختوں میں ہو تنہا سیب استادہ
مرا محبوب
جیسے جھاڑیوں کے درمیاں کوئی گُلِ سوسن
مرا محبوب مجھ سے کل ملا تھا
اس نے مجھ سے خوب باتیں کیں
وہ کہتا تھا کہ اے میری پری
اے نازنیں
اب تو مری بستی کو میرے ساتھ چل
برسات کا موسم چلا
بادل برس کر کھل چکے
انگور اور سیبوں کی مٹی جاگ اُٹھی
اے کوہساروں کی کبوتر
تو نہ جانے

کن پہاڑوں کی دراڑوں میں چھپی ہے
آمرے ہمراہ چل پیاری —"

بتانِ آذری کا رقص جاری تھا
فضا پر سحر طاری تھا
ہر اک کی آنکھ میں تِل کی طرح
وہ کافرستاں کی قلوپطرا
مگر ہم میں کوئی سیزر نہ انطونی

ضیا گوتم سہی
لیکن کشن بی بی
وہ کافر جو ضیا کو بھی نہ سونپی جائے ہے مجھ سے

نہ جانے کس طرح یہ شب ڈھلی
لیکن سحر دم
جب پرندوں کے چہکنے کی صدا آئی
کشن بی بی
سیہ ملبوس میں لپٹی
جبیں پر کوڑیوں کا تاج
گالوں پر گھنی زلفیں
کنیزوں کی طرح اپنی رفیقوں کو لیے
رخصت ہوئی ہم سے
بصد اندازہ استغنا و دارائی
تو ہم سارے تماشائی تھے پتھر
اور پتھر تھے تماشائی

ظہور نظر

دل اور میں

ذہن میرا مجھ سے کہتا ہے کہ تُو
ہے خود اپنے دل کے صحرا کا سراب
کون تیرے پاس آئے، کس لیے آئے
کہ خواب —،
جاگتی آنکھوں سے کرتے ہیں گریز
منتظر لمحوں پہ بنتے ہیں عذاب
اتنا کیا کم ہے کہ دشتِ دل کی تپتی دھوپ میں
تو جب اپنی تشنگی کو خود دکھاتا ہے سراب
چھوڑ کر جاتے نہیں تجھ کو، تری
روح کے بے چین و بے منزل سحاب

اور میں —،
بے رحم بوڑھے وقت کی زنجیر میں جکڑا ہوا
چیخ اٹھتا ہوں کہ ایسا ہے تو پھر
تشنہ لب، ترسیدہ، نم دیدہ تمنائیں، کہ جو
میرے دل سے میری جانب ہیں رواں اک عمر سے
ختم سیرِ دشت کرتی کیوں نہیں !؟
کیوں نہیں تھکتی ہیں، مرتی کیوں نہیں !؟

ادا جعفری

میلادِ بہار

رازداں بہاروں کے
تم کہ طفلِ ناداں ہو
جانے کس گلستاں سے
میرے پاس آ پہنچے
کتنے شوق سے میں نے
اپنے گھر کے آنگن کی
تم کو آبرو بخشی

سال بیت جائیں گے
جب بہار آئے گی
ریشمیں شگوفوں کے
زمزمے بکھیرو گے
اپنے آپ میں کھو کر
نکہتوں کے شہ پارے
لوحِ جاں پہ لکھو گے
سوچ ہم جوانی کی
ناز سب حسینوں کے
ایک جیسے ہوتے ہیں
(اپنے عکس کے آگے
سارے رنگ پھیکے ہیں)

جب بہار آئے گی
جانے میں کہاں ہوں گی
پیچ و خم سے بنتی ہے
منزلوں کی پگڈنڈی
تم تو بھول جاؤ گے
لمس میرے ہاتھوں کا
خواب میری آنکھوں کے

میں تمھیں نہ بھولوں گی
میں کہ فطرتاً ماں ہوں

ادا جعفری

آپ بیتی

میں بھی تھکن سے چُور ہوں ، تم بھی نڈھال ہو
گھائل مری نگاہ ہے ، تم پائمال ہو
چھالے تپک رہے ہیں ، ذرا دھیان تو بٹے
کچھ داستانِ دل ہی کہو ، راستہ کٹے
کیا کیا فریب کھائے ہیں پندارِ ہوش کے
دھوکے دیئے ہیں آپ دلِ نامراد کو
کانٹوں کو تم نے تارِ گریباں سمجھ لیا
پھولوں کو میں نے حاصلِ درماندگی کہا
تم اکتسابِ درد کی لذت میں کھو گئے
میں انبساطِ برگِ گلِ تر کی ہو گئی
اپنے دُکھوں کا چارہ نہ گل تھے نہ خار تھے
اوروں سے اپنے گھر کا پتہ پُوچھتے پھرے
گھبرا کے آرزوؤں کی شمعیں بجھائی ہیں
کیا قہر ہے کہ خود سے بھی آنکھیں چرائی ہیں
صحرائے درد راہ میں ہے ، مضمحل ہیں ہم
رہبر کسے بنایئے ، گم کردہ دل ہیں ہم

مصطفیٰ زیدی

سایہ

تمام شہر پہ آسیب سا مسلط ہے
دھواں دھواں ہیں دریچے ہوا نہیں آتی
ہر ایک سمت سے چیخیں سنائی دیتی ہیں
صدا مگر ہم نفس و آشنا نہیں آتی

گھنے درخت، در و بام، نغمہ و فانوس
تمام سحر و طلسمات و سایہ و کابوس
ہر ایک راہ پہ آوازِ پائے نامعلوم
ہر ایک موڑ پہ ارواحِ زشت و بد کا جلوس

سفید چاند کی اجلی قبائے سیمیں پر
سیاہ وسمہ و کفن کا گماں گزرتا ہے
فضا کے تخت پہ چمگادڑوں کے حلقے ہیں
کوئی خلا کی گھنی رات سے اترتا ہے

تمام شہر پہ آسیب سا مسلط ہے
کوئی چراغ جلاؤ، کوئی حدیث پڑھو
کوئی چراغ بہ رنگِ عذارِ لالہ رخاں
کوئی حدیث بعنوانِ صدقۂ دل و جاں
کوئی کرن پئے تزئینِ غرفہ و محراب
کوئی نوا پئے درماندگان و سوختہ جاں

سنا ہے عالمِ روحانیاں کے خانہ بدوش
سحر کی روشنیوں سے گریز کرتے ہیں
سحر نہیں ہے تو مشعل کا آسرا لاؤ
کہیں سے دل کی سلگتی ہوئی دعا لاؤ
دلوں کے غسلِ طہارت کے واسطے جا کر
کہیں سے خونِ شہیدانِ نینوا لاؤ

ہر اک قبا پہ کثافت کے داغ گہرے ہیں
لہو کی بوند سے یہ پیرہن دھلیں تو دھلیں
ہوا چلے تو چلے بادباں کھلیں تو کھلیں

منیر نیازی

حرفِ سادہ و رنگیں

اک کلی گلاب کی
گرچہ اُس چمن میں ہے
یاد ایک خواب کی
شام کے گگن میں ہے
اسم سبز باب کا
پُر فریب بن میں ہے
نقش اک شباب کا
سایۂ کہن میں ہے
اک پکارتی صدا
جبر کے گھن میں ہے
دور دور تک ہوا
کوہ اور دمن میں ہے

احمد ظفر

رشتے

اداسی مرے سر میں پتھر ہے
آنکھوں میں مٹی
دلِ غمزدہ میں الاؤ
کہ جس سے مرے سر میں وحشت جنم لے رہی ہے
ستارے مری چشمِ تر میں ابھرنے لگے ہیں
الاؤ دہکتے ہوئے سرخ پھولوں میں تبدیل ہونے لگا ہے

اداسی مری آرزوؤں کی قاتل
کبھی سبزہ و گل کی مانند بکھری ہوئی ہے
کبھی تیرے چہرے کی چاندنی سی نکھری ہوئی ہے
کبھی زرد پتوں کی مانند ہیں میری آنکھیں
کبھی ہونٹ تیرے
اداسی ازل سے ہے اک مہر جن پہ

ازل سے ابد تک ستاتی رہی ہے اداسی
دیئے سے جلاتی بجھاتی رہی ہے اداسی
اداسی کبھی ابر پاروں سے گرتی ہوئی سرد جھالر
کبھی دھند ہے آنسوؤں کی

اداسی مرا آئنہ ہے
کہ جس میں ترے حسن کے نقش بکھرے ہوئے ہیں
ترا حسن جس نے اداسی کی مشعل کو روشن کیا ہے
وہ مشعل تری رہنما بن گئی ہے
خموشی بھی جیسے صدا بن گئی ہے
کہ جس کے سہارے ازل سے ابد تک چلا جا رہا ہوں
اداسی مری زندگی بھی، مری موت بھی ہے

احمد ظفر

خزاں

سینہ جویا ہے کسی پھول کا، آنکھیں ویراں
دعوتِ رنگ ملے کس سے کہاں سے؟ کیسے؟
سوچتے سوچتے دن رات گذر جاتے ہیں
کتنے تارے مری پلکوں پہ جلاتے ہیں چراغ
کتنے خنجر مرے سینے میں اُتر جاتے ہیں

پھر وہی سعیٔ مسلسل ہے، وہی جورِ قدیم
وقت زنجیر بھی، تقصیر بھی، تقدیر بھی ہے
ہاتھ ٹوٹے ہوئے، پھوٹی ہوئی آنکھیں جیسے
آئینہ جیسے شکستہ ہو، شکستہ ہے دماغ
بھیک مانگوں سرِ بازار تو مانگوں کیسے

کون آواز یہاں دے گا کسے تاب ہے یہ
دل پہ جو گذرے اسے کون رقم کرتا ہے
درد کی لہر میں لپٹے ہوئے کتنے انساں،
دیکھتے دیکھتے چپ چاپ گذر جاتے ہیں
زندہ لاشیں ہیں، بگولوں میں سسکتے پتے
خاک بن بن کے سرِ راہ بکھر جاتے ہیں

جمیل ملک

نروان سے پہلے

فضا میں یہ کیسی چبھن ہے !
ستارا کوئی اپنے مرکز سے ٹوٹا ہے
یا میرے دل کی صدا ہے !

یہ موجِ ہوا ہے کہ بجھتا دیا ہے !
پس و پیش سائے لرزتے ہیں
یا میرا دل کانپتا ہے

یہ موہوم سی سرسراہٹ ہے کیسی !
یہ کس کی ادا ہے !
فرشتہ کوئی میرے پہلو سے گزرا ہے
یا تیرے قدموں کی آہٹ ہے، کیا ہے

عجب وسوسوں میں گھرا ہوں
خلا میں خلا تا بہ حدِ نظر ہے
خیالوں میں کتنے بھنور پڑ رہے ہیں !
نہ اپنی خبر ہے نہ تیرا پتہ ہے
میں اُوپر ہی اُوپر اُڑا جا رہا ہوں
میں کس برج میں ہوں، یہ کیا مرحلہ ہے !
زمیں، چاند، سورج، ستارے
ہر اک چیز میرے تعاقب میں ہے
میں خلاؤں میں چکرا گیا ہوں
مرے سامنے کون سی انتہا ہے !
فنا یا بقا ہے !!

جمیل ملک

نروان

میں تیری چاہت میں کو بکو، در بدر پھرا ہوں
ہر ایک گھر سے مری صدا کا جواب
چُپ، اِک بسیط چپ تھا
سبھی نے پردے گرا دئیے تھے، کوئی نہ بولا
کہ میری آشفتگی، مری بیکسی کا دامن بھی چاک تھا میرے دل
کی صورت

کھنکتے سِکوں کا نغمۂ جاں فزا سُنا
کھلکھلاتے نوٹوں کا رقصِ پیہم بھی مَیں نے دیکھا
مگر یہ وہ خواب تھا کہ جب آنکھ کھل گئی تو وہی خموشی
مہیب، گہری، اٹوٹ چُپ
اور مَیں
اُسی خوابِ دلنشیں کی حسین تعبیر ڈھونڈتا تھا

مرے خیالوں میں حشر برپا تھا
خود نمائی کی گونج تھی وہ کہ میرے ہی کان بج اُٹھے تھے؟
کہاں کہاں تھا مقام میرا
ہر اک زباں پر تھا نام میرا
وہ شور تھا کہ مری سماعت بھی سو گئی تھی
پھر ایک قاتل، مہیب چپ تھی جو میرا مقسوم ہو گئی تھی

اور اب
کہ میں خامشی کی لو سے چراغ دل کا جلا چکا ہوں
حجاب سارے اُٹھا چکا ہوں
کہیں بہت دور جا چکا ہوں
تو مجھ کو عورت بھی ڈھونڈتی ہے
تو مجھ کو شہرت بھی ڈھونڈتی ہے
مگر مَیں واپس نہ آ سکوں گا
مگر میں واپس نہ آ سکوں گا

شاذ تمکنت

دائرہ

پلکیں نیندوں کے جھنور، آنکھیں شبستاں کے چراغ
سخنِ زیرلبی مشک کے جھونکے جیسے
لفظ نوشینہ تو لہجہ ہے شکر قند کی طرح
جملے اس چاؤ سے پورے ہوں کہ وعدے جیسے
پیاس کی آنچ سے چٹخے نہ بدن کا بلّور
قوسِ ملبوس میں جلتے ہوں شوالے جیسے
ہربنِ مُو ہے ہم آغوشیِ پنہاں کی پکار
تار کس دیں تو کھنک اُٹھتے ہوں پردے جیسے

اے دلِ زود فراموش خبر ہے کہ نہیں
زندگی آپ کو اس طرح بھی دہراتی ہے
کبھی نارنجی، کبھی سرخ، کبھی سبز قبا
وہی لڑکی ہے جو سو رنگ سے آجاتی ہے

تابش صدیقی

ایک شام

میں آج شام سے بیٹھا ہوں سر جھکائے ہوئے
کسی سے بھی تو نگاہیں ملا نہیں سکتا

وہ سر،
جو پانچ برس سے بلند و بالا تھا
ہُوا ہے زینتِ آغوشِ فرش — یوں، جیسے
شفق کے پھول ستاروں کے بام سے گر کر
کثیف خاک کی جھولی میں خاک ہو جائیں
سمٹ گئے تھے جو،
وہ ہاتھ — پھر سے پھیل گئے
اندھیری رات میں بلّی کی پتلیوں کی طرح

رقیبِ بزدل و مکار کی شبِ تیرہ
مسرتوں کے شراروں سے جگمگا اٹھی
گلے میں سُوکھے ہوئے قہقہے کھنکنے لگے
گرسنہ، پچکی ہوئی تو ند سر اٹھانے لگی
رقیبِ زشت خصال
غلیظ دانت نکالے اچھلتا پھرتا ہے
سمجھ رہا ہے کہ میں وہ نہیں
جو کل تک تھا

میں آج ایک زبانِ خموش و ویراں ہوں
میں ایک دیدۂ غم آشنا و حیراں ہوں

میں اس کے چاہنے والوں میں تھا
(اور اب بھی ہوں)
ہزار چاہا، مگر
میں نہ اُس کو روک سکا
بس اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا جیسے
ازل سے میرے مقدّر میں تھا یہی شاید
میں اس کا ہنستا ہُوا عزم آفریں چہرہ
نگاہِ شوق لیے،
اُنتہائے شوق بنے،
دیکھتا رہا — لیکن
زباں پہ حرفِ محبت بھی آ سکا نہ کوئی

میں آج
شرم سے بیٹھا ہوں
سرنگوں
خاموش

امین راحت چغتائی

سرسراہٹ

دامنِ کوہ میں دیو قامت درختوں کا جنگل
کہ جس سے ہوا کا گزر ہو تو یوں سیٹیاں بجنے لگتی ہیں جیسے
کسی شہر کے کوچۂ خوش نظر سے
کسی بانوئے خوش ادا کا گزر ہو
تو کچھ منچلے بے ارادہ بجانے لگیں سیٹیاں جھوم کر

اِن درختوں کے سائے میں لیٹی ہوئی دوب میں سرسراہٹ سے
اک دختِ دہقاں پریشاں پریشاں
یہی سوچتی جا رہی ہے :
اچانک کسی سمت سے سانپ آ کر نہ ڈس لے ،
کہ جنگل ہے اور ہر طرف ہُو کا عالم
جوانی کا دم خم
کہیں ٹوٹ کر خاک میں مل نہ جائے

مگر یہ بھی خواہش ہے دل کے کسی گوشۂ بے نشاں میں
اگر سانپ ڈس لے تو یہ روز کا خوف جاتا رہے
اور دیکھیں کہ اُٹھتی ہیں ٹیسیں سی کیسی بدن میں
رگوں میں تناؤ سا آتا ہے کیونکر
اثر کس طرح زہر کرتا ہے دل پر
نمودار کیوں ہونے لگتے ہیں آنکھوں میں نیندوں کے ڈورے

یہی سوچتی سوچتی راہ میں
رینگتے ، ہانپتے وقت کی پیٹھ پر بیٹھ کر
دیو قامت درختوں کے سائے میں لیٹی ہوئی دوب سے پوچھتی ہے
'یہ لرزا سا طاری ہے کیوں جسم و جاں پر ؟
بھلا خوف کیسا !
کہ یہ سانپ تو دیکھے بھالے ہیں میرے '

پروین فنا سیّد

ہنسی

چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہم کتنا ہنستے تھے
بے مقصد، بے بات ہنسی کا دھارا پھوٹا
تم نے پوچھا —— یہ دیوانہ پن کیسا ہے
اتنی ہنسی تو راس نہیں آتی کلیوں کو
میں نے کہا تھا — آج مجھے کھل کر ہنسنے دو
کھل کر ہنسنے تو برسوں گزرے صدیاں بیتیں
لمحہ لمحہ، پل پل، ہم چپ چاپ جلے ہیں
آج تو کھل کر ہنس لیں — کل پھر جلنا ہوگا

فریب

آج پھر تم مجھے کس محفلِ غم میں لائے
آج پھر میں نے سرِ بزم اندھیرا دیکھا
رنگ اور نور سے بہکی ہوئی اس دنیا میں
میں نے گمبھیر اداسی کا بسیرا دیکھا
کھلکھلاتے ہوئے چہروں کی صباحت میں چھپے
کتنی سوچوں کے الجھتے ہوئے افسانے تھے
یہ بظاہر جو تمہیں اپنے نظر آتے تھے
اصل میں اپنی حقیقت سے بھی بیگانے تھے

محمد علوی

پہلا خدا

اندھیرا تھا!
چاروں طرف
موت منڈلا رہی تھی!
نگاہوں میں
مایوسیاں بس گئی تھیں!
دلوں میں
کئی خوف گھر کر گئے تھے!
تو اُس وقت
ہم نے
نہایت عقیدت سے
پہلے خدا کو پکارا

وہ پہلا خدا
جس نے ہم کو
اندھیروں سے باہر نکالا
اجالوں کی نعمت عطا کی
مگر ہم اسے بھول بیٹھے!
کہاں ہے
وہ پہلا خدا اب کہاں ہے؟
ہمیں پھر
ضرورت ہے پہلے خدا کی!!

ریت

سکوں ریت کا ایک ذرّہ ہے
جو ریت نے کھا لیا ہے!
اُسے ڈھونڈھنے کی نہ کوشش کرو
اُونٹ پہ
اپنی تنہائیاں لاد کر
پا برہنہ
دہکتے ہوئے ریگ زاروں میں
بھٹکا کرو!
اور سرابوں کو دیکھو
تو آنکھیں چرا لو
کہ سب ریت ہی ریت ہے
ریت ہی ریت ہے!
ریت ہے
ریت!!

ادیب سہیل

شہرِ استخواں

اب تو ہر جلوۂ شگفتہ پر
جاگ اُٹھتا ہے کرب کا عالم
ناز جس پھول سے بدن پر تھا
وہ فسردہ ہوا ہے بے موسم

شاخِ گرویدگی میں جانے کیوں
سرد مہری کا لگ رہا ہے ثمر
اِک ستم ہے کہ اُس کے پہلو میں
ذہن کو کھینچتا ہے نقشِ دگر

جسمِ رعنا کے خواب دیکھتا ہوں
پیش ہے لیکن استخوان کا شہر
پُرکشش ہے تضاد کے باوصف
مشترک یہ نشاط و غم کا دہر

رہ کر اس عالمِ خزاں میں بھی
تازہ یادِ بہار کرتا ہوں
بُعد محسوس جب بھی ہوتا ہے
اور شدت سے پیار کرتا ہوں

رحمان فراز

دوام

ہماری تہذیب کے نئے پھول جب کھلیں گے
تو ہم نہ ہوں گے
ہمارے خوں سے گندھی ہوئی
پائمال رستوں کی زرد مٹی
مہک اُٹھے گی، تو اس کی مہکار ہم بنیں گے

ہمارے جسموں کا سرخ سورج
زمین کو تابناک کر کے
چھپا، تو اس کی شعاعوں کے یہ حسین ریزے
نکھار دیں گے ترے وطن کے حقیر ذرّے
سنوار دیں گے ترے چمن میں ہزار نغمے

ہماری روحیں بدن کا بوسیدہ پیرہن گر اُتار پھینکیں
تو ایک جوشِ نمو میں ہم بھی
حسین پھولوں سے ڈولتے شاخسار کی طرح لہلہائیں

ہماری قدریں اَمِٹ رہیں گی
ہماری تہذیب کے نئے پھول پھر کھلیں گے
تو کیا ہُوا، ہم اگر نہ ہوں گے
وہ تیز مہکار تو اُڑے گی
سراغ دیتی ہوئی پھرے گی
تیری اَنا کا — میری اَنا کا

رحمان فراز

رفتگاں

ہم سے پہلے بھی تو اِس مقتل میں لوگ
آئے تھے نعرہ بلب، شعلہ بجاں
اور رکھ دی اپنے اک اک حرف میں
دل کے دُکھتے زخم کی کُھلتی زباں
وقت کے دھارے پہ اُن کے خوں کی سطر
ایک عہدِ نَو کی رنگیں داستاں
اُن کے نقشِ پا کی ہر اُجلی لکیر
عرصۂ شب پر مثالِ خطِّ سحر
عہدِ ماضی کی وہ اک صوتِ خموش
اپنی ہر آواز سے تابندہ تر
کاش ہم بھی اپنے خوں میں ڈوب کر
لکھ سکیں ایسی ہی اک سطرِ تپاں،
لوحِ دُنیا پر، باندازِ دگر
اپنے پیکر چند چلتے پھرتے سائے
جن کو کھا جاتی ہے ہر تیرہ شبی
اپنی ہر آواز — آوازِ شکست
اور بڑھ جاتی ہے جس سے خامشی
اپنے سینے پر کہاں وہ تازہ زخم
پھوٹ نکلے جن سے صبحِ زندگی

قہقہے لب پر ہیں، دل افسردہ ہیں
دوستو! ہم زندہ ہیں یا مردہ ہیں

ریاض مجید

رفتگاں کی منازل کی تکریم کر

جانے والے زمانے کے رستے میں آنکھیں بچھا کر
مہ وساں کی گرد کی تہہ میں ڈوبی فراموش یادوں کی آواز سُن
اپنے پیاروں کی مٹی کو کحلِ بصر جان
اُس راہ پہ بیٹھ جا
رفتگاں جس سے ہو کر گئے ہیں
(دعا مانگ وہ جس جگہ پر بھی ہوں خوش رہیں)

رفتگاں کی منازل کی تکریم کر
آنکھ سے حال کی بے مروّت چمک کو نکال اور دیکھ آج بھی اُن
منازل میں تیرے لیے کیا خوشی ہے؟

پُرانی رُتوں کے تصوّر سے بھیگی ہوئی آنکھ میں تیرتے اشک سے
قیمتی کوئی شے ہے تو کہہ!
گئے لمحوں کی پُر فضا یاد میں ڈوب کر ایک حسرت بھرے بوڑھے
سینے سے باہر نکلتے ہوئے سانس سے زندگی بخش اگر کوئی اک
سانس ہے تو بتا!

یاد رکھ!
بھولے بسرے ہوئے راستوں کی زیارت سے بڑھ کر نظر
کے لیے کوئی جنّت نہیں ہے!

نظر کے تقاضوں کو پہچاننے کی سزا کون جھیلے

آزمائش کے اِس مرحلے سے گزر جا
ہم اک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں
ہم اک دوسرے کے لیے اجنبی ہی رہیں گے
ہم اک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے تو
مر جائیں گے
پھر بھی اک دوسرے کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے!

نگاہیں اٹھا
سامنے دیکھ
تیرے لیے کس قدر راستے ہیں

لیلیٰ عطاء اللہ

بے بسی

مجھ سے کہتی ہیں روایاتِ کہن
اور بتاتے ہیں بزرگوں کے چلن

شعر کہنا نہیں اچھا ہوتا
دل کی دنیا کا بیاں ٹھیک نہیں
لڑکیاں راز نہ کھولیں اپنے
لڑکیاں خود کو چھپا کر رکھیں

جسم تو خیر چھپا رہتا ہے
ہو سکے گر تو اسے اور چھپاؤ
دل کو بھی اپنی طرح قید رکھو
روح کے چہرے سے پردے نہ اُٹھاؤ

لڑکیاں پردوں میں مستور بھلی
مرد کی ذات ہے عنوانِ جلی

میں نے کب شاعری کی — محترمو!
مجھ کو تو اس کا تصور بھی محال
اتنی صدیوں کی چٹانوں کے تلے
کون کر سکتا ہے تخلیقِ جمال

اپنے پردے بھی اُٹھاتا ہے کوئی؟
کون ہے، خود کو جو عریاں کر دے
کون ہے! بن کے جو اک موجِ صبا
نکہتِ گل کو پریشاں کر دے
کیوں کہوں خالقِ اشعار ہوں میں
اپنی سوچوں میں گرفتار ہوں میں

سبط نبی صبیم

شیشوں کا شہر

گلی میں نہ اب تُو، نہ وہ زندگی ہے
دریچوں میں بیٹھی ہوئی خامشی ہے
عجب بات ہے، جانے کیوں آج ہر شے
مجھے حیرتی ہو کے یوں دیکھتی ہے
کہ جیسے میں اس کا شناسا نہیں ہوں
میں اک اجنبی ہوں!

یہی وہ گلی ہے ـــ
جسے سالہا سال سے آرزو تھی
کہ گزرا ہوا میرا ایک ایک لمحہ
یہ سینے میں محفوظ کر لے

مگر یہ گلی اب اُسی عکس سے اپنا دامن بچا کر
مرا عکس یوں مجھ کو لوٹا رہی ہے
کہ جیسے مرے چار سُو آئینے ہوں!

شبی فاروقی

رشتہ

ہمارے ابا
زمیں کے پیوند ہو چکے ہیں
ہمیں بھی ہونا ہے دفن اک دن
زمیں کے نیچے
زمین ہی ـ
جبکہ آنے والی ہماری نسلوں کی
آخری خوابگاہ ٹھہری
تو پھر وہ ہم سے
جو اپنے ماں، باپ، بھائی، بہنوں کے مردہ جسموں کو
آگ، پانی، ہوا میں تحلیل کر رہے ہیں
جو ایک دن،
خود بھی آگ، پانی، ہوا میں تحلیل ہو رہیں گے
یہ کس عداوت میں کہہ رہے ہیں
"تمھارا رشتہ زمیں سے کیا ہے؟"

احمد ندیم قاسمی

کرب

کرب کی آخری حد ایک نہیں
ایک وہ ہیں جو بنے کرب کی شدت سے بُتِ سنگ نژاد
اور اک وہ ہیں جو اس درجہ ہوئے نرم و گداز
کہ کوئی قہقہہ مارے تو لرز جائیں
لرز کر رو دیں
کرب کے صید کچھ ایسے بھی ہیں
تلوے سے اگر خار نکالیں تو پکاریں
کہ بہار آئی ہے
اور وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں
کہ ہم کرب کا کندن ہیں
ہمیں کرب نے مارا ہے کہ ہم زندہ رہیں
اور اک میں ہوں
کہ جس کرب سے گزرا ہوں
اسے دوست بنایا ہے
جہاں جاؤں، اسے ساتھ لیے پھرتا ہوں

ڈاکٹر سید عبداللہ

دادِ سخن

ہماری پرانی تنقید نمو بہت کم پاتی رہی۔ اس کا کام سمجھانے تک محدود رہا۔ فیصلے بھی ہوتے رہے اور اکثر صحیح ہوتے رہے لیکن فیصلے کی دلیلوں یا اصولوں کی بحث محض اشاروں اشاروں میں کر دی جاتی تھی۔ خیال شاید یہ تھا کہ باخبر سب کچھ جانتے ہیں اس لئے ان سے کیوں کہا جائے۔ باقی رہے بے خبر سو ان سے کیا کہا جائے

با خبروں سے کیوں کہوں، وہ بے خبروں سے کیا کہوں

اس طریق کار سے قدیم زمانے کے طالبان علم کو نقصان پہنچا ہو گا مگر ہمیں جو نقصان پہنچا اس کی کوئی حد نہیں۔ اشارے یوں بھی اشارے ہی ہوتے ہیں مگر ان کی نارسائی اس وقت بیکراں ہو جاتی ہے جب ان اشاروں کے جاننے والے ہی ختم ہو گئے ہوں۔

فارسی کا میں تنقیدی اصولوں کی کتابیں کچھ زیادہ نہیں۔ اگر ہمیں آج ان اصولیات کو مدون کرنا ہو تو تذکروں کے سوا ہمارے پاس کیا ہے؟

دورِ مغلیہ میں اکبر کے زمانے میں شعر و ادب کا خاصا چرچا تھا۔ نکتہ رسی اور نکتہ دانی کی بھی کمی نہ تھی۔ اس زمانے میں ادب کے بڑے بڑے مسئلے پیدا ہوئے اور بڑی بڑی اختلافی باتیں سامنے آئیں مگر آج ان کی تفصیل تو کیا ان کے اجمال تک کے لئے ہم ترس رہے ہیں۔ بعد کے زمانے کا بھی یہی حال ہے۔

ایسے حالات میں اصول تنقید کی طرف معمولی سی پیش قدمی بھی غنیمت معلوم ہوتی ہے۔ فیضی کے خطوط (لطیفہ فیاضی)، اور حکیم ابوالفتح گیلانی کے مکاتیب (چہار باغ)۔ اور ایک حد تک ابوالفضل کے شذرات (انشاء دفتر سوم) کو بنیادی باتوں کے لئے بے حد مفید اجمال سمجھنا چاہئے۔

بعد کے زمانے میں میر محسن اکبرآبادی کی کتاب محاکمات الشعرا (جس کا ایک ناقص نسخہ یونیورسٹی لائبریری میں ہے) اور خان آرزو کا ایک مختصر سا رسالہ دادِ سخن اصول بندی کی طرف پیش قدمی کی قابلِ قدر کوشش ہے۔

خان آرزو عہد محمد شاہ کے بعد کے بزرگ تھے۔ تاریخ وفات ـــــــ ہے۔ ہندوستانی فارسی کے بڑے حامی اور فارسی دانانِ ہند کے بڑے طرفدار۔ میر و مرزا کے زمانے کے اکثر اردو شاعر ان سے فیضیاب اور ان کے علم و فضل کے معترف تھے۔ شعرائے فارسی کا ایک جامع تذکرہ (مجمع النفائس) لکھا۔ فارسی کے دو تین لغات مدون کئے۔ فقہ اللسان پر مثمر نام کی ایک کتاب لکھی۔ اور ان سب کے علاوہ شعری علوم اور بیان و معانی پر رسالے لکھے ..... انہی میں ایک مختصر سا رسالہ دادِ سخن بھی ہے جس میں منجملہ دیگر مطالب کے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ شعر فہمی کے اصول کیا ہیں؟

اس رسالے کی تیسری فصل (مقدمہ سوم) میں خان آرزو نے شعر فہمی کے چھ راستے یا طریقے بتائے ہیں:

۱۔ خان آرزو کے نزدیک پہلا طریقہ "طریق عامۂ اہل زبان" یعنی خاص و عام لوگ بھی فطری طور پر شعر کو سمجھنے کی جتنی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے مطابق مفرد اور مرکب الفاظ کے جو معنی ہر شخص پر منکشف ہیں ان تک رسائی خود بخود ہو جاتی ہے۔ شعر کی دوسری لطافتوں کا علم تو مطالعہ اور اکتساب پر منحصر ہے۔

۲۔ دوسرا راستہ "دریافت ارباب معانی" ہے۔ ارباب معانی سے علم معانی کے ماہرین مراد ہیں اور یہ وہ علم ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلام مقتضائے حال کے مطابق ہے یا نہیں۔ تجربہ یا خیال جس طرح بیان ہونا چاہیے (کامل ابلاغ کے نقطۂ نظر سے) اس طرح بیان ہوا ہے یا نہیں۔ کلام میں قدرتی ترتیب (تقدیم و تاخیر)

مدنظر رکھی گئی ہے یا نہیں، جہاں بیان تفصیل چاہتا ہے تفصیل اور جہاں اختصار و ایجاز کی ضرورت ہے وہاں اختصار و ایجاز ہے یا نہیں۔

خان آرزو کا کہنا ہے کہ جو لوگ شعر فہمی کے لیے صرف علم معانی پڑھتے ہیں۔ لکھتے ہیں، وہ قدرتی طور پر شعر فہمی کے دوسرے ذرائع اور وسائل کی طرف متوجہ نہیں ہو پاتے مثلاً انھیں تشبیہ و مجاز مرسل اور کنایہ و استعارہ کے رموز اور لطافتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ غرض یہ طریقہ بھی ناقص رہتا ہے۔

۳۔ اس کے برعکس کچھ اور لوگ ہیں، جو شعر میں کنایہ و استعارہ ہی ڈھونڈتے رہتے ہیں اور باقی ہر چیز سے قطع نظر کر لیتے ہیں، یہ لوگ شعر کو علم بیان کا غلام سمجھتے ہیں۔

۴۔ اسی طرح کا ایک اور گروہ ہے جو شعر اور صنعت گری کو ایک چیز سمجھتا ہے۔ یہ حضرات صنائع بدائع کی جستجو میں لگے رہتے ہیں اور باقی ہر چیز کو ہیچ خیال کرتے ہیں بلکہ اس خیال کے ایک نقاد نے تو یہاں تک کہا ہے:

شعرے کہ نباشد دو محل　　باگوز شتر بود برابر

(جس شعر سے دو معنی نہ نکلیں اسے گوز شتر سمجھنا چاہیئے) یہ دراصل صنعت ایہام سے غیر معتدل دلچسپی کا نتیجہ ہے اور حالت یہ ہے کہ انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ التفات صنعت نہیں علم معانی کا مسئلہ ہے۔ اسی طرح یہ کہ استعارہ علم بدیع سے متعلق نہیں، بلکہ اس کا تعلق علم بیان سے ہے۔

۵۔ خیر یہ لوگ پھر بھی غنیمت ہیں، ایک اور طبقہ ایسا بھی ہے جو سابق الذکر سے بھی زیادہ غضب ڈھاتا ہے۔ وہ ہے مدرسوں کا طبقہ۔ یہ لوگ محض زبردستی سے نقاد بن جاتے ہیں اور اپنی منصبی بالادستی سے فائدہ اٹھا کر اپنے قیاس سے ادبی فیصلے صادر کرتے ہیں۔ کیونکہ انھیں یہ معلوم ہے کہ ان کی جہالت کا راز فاش نہیں ہوگا، اور وہ جو کچھ کہیں گے ان کے شاگرد اس پر اعتراض نہیں کر سکیں گے۔

خان آرزو نے اس ضمن میں ایک مثال دی ہے۔ ایک مدرس نے سعدی کا یہ شعر پڑھا:

بنام خداوند جان آفریں　　حکیم سخن بر زباں آفریں

اور کہا کہ اس کا دوسرا مصرع غلط ہے اور صحیح یوں ہے کہ:　　چہ گویم سخن بر زباں آفریں

پہلی صورت اس لئے غلط ہے کہ اگر حکیم اور سخن، زباں کو آپس میں مضاف مضاف الیہ کا تعلق ہے تو یہ بڑی قبیح بات ہے کیونکہ مضاف مضاف الیہ کے مابین اتنا فاصلہ نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن معترض کو یہ خیال نہیں آیا کہ فاصلے والا اعتراض مان بھی لیا جائے تو بھی یہ کس طرح معلوم ہوا کہ متبادل مصرع بالکل صحیح ہے اور صحیح یہ ہے کہ اصل کے بدلے میں جو مصرع تجویز ہوا ہے وہ بالکل مہمل ہے لیکن ملائے مکتبی کو اس پر برابر اصرار رہا۔ بہرحال اکثر مدرسوں کی شعر فہمی اسی قبیل کی ہے۔

۱؎ فہم سخن سے واقف مذاق شعر۔ مذاق شعر سے مراد وہ معیار اور تجربے ہیں جو شاعر کے مدنظر ہوتے ہیں اور جن کی روشنی میں یا جن کی تحریک سے وہ شعر کی تخلیق کرتے ہیں۔

خان آرزو نے یہ بڑے کام کا اصول بتایا کہ شعر فہمی کے اصول خود شعروں کے اندر موجود رہتے ہیں۔ اس لئے نقاد کو تشریح یا فیصلہ کرتے وقت یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ خود صاحب سخن[۱] کے مدنظر کیا ہے؟

مراعات طریقے کہ صاحب سخن را منظور بود۔

یہاں طریقے سے مراد اسلوب بھی ہے اور جذباتی تجربہ اور شاعرانہ مسلک اور نصب العین بھی چنانچہ خان آرزو نے اس کی تشریح کرتے ہوئے خود لکھا ہے اور اگرچہ بظاہر اسلوب و الفاظ و ترکیب پر زیادہ زور دیا ہے تاہم مثالوں سے اچھی طرح ظاہر ہو جاتا ہے کہ مذاق شعر سے مراد معیار بھی ہیں اور تجربے بھی ہیں۔

خان آرزو کے نزدیک مذاق شعر سے باخبر ہونے کے لئے چند باتیں ضروری ہیں، مثلاً روز مرہ کا علم۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ شاعر کے اظہار میں لطافتوں کا ایک عنصر "روز مرہ" کے ذریعے داخل ہوتا ہے۔ اسی طرح لفظوں کی شناخت بھی لازمی ہے۔ شاعری ایک لحاظ سے لفظوں کا کھیل بھی رہا ہے۔ لفظوں کی جذباتی، فکری، تصویری اور صوتی قیمت ہوتی ہے۔ ہر شاعر کا انتخاب الفاظ اپنے موضوع اور اپنے "مذاق شعر" کے مطابق ہوتا ہے۔ نقاد اگر قیمتوں پر نظر نہیں رکھے گا تو وہ ان لطافتوں سے باخبر نہ ہو سکے گا جو شاعر کے مدنظر تھیں۔

اسی طرح علم بند و بست الفاظ" اور "علم ترکیب الفاظ" بھی لازمی ہے .... "اور آخر میں طرز اور مسلک کی شناخت یعنی یہ کہ شاعر کا ذوق کسی خاص مسلک کے تابع ہے ؟ وہ خیال سے خاص دلچسپی رکھتا ہے یا ادا بندی کا دلدادہ ہے؟ یا تمثیل اور مثالیہ کا عاشق ہے ؟

خان آرزو نے اپنے اس رسالے میں قدسی اور شیدا کی مشہور ادبی نزاع کے بارے میں جو محاکمہ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعر میں ابلاغ (بلاغت کی کامل رسائی) کو لازمی سمجھتے ہیں۔ جو شعر اپنے سامع کو فوراً اپنے مطلب سے آگاہ نہ کر سکا وہ مقصد میں کامیاب نہ ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ شعر میں ابہام و خفا کا عنصر آ ہی جاتا ہے لیکن ابہام وہی دلکش ہوگا جو فوراً منکشف ہو جائے اس علاوہ "عقلی قرینہ" بھی بے حد ضروری ہے۔ جس مضمون کی تصدیق عقل یا حقیقت واقعی سے نہیں ہوتی اس پر سامع آسانی سے ایمان نہیں لاتا۔ اس کی نظر میں ایسا مضمون محض کھیل یا اختراع لایعنی سے زیادہ کچھ نہ ہوگا۔

قرینہ عقلی کی وضاحت سے لئے قدسی کے ایک ہی شعر کے محاکمے سے کچھ نتیجے نکالے جا سکتے ہیں۔ قدسی نے لکھا تھا :-

عالم از نالہ من بسکہ چناں تنگ فضاست
کہ سپند از سر آتش نتواند برخاست

(ترجمہ : میرے نالہ (و فریاد) کی وجہ سے دنیا اتنی تنگ فضا ہو گئی ہے کہ آگ میں ڈالا ہوا اسپند جس کی فطری خاصیت ہی یہ ہے کہ تاؤ کھا کر اچھلے اور باہر نکل آئے مگر فضا اس درجہ تنگ ہو گئی ہے کہ وہ بھی) آگ سے اچھل کر باہر نہیں آ سکتا) قدسی جس دور کا شاعر ہے اس میں اس طرح کے معانی عام ہیں مگر ایرانی ہندی جھگڑا میں ہمارے ہندی اکثر بدنام کئے جاتے تھے کہ ان کے اشعار میں خیال بافی و حقیقت سے دوریاں بہت ہوتی ہیں۔ مگر قدسی تو مشہد سے آیا تھا۔ اس کے کلام میں یہ خیال بافی کیوں ؟

اسی کو بے نقاب کرنے شیدا ہندی (شاہجہاں کے زمانے کا ہندوستانی شاعر) اٹھا اور اس نے قدسی کے اشعار کے پرخچے اڑا دیے۔ اس پر بڑی بحث ہوئی۔ ملا ابو البرکات منیر لاہوری، ملا طبا طبائی اور دوسرے لوگوں نے زور شور سے حصہ لیا اور یہ بحث اپنے زمانے سے نکل کر خان آرزو کے زمانے تک آ گئی۔

میں نے قدسی کا جو شعر نقل کیا ہے۔ اس پر شیدا نے اعتراض یہ کیا ہے کہ مضمون میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے۔ وہ عقلی لحاظ سے درست نہیں۔ شیدا نے لکھا :-

نالہ در سینہ ہوائے است کہ پیچاں شدہ است
چوں ز لب گشت ہوا گیر ہم است جنس ہواست

(نالہ تو ایک قسم کی ہوا کا نام ہے جو سینے سے اٹھتی ہے جو لبوں کے توسط سے جب باہر فضا میں پھیل جاتی ہے تو پھر بھی ہوا ہی رہتی ہے)

عالم از دمے قتو د تنگ ولیکن ز ملال
اہل عالم گر از و تنگ نشینند رواست

(یعنی جب یہ ہوا ہے تو ہوا سے عالم کیسے تنگ فضا میں ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ سے اہل عالم افسردہ و ملول و حزیں ہو جائیں)

اعتراض یہ ہے کہ کسی کے آہ و نالے سے عالم (گنجائش کے معنوں میں) تنگ ہو جائے یہ بیان واقع نہیں یعنی حقیقت واقعی کے خلاف ہے۔

اس پر دوسرے لوگوں کے علاوہ منیر لاہوری نے بھی لکھا اور قدسی کی حمایت میں یہ کہا کہ لفظ تنگ لطور ایہام آیا ہے اس لئے قدسی کا شعر ٹھیک ہے لیکن خان آرزو کا محاکمہ یہ ہے کہ ایہام تک کیلئے قرینہ عقلی لازمی ہوتا ہے ورنہ ایہام سے شعر مہمل ہو کر رہ جائے گا۔

اس کے علاوہ کیفیت الگ شے ہے اور کمیت الگ حقیقت، لہذا کیفیات کے لئے کمیات کا اور کمیات کے لئے کیفیات کا استعمال درست نہیں۔

ان تمام بحثوں سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شاعری میں تخیل، استعارہ اور ایہام اپنی جگہ درست اور برحق ہے مگر سامع کے نقطۂ نظر سے وہ شاعری ناکام رہتی ہے جو مضمون کو سامع تک فوراً پہنچا نہ سکے۔ اور سامع کے دل میں وہی شاعری اترتی ہے جو جذباتی صداقت کے علاوہ عقلی اور واقعی حقیقتوں کے زیادہ قریب ہو۔

خان آرزو نے اس قسم کی بحثیں اپنی اور کتابوں میں بھی اٹھائی ہیں خصوصاً سراج منیر میں ــــ اور ہم ان کے غائر مطالعے سے بہت سے عمدہ تنقیدی اصولوں کا استخراج کر سکتے ہیں۔

سید علی عباس جلالپوری

رُوحِ عصر

(آخری قسط)

روحِ عصرِ حاضر

اس بدیہی حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سائنس کی ترقی سے انسان کے سوچنے کے انداز بدل گئے ہیں اور صنعتی انقلاب کے شیوع نے زرعی معاشرے کی قدروں اور نصب العینوں کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ کیمسٹری اور طبیعیات نے قانونِ سبب و مُسبّب کی اہمیت واضح کی ہے اور اس طرح نوعِ انسان کو سیکڑوں توہمات سے نجات دلائی ہے۔ اب یہ حقیقت مسلّم ہو چکی ہے کہ کوئی مُسبّب بغیر سبب کے معرضِ وجود میں نہیں آسکتا نتیجۃً خوارقِ عادات کا وجود صرف صوفیہ کے تذکروں میں باقی رہ گیا ہے۔ موسمیات نے قدیم ضمنیاتی اوہام کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اب ہم بارش، زلزلے، طوفان وغیرہ کی علمی توجیہہ کرتے ہیں اور انہیں کسی مافوق الطبع ہستی سے منسوب نہیں کرتے۔ علم طبقات الارض نے اُن تبدیلیوں کا انکشاف کیا ہے جو لاکھوں برسوں سے زمین کے بطون میں واقع ہو رہی ہیں۔ علم الحیوان نے ثابت کر دیا ہے کہ جسمانی ساخت کے لحاظ سے انسان حیوانات کے کنبے سے ہی تعلق رکھتا ہے اور انہی کی ایک ترقی یافتہ نوع ہے۔ علم الانسان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اقوام و ملل تاریخ کے کسی نہ کسی دَور میں وحشت و بربریت کے احوال سے گذر چکی ہیں اور اس دَور کی روایات بعد کے تمدنوں کے اجزائے ترکیبی بن چکی ہیں۔ نفسیاتِ جدید نے ذہنی واردات کے متعلق اکثر غلط فہمیوں کو رفع کر دیا ہے اب ہسٹریا یا فتورِ ذہن کو کسی فوق الفطرت مخلوق کی کارفرمائی نہیں سمجھا جاتا بلکہ دماغی عوارض سمجھ کر ان کا علاج کیا جاتا ہے۔ علم ہیئت کے انکشافات نے آفرینش و تکوینِ کائنات کے قدیم نظریات کا ابطال کیا ہے اور ہمیں بتایا ہے کہ کائنات کی لامتناہی وسعتوں میں کرۂ ارض کو کم و بیش وہی مقام حاصل ہے جو صحرائے اعظم میں ریت کے ایک ذرّے کو یا بحرالکاہل میں پانی کے ایک قطرے کو۔ کہکشاں کے بعض ستارے ہم سے اتنی بے پناہ مسافت پر واقع ہیں کہ ان کی روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار فی سیکنڈ کی رفتار سے چلتی ہوئی دو لاکھ بیس ہزار "روشنی کے سالوں" میں ہم تک پہنچ سکتی ہے۔ سورج سے نزدیک ترین ستارے الفاسنتاری کی دُوری چار روشنی کے سالوں سے زیادہ ہے۔ کہکشاں میں تیس لاکھ ستارے ہیں۔ ایسے ہی تین بلین اور کہکشاں ہیں جو دوربین کی مدد سے دریافت کئے جا چکے ہیں۔ ایک کہکشاں سے دوسرے کہکشاں کی مسافت بیس لاکھ "روشنی کے سال" ہے اور سب برق رفتاری سے ایک دوسرے سے دور ہٹتے جا رہے ہیں۔ کائنات کی ان ہوشربا وسعتوں کے پیشِ نظر کلیسائے روم کا تصورِ کائنات محض گڑیا کا گھر ہے۔ ڈینٹے کرۂ ارض کو تمام کائنات کا مرکز سمجھتا تھا جس کے گرد نو بیضوی کُرے موجود ہیں۔ چنانچہ اس کائنات کی سیر سے وہ صرف چوبیس گھنٹوں میں فارغ ہو جاتا ہے۔ پروٹسٹنٹ مذہب کے پیرؤوں کے عقیدے کے مطابق کائنات کی تکوین سنہ ۴۰۰۴ ق م میں عمل میں آئی تھی۔ آرچ بشپ اشر نے تو یہ بھی ثابت کر دکھایا ہے کہ کائنات ۲۳ اکتوبر کو صبح کے نو بجے معرضِ وجود میں آئی تھی۔ ڈینٹے کی تحقیق یہ تھی کہ تخلیقِ آدم سنہ ۵۲۰۰ ق م میں ہوئی تھی اور قیامت سنہ ۱۸۰۰ء بعد از مسیح برپا ہوگی۔ آج علم ہیئت کے انکشافات کی روشنی میں یہ عقاید مضحکہ خیز دکھائی دیتے ہیں۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں سائنس کو خاص طور پر حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ ہوائی جہاز، سینما، بے تار برقی، ایکس رے، ریڈار، ٹیلی ویژن، ریڈیائی عمل وغیرہ کی ایجادات سے کہیں زیادہ اہم طبیعیات کے انکشافات ہیں۔ لائب نتس نے آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کی پیش قیاسی کی تھی۔ اس نے نیوٹن کے نظریۂ کشش ثقل پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ زمان و مکان محض اضافی علائق پر مشتمل ہیں۔ تمام حقائق ذہنی ہیں اور جس چیز کو ہم مادہ سمجھتے ہیں وہ نفسیاتی اکائیوں پر مشتمل ہے۔ ان اکائیوں کو اس نے MONADS کا نام دیا تھا۔ آئن سٹائن نے لائب نتس کی تائید کی ہے اور مکان زمان کی وحدت کا اثبات کیا ہے۔

ایٹم کے تجزیے سے مادے کا قدیم تصور بدل گیا ہے۔ شروڈنگر اور ہائزن برگ کی تحقیقات نے جبریت کی نفی کی ہے۔ مادے کے جوہری قوت میں تحلیل ہو جانے اور قوت کی لہروں کی آزادروی نے طبیعیات کی دنیا میں انقلاب برپا کیا ہے۔ پلانک کے نظریہ مقادیر عنصری کی رو سے بھی قدر و اختیار کے تصور کو تقویت بہم پہنچی ہے اور مادیت کے ساتھ جبر کا جو خیال وابستہ تھا وہ ختم ہو گیا ہے۔ بقول برٹرنڈ رسل ٹھوس اشیاء محض واقعات کی ہی محسوس و مرئی صورتیں ہیں۔ ڈاکٹر جانسن کے متعلق مشہور ہے کہ اسے کسی نے بتایا کہ بشپ بارکلے مادے کے وجود کا منکر ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے گلی میں جاتے ہوئے ایک پتھر کو ٹھوکر ماری اور کہا "میرے لئے مادے کے وجود کا یہی ثبوت کافی ہے" اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے برٹرنڈ رسل لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر جانسن کو کیا معلوم تھا کہ ان کا پاؤں اور پتھر جس کو انھوں نے ٹھوکر ماری تھی، دونوں واقعات کے ہی مجموعے تھے۔ اب میز، کرسی، اینٹ پتھر وغیرہ اشیاء کو ٹھوس نہیں کہا جا سکتا یہ چیزیں دراصل چند قوانین کی نشان دہی کرتی ہیں جن کے ماتحت یہ واقعات صورت پذیر ہوئے ہیں۔

ان انکشافات کی رو سے ایک طرف مادہ نظام کائنات میں تبدیل ہو گیا ہے تو دوسری طرف نفسیات میں "انا" غائب ہو گئی ہے اور شخصیت واقعات کا ربط سبب و مسبب بن کر رہ گئی ہے۔ مادے اور ذہن کا امتیاز اب ناقابل قبول ہے۔ کائنات جس چیز سے بنی ہے اسے یا طبیعی کہا جا سکتا ہے یا ذہنی یا یہ کہ دونوں سے مل کر بنی ہے، یا یہ کہ دونوں میں سے کوئی بھی اس کی ساخت و تکوین میں شامل نہیں ہے۔[1] ہمارے زمانے کے بعض متکلمین نے طبیعیات جدید کے ان انکشافات کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس سے تصوف اور مثالیت کے نظریات و عقاید کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ یہ غلط فہمی ایٹم کے اجزا کو "روحانی" کہہ کر پیدا کی جا رہی ہے۔ ان کے خیال میں مادہ کالعدم ہو گیا ہے اور روحانیت کی تصدیق و توثیق کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مادہ کالعدم نہیں ہوا بلکہ اس کے جوہری قوت کی لہروں میں تحلیل ہونے کا راز دریافت کیا گیا ہے اور مادے اور قوت کے باہم تبادل ہونے کا ثبوت ملا ہے۔ متکلمین نظریۂ اضافیت سے اس بات کا ثبوت اخذ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اب معروض (object) کا وجود ختم ہو چکا ہے اور سب حقائق موضوعی subjective ہیں۔ جدید طبیعیات کی رو سے مادے کے قدیم اور عمومی خصائص بے شک باقی نہیں رہے لیکن طبیعی عالم کی معروضی حقیقت بدستور برقرار ہے۔ مادہ جوہری قوت کی لہروں میں تحلیل ہو سکنے کے باوجود ایک معروضی حقیقت ہے جو ہمارے ذہن سے علیحدہ اور آزاد طور پر موجود ہے۔ اشیاء کی حقیقت ان کے ظاہر سے مختلف سہی لیکن انسان کے لئے بہر حال ناگزیر ہے کہ وہ اپنے اور فطری مظاہر یا خارجی حقایق کے درمیان مفاہمت پیدا کرے۔ اس کوشش میں اسے طبیعی یا خارجی مظاہر کو تبدیل کرنے پر قدرت حاصل ہوگی اور یہی حقیقت دوگونہ یعنی خارجی اور داخلی یا موضوعی اور معروضی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لارڈ برٹرنڈ رسل لکھتے ہیں:

> "جو لوگ مادیت کے حامی ہیں وہ اب بھی ایسا فلسفہ اختیار کر سکتے ہیں جو کم و بیش ان کے سابقہ موقف کی تائید کرتا ہو۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ طبیعیات کا سلسلۂ سبب و مسبب بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور واقعات طبیعی قوانین کے تابع ہیں۔"

سائنس کے مخالفوں کی طرف سے بسا اوقات یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ سائنس کا تعلق اسباب و علل سے ہے، مقاصد کا تعین اس کے بس کی

---

[1] An outline of Philosophy by Bertrand Russel

بات نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس دانوں نے آج تک مقاصد کے تعین کی کوشش ہی نہیں کیونکہ مقاصد اور نصب العین سائنس دانوں کے حلقۂ تحقیق سے خارج ہیں۔ یہ کام فلسفہ کا ہے جو سائنس کے انکشافات کی ترجمانی کر کے مقاصد کا تعین کیا کرتے ہیں۔ اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ جو فلسفی کسی نہ کسی شعبۂ سائنس میں بصیرت تامہ نہیں رکھے گا اُسے حقائق علمی کی ترجمانی کے قابل ہی نہیں سمجھا جائے گا۔ اب مجرد صداقتوں یا اٹل حقایق کو فلسفیانہ استدلال کی اساس قرار نہیں دیا جا سکتا اور وہی مقاصد قابل قبول اور قابلِ حصول سمجھے جاتے ہیں جو سائنس کے انکشافات کے منافی نہیں ہوتے بلکہ ان کی تائید کرتے ہیں۔ ان حقایق کے پیش نظر کائنات اور زندگی کے مسائل کا سائنٹفک نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا ہی روحِ عصرِ حاضر ہے۔ اس نقطۂ نظر کو فطری طور پر حقیقت پسندی کے نظریۂ حیات پر منتج ہونا چاہیئے تھا اور حقیقت پسندی کا تقاضائے اولیں یہ تھا کہ یورپ کے باشندوں کے ساتھ اقوام عالم کو سائنس کے برکات سے استفادے کے مواقع بہم پہنچائے جاتے لیکن مغرب کے تاجروں اور ملوکیت پسندوں کی خود غرضی مانع ہوئی اور سائنس کی ترویج و اشاعت سے انسان دوستی کے نصب العین کی عملی ترجمانی کا جو خواب زریں فرانسیسی قاموسیوں نے دیکھا تھا، وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، اور اہلِ مغرب کا تنزل پذیر تمدن، سائنٹفک نقطۂ نظر اور حقیقت پسندانہ نظریۂ حیات کے درمیان عملی اور حرکی ربط و تعلق قائم کرنے میں ناکام ثابت ہوا۔ دوسرے الفاظ میں جس حقیقت پسندانہ اور معروضی انداز نظر سے علمی عقدے حل کیے گئے تھے، اُسے معاشرتی مسائل کے سلجھانے میں بروئے کار نہ لایا جا سکا۔ اہلِ مغرب سائنس کے عقدوں کو حل کرنے کی کوشش میں معروضی طرزِ تحقیق سے کام لے رہے ہیں لیکن معاشرے کے مسائل کو موضوعی انداز نظر سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ نتیجۃً مغرب میں موضوع کا رشتہ معروض سے، فرد کا رشتہ جماعت سے، متقدر طبقے کا رشتہ عوام سے اور ادبار شعراء اور فن کاروں کا رشتہ ماحول کے جاندار تقاضوں سے منقطع ہو چکا ہے۔ فرد کی ذہنی اور ذوقی صلاحیتوں کو جماعت کے مفاد کے لئے وقف کر دینے کی بجائے جماعت کے مفاد کو فرد کے مفاد کی بھینٹ چڑھا دیا گیا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ فردیت کا آغاز رومانیت کی ترویج سے ہوا تھا۔ مرورِ زمانہ سے یہ فردیت، موضوعیت، تنوطیت، تشکک، وحاملیت، جبریت، داخلیت اور موجودیت کی تنزل پذیر کیفیات پر منتج ہوئی جن کا مطالعہ ہم اہلِ مغرب کی سیاسیات سے لے کر اُن کے فلسفے، ادبیات اور فنونِ لطیفہ میں کر چکے ہیں، اور جن کی ترویج نے اہلِ مغرب کی حیات افروز اور تعمیری صلاحیتوں کو یکسر سلب کر لیا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر اہلِ مغرب سے یہ توقع وابستہ کرنا وہم باطل سے کم نہ ہوگا کہ وہ انسانیت عالیہ کے نصب العین کی پاسبانی کریں گے یا متعلقہ اخلاقی قدروں کی ترجمانی کر سکیں گے۔ اب روحِ عصرِ حاضر کی عملی ترجمانی یا سائنس کے طرزِ تحقیق اور حقیقت پسندانہ نظریۂ حیات کے ربط و تعلق کی بحالی مشرق کے ترقی پذیر معاشرے میں ہی ممکن ہے۔

ایک مورخ کا قول ہے کہ تہذیب ایشیا سے یورپ کو گئی تھی۔ وہاں چند صدیوں کے قیام کے بعد امریکہ کو ہجرت کر گئی اور اب بحر اوقیانوس کو عبور کر کے دوبارہ اپنے وطن کو لوٹ آئی ہے لیکن بعض سادہ لوح ایشیائی ابھی تک تہذیب کے انتظار میں مغرب کی طرف ٹکٹکی لگائے بیٹھے ہیں ـــــ اس عاشقِ شوریدہ سر کی طرح جو اپنے صدر دروازے میں بیٹھا عالمِ خود فراموشی میں اپنی محبوبۂ دلنواز کی آمد کا انتظار کھینچ رہا ہو اور اس خوش آیند حقیقت سے بے خبر ہو کہ اس کے خوابوں کی ملکہ عقبی دروازے سے اس کے شبستان میں داخل ہو چکی ہے۔

جنگل پہ لپک رہے ہیں شعلے
طاؤس کو رقص کی پڑی ہے

نیر واسطی

ڈاکٹر وزیر آغا

ایک تازہ ادبی مسئلہ

پچھلے دنوں اردو کے ایک ادیب نے اس بات پر گہری تشویش کا اظہار کیا کہ اردو ادبا ڈیڑھ ہی برس میں جنگ اور اس کے تجربات کو بھول گئے ہیں. اور اب اردو ادب اسی ڈگر پر رواں دواں ہے جس پر وہ پچھلے اٹھارہ برس سے گامزن تھا۔ ان کے نزدیک اردو ادبا کی یہ روش ملکی مسائل سے کوتاہی اور بے التفاتی کے مترادف ہے۔ آخر میں انھوں نے یہ مشورہ دیا ہے کہ اردو ادبا جنگ کے موضوع پر از سر نو لکھنا شروع کر دیں۔

میری رائے میں ان صاحب کی یہ تشویش بے بنیاد اور ان کا قیمتی مشورہ ادب کے طریق کار سے ناآشنائی کا مظہر ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ کیسے؟

قصہ یہ ہے کہ جب ستمبر ۱۹۶۵ء میں دشمن کی فوجوں نے کوئی الٹی میٹم دیے بغیر رات کی تاریکی میں ہمارے وطن پر حملہ کیا تو ہم پاکستانی آن واحد میں ایک ایسی مستحکم قوم میں تبدیل ہو گئے جو کسی داخلی انتشار سے گویا آشنا ہی نہیں تھی۔ اس اتحاد اور اتفاق کے پس پشت تحفظ ذات کی ضرورت کے علاوہ اپنے وطن، اس کی ثقافت اپنے مذہب اور اس کی روایات کو دشمن کی یلغار سے محفوظ رکھنے کا ایک عزم بھی پنہاں تھا۔ گویا جب دشمن نے حملہ کیا تو ہم نے ان تمام اشیا کا باآواز بلند نام لیا جو ایک زبردست خطرے کی زد میں تھیں۔ ہم نے اس لئے نام لیا کہ جب کسی شے کے مجروح ہونے یا چھن جانے کا خطرہ درپیش ہو تو اس شے سے جذباتی وابستگی فوراً سطح پر آجاتی ہے۔ اس ضمن میں ہم نے سیالکوٹ، لاہور، قصور اور سرگودھا کے ترانے گائے کہ ان شہروں کو دشمن سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور ان کے مقابلے میں میانوالی، جھنگ اور لائل پور کا اس لئے نام نہ لیا کہ یہ شہر ابھی دشمن کی زد سے محفوظ تھے۔ پھر چونکہ ہمارے وطن کی سالمیت خطرے میں پڑ گئی تھی اس لئے ہم نے حب الوطنی کا بھرپور اظہار کیا اور چونکہ دشمن کی صفوں میں ایسے عناصر موجود تھے جو فتح کی صورت میں ہماری مذہبی روایات سے کسی قسم کی رواداری کا سلوک نہ کرتے اس لئے ہمیں محسوس ہوا کہ یہ حملہ ہمارے وطن کے خلاف ہی نہیں ہمارے مذہب کے خلاف بھی تھا۔ چنانچہ ہم نے پوری آواز کی پوری شدت سے اپنے مذہب اور اس سے وابستہ تعلیمات کا ذکر کیا کہ یہ سارا بیش بہا سرمایہ دشمن کی یلغار کی زد میں تھا۔ مختصر یہ کہ ہماری جنگ دفاعی نوعیت کی تھی اور اس جنگ میں جس شے کو سب سے پہلے یا سب سے زیادہ خطرہ درپیش ہوا وہ اسی قدر جلد اور اسی نسبت سے ہمارے لئے ایک متاع عزیز بن گئی جس طرح عام زندگی میں ماں اپنے بچے کو اکثر کوستی اور بد دعائیں دیتی ہے لیکن بچہ ذرا علیل ہو جائے تو ممتا اس کی آنکھوں سے چھلکنے لگتی ہے۔

بعینہٖ عام حالات میں قومیں امن و آشتی کی فضا میں اس قدر ڈوبی ہوتی ہیں کہ سطحی نظر رکھنے والوں کو ان پر ارض وطن سے بے اعتنائی اور کوتاہی کا گمان ہونے لگتا ہے دراصل لیکن جب وطن کسی بیرونی حملے سے دوچار ہوتا ہے تو یہی قومیں ایک زبردست داخلی استحکام کا مظاہرہ کرتی ہیں اور وطن کے لئے بے پناہ محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر فی الفور میدان عمل میں نکل آتی ہیں۔ ستمبر کی جنگ اس بات کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے کیونکہ ان سترہ روز میں ہم یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ ارض پاکستان، اس کی ثقافت اور خود ہمارے مذہب کی بقا اور تحفظ کے لئے ہمارے دلوں میں کیسے ارفع جذبات دبے پڑے تھے!

دفاعی جنگ کے دوران وطن کا تحفظ اولیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ یہ ایک عام سا کلیہ ہے۔ مگر بات شاید یوں ہے کہ دفاعی جنگ کی صورت میں تمام تر قوتیں ارضی اور غیر ارضی دفاع کا جزو بن کر یک رنگ ہو جاتی ہیں یعنی سپاہی بندوق اور توپ سے لڑتا ہے، ادیب اپنے قلم سے، موسیقار اپنی آواز اور ساز کی لے سے جنگ میں شریک ہو جاتا ہے۔ اس وقت سپاہی سے کوئی یہ سوال نہیں کرتا کہ کیا اس نے اپنے بوٹوں اور وردی کو چمکایا یا نہیں۔ نہ ادیب سے کوئی یہ پوچھتا ہے کہ اس نے

جو کچھ کہا اس میں ادب کے مقتضیات کا احترام موجود تھا یا نہیں؟ دفاعی جنگ میں جو قوم اپنی تمام تر قوتوں کو یکجا کر کے اپنا تحفظ کرتی ہے اور لحظہ بھر کے لئے باقی تمام باتیں ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ یہی کچھ ہم نے بھی کیا۔ ہمارے شعرا اور ادبا وطن کے سپاہی بن گئے اور ایک زبردست قومی جذبے کے تحت انھوں نے افسانوں، نظموں اور مضامین کے انبار لگا دیئے۔ بعد ازاں حکومتِ پاکستان نے بھی ادیبوں کی اس قومی خدمت کا اعتراف کیا۔ یہی حال موسیقاروں، ملازموں اور عام شہریوں کا تھا کہ انھوں نے اپنی ننھی منی آوازوں کو توپوں کی گھن گرج میں ملا کر ایک ایسی گمبھیر آواز میں تبدیل کر دیا جو بہت دور تک سنی گئی اور جس نے دشمن کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ پھر سترہ روز کے بعد جنگ ختم ہو گئی۔ سپاہی محاذ سے واپس آنے لگے۔ ملک میں بلیک آؤٹ ختم کر دیا گیا۔ ریڈیو پر جنگی پروگرام میں بتدریج تبدیلی آ گئی۔ عوام آہستہ آہستہ زندگی کی نارمل سطح کی طرف پلٹتے چلے گئے اور اردو ادبا نے بھی قومی ادب پیدا کرنے کے بجائے آہستہ آہستہ عام قسم کا ادب تخلیق کرنے کی طرف اپنی توجہ منعطف کر دی۔

اور اب ڈیڑھ برس کے بعد اردو کے ادبا دو اہم سوالوں کی زد میں ہیں۔ ان میں سے پہلا سوال تو یہ ہے کہ جنگ کے ان سترہ دنوں میں انھوں نے جو کچھ تخلیق کیا، ادبی نقطۂ نظر سے وہ کس حد تک کارآمد تھا؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ ادیب اس قدر جلد جنگ اور اس کے تجربات کو فراموش کر کے عام قسم کے ادب کی طرف کیوں راغب ہو گئے۔

پہلے سوال کا جواب میں نے اوپر لکھ دیا ہے۔ دراصل ان سترہ دنوں میں ہمارے ادبا نے جو کچھ لکھا وہ قومی دفاع کا ایک قابلِ قدر اور موثر حربہ تھا اور جنگ لڑنے کے لئے اس کی اشد ضرورت تھی۔ اگر اس ادب میں سے ایک سطر تک زندہ نہ رہے تو بھی ہمیں اس کا کوئی افسوس نہ ہوگا۔ دیکھنا تو صرف یہ ہے کہ ایک خاص وقت میں اس نے قوم کی خدمت سرانجام دی یا نہیں؟ سو جنگ کے دوران میں ہمارے ادبا نے جو کچھ لکھا وہ ایک مقدس اثاثہ ہے اور اسے تنقید کی خوردبین کے نیچے رکھ کر اس کا جائزہ لینا ہرگز مستحسن نہیں!

دوسرے سوال کا جزوی جواب بھی اوپر آ گیا ہے مگر اس سلسلے میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت ابھی باقی ہے۔ بات یہ ہے کہ جنگ کے دوران ایک زبردست قومی اور ملی جذبے کے تحت اردو کے ادبا اور شعرا نے اپنے جذبات کا اظہار کیا اور یہ اظہار ان کی حبّ وطنی کا ایک اہم ثبوت ہے۔ ان جذبات کی حیثیت ایک "للکار" کی سی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب دشمن سامنے ہو تو اسے للکارا جاتا ہے اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو جائے تو جوش کا مدھم پڑ جانا ناگزیر ہے۔ چنانچہ جنگ کے بعد ہمارے ادبا کے ہاں ملی اور قومی سطح پر اصنافِ ادب کے ذریعے جنگ لڑتے چلے جانے کا رجحان بتدریج کم ہوتا چلا گیا لیکن اس کا یہ مطلب لینا کہ ان کے دل سے وطن اور قوم کی محبت بھی مٹ گئی، بعید افسوس ناک ہے۔ جنگ کوئی اچھی چیز نہیں اور ہم پاکستانی تو صرف دفاعی جنگ کے قائل ہیں کہ اس سلسلے میں ہمارے مذہبی احکام بالکل واضح ہیں۔ لیکن اگر کبھی آئندہ ہمارے وطن پر حملہ ہوا تو اس بات کو طے سمجھنا چاہئے کہ ہمارے ادبا اسی ملی اور قومی جذبے کا اظہار کریں گے جس کا مظاہرہ وہ ستمبر کی جنگ میں کر چکے ہیں۔ جس طرح آج ہمارے فوجی جوان جنگ کے عمل میں مبتلا نہیں لیکن ان کی وطن دوستی اور وفاداری پر کوئی حرف نہیں آ سکتا، اسی طرح اگر آج ہمارے ادبا اور شعرا جنگی نظمیں اور ترانے نہیں لکھ رہے تو اس سے ان کی حبّ وطنی معرضِ بحث میں نہیں لائی جا سکتی۔ اور جو شخص ایسا کرتا ہے وہ محض اپنی "لیڈری" کو چمکانے کی فکر میں ہے ہمیں اس کے اس کاروبار سے کوئی سروکار نہیں۔

اب رہا سوال کا یہ حصہ کہ آج کے اردو ادبا جنگ کے تجربات کو اپنی تخلیقات میں کیوں نہیں سمو سکے؟ تو اس سلسلے میں جنگ کے واقعہ پر از سرِ نو ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ستمبر کی یہ جنگ صرف سترہ روز جاری رہی اور صرف سرحدی علاقے تک محدود تھی۔ ہمارے ادبا میدانِ جنگ سے بہت دور اپنے شہروں میں اقامت پذیر رہے۔ یہاں تک کہ ہم میں سے شاید ایک ادیب بھی ایسا نہیں تھا جو پھٹتے ہوئے بموں کی زد میں آیا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے لئے یہ جنگ ایک عظیم الشان قومی سطح کا تجربہ تھی اور اس لئے ہم نے جو کچھ لکھا اس میں قومی جذبات کا برملا اظہار ہی غالب حیثیت رکھتا تھا۔ شخصی سطح پر ہم میں سے بہت کم ادبا جنگ کی تباہ کاریوں، اس کی ہولناکی اور کرب سے آشنا ہوئے اور اس لئے شخصی تجربہ ہماری تخلیقات کا جزوِ اعظم نہ بن سکا۔ تقسیمِ ملک کے موقع پر جو فسادات ہوئے تھے وہ نہ صرف کئی ماہ پر پھیلے ہوئے تھے بلکہ ان کے کربناک مراحل سے ہمارے بیشتر ادبا خود گزرے بھی تھے۔ نتیجۃً ان تخلیقات کی صورت میں سامنے آیا جن میں شخصی تجربات، ان کی سچائی اور کرب صاف طور پر جھلکتا دکھائی دیتا ہے مگر اردو ادبا کے لئے ستمبر کی جنگ کا تجربہ شخصی کم اور ملی اور قومی زیادہ تھا۔ ہمارے بیشتر ادبا نے دفتروں کی کرسیوں سے جنگ کا نظارہ کیا اور بعض تو تہہ خانوں سے شاذ ہی باہر آئے۔ ظاہر ہے کہ جب تک جنگ سے شخصی سطح پر تعارف حاصل نہ ہو ادبی تخلیقات میں اس کی پرچھائیں پوری طرح ظاہر

نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ جنگ کے بعد جنگ کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کے بارے میں جو ادب تخلیق ہوا اس میں بیشتر کی پیداوار
تھا۔ دراصل ادیب کا کام یہ نہیں کہ وہ شعوری طور پر مستعار تجربات کو اپنی تخلیقات میں سمو دے بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنے فن کو تجربات کی اساس پر استوار کرے۔ اگر کسی ادیب کی زندگی میں کوئی تجربہ موجود ہی نہیں تو وہ تخلیق کیا کرے گا۔ فسانۂ آزاد میں جب سرشار نے خوجی اور آزاد کو جنگ لڑنے کے لئے سمندر پار بھیجا تو تجربے کے فقدان نے داستان کو بے رنگ کر دیا تھا۔ بالکل اسی طرح جن ادبا نے محض مستعار تجربات سے اپنی تخلیقات میں رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے ان کے فن کے انحطاط کا بے گمان نفرتیں ہی رہتے ہیں۔ اس ضمن میں فنون کے پچھلے شمارے میں جناب انتظار حسین صاحب کا افسانہ "سوئے کے تار" بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ میں انتظار حسین صاحب کے اس افسانے کا خاص طور پر ذکر نہ کرتا (کیونکہ اپنے موقف کی حمایت میں بعض اور تخلیقات کی طرف بھی اشارہ کر سکتا تھا) مگر ــــــ
مگر چونکہ یہ مضمون "فنون" کے لئے لکھا گیا ہے۔ اس لئے اس افسانے کا تذکرہ ناگزیر ہو گیا ہے۔ بہر کیف اس افسانے کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ جب ادیب شعوری طور پر کسی ایسے موضوع کو اپنانے کی کوشش کرے جو اس کے تجربے کی دسترس سے باہر ہو تو اس کا نتیجہ بڑا دردناک ہوتا ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ کہنا میں یہ چاہتا تھا کہ کسی تجربے کو تخلیقات میں سمونے کا مشورہ دینے میں ہم حق بجانب نہیں کہ ادیب کا مسلک ہی یہ ہے کہ وہ کسی مشورے کے زیر اثر تخلیق نہیں کرتا بلکہ سدا اپنی ذات کے اظہار کی طرف مائل رہتا ہے اور وہی کچھ لکھتا ہے جس کا حکم "اندر" سے موصول ہوتا ہے۔ اب اگر اندر کے اس دیار میں کسی شے سے متعلق کوئی تجربہ موجود ہے تو وہ تخلیق میں ظاہر ہو کر رہے گا۔ اسے روکا نہیں جا سکتا۔ اور اگر یہ تجربہ موجود ہی نہیں تو پھر چاہے آپ اس موضوع پر اس سے ہزاروں صفحات لکھوا لیں، یہ جذبے کی گرمی اور سچائی کی رمق سے نا آشنا ہی رہیں گے۔

جنگ کے سلسلے میں شخصی تجربے کی کمی کا احساس تو بہر حال ہم سب کو ہے اور اس کی بڑی وجہ محض یہ ہے کہ جنگ مختصر تھی اور ہمارے ادیب اس کے کرب سے گزرنے نہیں پائے۔ دوسری طرف جنگ نے ہمیں ملی اور مذہبی سطح پر متحرک کیا۔ چنانچہ لازم تھا کہ جنگ کے بعد کی تخلیقات میں ایسی علامتیں ابھر آتیں جن کا انسان کی ( ) سے گہرا تعلق ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر اجمل صاحب نے خلیل، کلیم اور مسیح کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ستمبر کی جنگ نے ان علامتوں کو معنوی کشادگی عطا کی ہے اور وہ پاکستان کے مجروح شہروں پر محیط ہو گئی ہیں۔ مگر دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ یہ علامات پہلے ہی سے اردو ادب میں رائج ہیں اور ہر طبقے نے اپنی ضرورت کے مطابق ان کے مفاہیم میں کشادگی پیدا کی ہے۔ کبھی یہ صوفیانہ تصورات کے سلسلے میں رائج ہوئیں۔ کبھی درباری اور جاگیرداری ماحول کے ضمن میں اجاگر ہوئیں اور ابھی کل کی بات ہے کہ علامہ اقبال نے انھیں اپنی فکری پرواز کے سلسلے میں اور ترقی پسند تحریک نے اپنے مسلک کی تشہیر کے لئے استعمال کیا۔ چنانچہ جب جنگ کے سلسلے میں انھیں ایک بار پھر استعمال کیا گیا تو یہ اقدام مستحسن ضرور تھا لیکن نیا ہرگز نہیں تھا۔ پھر علامتوں کا سلسلہ ( ) کی مختلف پرتوں مثلاً ( ) سے مربوط ہے کہ پہلا تو پلازم کی بنیادی جھنجھٹ پیدا ہوا نظر آتا ہے اور جب یہ سائیکی سے ابھرتی ہیں تو خود کو تلمیحات کی صورت میں نہیں بلکہ ( ) کی زبان میں ظاہر کرتی ہیں۔ دراصل سائیکی کے کئی مدارج ہیں جب کسی شخص کے داخلی نظام کو کوئی دھچکا لگتا ہے یا کوئی قوم بحران یا جنگ کی زد میں آتی ہے تو دھچکے کی شدت کے مطابق ہی سائیکی کے ایک خاص حصے کو بے نقاب کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دھچکا صرف سائیکی کی بالائی سطح کو متاثر کرے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سائیکی کے سارے تالاب میں ایسی ہلچل اور اضطراب پیدا کرے کہ اس کی تاریک ترین سطحوں کے خزائن بھی لپک کر بالائی سطح تک آ جائیں۔ بہر کیف یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ ستمبر کی جنگ نے اردو ادبا کے ہاں سائیکی کو برانگیختہ کرنے کا کام سرانجام دیا یا نہیں اور اگر سرانجام دیا ہے تو علامتیں سائیکی کے کس دیار سے نازل ہوئی ہیں نیز ان کی شکل و صورت اور نوعیت کیا ہے؟ اگر کوئی صاحب ان علامتوں کی نشاندہی کریں اور جنگ سے پہلے کی علامتوں سے انھیں ممیز اور جدا کر کے دکھائیں تو اس سے جنگ کے دور رس اثرات کا کچھ اندازہ ہو مگر یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جسے اخباری کالم میں حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس سے تو کوئی ڈاکٹر اجمل صاحب ایسا ماہر نفسیات ہی عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔

فتح محمد ملک

میراجی کی کتابِ پریشاں

ایک زمانہ ہوا جب میراجی نے انگلستان کی شاعر بہنوں کو اردو دنیا سے متعارف کراتے وقت ادبی نقاد کو خبردار کیا تھا کہ:

"کسی شاعر کے سوانح حیات اس کے کلام کے مطالعے میں اسی حد تک معاون ثابت ہو سکتے ہیں جس حد تک وہ اس کی ذہنی نشو و نما کو سمجھنے میں مدد دیں ذاتی حالات میں دلچسپی سے یہ نقصان دہ پہلو نکل سکتا ہے کہ ہم افسانہ پرست بن کر رفتہ رفتہ اس کے کلام کی حقیقت سے دور ہوتے جائیں گے اور پھر کلام کی صحیح جانچ میں الجھن پیدا ہو جائے گی:"

آج خود میراجی کی شخصیت اسی فریب انگیز دھندلکے میں گم ہے جسے برونٹی خاندان کی شخصیات کے اردگرد دیکھ کر وہ تڑپ اٹھے تھے۔ میراجی کی ذاتیات میں حد سے بڑھا ہوا انہماک رکھنے والے نقادوں کے ہاتھوں یہ دھندلکا روز بروز زیادہ گہرا اور زیادہ فریب انگیز ہوتا جا رہا ہے۔ یہ قرار دینے کے بعد کہ میراجی جنسی کجرویوں اور جسمانی آلودگیوں کے پجاری تھے اب اردو تنقید میراجی کے ان مفروضہ سماجی جرائم کی سزا تجویز کرنے میں معروف ہے۔ چنانچہ میراجی کے تازہ ترین نقاد اعجاز احمد نے خود کو سارتر جانا اور میراجی کو ژاں ژینے۔ اور پھر وہ سب کچھ اگل ڈالا جو سارتر نے ژینے کی شان میں کہہ رکھا ہے۔
دیکھنا چاہئے کہ سارتر نے بودلیئر کے بارے میں جو کچھ کہہ رکھا ہے وہ میراجی پر کب چسپاں ہوتا ہے:

He was an antisocial male, suffering from syphilis and an overdraught at the bank.

جدید اردو تنقید کی اہم دستاویز "مشرق و مغرب کے نغمے" کے مصنف کے نقطۂ نظر سے اس تنقیدی انداز نظر کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ یہاں فن کار اس کے ماحول سے الگ کر کے خلا میں جانچا گیا ہے۔ یہ ستم میراجی پر ڈھایا جائے تو المیہ اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ میراجی نے شعر و ادب پر عملی تنقید کے دوران جو فنی نظریات پیش کئے ہیں میراجی کو تختۂ مشق بناتے وقت ان سے قطع نظر کرنا نامناسب بھی ہے اور ضرر رساں بھی۔ اپنے عہد کی ادبی تحریکوں کا ذکر کرتے ہوئے میراجی لکھتے ہیں:

"حالی نے دیکھا کہ جس ماحول میں اس کی ہستی کا اظہار ہوا اس میں اسے کوئی بات ایسی نظر نہیں آتی جو مشرق سے بری اور اسلام کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہو چنانچہ اس کی طبیعت حالات سے برگشتہ ہو گئی اور وہ نیچرل شاعری کا بانی بن گیا۔ اردو کے موجودہ انقلابی شاعر بھی حالات سے بدظن ہو کر اپنی علیحدہ دنیا بسائے بیٹھے ہیں جس میں اشتراکیت ہے، مساوات ہے۔ نہ جانے کیا کچھ ہے۔ وہ دنیا بھی ویسی ہی ناکارہ ہے جیسی کہ پرانے شاعر کی خیالی دنیا کیونکہ اس میں عمل کا فقدان ہے اور باتوں کی کثرت۔ اس لحاظ سے صرف اقبال اردو کا ایک ایسا شاعر ہے جو سیدھی راہ پر چلتے ہوئے ایک نئی دنیا بسانا چاہتا ہے کیونکہ وہ ہر وقت،

عمل پر مصر رہتا ہے۔"

ہم عصر ادبی رجحانات پر ان خیالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ میراجی کو اپنے بزرگ معاصرین میں سے اقبال کا شاعرانہ مسلک پسند تھا لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ میراجی نے اقبال کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہنے کی بجائے اُس رَو کا ساتھ دیا جو اقبال کے متوازی چل رہی تھی۔ اس کی وجہ بھی میراجی نے اپنے مذکورہ مضمون میں ہی بتا دی ہے۔ ان کا کہنا ہے :

"ماحول کے ناپسندیدہ ہونے کی صورت میں اگر اس کی صورت باغیانہ نہ ہو تو شاعر صوفی یا بیراگی بن جاتا ہے اور باغیانہ صورت میں عمل کے ساتھ مصلح ملک و قوم بن جاتا ہے۔"

میراجی کی فطرت باغیانہ نہ تھی اس لیے انھوں نے صوفی بننے کی ٹھانی۔ وہ ایک زندہ اور توانا ذہن رکھتے تھے اس لئے انھوں نے کسی جامد نظریہ کے پُر فریب سکون سے آشنا ہونے کی بجائے اُس اضطراب کو اپنایا جو حقیقت کی تلاش میں انھیں نئے سے نئے ویرانوں کی سیر کراتا رہا اور جس کے باعث ان کا دل عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا بن گیا۔ صوفی کی ذہنی کیفیات بیان کرتے ہوئے میراجی اپنے ایک مضمون میں بتاتے ہیں کہ :

"صوفی یا بیراگی ایک ایسی سرزمین میں بستا ہے جو اس دنیا سے الگ ہوتی ہے۔ وہ زمین تمام تر آسمان کی طرح صاف اور منزہ فضا بھی نہیں ہوتی اور تمام تر اس دنیا کی آلودگی میں بھی نہیں ہوتی اور اس جگہ بیٹھے ہوئے وہ اس جہاں کی زبان و بیان اور تصورات اور استعاروں کو مفہوم کی ایک روحانی نفاست کا لباس پہنا کر ان کیفیات کا اظہار کرتا ہے جن کے بیان کے لئے حقیقتاً اس دنیا کی زبان میں الفاظ ہی میسر نہیں آتے ـــــ اس بلند درجے تک پہنچنے کے لئے صوفی کو بعض دنعہ مختلف ذرائع سے اپنی ذہنی زندگی میں ایک سادگی پیدا کرنی پڑتی ہے یہ ذرائع فاقہ کشی، عزلت نشینی، منشیات کا استعمال اور اسی طرح کے ذرائع بے خودی ہیں جن کے وسیلے سے ایک بھید بھری کیفیت ذہن پہ چھا جاتی ہے۔ صوفی یا بیراگی کو انتہائی درد یا انتہائی مسرت اس منزل تک پہنچاتی ہے جس کا تعلق کلیتہً جسم سے بے نیاز رہتا ہے ـــــ"

اس طرزِ فکر کے علاوہ میراجی کا طرزِ حیات اور شاعرانہ کمال اس حقیقت کا غماز ہے کہ میراجی ایک صوفی شاعر ہیں اور انھوں نے ایمیلی کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ خود ان کے بارے میں بھی سچ ہے :

"ایمیلی کی فطرت میں سب سے بڑا تضاد یہ ہے کہ وہ گھریلو مستی طبیعت کے باوجود اپنے دل کی گہرائی میں ایک صوفی تھی ایک بیراگن تھی۔ وہ میرابائی کی طرح یہ نہیں کہتی کہ "کہاں یاں موہے نہ بھاوے"۔ وہ گھر کی ہر بات میں دلچسپی لیتی ہے لیکن وہ تصور میں ایک احساس مذہبی رکھتی ہے۔ اس کے لیے وجد و حال کی کیفیت جانی پہچانی بات ہے۔ ...... ایمیلی اپنے نفس کی خیالی دنیا میں جس محبوب سے ملنے کی مشتاق تھی وہ روحِ الابد تھی۔ یہ سب نظریہ اگرچہ تصور کا کرشمہ ہے لیکن اس کی حقیقت کو اس سائنٹفک زمانے میں بھی آسانی سے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ یہ زندگی کا تصور کوئی غیر مری چیز نہیں جسے سادھو سنت خدا کی رحمت سے کبھی کبھار دیکھ لیتے ہیں بلکہ ایک معین تصور ہے جسے ہر طبیعت اپنے لئے از سرِ نو تخلیق کرتی ہے۔"

میراجی نے اس معین تصور کو اپنے لئے از سرِ نو تخلیق کیا جس کے ثبوت کے طور پر میراجی کی خوبصورت ترین نظم "خدا" پیش کی جا سکتی ہے۔ یہاں میراجی نے روحِ ابد سے ہم آہنگ ہونے کی واردات پیش کی ہے :

میں تجھے جان گیا روحِ ابد
تو تصور کی تمازت کے سوا کچھ بھی نہیں

چشمِ ظاہر کے لئے نخوت کا ننگیں مرقد
اور مرے دل کی حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں
اور مرے دل میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

اس نظم سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو دیو مالا سے دلچسپی اور خاص انداز کی وسیع المشربی کے باوجود میراجی کے اندر جو شدید مذہبی احساسات ہیں ان پر اسلام کی گہری چھاپ ہے ۔ موت سے چند برس پہلے جب میراجی سے ان کے ترکِ اسلام کی وجہ پوچھی گئی تو انھوں نے احتجاجاً کہا تھا:

"یہ بات[1] غلط ہے کہ میں نے اسلام کو ترک کیا۔ میں ایک خدا کو اب بھی مانتا ہوں مگر میں نے حضرت عمر فاروقؓ تک اسلام کو سمجھا ہے اس کے بعد مجھے اسلام کی اصلی شکل نظر نہیں آئی لیکن مجھے قرآن پڑھنا اور سننا اب بھی غش آ جاتا ہے۔"

ان کی عزیز ترین آخری[2] تمناؤں میں سے ایک یہ تھی کہ وہ جرمنی جا کر قرآنی اخبار پر تحقیق کریں تاکہ دنیا قرآن کے حقیقی مفہوم سے آشنا ہو سکے زندگی کے آخری دور میں جب وہ کرشن چندر کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ کرشن چندر[2] اس انکشاف پر بجا طور پر ششدر تھے:

"میراجی مسلمان ہیں بلکہ پکے مسلمان ہیں۔ ان کا ہندو نام ایک دھوکا ہے۔ صبح سویرے وہ جو بے دھنی کا جو راگ الاپتے ہیں وہ بھی محض فریب ہے۔ دراصل وہ مسلمان ہیں۔"

کرشن چندر نے آزاد خیالی اور وسیع المشربی کے جس جرم کی پاداش میں اپنے مہمان کو فریبی اور دھوکے باز کہا ہے، صوفیا اپنے اسی دامنِ تر پر ہمیشہ نازاں رہے ہیں۔ اگر محض نام بدل لینے سے آدمی بدل جاتا تو سولہویں صدی کے مشہور صوفی بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی الکھ داس کے نام سے برج بھاشا میں نہ لکھتے ——— ہاں تو ہم نے میراجی کے دین و مذہب کا ذکر ان کی نظم خدا کو سمجھنے کے لئے اٹھایا تھا۔ نظم یوں شروع ہوتی ہے:

میں نے کب دیکھا تجھے روحِ ابد
ان گنت گہرے خیالوں میں ہے تیرا مرقد
صبح کا شام کا نظارہ ہے
ذوقِ نظارہ نہیں چشمِ گداگر کو مگر

'صبح کا شام کا نظارہ ہے' ——— اس میں حضرت ابراہیمؑ کے عرفانِ حقیقت کی واردات کو بیان کرنے والی قرآنی حکایت واضح طور پر موجود ہے۔ جوں جوں نظم آگے بڑھتی ہے تخلیقِ آدم اور تخلیقِ حیات و کائنات کے اسلامی تصورات موج در موج پھیلتے سمٹتے نظر آتے ہیں اور بالآخر نظم ان مصرعوں پر ختم ہوتی ہے:

اور مرے دل کی حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں
اور مرے دل میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

میراجی کے دل میں محبت کے سوا کچھ نہیں لیکن میراجی کو اپنے اردگرد پھیلی ہوئی دنیا میں یہ محبت، یہ نورِ ازل کہیں نظر نہ آیا۔ نظم "سلسلۂ روز و شب" ملاحظہ ہو:

---

[1] 'میراجی' از منظور ممتاز مطبوعہ "نقوش" لاہور
[2] 'میراجی کے خطوط' از منظور ممتاز مطبوعہ ہم قلم کراچی

خدا نے الاؤ جلایا ہوا ہے
اُسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے
ہر اک سمت اس کے خلا ہی خلا ہے
سمٹتے ہوئے دل میں وہ سوچتا ہے
تعجب کہ نورِ ازل مٹ چکا ہے

بہت دور انسان ٹھٹکا کھڑا ہے
اسے ایک شعلہ نظر آ رہا ہے
مگر اس کے ہر سمت بھی اک خلا ہے
تخیل نے یوں اس کو دھوکا دیا ہے

عدم اس تصور پہ جھنجلا رہا ہے
نفس دو نفس کا بہانہ بنا ہے
حقیقت کا آئینہ ٹوٹا ہوا ہے
تو پھر کوئی کہہ دے یہ کیا ہے، وہ کیا ہے؟
خلا ہی خلا ہے، خلا ہی خلا ہے

نورِ ازل کے مٹ جانے کے بعد کی تیرہ و تار فضا میں میراجی نے حقیقت کی طرف اپنا سفر شروع کیا مگر یہ وہ دنیا ہے جس کا مجازی رنگ پہلے سے مختلف ہے کیونکہ بقول میراجی "سگمنڈ فرائیڈ کے نظریوں نے حضرت یوسفؑ کے فن کو ایک گئی گذری بات بنا دیا ہے لیکن بیداری کے خوابوں کی دلکشی ابھی تک قائم ہے" چنانچہ میراجی کے ہاں بیداری کے خوابوں کے سہارے مجاز سے حقیقت کا سفر شروع ہوتا ہے لیکن جب وہ منزل پر پہنچتے ہیں تو حقیقت کا آئینہ تزارخ سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو جاتا ہے۔ ان بکھری ہوئی کرچیوں کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی کوششوں میں میراجی کی انگلیاں فگار ہوئیں اور خامہ خونچکاں۔ تب دردِ دل لکھنے کا کام موقوف ہوا اور ان کی فسردہ سی ہڈیاں، اور فسردہ سی خاکستر بے نشان نے "فسردہ فضا میں جذب ہو کر سکون پایا[1] لیکن یہ تو وہ منزل ہے جس کے میراجی مسافر تھے اور جو بالآخر میراجی کو ملی اور ہمیں اس وقت ان کے اس صوفیانہ اور شاعرانہ سفر کے احوال و مقامات جاننے کی آرزو ہے۔

اس سلسلے میں ہمیں اپنا سفر یہاں سے شروع کرنا پڑے گا کہ میراجی نے ناساعد حالات سے ڈر کر تصوف کے دامن میں پناہ لی۔ اگر ان میں باغیانہ جذبہ اور عمل کی قوت ہوتی تو وہ اسلام کی ابتدائی سادگی اور پاکیزگی کے متلاشی اقبال کے ہمنوا بن جاتے۔ اس خاص طرح کے جذبہ اور خاص طرح کے عمل کے فقدان کی وجہ سے وہ خود اپنے لفظوں میں عشق کے طائرِ آوارہ کا بہروپ بھرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے ناساعد حالات تھیں جن سے پنجہ آزما ہونے کی طاقت خود میں نہ پا کر میراجی راہِ فرار اختیار کرتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ میراجی کا ہندی مسلمان ہونا اس ضمن میں مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ میراجی کے مصائب سراسر ذاتی ہوتے ہوئے بھی برطانوی ہندوستان میں رہنے والے عام مسلمان نوجوان کے نمائندہ مصائب ہیں۔ میراجی ۱۹۱۲ء میں ایک ایسے شخص کے ہاں پیدا ہوئے جو کام کے

---

[1] فسردہ سی کچھ ہڈیاں ہیں، فسردہ سی خاکستر بے نشاں ہے۔
فسردہ سے کنکر، فسردہ فضا میں سکوں ہے
(تنہائی از میراجی)

اعتبار سے برطانیہ کی سب سے بڑی کالونی کا وفادار ملازم، مذہباً کٹر مسلمان اور طبعاً شاعر ہے (بحوالہ مولانا صلاح الدین احمد اور جناب کالی)، جس زمانے میں میراجی پیدا ہوئے، سن شعور کو پہنچے اور اپنے باپ کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مختلف ریلوے سٹیشنوں پر زندگی کے چل چلاؤ کا مشاہدہ کرنے اور ریل کی پٹڑیوں کے دونوں جانب پھیلی ہوئی بنجر ادیموں اور ڈراؤنے سناٹوں میں زندگی کے ہنگاموں سے بھرپور رونقوں کے خواب دیکھنے میں مصروف تھے۔ وہ زمانہ ہماری تاریخ کا عجیب و غریب باب ہے۔ سیاسی طور پر یہ عہد ہندو مسلم اتحاد اور ادبی طور پر ہندوستانیت کی بڑھتی ہوئی لے کا منظر پیش کرتا ہے۔ تحریک خلافت اور جمعیۃ العلمائے ہند کی رہنمائی میں تمام ہندی مسلمان کانگرس کے دوش بدوش ملکی آزادی کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ ادبی محاذ پر مولوی عبدالستار، مولانا عبدالحق، مولانا ناشر اور تاجور نجیب آبادی کے رسالوں میں اردو نظم و نثر کی اصلاح کے متعلق اس قسم کے پروگرام شائع ہو رہے ہیں:

۱۔ اردو سے عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ نکال کر اسے عام فہم ہندی زبان بنانا۔

۲۔ آئندہ عام ہندوستانی زبان کے مطابق گرامر تیار کرنا۔

۳۔ اردو نظم کو ہندی وزنوں میں منتقل کرنا

۴۔ اردو نظم میں ہندی مضامین، ہندی خیالات اور ہندوستانی واقعات کو بیان کرنا۔

مولانا تاجور کے لفظوں میں اس اصلاح کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اردو شاعری ہندوستانی شاعری بن جائے گی۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ جب بابائے اردو گاندھی جی کے ذیر اثر یہ نعرہ لگاتے ہیں کہ اردو زبان ہندو مسلمانوں کے ملاپ کا پھل اور اتحاد کی ضامن ہے۔ مگر یہی وہ زمانہ ہے جس میں ہندی مسلمان کے ذہن میں یہ کشمکش بھی اپنے عروج پر ہے کہ وہ ہندوستان میں رہتے ہوئے بھی اس بڑی اسلامی دنیا کا اٹوٹ انگ ہے جو ہندوستان کے مغرب میں پھیلی ہوئی ہے۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی جوہر نے کہا تھا۔

میں بیک وقت ایک ہی قطر کے دو متقارب دائروں میں گھرا ہوا ہوں جن میں سے ایک کا نام ہند ہے اور دوسرے کا اسلامی دنیا!

اس کشمکش کا نتیجہ تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد ہندو مسلم نفاق، مسلمانوں کی پُرمصائب ہجرت اور مسلمانوں کے ذہن کی بیحد پیچیدہ ذہنی الجھنوں کی صورت میں نکلتا ہے۔ سنہ تیس میں مولانا جوہر کی وفات کے بعد مسلمانوں کا کوئی رہنما ہی باقی نہیں رہتا۔ وہ ہندوستان کی آزادی یقینی ہو جاتی ہے۔ ایسے میں عام مسلمان اس الجھن میں گرفتار ہے کہ مستقبل کے آزاد ہندوستان میں اس کی ہستی کی بقا کیسے ممکن ہے؟ — اقبال جن رجحانات کے نمائندہ تھے وہ سیاست کی دنیا میں ابھی زیر زمین کام کر رہے تھے اس لئے اس کشمکش کو حل کرنے کا آسان مگر منفی حل ابو الکلام جیسے سیاسی رہنماؤں اور میراجی جیسے شاعروں کو یہ نظر آیا کہ وہ ہندوستانی قومیت کے تصور کو اپنا کر ہندوستان میں ضم ہو جائیں۔ چنانچہ میراجی مستقبل کا تصور تک نہیں کر سکتے:

مستقبل سے میرا تعلق بے نام سا ہے۔ میں صرف دو زمانوں کا انسان ہوں۔ ماضی اور حال۔ یہی دو دائرے مجھے ہر وقت گھیرے رہتے ہیں اور میری عملی زندگی بھی انہی کی پابند ہے۔ (دیباچہ — میراجی کی نظمیں)

خالصتاً ذاتی سطح پر میراجی کے مستقبل سے بے نیاز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسے باپ کے سب سے بڑے فرزند تھے جو ریٹائر ہو چکے تھے اور گھر بھر کی امید بھری نظریں ان ہی پر مرکوز تھیں مگر ان کی سنگ دل خون سکھاتی ہوئی بیکار سماج محض اس بنا پر انھیں کوئی قابل عزت مقام دینے سے انکاری تھی کہ ان کے پاس اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے باوجود میٹرک تک کی سند نہ تھی۔ نتیجہ یہ کہ میراجی ایک ایسی سرزمین کی طرف ہجرت پر مجبور ہوئے جو اس دنیا سے الگ تھی،

مجھ کو کچھ فکر نہیں آج یہ دنیا مٹ جائے
مجھ کو کچھ فکر نہیں آج یہ بیکار سماج

اپنی پابندی سے دم گھٹ کے فسانہ بن جائے
میری آنکھوں میں تو مرکوز ہے روزن کا سماں
اپنی ہستی کو تباہی سے بچانے کے لئے
میں اسی روزنِ بے رنگ میں گھس جاؤں گا
لیکن ایسے تو وہی بت نہ کہیں بن جاؤں
جو نگاہوں سے ہر اک بات کہے جاتا ہے
چھوڑ کر جس کو صنم خانے کی محجوب فضا
گھر کے بے باک و المناک سیہ خانے میں
آرزوؤں پہ ستم دیکھنا ہے گھلنا ہے
میں تو روزن میں نہیں جاؤں گا، دنیا مٹ جائے
اور دم گھٹ کے فسانہ بن جائے
سنگ دل خون سکھاتی ہوئی بے کار سماج
میں تو اک دھیان کی کروٹ لے کر
عشق کے طائرِ آوارہ کا بھروپ بھروں گا پل میں
اور چلا جاؤں گا اس جنگل میں
جس میں تو چھوڑ کے اک قلبِ فسردہ کو اکیلے چل دی
راستہ مجھ کو نظر آئے نہ آئے پھر کیا
ان گنت پیڑوں کے جھنڈا ولں کو
میں تو چھوتا ہی چلا جاؤں گا
اور پھر ختم نہ ہوگی یہ تلاش
جستجو روزنِ دیوار کی مرہون نہیں ہو سکتی
میں ہوں آزاد مجھے فکر نہیں ہے کوئی
ایک گھنگھور سکوں، ایک کڑی تنہائی
میرا اندوختہ ہے

(شام کو — راستے پر)

گھر کے بے باک، المناک، سیہ خانے میں، آرزوؤں پہ ستم دیکھنے، گھلنے، اور اپنی ہستی کو تباہی سے بچانے کی خاطر میراجی نے عشق کے طائرِ آوارہ کا بھروپ تو بھر لیا، مگر اس بھروپ کے نیچے میراجی کا بدن کراہتا رہا، روح تلملاتی رہی۔ اس بھروپ کو اتار کر دیکھا جائے تو میراجی لاہور کی بنگالی لڑکی دلی کی مسلمان لڑکی، ممبئی کی پارسی لڑکی اور لکھنؤ کی بیوہ خاتون سے بے نیاز دکھائی دیں گے۔ وکیسی مثالی حسن کے طلبگار نہیں۔ کوئی سی لڑکی ان کی

محبوبہ بن سکتی ہے بشرطیکہ وہ ان کی دلہن بن کر ان کا گھر آباد کرتے۔ بہ الفاظ دیگر میراجی کے ہاں محبوبہ کا تصور منکوحہ کا تصور ہے۔ اپنی کتاب "اس نظم میں" سید علی منظور کی بے حد معمولی نظم "برادرِ نسبتی" کے مطالعہ کے دوران میراجی بڑے جذباتی لہجے میں اس امر پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ نئے شاعر بیاہتا زندگی اور گھریلو محبت میں رومان کی دل کشی کیوں نہیں دیکھ پاتے؟ اسی طرح اپنی غیر مطبوعہ کتاب "اجنتا کے غار" کے نامکمل دیباچہ میں میراجی نے بتایا ہے کہ:

> میری ایک عزیز ہیں، انھیں میرے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہیں۔ ایک روز باتوں باتوں میں انھوں نے عورت کو ستون کہہ کر اپنا مفہوم ظاہر کیا۔ آج میں غور کرتا ہوں تو ان کی یہ بات مجھے صحیح معلوم ہوتی ہے۔ خیالی زندگی میں شاعری کرتے ہوئے ہم عورت کو غزل، نظم یا جو کچھ چاہیں کہہ لیں لیکن عملی زندگی میں تو عورت مرد کے گھر میں ایک ستون ہی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی سے چھت قائم ہے اور آرام کے لئے سر چھپانے کی جگہ مہیا رہتی ہے۔ اس کے ہونے سے بچے پیدا ہوتے ہیں اور نہ ہونے سے نظمیں، خصوصاً میری نظمیں اس لئے پیدا ہوئیں کہ اپنے گھر میں اس ستون کی غیر موجودگی میں تخلیق کا کام مجھی کو کرنا پڑا۔"

میراجی کی شاعری تنہائی، نا آسودگی اور نارسائی کی جن کیفیات کی ترجمان ہے وہ میراجی کے ذاتی المیہ سے پھوٹی ہیں۔ بیداری کے جن خوابوں کے شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکنے سے یہ المیہ وجود میں آیا ہے وہ بے حد عام، عملی اور پیش پا افتادہ قسم کے خواب تھے۔ میراجی زندگی کے سمندر سے صرف ایک قطرے کے طلبگار تھے۔ یعنی سر چھپانے کے لئے گھر اور گھر کا ستون ——— مگر ذاتی زندگی اس بخیلی پر بھی رضامند نہ ہو سکی۔

چنانچہ میراجی نے اپنی شاعری کی وساطت سے جس خیالی دنیا کو پیدا کیا اس میں زندگی کے عام مظاہر ایک انوکھی دل کشی کے حامل نظر آتے ہیں۔ یہ دنیا کچھ رنگ کے نور کچھ آوازوں اور کچھ سایوں کی دنیا ہے۔ میراجی کے گیتوں اور نظموں میں دلہن، بہن، ماں اور بچوں کے لہجوں اور مکالموں کا آہنگ شنید ہے تو ایک اچھوتی، انجان، کنواری دلہن کی تصویر دیدنی ہے۔ یہ دلہن پری زاد نہیں، متوسط طبقے کی عام سی عورت ہے جو ہماری دیکھی بھالی ہے اور جس میں ہمیں شاعری اور رومان کی کوئی ادا نظر نہیں آتی مگر میراجی کے ہاں وہ بے حد دلکش کردار ہے۔ خوشیوں کے جھیلے میں جھولنے کی تمناؤں کو سینے میں چھپائے یہ دلہن میراجی کی شاعری میں ہر جگہ موجود ہے کہیں پس منظر میں تو کہیں پیش منظر کے طور پر۔ اس کے کانوں میں بندے ہیں، ماتھے پر بندی، ہاتھ میں گجرا، گلے میں ہار اور زرتار دوپٹہ سر پہ لئے اور آنچل کو قابو میں کئے "روم روم سندر سنگھاروں سے سنوارے" سیج پہ بیٹھی دولہا کا انتظار کر رہی ہے۔ اس کے پاس ہی بیٹھی ہوئی دولہا کی بہن خوشی میں سرشار ہے:

> کیوں بہن، ہم نے سنا ہے کہ دلہن کی آنکھیں
> آنکھ بھر کر نہیں دیکھی جاتیں
> اور کہتی ہے بہن
> میرے بھیا کو بڑا چاؤ ہے، کیوں پوچھتا ہے
> اب تو دو چار ہی دن میں وہ ترے گھر ہوگی (تفاوتِ راہ)

مگر المیہ یہ ہے کہ دولہا اس دلہن تک نہیں پہنچ سکتا۔ گھر بسانے کے لئے جن مادی وسائل کی ضرورت ہے وہ اس کی دسترس سے باہر ہیں۔ میراجی کے ایک گیت کے الفاظ مستعار لوں تو دولہا اور دلہن کا فاصلہ دو پربتوں کا فاصلہ ہے۔ یہ پربت ایک دوسرے کو صرف بادل بن کر ہی مل سکتے، مگر پربت بادل کیونکر بنے؟

میراجی کی شاعری میں یہ پربت بادل بنا ہے اور "آدم بیج" "اور سنجوگ" سے لے کر "اجنبی انجان عورت رات کی" اور "لب جوئبارے" تک برسا ہے۔ "لب جوئبارے"

میراجی کی بدنام ترین نظم ہے مگر مجھے یہ نظم اپنی سفاک حقیقت نگاری اور بے رحم بیباکی کے باوجود اس لئے پیاری لگتی ہے کہ میراجی تخیل کی دنیا میں بھی کسی عورت کے حسن کو برتتے ہیں تو پہلے اس کو منکوحہ بنا لیتے ہیں:

........جس کے اس پار جھلکتا نظر آتا ہے مجھے

منظرِ انجان، اچھوتی سی دلہن کی صورت

ہاں تصوّر کو میں اب اپنے بنا کر دولہا

اسی پردے کے نہاں خانے میں لے جاؤں گا۔

(لب جوئبارے)

میراجی نے اس الزام کی تردید کرتے وقت کہ زندگی کا محض جنسی پہلو ان کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا کہ وہ جنسی عمل اور اس کے متعلقات کو قدرت کی سب سے بڑی نعمت اور زندگی کی سب سے بڑی راحت اور برکت سمجھتے ہیں۔ قدرت کی اس سب سے بڑی نعمت اور زندگی کی اس سب سے بڑی راحت اور برکت سے دائمی محرومی کا احساس میراجی کی شاعری میں دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے، چھت پر لٹکتے ہوئے پیراہن اور دور سے نظر آتی ہوئی مسہری کے آغوش کی لرزشوں کے مناظر کو لبریز بلاغت کر دیتا ہے اور ان میں سے تلازمات کی ایک دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ تہذیب و تمدن نے جنس کے اردگرد جو آلودگی قائم کر رکھی ہے اور جس کی وجہ سے قدرت کی یہ سب سے بڑی نعمت جنسِ بازارین کر رہ گئی ہے۔ اس پر میراجی کے ہاں بعض اوقات بے انتہا تلخی اور کراہیت سے لبریز تصویریں بھی نظر آ جاتی ہیں مگر مجموعی طور پر وہ جنسی جذبات کو عبادت کی حد تک پاکیزہ سپردگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

ایک ہی بات جو پہلو میں چھپائے ہوئے سو باتوں کو

رات کو دن کی طرح نور سے بھر دیتی ہے

دل پہ اک سحر سا کر دیتی ہے

(اجنتا کے غار)

زندگی کے جنسی پہلوؤں ہی پر تخلیقی غور و فکر کے دوران میراجی رات اور دن کے قدیم اور اپنے زمانے میں مقبولِ عام تلازمات میں کایا کلپ کر دیتے ہیں۔ میراجی کے ہاں دن ظلم کی علامت ہے اور رات تخلیقی جوش و نمو اور انبساط کی علامت۔ "آمدِ صبح" اور "سنجوگ" جیسی نظموں میں رات اور چاند پریتم اور پریمی ہیں اور سورج رقیب ـــ اور غروبِ آفتاب سے لے کر طلوعِ آفتاب تک کے بے حد دلکش وقفۂ زماں میں انسانی عشق کا ڈراما سارے رنج و راحت سمیت دیکھا جا سکتا ہے۔ رات اور دن کی یہ علامات ذاتی اور رومانی ہی نہیں اجتماعی اور سیاسی رنگ بھی رکھتی ہیں:

رات کے سائے ہی خاموش رہا کرتے ہیں

دن کے سائے تو کہا کرتے ہیں

بیتی لذت کی کہانی سب سے

اور مری ہستی بھی اب دن کا ہی اک سایہ ہے

جس کے ہر ایک کنارے کو شعاعِ سوزاں

اتنی شدت سے جلانے پہ، مٹانے پہ تلی بیٹھی ہے

کاش آ جائے گھٹا، چھائے گھٹا اور بن جائے

بڑھتے سورج کا زوال

(دن کے روپ میں رات کہانی)

یہاں مجھے میراجی کے مصرعے ملکۂ معظمۂ انگلستان کے چڑھتے سورج کے زوال کے لئے دست دعا بنے نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ میراجی نے زندگی کی سفاک حقیقتوں سے خواب و خیال کی دنیا کی طرف گریز ہی کے لئے عشق کے طائرِ آوارہ کا بہروپ بھرا تھا مگر اس بہروپ کی مصوری کے دوران میراجی نے بیسویں صدی کے نصف اول کے برطانوی ہند کے بے چین اور بے راہ رو نوجوان کی پوری جذباتی سرگزشت بیان کر دی ہے:

میری آنکھیں ہیں کہ بازو اپنے
جیسے اک پیڑ کے ٹہنے ہوں کہیں پھیلے ہوئے
جن پہ طائر کا نشیمن کبھی بنتا ہی نہ ہو
سوکھتے جاتے ہوں ٹہنے غم محرومی سے

(ہندی نوجوان)

یہ نوجوان جس نئی شہری تنظیم اور صنعتی اخلاقیات کا شکار ہے وہ گھریلو زندگی کی تخریب کے بعد لذت اور آسودگی کے نت نئے ڈھنگ پیدا کر رہی ہے۔ اپنی تعلیم کے باوجود یہ نوجوان زندگی کی دوڑ میں زیادہ سے زیادہ کلرک بن سکتا ہے۔ میراجی نے اس کلرک کا نغمۂ محبت لکھا ہے۔ اس نوجوان کو مشینی زندگی کے سکونِ آہنی سے نجات نہ پاسکنے کے غم کو دفتری فائلوں میں غرق کرنا پڑتا ہے مگر افسر —— اس کی شان ہی اور ہے:

جب آدھا دن ڈھل جاتا ہے تو گھر سے افسر آتا ہے
اور اپنے کمرے میں مجھ کو چپڑاسی سے بلواتا ہے
یوں کہتا ہے، ووں کہتا ہے لیکن بیکار ہی رہتا ہے
میں اس کی ایسی باتوں سے تھک جاتا ہوں تھک جاتا ہوں
پل بھر کے لئے اپنے کمرے کو فائیل لینے آجاتا ہوں
اور دل میں آگ سلگتی ہے: میں بھی جو کوئی افسر ہوتا
اس شہر کی دھول اور گلیوں سے کچھ دور مرا پھر گھر ہوتا
اور تو ہوتی!
لیکن میں تو اک منشی ہوں، تو اونچے گھر کی رانی ہے
یہ میری پریم کہانی ہے اور دھرتی سے بھی پرانی ہے

(کلرک کا نغمۂ محبت)

اس نوجوان کی تشنہ تمنائیں قلم کے پرتے پر پوری ہو سکتی ہیں یا عکسِ تخیل سے یا کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اس کی جیب اور طوائف کے دامن کی دوری مٹ جاتی ہے۔ اعصاب آسودہ ہو جاتے ہیں مگر روح کی تیرگی نہیں مٹتی نتیجہ یہ کہ بازارِ حسن کے اونچے مکان کے سینے میں بھی بیتاب روح منعکس نظر آتی ہے اور وہاں کے گیتوں میں بھی بیداد کا جوش اور فریاد کا عکس واضح جھلکتا ہے۔ اپنے زمانے کے نوجوان کی اس مجبوری اور بے بسی پر میراجی نے صنعتی تہذیب اور نئی شہری تنظیم پر جو صدائے احتجاج بلند کی ہیں، انہیں سن کر میراجی کے اس دعوی کو مانے بغیر چارہ نہیں کہ فی الحقیقت موجودہ صدی کی بین الاقوامی سیاسی، اقتصادی اور اخلاقی کشمکش ان کا مرکزِ نظر رہی ہے (بحوالہ "میری پسندیدہ نظم" مرتبہ حسن عسکری)۔ "اونچا مکان"۔ "اخلاق کے نام"۔ "بلندیاں"، "ترقی پسند ادب" اور ادا کاران کے اس دعوی کا مکمل ثبوت ہیں۔

میراجی اپنی خیالی دنیا میں گھر بار میں جڑیں پکڑنے اور اپنے لواحقین کی خدمت کا حق ادا کرنے کی حسرتوں کے علاوہ مذکورہ بالا کشمکش کو

بھی دور آتے دیکھتے ہیں اور اسی کشاکش کے پس منظر میں ذاتی مصائب سے نجات پانے میں سرگرم رہتے ہیں اور ساتھ ہی عشق کے طائر آوارہ کا بہروپ بھی قائم رکھتے ہیں۔ یہ عشق ان کی ذاتی محرومیوں میں آفاقی وسعتیں سمیٹ لاتا ہے:

میں ہوں اک بھنڈار دکھوں کا، میرے پاس خزانہ ہے
میں سنے اوروں کے دکھ میں اپنے دکھ کو پہچانا ہے

(بیوپاری)

میراجی نے قیوم نظر اور اپنی ہمشیرہ کے نام جو خط لکھے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غم روزگار میراجی کا سب سے بڑا غم ہے۔ منشی مہتاب دین کے اندھا ہونے، فوت ہو جانے، میراجی کے ان کی خدمت نہ کر سکنے کے غم اور اس غم کو غلط کرنے کے لئے پڑھنا لکھنا چھوڑ کر جوتوں اور استروں کی تجارت کرنے کے منصوبے اور آخر میں اپنی کھال تک بیچ کر بھائی بہنوں کے حقوق ادا کرنے کی تمنائیں —— یہ اور ایسی ہی دوسری کئی پریشانیوں کو کسی پر ظاہر کرنا میراجی اپنی غیرت کے منافی سمجھتے ہیں لیکن پریشانیاں ان کی شاعری پر اپنا سایہ ڈالے بغیر نہیں رہتیں۔ زندگی سے گریز اور ستیز کی اس کشمکش کا نکتۂ عروج نظم "اجنتا کے غار" ہے جس میں اس بات پر غور کرتے کرتے کہ:

کیوں مجھے وقت کی رفتار نے الجھایا ہے؟

میراجی، داجد حانی میں کپل وستو کی "جلوۂ ذلب جہاں" دیکھتے ہیں اور ان پر کھلتا ہے کہ نجات کی راہ گوتم کی راہ ہے، سوئی ہوئی منکوحہ کو چھوڑنے اور گھر بار تیاگنے کی راہ:

دھیان تو آتے ہی آئے گا، مری آنکھوں کو
سب اک اور ہی شے بن کے نظر آتا ہے
اور تو —— سامنے لیٹی ہوئی جندری مورت
چندا سوروخطوط
جس نے بیتی ہوئی صدیوں میں مجھے الجھایا
تو ہی داسی ہے، تو ہی رانی ہے
ماتت کی مہلت، یک لمحہ کو انبار بنا دیتی ہے
ماتت کے جاتے یہ بیزار بنا دیتی ہے
میرے دل کو، مرا دل راجہ ہے
اس کنول تال کے پژمردہ کنارے پہ نشستہ ہے مگر
بات اس کی نہیں سنتا کوئی
اور یہ بیٹھے ہوئے سوچ کی لہروں میں بہا جاتا ہے
تیری بے باک اداؤں کا جلوس
دیکھتے دیکھتے آنکھوں سے نکل جاتا ہے
اور پھر دھیان مجھے آتا ہے

لیٹے لیٹے، جو تری آنکھوں میں نیند آ جائے
میں تجھے چھوڑ کے چل دوں ــــ چپ چاپ
اک اچٹتی سی نظر ڈال کے، نہ اٹھے، چل دوں

(اجنتا کے غار)

اس راہِ نجات پر چلتے چلتے میرا جی غار کے اندر پہنچے تو یہ بھید پایا کہ یہاں بھی چین نہیں:

نوعِ انساں بھی تو اک غار کی مانند ہے تاریک مقام
اس کی تاریکی اجالے کو دبا سکتی نہیں ہے لیکن
کیا اسی واسطے کچھ گیانی یہاں آئے تھے
تاکہ ان غاروں میں چپ چاپ ــــ جہاں والوں سے
ہو کے روپوش ــــ سفر طے کر لیں
دوشِ دزداں کا سفر طے کر لیں
لیکن افسوس یہاں بھی ان کو
نہ ملا یاسے نروان ــــ یہی دیواریں
ان کے افسردہ دلوں کی غماز
آج تک وحشت میں سرمارتی ہیں

(اجنتا کے غار)

یہ نظم ۱۹۴۲ء کی ہے اور اس حقیقت کی غماز کہ میرا جی نے اب دنیا میں رہ کر ترکِ دنیا کا فن سیکھ لیا ہے۔ چنانچہ وہ نوعِ انسان کے غار کی مانند تاریک مقام پر یاسے نروان حاصل کرنے کی جد و جہد کو تیز تر کر دیتے ہیں اور بمبئی جیسے شہر کے ہجوم میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ جب تک میرا جی اپنے مجاہدے سے فارغ ہوتے، اس قوم نے اپنی ہستی کی بقا کا مسئلہ حل کر لیا جس کے متعلق وہ کہا کرتے تھے کہ اس کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ اور میرا جی کے وہ دوست اور شاگرد جن کی بیروزگاری کو میرا جی ذاتی مسئلہ سمجھتے تھے۔ پاکستان کے مراکزِ اطلاعات و نشریات کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھے خوشحالی کی زندگی بسر کرتے تھے۔

پاکستان کا قیام میرا جی کے ہاں ایک بہت بڑا جذباتی تجربہ بن گیا اور انھوں نے قیوم نظر کو لکھا:

یہ خوشخبری کہ نستعلیق اہلِ وطن ہے کہ میرا جی اس ہنگامے سے سمندر کی مانند حیاتِ تازہ لے کر ایک بار پھر زندگی کی کشمکش کا مقابلہ کرنے کو تیار ہو جائے۔[۱]

یہ حیاتِ تازہ میرا جی کو بمبئی کے تاریک غار سے باہر اور دنیا کی روشن فضاؤں سے رابطہ قائم کرنے پر اکساتی ہے۔ "خیال" منظرِ عام پر آ جاتا ہے اور میرا جی "خدا"، "سلسلۂ روز و شب"، "یگانگت"، "تنہائی" اور "عدم کا خلا" جیسی نئی نظمیں تخلیق کرتے ہیں۔ یہ نظمیں اس قدر نئی ہیں کہ خود میرا جی کے ہاں رنگِ تازہ کی نمود کی مثال ہیں۔ ان میں حرف و معنی، ہر دو اعتبار سے میرا جی کے ہاں ابتدائی ہندی نواز شاعری سے عجمی اسلامی شعری روایت کی طرف گریز کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ اس دور میں میرا جی نہ صرف نئی پابند نظمیں اور غزلیں کہتے ہیں بلکہ پرانی پابند نظموں اور غزلوں کو شائع کرنے کے لئے بھی بے قرار نظر آتے ہیں۔ دامودر گپت کے ساتھ ساتھ عمر خیام کا ترجمہ بھی کرتے ہیں اور دامودر گپت کی نظم شائع کرتے وقت "خیال" کے اداریے میں یہ لکھنا نہیں بھولتے:

---

[۱] "میرا جی کے چند خطوط" از الطاف گوہر، مطبوعہ "نئی تحریریں" نمبر ۴

"دا مور رکیٹ کی پیروی میں آج ہم ایسی چیز ہرگز نہ لکھیں گے لیکن ایسی چیز پڑھیں گے ضرور تاکہ ہماری دنیا میں وہ ماحول ہی نہ بننے پائے جو محض لذت کو حیات بتاتا ہے۔"

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انھیں گھر یاد آنے لگتا ہے، ماں کی آواز سنائی دیتی ہے:

یہ سرگوشیاں کہہ رہی ہیں اب آؤ کہ برسوں سے تم کو بلاتے بلاتے

مرے دل پہ گہری تھکن چھا رہی ہے

کبھی ایک پل کو، کبھی ایک عرصہ صدائیں سنی ہیں مگر یہ انوکھی

ندا آ رہی ہے

بلاتے بلاتے تو کوئی نہ اب تک تھکا ہے نہ آئندہ شاید

تھکے گا

"مرے پیارے بچے" "مجھے تم سے کتنی محبت ہے" "دیکھو

اگر یوں کیا تو بُرا مجھ سے بڑھ کر نہ کوئی بھی ہوگا"

"خدایا خدایا!"

کبھی ایک سسکی، کبھی اک تبسم، کبھی صرف تیوری

مگر یہ صدائیں تو آتی رہی ہیں

انھی سے حیاتِ دو روزہ ابد سے ملی ہے

مگر یہ انوکھی ندا جس پہ گہری تھکن چھا رہی ہے

یہ ہر اک صدا کو مٹانے کی دھمکی دیے جا رہی ہے

(سمندر کا بلاوا)

یہ وہ زمانہ ہے جب میرا جی کا جسم جواب دے چکا تھا اور وہ "کتاب پریشاں" کے عنوان سے ہمیں اپنے ادبی، فنی، معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی نظریات سے روشناس کرانے کا سلسلہ منقطع کرنے پر مجبور ہو گئے تھے اور لاہور آ کر اپنا علاج کرانے کے خواب دیکھنے لگے تھے ۔۔۔ مگر ان کی بجائے صرف یہ خبر لاہور پہنچ سکی کہ بسترِ مرگ پر دم توڑتے ہوئے میرا جی کے ہاتھ میں جو کتاب تھی اُس کا نام ہے:

"The Defeat of Baudelaire"

(بودلیئر کی شکست)

لے "میرا جی کے آخری لمحات" از اختر الایمان مطبوعہ نقوش لاہور

منیر احمد شیخ

تنقید کی اخلاقی اقدار

نظریاتی تنقید کے بنیادی مسائل میں اخلاقی اقدار کے تعین کا مسئلہ ایک مدت سے یورپ میں ادبی تنقید کا دلچسپ موضوع رہا۔ ہمارے ہاں تنقید کی روایت، خاص طور پر جدید تنقید کا انداز نظر مغرب کے تنقیدی نظریات کے زیر اثر مرتب ہوا۔ اردو ادب کے نقادوں نے جانچنے پرکھنے کے پیمانے مغرب ہی سے مستعار لئے اور نقد و نظر کا خالصتاً مشرقی نقطۂ نظر جو مشرق کی اخلاقیات سے پیدا ہوا تھا، مہمل نظر ٹھہرا۔ تنقید کے اخلاقی پیمانے معاشرے کے تہذیبی اور سماجی حالات سے جنم لیتے ہیں۔ مغربی تنقید کا نظریہ مغربی معاشرے کی تہذیبی اقدار کا حامل ہے اور مشرق کے جانچ پرکھ کے پیمانے مشرق کی مخصوص تہذیبی روایت سے پیدا ہوئے ہیں۔ ہمارے یہاں جدید تنقید نے یہ ٹریجیڈی عرصے سے اردو ادب کے ساتھ روا رکھی ہوئی ہے کہ ایک مختلف معاشرے کی تنقیدی اقدار کو جوں کا توں اُٹھا کر ایک مختلف معاشرے کے ادب پر عاید کر دی جاتی ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ نہ صرف ناانصافی کی بات ہے بلکہ ایک لحاظ سے جہالت اور گمراہی کی دلیل ہے۔ ہمارا اپنا اخلاقی نقطۂ نظر جو مشرق کی بصیرت سے نکلا ہے۔ کم از کم تنقید کی حد تک شعر و ادب کی پہچان میں سراسر غائب نظر آتا ہے۔

مولانا حالی سے پہلے اردو تنقید، ادب کی ایک الگ صنف کی حیثیت نہ رکھتی۔ تاہم شعر و ادب کی جانچ پرکھ کا ایک انداز ضرور تھا۔ یہ تنقید شعر کے راستے سے، خطوط کے ذریعے یا تذکروں میں کسی نہ کسی صورت موجود تھی، اگرچہ کسی شاعر ادیب کا کوئی مکمل اور تفصیلی جائزہ ان میں نہ ہوتا تھا مگر اشاروں اور رمز و کنایہ میں تنقیدی آراء کا اظہار ضرور ہوتا تھا۔ اس دور میں تنقید ذات سے الگ نہ تھی یعنی رائے دینے والے کے یہاں پہلے سے کوئی بندھے ٹکے نظریات نہ ہوتے تھے۔ جن کی روشنی میں وہ ہمعصر تخلیقات کو جانچتا۔ تنقید ابھی تک پیشہ نہیں بنی تھی اور کسی شاعر کے بارے میں گفتگو کرنے والے اُس کی ذات کو اُس کے کلام سے الگ نہ کرتے تھے بلکہ اکثر اوقات تو جانچ پرکھ میں ذاتی تعصبات یا کبھی کبھی تعلقات بھی در آتے تھے اور تنقید شاعر کی پوری شخصیت اور اُس کے کلام پر تبصرے کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ ایک لحاظ سے خوبی بھی تھی اور ایک لحاظ سے کمزوری بھی۔ خوبی ان معنوں میں کہ تنقیدی اخلاقیات بنے بنائے اصولوں اور نظریات کی محکوم نہ تھی۔ شاعر اور اس کا کلام مل کر ایک تہذیبی علامت بنتے تھے اور ایک زندہ روایت کا متحرک عنصر۔ خرابی کی بات صرف یہ تھی کہ بعض اوقات تعصبات اور معاصرانہ چشمک کلام کی خوبیوں کو سامنے نہ آنے دیتے۔

اردو تنقید میں تعصب اور چند مروجہ اخلاقی نظریات نے ایک مدت تک ادبی روایت میں نئے عناصر کو تسلیم نہ کیا۔ نظیر اکبر آبادی اس ضمن میں خاص مثال ہیں۔ اُن کی شاعری جو ادب کی مروجہ روایت سے الگ تھی۔ تنقید ادب کے مروجہ اخلاقی نظام کی نذر ہو گئی۔ یوں کہئے کہ تنقید ادب کا ایک اخلاقی نقطۂ نظر روایت سے انحراف کا متحمل نہ ہو سکا اور ایک اچھے بھلے باندار شاعر کو تاریخ ادب کی اخلاقیات نے شہر بدر کر دیا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا تنقید ادب میں صرف خارجی پیمانے ہی ہونے چاہئیں یا اس میں داخلیت کی بھی کچھ نہ کچھ کارفرمائی ضروری ہے۔ یہ مسئلہ تنقید کا

اہم بنیادی مسئلہ ہے اور اس معاملے میں محض داخلیت اور محض خارجیت کی دو انتہائیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ اس معاملے میں ہمیں تخلیقِ ادب کے نظریے کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ "تخلیق ذات سے شروع ہوتی ہے"، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ذاتی حوالے کے بغیر ادب، ادب نہیں بنتا لفظی بازی گری رہ جاتا ہے۔ ذاتی حوالے سے میری مراد ادیب کی اپنی ذات اور اس کے اردگرد کی فضا ہے جس میں وہ جیتا ہے اور اس کے وہ مسائل ہیں جن کا اسے سامنا کرنا پڑتا ہے یہ مسائل تہذیبی، اقتصادی اور تاریخی عوامل سے وجود میں آتے ہیں اور ادب کا حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر انھی مسائل میں سے پیدا ہوتا ہے۔ غالب کی شاعری کو اس کے تہذیبی، تاریخی اور اقتصادی پس منظر کے بغیر پڑھیے اور دیکھیے کہ پڑھنے والے کے ہاتھ کیا آتا ہے؟ یہ صرف غالب ہی کی بات نہیں، ہر ادبی کسوٹی لکھنے والے کے دور ہی میں موجود ہوتی ہے، اسے اپنے دور سے الگ نہیں کیا جا سکتا یعنی تنقیدی اقدار کی ترتیب میں ادیب کا ذاتی حوالہ لابدی ہے۔ [illegible] کے تخلیقی شعور کو سمجھنے میں بہت اہم ہے۔ ایک دور کا انفرادی اور اجتماعی شعور تخلیقِ ادب کے راستے سے اظہار پاتا ہے اسی لئے ادب اپنے دور کا آئینہ کہا جاتا ہے کہ اس میں پورے عہد کی جذباتی اور ذہنی کشمکش اور اس کے اخلاقی تقاضے موجود ہوتے ہیں۔ یہ ایک دور کا ذاتی حوالہ ہے، چنانچہ جس طرح تخلیقِ ادب میں ذات تخلیق سے جدا نہیں ہوتی اسی طرح اس کے پرکھنے کے معیار متعین کرتے وقت لکھنے والے کی ذات اور اس کے زمانے کا شعور تنقیدی اقدار کا لازمی حصہ ہوتا ہے تخلیقِ ادب اور تنقیدِ ادب دراصل ایک ہی اخلاقی نظام کے تابع ہوتی ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ادب کی تخلیق تو ایک اخلاقی نظام کے تحت ہو رہی ہے اور اس کی قدر و قیمت کے معیار ایک اور اخلاقی نظام سے متعین ہوں۔ پہلی اخلاقی قدر باہم اخلاقی نظام ہی پیدا کرتا ہے اور یہیں سے اس دور کے ادبی شعور کی بنا پڑتی ہے۔ اس لحاظ سے ہمارا قدیم طرزِ تنقید، جدید طرزِ تنقید سے افضل ہے کہ وہ اس شعور سے عاری نہیں۔

میں نے شروع میں مولانا حالی کا حوالہ دیا تھا کہ اردو تنقید میں انھوں نے ایک باقاعدہ شعوری سطح پر ادب کو جانچنے پرکھنے کے معیار متعین کرنے کی طرح ڈالی۔ حالی اگرچہ اسی دور سے تعلق رکھتے تھے جس میں تذکرہ نویسی تنقیدِ ادب کا موثر ذریعہ تھی، مگر انھوں نے بھی خالصتاً داخلی معیارات کو شعر و ادب کے لئے کافی نہ سمجھا اور کچھ خارجی پیمانے بھی بنائے جو ان کی شاعری کی طرح اخلاقیات کے چند مخصوص سانچوں میں ڈھلے ہوئے تھے۔ ہرچند کہ تنقیدِ ادب میں اخلاقی اقدار کا تعین کوئی گالی نہیں لیکن ہمارے جدید ناقدین نے مولانا حالی کی "اخلاقیات" ہی کو نشانہ بنایا اور ان کی شاعری اور ان کی تنقید اسی حوالے سے زیرِ عتاب رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ حالی نے اردو تنقید میں جس نئے دور کی بنیاد رکھی وہ خارجیت کے ساتھ ساتھ داخلی عناصر کی یکسر نفی نہیں کرتا۔ اگر ایسی بات ہوتی اور وہ ذاتی پسند اور ناپسند کو تخلیقِ ادب میں نہ کھپنے دیتے تو یادگارِ غالب، حیاتِ سعدی اور حیاتِ جاوید جیسی کتابیں نہ لکھی جاتیں۔ مولانا حالی کا کام یہ ہے کہ انھوں نے ذاتی تعصبات کے عناصر کو تنقید میں ختم کیا اور چند خارجی معیاروں کی طرف اشارے کئے کہ تنقیدِ ادب کو انہی معیاروں پر اپنی عمارت تعمیر کرنا تھی تاکہ یہ ایک الگ صنف کی حیثیت سے پہچانی جا سکے۔ اس کام کا فائدہ یہیں یہ ہوا کہ حالی کے بعد محض ادب ہی نہیں، ادیب کی ذات بھی موضوعِ ادب بن گئی۔ جدید تنقید میں ادیب کے تہذیبی و اقتصادی پس منظر کے علاوہ اس کے نفسیاتی تجزیے بھی ہونے لگے اور نفسیاتی تنقید بھی نقد و نظر کا ایک جزو قرار پائی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے ناقدین علمِ نفسیات کے کچے پکے شعور کی وجہ سے بہت سی بوالعجبیاں کر جاتے ہیں اور ادب و شعر کو اپنے گورکھ دھندے میں لے جاتے ہیں کہ ادبی ذوق کی تربیت کہیں بہت پیچھے رہ جاتی ہے۔

بہرحال اب آہستہ آہستہ بات یہاں تک پہنچی ہے کہ ادبی تنقید بہت سے اخلاقی نظریات میں سے گزرتی ہوئی ایسے مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں ادیب کی ذات اور اس کا ادب لفظِ معظم کے چکر سے نکل آئے ہیں۔ اب لکھنے والے کا پورا تجزیہ اس کی گرفت میں اور اس کی کمزوریاں صحیح ادبی شعور کے لئے اتنی ہی اہم ہو گئی ہیں جتنی کسی زمانے میں اس کی خوبیاں، نیکیاں اور تقدس اہم ہوا کرتا تھا۔ جدید تنقیدِ ادب، ادیب کے احترام سے نکل کر حقیقت پسندی کے زیادہ قریب ہو گئی ہے۔ اب اخلاقی قدریں جدید اقتصادی، سماجی اور نفسیاتی عناصر ہی کے زیرِ اثر مرتب ہوتی ہیں اور انھی کے حوالے سے نئے ادبی محاکمات دیکھنے میں

آنے لگے ہیں۔

ہماری ادبی تنگ نظری کو جانچنے پرکھنے کے مغربی معیاروں کے سلسلے میں ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ ہمارے جدید لکھنے والے فنِ تخلیق میں مغرب ہی کی پیروی کرتے ہیں۔ مثلاً فنِ افسانہ نویسی سے ۱۹۳۵ء کے بعد کی پود مغرب کی دی ہوئی لائنوں پر ہی کہانی کے خطوط بناتی رہی گویا ان سب کے پیر و مرشد امریکہ، فرانس، انگلستان اور روس ہی تھے۔ منٹو کی مثال اس ضمن میں دی جاتی ہے کہ اس نے او ہنری اور موپساں کے تتبع میں لکھا چنانچہ منٹو کے افسانوں کو پرکھنے کے اصول بھی وہی ہوں گے جو مغرب میں رائج ہیں۔ یہ استدلال بظاہر بہت اپیل کرتا ہے اور الزام کو ناقدین سے ہٹا کر ادیبوں کے سر پر تھوپ دیتا ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو یہ اعتراض صرف تکنیک کے تتبع کی حد تک درست ہے۔ اُردو افسانہ تکنیک کے اعتبار سے مغرب کی افسانہ نویسی کی روایت میں لکھا گیا لیکن اردو افسانے کے موضوعات اور ان کی بُنت مشرق ہی کے ماحول میں ہوئی۔ ان میں تمام تر جذباتی اور ذہنی مسائل اپنے یہاں کے انفرادی اور اجتماعی مسائل ہیں۔ ہمارے افسانہ نگار کی تحریک کا مرکز مغرب نہیں مشرق ہی رہا ہے اور اسی پس منظر میں لکھنے والوں کی تخلیقی صلاحیتوں نے جنم لیا ہے۔ لہٰذا اپنے افسانے کے خالصتاً مشرقی موضوعات کو محض اس لئے مغربی پیمانوں سے ناپنا کہ ان موضوعات کو برتنے میں مغربی افسانے کی تکنیک کو استعمال کیا گیا ہے کچھ ایسا صحیح طرزِ عمل نہیں ہے۔

تنقید کی اخلاقی اقدار کے سلسلے میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ جدید ناقدین کو کوئی ادبی محاکمہ دینے سے پہلے اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا ہے کہ لکھنے والوں نے اپنے دور کی اخلاقی قدروں کو کس حد تک قبول کیا اور کس حد تک رد کیا۔ رد و قبول سے اس عہد کے لکھنے والوں کی جذباتی اور شعوری کیفیات کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک مخصوص وقت میں ادبی رُخ کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ لکھنے والوں نے مروجہ اخلاقی قدروں کو کبھی جوں کا توں قبول نہیں کیا ان سے بغاوت کی ہے یا ان میں تبدیلیاں لائے ہیں۔ بغاوت کی صورت میں ادیب کو مروجہ اخلاقی اقدار کے مقابلے میں ایک دوسرا اخلاقی نظام پیش کرنا پڑتا ہے جیسے مارکسی ادیبوں نے روحانی اقدار کے متبادل مادی اقدار کی اخلاقیات کا نظام پیش کیا۔ یہ متبادل اور مخالف قوتیں اخلاقیات کی شکست و ریخت میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور ادبی رجحانات انہی قوتوں کے حوالے سے جانچے اور پرکھے جاتے ہیں۔ مروجہ اخلاقی نظام کو من و عن قبول کرنے میں لکھنے والا ایک جامد روایت کا حصہ بن کر رہ جاتا ہے اور اپنی انفرادیت قائم نہیں رکھ پاتا۔ روایت اسی طرح آگے بڑھتی ہے کہ اس میں سے مردہ حصوں کو رد کر دیا جائے اور زندہ اور جاندار حصوں کو قبول کر کے انہیں آگے چلایا اور بڑھایا جائے۔

ممتاز احمد

اقبال کا اصل کارنامہ

یہ مضمون یقیناً مصنف کے وسیع اور گہرے مطالعے کا نتیجہ ہے اور اقبال کے کارناموں کو ایک نئے زاویے سے سمجھنے کی عالمانہ کوشش ہے، مگر ہماری رائے میں مصنف نے سر سید کی تحریک کے بارے میں جو اظہار خیال کیا ہے وہ محل نظر ہے۔ اسی طرح یہ مسئلہ بھی مزید بحث کا متحق ہے کہ اقبال نے فقہ اور اسلامی الہیات کی تشکیل نو کے سلسلے میں سید سلیمان ندوی اور مولانا انور شاہ کے علاوہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی بھی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس مضمون کا آخری فقرہ بھی ایک مفید اور تعمیری بحث کا موضوع بن سکتا ہے۔

اہلِ قلم سے اور خاص طور سے ماہرینِ اقبالیات سے گزارش ہے کہ وہ اس مضمون کو مذاکرے کا موضوع قرار دے کر اپنے ارشادات سے "فنون" کو نوازیں ——— ادارہ

ایک فرانسیسی نقاد کا قول ہے کہ ہر بڑا شاعر اپنے زمانے سے بلند بھی ہوتا ہے لیکن اپنے زمانے کے چیلنج کا جواب بھی ہوتا ہے۔ یہ بات دُنیا کے دوسرے شاعروں کی طرح اقبال کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ پس ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اقبال کے فکر و فن کو سمجھنے کے لئے اُن حالات کو بھی نگاہ میں رکھیں جو اُن کے دور میں برصغیر اور برصغیر سے باہر نئی دنیا کی تشکیل میں ایک اہم حصّہ ادا کر رہے تھے۔ ان حالات کے حوالے سے ہی اقبال کا اصل کارنامہ اپنی واضح ترین صورت میں سامنے آ سکتا ہے۔

آج بیسویں صدی کے آخری سرے پر کھڑے ہو کر جب ہم اس صدی کے آغاز میں برصغیر اور دوسرے اسلامی ممالک کے مسلمانوں کی حالت پر اعادۂ نظر کرتے ہیں تو ہمیں اقبال کے ساتھ ہمنوا ہو کر یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کی ناکامی کے نتیجے میں برصغیر میں مسلمانوں کا بچا کھچا سیاسی اقتدار بھی ختم کیا جا چکا تھا اور انگریز پوری طرح ہندوستان کے سیاہ و سپید کے مختار بن چکے تھے تاہم مسلمانوں کا معاشی و مادی ابتلا کا شکار ہو جانا کوئی اتنا بڑا حادثہ نہ تھا جو بطور امت کے اُن کے اجتماعی شعور میں بنیادی تبدیلیوں کا سبب بنتا۔ اس طرح کے حادثات قوموں کی زندگی میں ہوتے ہی رہتے ہیں اور زندہ قومیں بحرانوں سے مضمحل اور ضعیف نہیں ہوتیں بلکہ انہیں اپنی قوت و شوکت کے لئے ایک چیلنج سمجھ کر عروج کے لئے بحرانوں کو بطور زینے کے استعمال کرتی ہیں۔ اصل حادثہ اور اصل المیہ معاشی و مادی نقصانات کے علاوہ تھا اور وہ المیہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے اختتام اور انگریزوں کے سیاسی اقتدار کے آغاز کی درمیانی مدت میں مسلمانوں کے اندر سے کوئی ایسا رجل رشید پیدا نہیں ہوا جو ایک کی تعمیر اور دوسرے کی تخریب کے اصل وجوہ سے باخبر ہوتا اور تہذیبی انتشار کی اس فضا میں مسلمانوں کیلئے

ایک ایسا لائحہ عمل تجویز کرتا جو انھیں غیر ملکی استحصال کے خلاف سینہ سپر ہونے اور دینِ حق کا علمبردار ہونے کی راہ دکھاتا۔ برعکس اس کے اس دور میں مسلمانوں کے اندر سے جو افراد اُٹھے انھوں نے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو انگریز کی سیاسی غلامی سے سمجھوتہ کرنے کا مشورہ دیا بلکہ تہذیبی دائرے میں بھی ہتھیار ڈال دینے کی تلقین کی۔ سرسید اور ان کے رفقاء کی کوششوں سے اس دور کے مسلمان نوجوان کو ڈگری اور اس ڈگری کے نتیجے میں کلرکی اور پھر اس کے نتیجے میں ڈبل روٹی تو حاصل ہو گئی لیکن یہ نوجوان اس انقلابی روح سے محروم ہو گیا جو ستاروں پر کمندیں ڈالنے کے لئے مہمیز بنتی تھی۔ میکالے نے کہا تھا کہ ہم ہندوستان میں ایک ایسا نظامِ تعلیم رائج کریں گے جو نام کے مسلمان تو باقی رکھے گا لیکن ان کی روح انگریزوں جیسی ہوگی۔ سرسید نے کہا کہ ایک غیر قوم ہمارے نوجوانوں کو جھٹکا کیوں کرے، ہم خود ہی انھیں ذبح کئے دیتے ہیں، چنانچہ علی گڑھ تعلیمی تحریک نے جو نسل تیار کی وہ تخلیقی صلاحیتوں سے محروم اور زندگی کے ہر دائرے میں مغربی تہذیب کی مقلد تھی۔

دوسری طرف مسلمان قوم کی سب سے زندہ جاندار، بھرپور اور عمل کے میدان میں سرگرم کار رکھنے والی روایت جہاد کی تھی جسے انگریزوں کے اقتدار کے مستقل تحفظ کی خاطر ختم کرنے کی بھی ایک کوشش کی گئی۔ اس سیاسی و تہذیبی انتشار نے زندگی کے مختلف شعبوں میں جس طرح اظہار کیا وہ یہ تھا کہ ایک طرف تو سیاسی فلسفے پر مغرب کا پوری طرح غلبہ ہو گیا اور مغربی تصورِ قومیت اور لادینی جمہوریت، مسلمانوں کے آئیڈیل قرار پائے۔ دوسری طرف معاشرتی شکلوں میں بھی بنیادی تبدیلیاں عمل میں آنے لگیں۔ لباس، رہن سہن، زبان ہر چیز پر مغربیت کا غلبہ ہو گیا اور مادیت نے اخلاقی اور روحانی اقدار کی جگہ لے لی۔ ان حالات نے بیسویں صدی کے آغاز ہی سے برصغیر کے مسلمانوں میں تہذیبی انتشار کی جو کیفیت پیدا کرنی شروع کر دی تھی اس کا نتیجہ اقبال ہی کے ایک شعر میں یہ تھا:

بجھی عشق کی آگ، اندھیر ہے مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

برصغیر سے باہر مسلمانوں کی حالت اس سے کچھ بہتر نہ تھی۔ ایران میں رضا شاہ اور افغانستان میں امان اللہ خاں کی آمریت مسلط تھی، عرب دنیا مغرب کے سیاسی استحصال کے آگے دم توڑ رہی تھی اور ترکی میں مصطفیٰ کمال اوجِ ثریا کی قربت کا عزم رکھنے والی قوم کو مغرب سے قریب ہونے کا حکم دے رہے تھے۔ عالمِ اسلام کے علاوہ دنیا کے دوسرے ممالک اور بالخصوص مغربی ممالک بھی وطنی قومیت کے متعصبانہ نظریئے کی پیروی کے نتیجے میں ایک بڑی جنگ کے غار کے دہانے پر کھڑے تھے طبیعی علوم میں نئے نئے انکشافات قدیم نظریاتی سانچوں کو ڈھا کر ایک نئی دنیا کے طلوع کی خبر دے رہے تھے۔ فکر کی دنیا میں کانٹ چھانٹ کا ایک وسیع سلسلہ جاری تھا۔ فرد کی بے قید آزادی کے ردِعمل کے طور پر اشتراکی اور فاشی نظریات جنم لے رہے تھے۔ غرضیکہ تعمیر و تخریب کا ایک وسیع سلسلہ تھا جو سارے یورپ پر چھایا ہوا تھا۔

یہ تھے وہ حالات جن کے درمیان اور جن کے مقابلے میں اقبال نے اپنی فکر کا چراغ روشن کیا۔ اقبال خود مشنری اسکول اور مغرب کے تعلیمی اداروں کے تعلیم یافتہ تھے لیکن اُن کے دل و نگاہ مسلمان تھے اور مغربی افکار کا وسیع و عمیق مطالعہ کرنے کے باوجود وہ اس دور کے دوسرے نوجوانوں کی طرح اس کے طلسم کا شکار نہ ہو سکے۔ اسلام کے عالمگیر پیغام نے ان کے دل میں اس طرح گھر کر لیا کہ پھر اس کے بعد اُن کی شاعری اسلام اور مسلمانوں کے شعورِ ملی کی ترجمان بن گئی۔ مغرب میں ایک نئے دور کی تعمیر اور مغربی ممالک کی مادی ترقی جہاں دوسرے مسلمانوں کو مرعوب اور مسلمانوں کے اندر پائی جانے والی اجتماعی انتشار کی کیفیت انھیں مایوس کر رہی تھی، وہاں اقبال ان حالات سے مایوسی کے بجائے رجائیت کا سبق لیتا ہے اور علی وجہ البصیرت اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ یہ حالات مسلمانوں میں ایک بڑی تبدیلی کا سبب بننے والے ہیں:

کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں

دیکھ چکا المنی، شورشِ اصلاحِ دیں   جس نے نہ چھوڑے کہیں عہدِ کہن کے نشاں
حرفِ غلط بن گئی، عصمتِ پیرِ کنشت   اور ہوئی عقل کی کشتیِ نازک رواں
چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب   جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملتِ رومی نژاد، کہنہ پرستی سے پیر   لذتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں
روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب   رازِ خدائی ہے یہ، کہہ نہیں سکتی زباں

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اُچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

اسلام کے لئے اقبال کے دل میں بے پناہ تڑپ اور ایک شدید جذبہ موجود تھا لیکن ابتدا میں اس جذبے نے باقاعدہ ایک آئیڈیالوجی کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ اسلام کو بطور ایک آئیڈیالوجی کے پیش کرنے کا آغاز اُن کی "بانگِ درا" کی آخری طویل نظموں "شکوہ"، "جوابِ شکوہ"، "طلوعِ اسلام" اور "شمع و شاعر" سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد کا دور، اُن کی فکر کی تشکیل کا دور ہے جس میں وہ اسلام کو بطور ایک عالمگیر صداقت اور مکمل نظریۂ حیات کے سامنے لاتے ہیں۔ یہی وہ دور ہے جس میں اُنھوں نے "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" جیسی معرکۃ الآرا کتابیں لکھیں۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال نے اپنی فکر کے اظہار کے لئے شعر ہی کو ذریعہ بنانا کیوں پسند کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کی بنیادی ایمانیات تو اپنی خالص شکل میں موجود تھیں لیکن اُن کا خیال تھا کہ بطور امتِ وسط کے، مسلمانوں پر جو فرائض عائد کئے گئے تھے اور تاریخِ عالم میں امت کو جس مشن کی تکمیل کرنی تھی، ان فرائض اور مشن کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کا اصل مرض بے عملی، جمود اور سکون کا مرض تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ مسلمان اس وقت تک دوسروں کی سیاسی اور فکری غلامی سے آزاد نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنی ایمانیات کا ایک گہرا مضبوط اور اٹوٹ رشتہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں سے استوار نہ کریں۔ گویا مسلمانوں کو اس وقت ایمان کی ضرورت نہیں تھی بلکہ سرچشمۂ ایمان سے زندگی کو متحرک کرنے والے پیغام کی ضرورت تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ زندگی بخش اور حرکت و جد و جہد پر اُبھارنے والا پیغام فکری بحثوں سے نہیں بلکہ جذباتی اپیل کے ذریعے ہی پہنچایا جا سکتا تھا اور یہ جذباتی اپیل صرف شعر ہی میں ممکن ہے۔ التشبیہ بلا مشبہ، یہ بات بھی سامنے رکھنی چاہیئے کہ قرآن پاک کو شعر تو نہیں لیکن شعری نثر کا وہ اعلیٰ ترین نمونہ ضرور ہے جو آج تک انسان نے دیکھا ہے۔ قرآن پاک کی اس شعری نثر سے تفلسف کے بجائے علمیت پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک کی آیات پڑھ کر آدمی کو منطقی اور عقلی نکتہ طرازیوں کی نہیں سوجھتی بلکہ اس کے دل میں کچھ کر گزرنے کا عزم بیدار ہوتا ہے۔ اقبال نے بھی مسلمانوں کو حرکت اور جد و جہد پر اُکسانے کے لئے اپنے محدود انسانی دائرے میں اس اسلوب کو اپنانے کی کوشش کی۔

"اسرارِ خودی" فرد کی یافت اور "رموزِ بے خودی" امت کی یافت کی نہایت کامیاب کوششیں ہیں۔ ان میں اقبال نے اپنے نظریۂ خودی اور بے خودی کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔ رائج الوقت تصوف پر، جو مسلمانوں کو بے عملی اور رہبانیت کی طرف لے جا رہا تھا، تنقید کی، اُن انفرادی اور اجتماعی صفاتِ عالیہ کی نشان دہی کی جو حالات کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کو اپنانا ضروری تھیں۔ ساتھ ہی اسلام کو انسان کے وضع کئے ہوئے باطل نظریات پر غالب کرنے کے لئے اجتماعی جد و جہد پر زور دیا۔ اقبال کی فکر میں یہی دو کتابیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ اُن کے دوسرے مجموعوں میں انہی کے خیالات کو مزید توضیح و تشریح کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اقبال نے بتایا کہ اسلام کا مقصد

زندگی کو جامد اور ساکن کرنا نہیں بلکہ متحرک اور سرگرم کار رکھنا ہے اور جد وجہد اور کشمکش کے شعلوں کی آنچ ہی میں زندگی تخلیقی، موثر اور فعالی عناصر کو پروان چڑھا سکتی ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز　　چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز　　سرشت اس کی ہے مشکل کشی جفا طلبی
کشاکش زم و گرما، تپ و تراش و خراش　　ز خاک تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی
اسی کشاکش پیہم سے زندہ ہیں اقوام　　یہی ہے راز تب و تاب ملت عربی

اقبال کی اس انقلابی دعوت اور جذباتی اپیل کو بہت جلد ہی اپنے اظہار کا موقع مل گیا۔ خلافت تحریک برصغیر پاک و ہند میں اس جوش و خروش سے اٹھی کہ جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن اس تحریک کے بہت جلد ہی ناکام ہو جانے سے جو دور رس اثرات مسلمانوں پر مترتب ہوئے، وہ بھی کچھ کم نقصان دہ نہ تھے۔ تحریک خلافت کی ناکامی نے پوری مسلمان قوم کو مضمحل اور مایوس کر دیا۔ انتشار اور تہذیبی خلا کی اس کیفیت نے اقبال کو اس پر مجبور کیا کہ وہ اپنے طریق علاج پر Rethinking کرے۔ خلافت تحریک سے اقبال نے جو سبق سیکھا اس کے مطابق اس نے جذبات سے قوم کو اٹھانے کے ساتھ ساتھ ایمان کی پختگی پر بھی زور دینا شروع کر دیا۔ اس کے بعد سے اقبال مسلمانوں کی فکری بنیادوں کی مضبوطی کے لئے ٹھوس کام کا آغاز کرتے ہیں۔ نئے کام کے آغاز میں سب سے زیادہ اہمیت وہ برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی مسئلے کو دیتے ہیں۔ متحدہ قومیت کے نظریئے پر ضرب کاری لگاتے ہیں اور ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں مسلمانوں کے تہذیبی تشخص کے تحفظ کے لئے ایک الگ خطۂ زمین کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی وہ دوسرا اہم کام جو انجام دیتے ہیں، وہ فقہ اور اسلامی الٰہیات کی تشکیل نو کا کام ہے۔ اس کے لئے وہ سید سلیمان ندوی مولانا انور شاہ کاشمیری اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس دور میں اُن کا اہم ترین کام ان کے وہ خطبات ہیں جو بعد میں تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ Reconstruction of Religious Thought in Islam کے نام سے شائع ہوئے۔ ان خطبات کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ ان میں اقبال نے مذہبی تجربے کو وجدان سے بلند ہو کر سائنسی تجربے کی اصطلاحات میں بیان کیا، اسلامی فکر کے بعض پہلوؤں کی نہایت حکیمانہ انداز میں تشریح کی اور اس بات پر زور دیا کہ دین و دانش، مذہب و سائنس میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ اسلام کی الٰہیاتی فکر کی تدوین نو اور اسلامی فقہ کی تشکیل جدید کے سلسلے میں اقبال کی کوششیں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کم از کم فقہ کی تدوین نو کی ضرورت کا احساس تو انہیں اسی وقت ہو گیا تھا جب انھوں نے مسلمانوں کے لئے ایک الگ خطۂ زمین کا مطالبہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ایک دوست کے مطابق اگر اقبال زندہ رہتے اور پاکستان کے سربراہ بنتے تو چھٹے خلیفۂ راشد کہلاتے کیونکہ دیکھا جائے تو اس وقت عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ ہی خلافت کی بازیافت ہے۔ آج مسلم ممالک میں بادشاہت، آمریت، جمہوریت، سب کچھ ہے لیکن خلافت کہیں نہیں ہے۔ اقبال نے اس کام کو اپنی عمر کے بالکل آخری حصے میں شروع کیا تھا۔ افسوس کہ عمر نے انہیں مہلت نہ دی اور یہ اہم کام ادھورا اور غیر منظم رہ گیا لیکن اقبال جو کام کر گئے تھے، بعد میں اُٹھنے والی تحریکوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اگر اقبال کے کارنامے کے دو حصے کرنے کی اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ اقبال کی جذباتی اپیل سے قائد اعظمؒ نے اور اقبال کی فکری تحریک سے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے احیائے اسلام کے کام کو آگے بڑھایا۔

ڈاکٹر نبی ہادی

اکبر اعظم کا دوسرا ملک الشعراء — شیخ فیضی

— ۲ —

اس بات کو خاطر میں رکھنا پڑے گا کہ یہ پوری نسل تیموری دور کے فنونِ لطیفہ کی وارث تھی۔ تیموری شاہزادوں کی بدولت جمالیات اور زیبائی سے تعلق رکھنے والے تمام ہنر ہرات، کابل، بدخشاں اور خراسان کے مختلف شہروں میں پروان چڑھے۔ تیموری عہد کے مشہور شاعر جن کے نغموں نے بعد کی نسل کے ذوقِ سخن کو تربیت دی، نغانی، ہلالی چغتائی، امیر شاہی سبزواری، وحشی یزدی وغیرہ شمار ہوتے ہیں۔ نغانی نے تمام شاعروں پر بلاشبہ گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ ایران کے بعد معاصر دانشوروں کے نزدیک فغانی غزل کے جداگانہ مکتب کا بانی ہے اور مغل عہد کے سارے شاعر اسی مکتب کے پروردہ ہیں۔ مگر دوسرے شاعروں کی دی ہوئی روایات کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ہلالی چغتائی کی ایک غزل پوری نسل کے ذہنی رجحانات میں منعکس نظر آتی ہے۔ ابوالفضل کشمیر کے عبادت خانے کے لئے کتبہ لکھتا ہے اور اسی غزل کا سہارا لے کر عبارت تراشتا ہے:

"پروردگارا بہر جائے کہ می روم جویائے تو اند و بہر خانہ کہ می نگرم گویائے تو:

اے تیرِ غمت را دلِ عشاق نشانہ — خلقے بتو مشغول تو غائب زمیانہ
گہ معتکف دیرم و گہ ساکنِ کعبہ — یعنی کہ ترا می طلبم خانہ بخانہ"[1]

اس غزل کا ایک اور شعر ہے:

مقصودِ من از کعبہ و بتخانہ توئی تو — مقصود توئی، کعبہ و بت خانہ بہانہ

وحشی یزدی ایک طولانی ترجیع بند کہتا ہے۔ ہلالی کی غزل کا تاثر اور انعکاس صاف نمایاں ہے: (۱) شاعر کی انانیت بلبل کے پیکر میں عشق و محبت کے جہان کی سیر کے لئے پرواز کرتی ہے اور تیرِ غم کا نشانہ بن جاتی ہے۔ (۲) دنیا کے تماشے سب قصے ہی قصے ہیں۔ کس کے زمانے میں کیا ہوا کون جانتا ہے اور کون سنتا ہے):

جز عشق و محبت گنہم چیست کہ کردم — "اے تیرِ غمت را دلِ عشاق نشانہ"
بلبل ہدفِ تیر نمودن کہ پسندند — خاصا کہ بود بلبلِ مشہور زمانہ
در دورکہ بودست و کہ یکبار شنودست — تاریخ زمان ہست فسانہ بفسانہ

کامل جہرمی جہانگیری عہد کا شاعر ہے۔ وہ بھی اپنے مضمون کے لئے یہی قافیے مستعار لیتا ہے۔ افکار اس کے شخصی تجربے کا نتیجہ ہیں۔

---

[1] بد نمین مقدمہ آئین اکبری بحوالہ تذکرہ ور المنثور تالیف محمد عسکری حسینی بلگرامی۔ ص ۵۵

اس کے ذہن میں ایک ایسی ناگوار دنیا کی تصویر ہے جہاں کوئی کسی کا نہیں سب حرص و ہوس کے دیوانے ہیں۔ مگر فرید کا لہجہ اس سے زیادہ شیریں اور دلکش کیا ہوگا:

از حرص و امل ہست جہاں زاہل زمانہ　　پُر عربدہ و شور چو حمّام زنانہ
خود حامی خود باش کہ کس را غم کس نیست　　با اہل زمانہ ست ہمہ عذر و بہانہ
از اہل جہاں ہیچ تمتع نتوان یافت　　گفتم بتو ایں حرف کہ تیر است و نشانہ[1]

مندرجہ بالا اشعار یہ دکھانے کے لئے انتخاب کئے گئے کہ مغل دور کی روشن فکر جماعت کا ذہنی رجحان کس طرف تھا۔ ان اشعار میں تنگ اور جامد تصورات کو مسترد کرنے کا اشارہ موجود ہے۔ کعبہ اور بت خانہ دونوں کو حقیقت تک رسائی کا وسیلہ کہا جا رہا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان لوگوں کے پاس زندگی کا ایک عرفان اور ایک بصیرت نظر آتی ہے۔ ان کی نظر میں دنیا کے تمام انقلابات انفرادی ہوں یا اجتماعی، ایک عبرت انگیز فسانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ بے اعتقادی اور تشکیک کے مرحلے سے چل کر یہ لوگ اعتقادی منزل تک رسائی میں کامیاب ہو جاتے ہیں

گفتم بتو ایں حرف کہ تیر است و نشانہ

دنیا کے ہر معاشرے میں بعض افراد کی مثال فضاؤں کے آوارہ شہاب کی سی ہوتی ہے جو بظاہر کون و مکاں کے نظام سے بالکل بے تعلق، بیگانہ، اور آزاد گھومتے ہیں۔ ویسے ان کا کوئی قرینہ اور کوئی مقام و مدار نہیں ہوتا۔ مگر وہی لوگ اجتماعی خیالات کی تبلیغ کا سب سے موثر وسیلہ ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے آہنگ میں قلب روزگار کی دھڑکن کہیں زیادہ صاف سنائی دیتی ہے۔ نمونے کے طور پر اکبری عہد کا ایک شاعر جس کی بابت معاصرین کہتے ہیں کہ درویش بہرام کے نام سے مشہور ہے، کسی مخصوص جماعت اور مخصوص حلقے سے تعلق نہیں رکھتا۔ پورے ہندوستان میں آزادی سے سیاحت کرتا پھرتا ہے۔ انداز بیان کی بیباکی اور صفائی توجہ کے قابل ہے:

اساس پارسائی را شکستم تا چہ پیش آید　　سر بازار رسوائی نشستم تا چہ پیش آید
بہ ترسا زادۂ دل دادم و سررشتۂ دینم　　دریں بیرانہ سر زنار بستم تا چہ پیش آید[2]

(۳)

فیضی کے سوانح میں ابوالفضل کی داستانِ حیات اس طرح پیوستہ اور مربوط ہے کہ دونوں کو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ دونوں بھائی ایک ہی منزل مقصود کے رہ نوردا اور نصب العین کے اعتبار سے ہر قدم پر ایک دوسرے کے شریک تھے۔ عقاید کی یکجہتی میں دونوں کا میدان ایک، البتہ طریقۂ کار میں دونوں کی روش جدا یعنی ایک بھائی سیاستمدار اور مدبر تو دوسرا بھائی مفکر و شاعر کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آیا۔ ایک نے فلسفہ و شعر کے مشاغل میں زندگی بسر کی۔ دوسرا جہانبانی کے امور اور ملک گیری کے مسایل میں لگا رہا۔ مفکر کا منصب یہ ہے کہ نئے نظام کی جستجو، پرانے مسلمات کی تنقید، اور تازہ عقاید کی تشکیل میں مشغول رہے۔ اس کی شخصیت میں وہ پرانا آدم جلوہ افروز ہوتا ہے جو ہنوز جنت کی شاداب فضا سے باہر نہیں آیا تھا۔ زندگی کا نقشہ اور نصاب اس کے لئے صرف اتنا ہے کہ:

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

صدیوں کی عقل و دانش کے معطر گلدستے ہر وقت اس کے چاروں طرف بکھرے اور پھیلے پڑے رہتے ہیں۔ کتابیں ایک لمحہ اس کا

---

[1] میخانہ، عبدالنبی فخر الزمانی ص ۵۷۳، مطبوعہ لاہور　　[2] طبقات اکبری، نظام الدین احمد ص ۵۰۹ ج ۲

دامن نہیں چھوڑتیں۔ وہ اس کی تنہا سا ندیم اور رفیق ہوتی ہیں۔ وہ رفیق جن سے دھوکے کا کھٹکا نہیں۔ جن کی صحبت میں آدمی تنہا نہیں رہتا اور جن کی خاموشی گفتار ہمیشہ تر و تازہ رکھتی ہے۔ فیضی ایک جگہ کہتا ہے کہ میرے ذہن میں افکار کی جگمگاہٹ اور فنون کی نکتہ ریزی کا یہ عالم رہتا ہے گویا چھلنی میں سے ستارے چھن رہے ہیں۔ یہ جگمگاہٹ مفکر کے اندیشے کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس میں آفاقی حقیقت اور لازوال سچائی محفوظ ہوتی ہے جو اندیشے کو لازوال زندگی بخشتی ہے :

گروہ ز فنون نکتہ ریزی پرویزن سر ستارہ بیزی[1]

دوسری طرف سیاستدار کی ہستی ہے جو بھرپور انداز میں افتادہ آدم کے کرشمات کا مظہر ہوتی ہے۔ اس کے لئے زندگی عمل اور عمل زندگی کا نام ہے۔ ہر حادثہ اس کی زندگی کا حصہ ہوتا ہے۔ اس کے افکار شیریں کلمات اور نازک اصطلاحوں میں ڈھلنے کے بجائے ٹھوس حادثات کی شکل میں ظہور کرتے ہیں۔ وہ اپنی توانائی سے واقعات کی صورت اور حادثات کی سمت متعین کرتا ہے۔ اس کی زندگی لحظہ موجود کے ہنگاموں پر مرکوز ہوتی ہے اور نصب العین صرف یہ کہ ؎

حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

اس کی تدبیر اور کوشش کی آخری حد نوع بشر کے لئے امن و عافیت کی برقراری پر ختم ہوتی ہے۔ اور اس حد تک رسائی کے لئے ایک آہنی ارادہ اس کے پاس ہوتا ہے۔ مشکلات سے پنجہ آزمائی کرتا ہے اور ایک ہمت عالی جو طوفانی دریا کی طرح موجزن اور بے قرار رہتی ہے۔ شیخ ابوالفضل اپنے بارے میں کہتا ہے کہ میں نے اپنے لئے گفتار کا دروازہ بند اور کردار کا دروازہ کھلا پایا۔ "چوں در گفتار بستہ دیدم در گاہ کردار کشادہ یافتم"[2]

ابوالفضل ایک کامیاب مدبر اور انسانی مسایل کا زبردست دانشمند ہے۔ وہ پورا احساس رکھتا ہے کہ ملک گیری کے امور اور بہبودئ بشر کی راہ میں عمل اور عقیدہ دونوں کی درستی اور دیانت لازم ہے۔ اس کے بغیر ایک قدم بھی صحیح نہیں ہوتا۔ محض انصاف کے ذریعہ معاشرہ خلل سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ خلق خدا عدل و داد کے بغیر عافیت کا منہ نہیں دیکھتی۔ خود غرضی اور خود پرستی اور تنگ نظری ایسے سنگین وزن ہیں جن سے معاشرے کے رشتے میں ہمیشہ کھنچاؤ اور حد سے زیادہ تناؤ پیدا ہوتا ہے۔ اور آخر یہی وزن رسی کو توڑ بھی دیتے ہیں۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ عملی امور کی پیچیدگی کہاں انسان کو راہ راست سے ہٹا دیتی ہے اور کہاں ٹھوکر کھلاتی ہے۔ وہ انفرادی لغزشوں سے درگذر کا قایل ہے اور کبھی افراد کو سرزنش کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ اس کا دل فرد کے لئے رحم و کرم کے احساس سے لبریز ہے۔ ایک موقع پر کہتا ہے: "آدمی زاد معجونے است از مستی و ہشیاری سرشتہ"[3]

اکبر نامے کے صفحات میں کہیں بھی شخصی نفرت اور ذاتی دشمنی کا اظہار نہیں ہونے دیتا۔ وہ حریفوں کے مقابلے میں اپنے مرتبے کی بلندی اپنی طاقت اور اپنی بے پناہ استعداد پر پورا اعتماد رکھتا ہے کہ ذرا سی شکایت اور ملال اور افسردگی اس کے لہجے سے معلوم نہیں ہوتی۔ اس کو بھرپور بھروسہ ہے کہ میرے قلم کی ہلکی سی ضرب بڑے سے بڑے محاذ کا شیرازہ بکھیر دے گی۔ وہ بغیر کسی کی طرف اشارہ کئے، ایک نظر میں اپنے حریفوں کا جائزہ لیتا ہے۔ ان پر ایک لمبی سی حقارت کی نظر ڈالتا ہے اور سرسری سی بات کہہ کے گذر جاتا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے: الحمد اللہ گیتی خدیو کی دوربینی اور ژرف نگاہی کا نتیجہ یہ ہے کہ "بد گوہران طمع اندوز آج کس کساد بازاری کا شکار ہیں۔ پھر کہتا ہے: "دو کانچۂ ریا و بازار چہ تزویر کساد یافتہ"[4]

شاہنشاہیت کے نظام کی ہزار کوتاہیوں میں ایک یہ بھی ہے کہ آدمی کی شخصی استعداد، دانشمندی، تدبر اور برجستہ کارنامے کوئی اہمیت اور وزن نہیں رکھتے جب تک ایک فرد واحد یعنی بادشاہ کے نام کا کلمہ نہ پڑھا جائے۔ یہی وہ علت ہے جو مشرق کے عمومی کردار میں آزاد خیالی کا گلا گھونٹ کر چاپلوسی، حیلہ سازی اور روباہ بازی کی صفات کو داخل کرتی ہے۔ ابوالفضل بھی خوشامد پر اترتا ہے تو جی بھر کے حق ادا کرتا ہے۔

---

[1] اکبر نامہ ص ۳ ج اول مقدمہ
[2] اکبر نامہ ص ۱۱۰۷ ج ۲
[3] اکبر نامہ ص ۳۶۶ ج ۲

البتہ خوب جانتا ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور لب و لہجہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آستین کی آڑ میں مسکرا رہا ہے۔ کہتا ہے: "لوگ مجھے خوشامدی کہیں گے کہ نوکر ہوں اس لیے آقا کی قصیدہ خوانی کر رہا ہوں۔ کاش نوکر نہ ہوتا پھر دکھاتا"[1] کہ میرا قلم اس برگزیدۂ الٰہی کے کمالات صوری و معنوی کی تعریف میں کیا گل افشانی کرتا ہے: "کاشکے در سلک ملازمان ظاہر منسلک نگشتمے تا ہر چہ گفتمے و نوشتمے ظاہر بینان کور باطن این کس را از گروہ خوشامد گویان ندانستندے"[2]

ابوالفضل کی شخصیت کا باریک نکتہ یہ ہے کہ ظاہری طمطراق کے پردے میں ایک فنکار کی روح مصروف عمل نظر آتی ہے۔ اس کا ذہن امور سیاسی میں مبتلا رہنے کے باوجود تخلیقی عمل سے غافل نہیں ہوتا۔ فنکار کی یہ عادت ہوتی ہے کہ عرصۂ امروز کی رستاخیز میں رہنے کے باوجود اپنے کو ابدیت میں گم کئے رہتا ہے اور بقول معروف جریدۂ عالم پر اپنے نام کا نقش دوام کندہ کرنے کی آرزو اسے ایک لمحہ عافیت اور چین نہیں دیتی۔ اس زاویۂ نظر سے ابوالفضل کو دیکھیے۔ اس کو اقتدار کی آخری بلندی نصیب تھی۔ اکبر کا ہر شخصی اقدام اس کے مشورے کا رہین تھا۔ امور سلطنت کی ہر گرہ اس کے اشارے سے کھلتی تھی۔ دارالوزارہ میں اس کی زبان کا ہر جملہ قول فیصل کا حکم رکھتا تھا۔ اس کا گھر خاص و عام کی نگاہوں کا مرکز اور اہل حاجت کی سب سے بڑی آماجگاہ تھا۔ قدرت نے اس کے جسم کو خستگی ناپذیر توانائی بخشی تھی۔ اس کے فرائض منصبی میں فوج کی سپہ سالاری اور جنگی مہمات کے کام بھی شامل تھے۔ بظاہر اس کی سیمابی شخصیت دیوان خاص سے لے کر لشکر گاہ کے خیمے تک ہر جگہ نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود شیخ کا قلم اکبر نامے کی تالیف میں مشغول ہے۔ یہ کاوش اس کی غیر معمولی استعداد کا زبردست ثبوت ہے۔ اکبر نامے کا ہر جملہ اس بات کی شہادت ہے کہ شیخ ابوالفضل پیدائشی طور سے ایک اہل قلم اور فنکار تھا جس کو اتفاقات کی دستبرد نے علم و تحقیق کے گوشۂ عزلت سے نکال کر دربار سیاست اور ماحول سلطنت کے ہنگاموں میں جا پھینکا۔

اکبر نامہ شیخ کے سیاسی اور اخلاقی افکار کا ایک صحیفہ ہے جس میں زندگی کے نشیب و فراز کا ہر منظر موجود ہے۔ وہ کتاب کے ابتدائی حصے میں جہانبانی کے اصول ہشتگانہ پیش کرتا ہے اور ان اصولوں کو مثالی مملکت کی اساس اور ضمانت قرار دیتا ہے: "اول بخت بلند، دوم ہمت ارجمند، سوم قدرت کشورکشائی، چہارم ملک داری، پنجم کوشش در معموری بلاد، ششم صرف نیت بر فاہیت عباد، ہفتم خوش دل ساختن سپاہی، ہشتم ضبط ایشان از تباہی"۔ شیخ کا دعویٰ ہے کہ یہ آٹھ اصول ملحوظ رکھے جائیں تو یقیناً خلق خدا کے لئے امن، آسودگی، آسایش اور خوشحالی فراہم کی جا سکتی ہے۔ مسلمانوں میں مثالی مملکت کا تصور خلافت راشدہ کے ساتھ وابستہ ہے جس کو خلافت الٰہیہ کا لقب دیا گیا، مگر وہ تیئیس برس سے آگے نہ چل سکی۔ اس کے بعد دو راستے تھے۔ ایک یونان کے سیاسی عقاید اور مغربی رومۃ الکبریٰ کے قوانین و روایات کی راہ جس تک مسلمانوں کی رسائی نہ ہو سکی۔ دوسری ایران اور بازنطین کا نظام شاہنشاہیت جس کو انھوں نے اختیار کر لیا۔ ابتدا میں کچھ آوازیں جو قیصر و کسریٰ کی سنت اختیار کرنے کے خلاف بلند ہوئیں خاموش کر دی گئیں۔ بلاشبہ یہ ایک خونی راستہ تھا جس پر چلنے کی پاداش میں مسلمانوں کی تاریخ بقول شخصے قصاب کی دوکان کا نقشہ بن گئی۔ شاہنشاہیت کا ادارہ ایک فرد واحد یعنی بادشاہ کے گرد وجود میں آتا ہے۔ بادشاہ کی ذات قدیم ایرانی عقاید کے مطابق "فرِ الٰہی" و "شکوہ ایزدی" کا مظہر تھی۔ ابوالفضل ان اصطلاحوں کو بار بار استعمال کرتا ہے۔ یا شبان اور گلہ بان کی تشبیہات جو رعیت اور بادشاہ کا رابطہ ظاہر کرنے کے لئے مروج تھیں اکبر نامے میں تکرار کے ساتھ ملتی ہیں۔ وہ شاہنشاہیت کے نظام کا دل کھول کے حامی ہے اور ایک سیاسی علمداری کی حیثیت سے اس کے نفاذ اور استحکام میں اپنی پوری قوت لگا دیتا ہے۔ ایک جگہ کہتا ہے: "بادشاہی را با ضیائی نسبت داده اند"[3]

---

[1] اکبر نامہ ص ۲۴۰ ج ۲ [2] اکبر نامہ ص ۱۱۸ ج ۱ [3] اکبر نامہ ص ۲۳۲ ج ۲

شیخ کے نزدیک بادشاہ کی اولین ذمہ داری اور سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ: "آسودگیٔ رعایا و ترفیہ حال زیردستان و شکستہ پایان" کی خاطر اپنی پوری کوشش اور جان لگائے رہے۔ اس کے ذہن میں رعایا کی آسودگی کا تصور ایک مرکزی نکتہ ہے جو اس کے ہر اقدام کی رہنمائی کرتا ہے۔ وہ بار بار تاکید کے ساتھ کہتا ہے کہ عوام اللہ کی امانت ہیں: "بدایع و دایع حضرت جہان آفرین اند"[51] البتہ یہ بھی اصرار کرتا ہے کہ امور ملکی اور مسائل جہانبانی میں جمہور کی رائے اور جماعتی اقدام پر کبھی زیادہ اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ لوگ: "گمساں دو کانچہ حلوائی اند"[52]

ابوالفضل کی نظر میں مجموعی طور پر جہانبانی اور حکمرانی کے دو مقصد ہیں: "تا درمیان خلایق سربلندی حاصل آید و موجب گردآوری رضائے ایزدی گردد"[53] حکومت گویا خدا کی خوشنودی اور بندوں کے درمیان بزرگی حاصل کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ اہل اقتدار کے عمل کا معیار یہ ہے کہ خدا کی خلقت سچے دل سے خود داران کی عزت کرے۔ شیخ نصیحت کرتا ہے کہ اہل اقتدار کو چاہئے کہ ان دو نکتوں کو دستور العمل قرار دیں۔

ایک مدبر کی حیثیت سے ابوالفضل کا شایستہ کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کے دیرینہ اخلاقی نظریات کو ہندوستان کی سیاست پر لاگو کرنے کی تدبیر نکالی اور بادشاہ کو ایک عملی تجربے کی طرف توجہ دلائی۔ مسلمان مفکرین بہت پہلے سے اس عقیدے کا اظہار کرتے آئے تھے کہ اجتماعی تعمیر کی ہر کوشش باہمی اعتماد کے بغیر بیکار اور ہر انسانی ادارہ خلوص و یگانگت کی بنیاد کے بغیر خلل پذیر ہوتا ہے ع گر بنائے محبت کہ خالی از خلل است۔ ہم کہہ سکتے ہیں اور اکبر نامے کا مطالعہ اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ ابوالفضل پہلا آدمی ہے جس کے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ فقط طاقت کا استعمال کسی پائیدار نتیجے پر نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے افکار کی بدولت سلاطین کی جنگجویانہ روش کروٹ بدلتی ہے اور عام مسلمانوں میں ہندوستان کو دارالحرب سمجھنے کا تصور اپنی جگہ سے جنبش کھاتا ہے۔ رفاہ عام اور بہبودیٔ کل کی ضمانت یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بلا امتیاز دین و مسلک خدا کی دی ہوئی نعمتوں میں شریک بنائیے۔ اور یہ کہ عوام کا تعاون جتنا زیادہ حاصل ہو، مملکت کی بنیاد اتنی ہی زیادہ مضبوط ہوگی۔ یہ تازہ عقیدہ صلح کل کے نام سے پیش کیا گیا: "ہمین عشق نہ کو زین صلح کل کردیم"۔ مسلمانوں کی اب تک کی کیفیت یہ تھی کہ ہندوستان کے بارے میں دارالحرب والے نظریے کو آسانی سے بدلنے کے لئے تیار نہ تھے۔ شیخ کو اس مشکل کا احساس تھا۔ کہتا ہے کہ کلمۂ حق اکثر تلخ ہوتا ہے اور خلق سے نیچے نہیں اترتا: "کلمۂ حق بس تلخ باشد و در امزجہ و طبایع اکثر ناگوار می آید"[54] یہ دو عقیدے ایک دوسرے کے حریف کی حیثیت سے میدان میں موجود تھے۔ حالات کی صورت یہ ہوئی کہ نیا عقیدہ حکمت عملی کی شکل اختیار کرنے لگا۔ یہ حکمت عملی جن لوگوں کے ہاتھوں تشکیل پا رہی تھی ان کے خلاف اعتراضات کا طوفان ایک لازمی نتیجہ تھا۔ بدایونی ایک رات کا واقعہ بیان کرتا ہے کہ میں نے ابوالفضل سے پوچھا "آخر تمہارا کوئی دین و مذہب بھی ہے" اور اس نے جواب دیا کہ "میں تو ابھی تک الحاد کی وادی کا سیاح ہوں": "شبے با شیخ ابوالفضل مرا مجالست روی داد ..... پرسیدم کہ میل شما ازین مذاہب مشہورہ بکدام بیشتر باشد؟ گفت می خواہم روزے چند در وادی الحاد سیرے بکنم"[55]

شیخ اپنے ذہن میں ایک متحرک دنیا کا تصور رکھتا ہے جو بہت جلد بدلتی اور رنگ بدلتی چلی جا رہی ہے اور جس میں نہ خوشی رکتی ہے اور نہ غم ٹھہرتا ہے "نہ شادی را مجال ایستادن و نہ اندوہ را در آن رخصت اقامت"[56] اس کے سیاسی افکار کا ماحول اس اصول پر مرتب ہوتا ہے کہ دنیا کا ہر حادثہ انسانی علم اور تجربے کے خزانے میں ایک نقد اضافے کی حیثیت رکھتا ہے: "بر رسم مزید آگاہی و تنبیہ احرار است"[57] اب یہ احرار کی ذمہ داری ہے کہ آگاہی اور تنبیہ قبول کرنے میں ذرا بھی غافل نہ رہیں، مصائب اور محرومیوں سے عبرت حاصل کرکے نئے تعمیری منصوبے تشکیل کرنا اور خلق خدا کو فلاح و بہبودی کی طرف لے جانا "احرار" کا منصب ہے۔ شیخ کے نزدیک مثالی انسان وہ ہے جس کی ذات میں دو صفات یعنی "مردانگی و فرزانگی" باہم موجود ہوں۔ معاشرہ اپنے دوام و استحکام کی خاطر

---

[51] اکبرنامہ ص ۲۵۶ ج ۱
[52] ایضاً ص ۲۵۹ ج ۱
[53] ایضاً ص ۱۰۸ ج ۱
[54] ایضاً ص ۹۱ ج ۲
[55] منتخب ص ۲۶۲ ج ۲
[56] اکبرنامہ ص ۳۱۳ ج ۲
[57] اکبرنامہ ص ۱۲۵ ج ۱

ہر زمانے میں کچھ مثالی افراد کا محتاج ہوتا ہے۔ ابو الفضل اس مقصد کے لئے بار بار "مردانگی و فرزانگی" کے جامع خصایل پر زور دیتا ہے۔

دنیا کے سارے ہنگامے انسان کے باطنی تضاد اور جدلیت کا کرشمہ ہیں۔ "آدمی نژاد را دو امر غریب در نہاد است، اول طبیعت کہ تمیز دارد و دوم چشم عقل دوربین کاردشناس"[1] آدمی کی سیرت "نہاد" کے یہ دو "امر غریب" ہیں جس کی بدولت تاریخ کا تمام تماشا نظر آتا ہے۔ واقعات کو عرق ریزی کے ساتھ سمجھنے اور قلمبند کرنے کا مقصد شیخ کی نظر میں یہ ہے کہ انسانی شعور بیدا ہو، لوگ عبرت قبول کریں، زندگی کو ہشیاری سے گذاریں اور مجموعی طور پر نیک عمل کو نصب العین قرار دیں: "تا جویائے آگہی پذیرائے عبرت گشتہ بہ نیروئے بخت بیدار زندگانی را بہشیار دلی و نیک عملی سپری کند"[2]

اوپر کی سطریں ابو الفضل کی شخصیت اور افکار کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کرتی ہیں۔ مگر یہ جستجو رہی جاتی ہے کہ اس کی شخصیت کے خدوخال کس طرح مرتب ہوئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ الہام اور اثر قبول کرنے کے لئے تاریخ کی کون سی ہستیاں شیخ کی نظر میں رہی ہوں گی۔ اکبر نامے کی تدوین کے ضمن میں ایک جگہ ادبیات عرب سے وابستگی اور تبحر کا دعویٰ کرتا ہے اور نہایت معذرت کے لہجے میں کہتا ہے کہ دراصل مجھے عربی زبان کی عادت ہو گئی تھی۔ فقط اس کتاب کی تالیف کے سبب فارسی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ بدایونی کا قول اگرچہ بر سبیل شکایت ہے۔ مگر کم از کم ایک عرب فاضل سے ابو الفضل کے روابط کا ثبوت ضرور ہاتھ آتا ہے۔ وہ شیخ حسن علی موصلی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ: "چندگاہ شیخ ابو الفضل نیز خفیہ از و تعلیم فن ریاضی . . . و دقائق و غوامض علوم کسب کردہ با وجود این ہرگز بہ تعظیم او پیش نیامد"[3] یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ خود شیخ مبارک ہی عربی زبان کی مہارت میں کسی اہل کمال سے کم تھے۔ یہ قیاس سراسر عبث ہوگا کہ ابو الفضل نے محض خود ستائی اور فضیلت نمائی کی خاطر یہ کہہ دیا کہ: "آغاز آگہی بتازی زبان خوئے گرفت، زبان پارسی کمتر سرائیدے"[4] اکبر نامہ شیخ کے دعوے کی بولتی ہوئی شہادت ہے۔ یقین اس بات کا ہے کہ عرب مورخین کے آثار ضرور اس کی نظر میں رہے ہوں گے۔ کیا بعید ہے کہ اکبر نامے کی تالیف کے محرکات وہیں سے فراہم ہوئے ہوں۔ عربی نثر کا انتہائی قیمتی ذخیرہ مورخین کے آثار پر مشتمل ہے، ناممکن ہے کہ ابو الفضل جیسا ذہین آدمی، جو کہ بقول خود عربی زبان کی عادت بھی رکھتا ہو، عرب مورخین کے آثار سے متاثر ہوئے بغیر رہ جائے گا۔ شوق کے سمند ناز کو تازیانہ چاہیے دوسری بات یہ کہ مغل سلطنت کی ذمے داریوں کا بوجھ الگ مجبور کئے تھا کہ تقلید اور مثال کے لئے نظریں تاریخ کی نامور ہستیوں پر جمی رہیں۔ الفخری کے بیان کے مطابق وزیر کا عہدہ بنی عباس کے زمانے میں وجود میں آیا۔ یحییٰ برمکی پہلا بڑا وزیر ہے جس نے تدبر اور دانشمندی کی روایات کو قایم کیا۔ پھر نظام الملک طوسی کا نام ایک ضرب المثل بن گیا۔ اس کی کتاب "سیاست نامہ" اصول جہانبانی اور تدبیر ملکی پر ایک اہم دستاویز شمار کی جاتی ہے ان جملوں کا مقصد اس بات کا جایزہ لینا ہے کہ اخذ و اکتساب کے معاملے میں صاحب اکبر نامہ کا ذہن کم و بیش کہاں تک گیا ہوگا دراصل ابو الفضل کو سرسری نظر سے پڑھنے کے لئے بھی مہینوں کا وقت چاہیئے۔ کوئی اس کام پر ذرا سا جم جائے تب محسوس ہوتا ہے کہ شیخ کے آہنگ میں جگہ جگہ عرب و عجم کے بے شمار صناد ید کی آوازیں گونجتی ہیں۔ البتہ زبان کے اعتبار سے کمال کی بات یہ ہے کہ اکبر نامہ خالص فارسی نثر کا ایک نادر نمونہ ہے۔ عبارت کے ہر جملے میں عربی کلمات و ترکیبات کے بجائے قدیم پہلوی زبان کے لفظ اور بندشیں جڑاؤ نگینوں کی طرح چمکتے نظر آئیں گے۔ یہ اس کی ندرت پسند طبیعت کا کرشمہ تھا یا پھر فیضی کی صحبت کا فیض سمجھئے۔ اس لئے کہ بقول خود جو کچھ لکھتا تھا وہ برادر گرامی کو دکھاتا تھا اور برادر گرامی عبارت پر اصلاح دیتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ نادر اسلوب برادر گرامی کی خاطر دشوار پسند کا نتیجہ ہو: "تا سال دہم نگاہ بے برنگاشتہ ہیچمدان محفل دانائی فرمودند، لیکن ما آنچنانکہ دل آسمان پیوند ایشان تسلی داشت کہ زمانہ چنین نیرنگی نمود"[5]

---

[1] اکبر نامہ ص ۱۰۹ ج ۲
[2] اکبر نامہ ص ۱۹۵ ج ۱
[3] منتخب ص ۱۳۶ ج ۳
[4] اکبر نامہ ص ۳۷۶ ج ۲
[5] اکبر نامہ ص ۳۸۳ ج ۲

ہندی مسلمان کی تاریخ کا حیرت انگیز نکتہ یہ ہے کہ صدیوں کا جایزہ لیتے چلے جایئے فکر و عمل کے کسی میدان میں باوقار ہستیاں شاذ و نادر ہی ملیں گی۔ ادب کے ساتھ ملحوظ رہے کہ اس جایزے سے وہ بزرگ مستثنیٰ ہیں جن کے ناموں کے ساتھ زہد و عرفان اور کشف و کرامات کے کارنامے وابستہ ہیں۔ فطرت اپنی فیاضی کے اظہار میں زمان و مکان کی قید سے بالکل آزاد ہے۔ کرۂ ارض پر بے شمار ہرے بھرے نخلستان ہیں جہاں انسان تھوڑی سی جدوجہد میں زندگی کے ہر عیش اور فراوانی سے دامن بھر لیتا ہے اور ایسے خطے بھی نظر آتے ہیں۔ جہاں آدم کی اولاد کے لئے زندگی سراسر جہنم اور عذاب بنی ہوئی ہے۔ بیشتر مقامات پر آج تک آدمی اپنے تمام وحشیانہ خصایل کو تمدن کی ہلکی سی پوست کے نیچے چھپائے پھرتا ہے۔ اس وسیع پس منظر میں برصغیر کے مسلمان کی اجتماعی سیرت اور کارناموں پر نظر کیجیے۔ گستاخی نہ ہوگی اگر سوال کیا جائے کہ صدیوں تک معاشی وسایل کی زبردست فراوانی اور سیاسی استحکام کے باوجود یہاں وہ روایات کیوں نہ بن سکیں جو مثال کے طور پر ہسپانوی عربوں کے ہاتھوں تھوڑی مہلت میں قائم ہوگئیں۔ ترکستان میں سامانی خاندان کے اقتدار کی بدولت بخارا صدیوں تک علم و دانش کا مرکز بنا رہا۔ مصر میں فاطمی سلسلے کا استحکام الازہر کی تاسیس اور قاہرہ کی مرکزیت کا باعث بن گیا۔ ہندی مسلمانوں کو فطری طور سے دوسری فوقیت یہ حاصل تھی کہ اس برصغیر میں قدیم زمانے سے علمی اور فکری روایات موجود تھیں۔ یہ روایات بھی یہاں کے مسلمان نہ پکڑ سکے اور ان سے استفادہ یا تقلید کا سلسلہ بھی قایم نہ رہ پایا۔ سوال یہ ہے کہ وہ ابن سینا اور وہ ابن رشد جو بخارا اور اندلس میں پیدا ہوئے بالآخر دلی اور آگرہ اور لاہور میں کیوں نہ پیدا ہوئے۔ ہندی مسلمانوں میں امیر خسرو کے بعد فیضی اور ابوالفضل ہی ایسے افراد نظر آتے ہیں جن کے کردار و شمایل میں ذرا بہت تاریخ کے بڑے بڑے لوگوں کی جھلک ملتی ہے۔ حکمائے متقدمین کا وقار اگر کسی کے تیور میں نمایاں ہے تو وہ فیضی ہے۔ اس کی شخصیت میں علوم کے تنوع اور کمالات کی جامعیت کی وہی شان ہے جو قدیم مفکرین کی امتیازی صفت تھی۔ علمی انہماک میں سخت جفاکشی اور شدید عرق ریزی قرون وسطیٰ کے عالموں کا وصف تھا۔ فیضی نے اس میراث کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ سواطع الالہام اسی جفاکشی اور عرق ریزی کی عادت کا نتیجہ ہے۔ اس کی عجیب و غریب فکری تربیت اور توانائی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ایک نامعلوم سرعت کے ساتھ وہ شاعری سے حکمت اور حکمت سے الٰہیات و تفسیر کی متفاوت راہوں میں گھومتا پھرتا ہے اور جس میدان میں قدم رکھتا ہے وہاں تمکین و کمال کی یہ شان ہے کہ مولانا جامی کا قول ہر جگہ صادق نظر آتا ہے ؎

گر صحبت گل پیشہ کنی گل باشی

واقعہ یہ ہے کہ عظیم ہستیوں کے فقدان کا احساس اسی پہلے بھی موجود تھا۔ بدایونی نہایت سپاٹ زبان میں اس بات کا اقرار کرتا ہے: "از آں زمانے کہ بنائے اسلام در ہندوستان واقع شدہ، حق سبحانہ اعیان و اشراف ایں دیار را ہمیشہ رعیت، سرشت و مخکوم طبیعت و پست فطرت آفریدہ است..." پھر یہ کہ ان لوگوں میں وہ اعلیٰ درجے کا جنگی سلیقہ اور عسکری مزاج بھی پیدا نہیں ہوا جو مجموعی طور سے اسلامی ایشیا کی دوسری قوموں کا شعار ہے۔ تاریخ کی بڑی اور فیصلہ کن لڑائیاں صرف عربوں اور ترکوں نے لڑی ہیں۔ بدایونی کا خیال اس معاملہ میں بھی غلط نہیں ہے "جاہ و جلال و دولت ایشاں ہرگز بہ ضرب شمشیر نبودہ جذبہ تمزویر و دیگر و نفاق ذاتی و بدنامی..." ممکن ہے بدایونی کے نظریات میں تھوڑا بہت مبالغہ ہو۔ وہ ایک شدید رجحان کا آدمی تھا۔ پھر بھی یہ غور کرنے کے قابل ہیں: "جامۂ سروری و سرداری بر قامت ہمت ایشاں کوتاہ آمدہ است"[۱] ابوالفضل نہایت متین اور سنجیدہ آدمی ہے وہ بھی احتیاط سے اسی قسم کے اشارے کرتا ہے۔ شیخ کی نظر اس طبقے کی طرف گئی جو مدد معاش کی مفت خوری کا عادی تھا: "اگرچہ ایں گروہ در ہر ملکے باشند و ہیچ اقلیمے ازیں طائفہ خالی نباشد، اما در ولایت ہندوستان از ہمہ جا بیشتر اند"[۲] (مسلسل)

۱۔ منتخب ... ص ۲۹۶ ج ۲
۲۔ اکبر نامہ ص ۲۷۸ ج ۳

ڈاکٹر سید محمد عقیل

اُردو میں ہمزہ کا استعمال

مقالہ نگار ہندوستان کی الٰہ آباد یونیورسٹی سے متعلق ہیں۔ انھوں نے اردو میں ہمزہ کے استعمال کے مسئلے پر ہندوستان میں اردو کی صورت حال کے حوالے سے بحث کی ہے مگر اردو الفاظ کی مروجہ ہیئت کو بدلنے کے حامی پاکستان میں بھی موجود ہیں اور یہ بحث ان کے لئے بھی مفید ہے ——— مدیر

علی گڑھ کے ایک اردو تعلیمی سیمنار میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ اردو میں ہمزہ کا استعمال بے معنی اور فضول ہوتا ہے۔ روایتی لکھنے والے اپنی پرانی عادت کے مطابق اس حرف کو لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی کہی گئی کہ ہمزہ کا کام صرف کسرہ یا 'ی' سے لیا جا سکتا ہے لیکن روایتی طور پر لکھنے والے ایک طرف ہمزہ کا استعمال کرتے ہیں اور دوسری طرف 'ی' میں نقطے بھی لگاتے ہیں۔ اس بات کی تحریک ان چند ہوشیار اور لسانیات سے واقفیت رکھنے والے ہندوؤں نے کی جو حال ہی میں امریکہ سے صوتیات (PHONOLOGY) کی تربیت حاصل کر کے آئے ہیں۔ اپنی بحث میں انھوں نے ہجوں اور آوازوں کی ساخت کے متعلق بہت سے فارمولے بھی بیان کئے اور زبان کو سائنٹفک ڈھنگ سے پڑھانے کا مطالبہ بھی کیا۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سی باتیں اردو والوں کے لئے بالکل نئی تھیں اور کارآمد بھی۔ طرز تعلیم میں صوتی آہنگ، زیر و بم، لفظوں کے اتار چڑھاؤ سے عبارت میں جو ایک حسن پیدا ہوتا ہے ان سب باریکیوں اور خوبیوں سے باخبر معلم طریقہ تعلیم کو نہ صرف کارآمد بلکہ اور دلچسپ بنا سکتا ہے لیکن اردو طرز تحریر سے ہمزہ کو الگ کر دینے سے اور بہت سی صوتی، تحریری اور مخرج کی الجھنیں پیدا ہو جائیں گی۔ ان دانشمندوں نے ان کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔

یہ درست ہے کہ اردو کے حروف تہجی کا نظام صوتی ترتیب پر قائم نہیں ہے اور اگر اسے صوتی ترتیب پر کسی طرح لے آیا جائے تو مبتدیوں کے لئے شاید کچھ تعلیمی آسانیاں بھی نکل آئیں لیکن ہمزہ کو نکال دینے پر بعض لفظوں کو صحیح طور پر لکھنا اور انھیں آوازوں کے ساتھ، جو کہ ان کے تلفظ کی [illegible] آوازیں ہیں، پڑھنا تقریباً ناممکن ہو جائے گا اور خاص طور پر شعر میں ایسے الفاظ نظم کرتے وقت صوتی آہنگ اور وزن کے قیام دونوں میں سخت مشکل پیش آئے گی۔ عربی زبان میں ہمزہ کا استعمال جس طرح ہوتا ہے اس کا بدل تو ممکن ہی نہیں لیکن اردو میں بھی یہ دقت کثرتاً اسی طرح کی ہوگی۔

عربی میں ہمزہ کی واضح صورتوں کا استعمال دو طریقوں پر ہوتا ہے۔ پہلا طریقہ بندشی POLOSIVE CONSONANT کا ہے اور دوسرا حلق بندقی آوازوں GLOTTAL STOP کا[1] لیکن اردو میں ہمزہ کا کام مصوتہ کا ہے جو کبھی ایک اور کبھی جڑواں مصوتہ DIPTHONGIC استعمال ہوتا ہے۔ ہمزہ القاطع کا استعمال اسی لئے تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ ایسی صورتوں میں اسے بالکل عربی [illegible] آواز اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اکثر پرانی اردو میں ایسے نمونے بھی ملتے ہیں جب ہمزہ القاطع اضافت کے لئے بھی لکھا جاتا تھا جیسے خلفائے اسلام کے بجائے خلفاء اسلام بھی لکھ دیا جاتا تھا۔ ہمزہ کی اس کثرت استعمال

(1) The Phonetics of Arabic by W. H. T. Gaindar P. 30-31, 1925 Edition.

نے اردو کی رسم تحریر میں اختصار اور ایک خاص صوتی آہنگ پیدا کر دیا ہے جو نہ عربی میں ہے اور نہ اُسے چھوڑ کر اردو والے اپنی عبارت میں وہ صوتی حسن پیدا کر سکیں گے اور بعض لفظوں نے تو ایسی مرکب صورتیں اختیار کر لی ہیں کہ ہمزہ سے دست بردار ہو کر ہم الفاظ سے ہی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ یہ صورت اگر کسی بہتر تبدیلی کے لئے ہوتی تو چنداں برا نہ تھا کیونکہ الفاظ صوتیاتی اور لسانی تاریخ کے طویل و عریض سفر میں برابر بنتے بگڑتے رہتے ہیں لیکن اپنا بہتر بدل لا کر زبان کے مزاج اور چلن کو وہ صورت اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں جس میں سہل انگاری کے ساتھ ساتھ حسنِ صرف اور خوبیٔ آواز بھی شامل ہوتی ہے لیکن جدید صورتیں جو ہمزہ کے بغیر تجویز کی جا رہی ہیں وہ شاید زبان اور الفاظ اور زبان کے ارتقا یعنی جانے پہچانے راستوں پر گامزن نہیں ہوتیں جن سے لسانی اور صوتی تغیرات مانوس ہیں۔

جو لوگ ہمزہ کے استعمال کے حق میں نہیں ان کا کہنا ہے کہ ہم عملی طور پر ہمزہ کے بغیر کام چلا سکتے ہیں۔ الفاظ کو آواز کی حرکت اور سیلیبل SYLLABLES کے نقاط قاطع سے الگ کر کے تحریری شکلوں میں لا کر مثال کے طور پر مسئلہ کو مس الا یا مس ال لکھیں گے اور سیاق و سباق سے صحیح پڑھ لیں گے (کیونکہ اسے MISS ALLAH پڑھ لینے کے بھی امکانات ہیں)۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمزہ کے استعمال کے بغیر لکھنؤ، مئو، کیکئی، پئے، سیتا پور (ضلع اناؤ کا پرانا نام)، عجائب، امرأ القیس، اناؤ، گھڑکائے، بہرائچ، خانۂ خدا (خانۂ خدا کہاں ہے)، ہیئت، زائرانِ حرم، لاؤ (اس میں واؤ کی خفیف آواز کا اظہار)، آؤ (اس میں واؤ کی الگ دو ٹکڑوں کی آواز کا اظہار)، آئینہ (دو آوازوں کے ساتھ)، منارۂ عظمت اور اسی طرح کے بہت سے الفاظ بغیر اپنی ہمزہ کی ترکیبوں کے نہیں لکھے جا سکتے۔ اس طرح کہ ان کی وہی صوت و آہنگ باقی رہے لیکن جو لوگ ہمزہ کے استعمال کے منکر ہیں وہ ایسے تمام الفاظ کو حسب ذیل طریقوں پر لکھنے کو تیار ہیں۔ نئے طرزِ تحریر میں (ہمزہ کے بغیر) متذکرہ بالا الفاظ اس طرح لکھے جائیں گے:

لکھنؤ = (۱) لکھ ناؤ (۲) لکھ نَ اُو

مئو = (۱) مَا ؤ (۲) مَ اُو (پہلا طریقہ قدیم اردو میں رائج تھا بعد کو متروک ہو گیا)[1]

کیکئی = (۱) کے کیَی (۲) کے۔ کَ۔ ای

پئے = (۱) پہ اے (۲) پ۔ اے

سیتا پور = (۱) سیے پور (جو یقیناً सीपर پڑھا جائے گا) (۲) سَ اِے پور

اناؤ = (۱) اُنا او (۲) اُن نَ او (حالانکہ آخری ہجے میں واؤ اور ہمزہ کی ملی ہوئی آواز برقرار نہیں رہ جاتی)

گھڑکائے = (۱) گھڑ کاے (۲) گھڑ کا یے (घड़काये)

بہرائچ = (۱) بہرا اِچ (۲) بہرایچ (बहरायच)

خانۂ خدا = (۱) خانہ اے خدا (۲) خانا اے خدا (۳) خانا ے خدا (۴) خانہ یے خدا (ख्वानायखुदा) (ख्वानायेखुदा)

ہیئت = (۱) ہے اَت (۲) ہے یت (جو صحیح تلفظ جاننے والے پڑھتے بھی ہیں) (۳) ہا اِے یت (۴) ہَ اِے یت

زائرانِ حرم = (۱) زا اِے رانِ حرم (۲) زا یرانِ حرم (जायरानेहरम)

لاؤ = (۱) لا و (واؤ کی خفیف آواز اور یکبارگی رُک جانے کے ساتھ) (۲) لا اُو (واؤ کی کھینچی ہوئی آواز)، اسی طرح آؤ کو بھی سمجھنا چاہیئے۔

---

[1] انھیں اعراب بالحروف لکھتے تھے جیسے پو، تاریں، پت کے بیچ کی کو واؤ سے ظاہر کرنا (دکنی لکھنا تھا)، لاکی بھی پیش یہاں زبر کو واؤ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی طرح اُس کی صورتیں یوں ہیں جیسے طریقے کی یوں پہنچتی کی بجائے پہنتی، جیوت تا بجائے پہنتا، ہیئت تا بجائے جیتنا (ملاحظہ ہو مقدمہ کربل کتھا ۱۹۶۵ء مرتبہ مالک رام اور مختار الدین، ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ)

آئینہ = (۱) آ اِی نا (۲) آیئ نا (۳) آ ئی نا (دونوں طرح کی آوازوں میں)

(۱) ؎ آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب و تب کی تاب ...
(۲) ؎ آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی

منارۂ عظمت = (۱) منارہ ے عظمت (۲) منارہ یے عظمت

ان میں سے اکثر الفاظ اور ترکیبوں کو جدید طریقے میں، اگر نظم کی صورت میں لکھا گیا تو تمام عروضی پابندیاں جس میں حسنِ قوافی، زحافات اور لفظی اسقام جیسے شکست ناروا وغیرہ شامل ہوں گے، برقرار نہیں رہ سکتیں۔ بحر کے ساتھ صوتی ہم آہنگی بھی باقی نہ رہے گی۔ اسی کے ساتھ ساتھ الفاظ پر صحیح اعراب کی یادداشت از بسکہ ضروری ہوگی جس کی پہلے اردو میں کبھی نہیں کی گئی اور پھر مختلف اوقات میں مختلف ہجے ان الفاظ کے لئے بھی لکھنے پڑیں گے جنھیں ہم ایک ہی طرح لکھ کر حسب موقع دونوں طرح پڑھ لیتے ہیں۔ مثال کے لئے ایک شعر لیا جاتا ہے ؎

کہا بڑھ کے الیاس نے آؤ آؤ بڑھانے لگے خضرِ منت کی ناؤ

یہ شعر دراصل بحرِ متقارب میں ہے اور اس کے ارکان فعولن۔ فعولن۔ فعولن۔ فعَل رفعولُ ہوتے ہیں۔ نئے طرز تحریر میں اس کے ارکان فعولن۔ فعولن۔ فعولن۔ فعولن بھی ہوں گے۔ حرف کی حرکت، سکون اور کشش کا احساس ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ اوپر ایک جگہ ہمزہ ساکن ہے جبکہ دوسری جگہ متحرک ہو جاتی ہے۔ دراصل واؤ میں اس کی آواز کے ساتھ ہمزہ کی خفیف صوتی کیفیت شامل ہے جو جدید طریقے میں ادا ہی نہیں ہو سکتی جب تک کہ اسے آؤ (आओ) نہ لکھا جائے اور اس طرح فعول رفعَل پھر فعولن میں تبدیل ہو جائے گا۔ اسی طرح ؎ 'ہاں اب بھی جو منارۂ عظمت ہے وہ حسین' کو دو طریقوں کو پڑھنا پڑے گا۔

(۱) ہاں اب بھی جو منارا ے عظمت ہے وہ حسین (جیسے عام طور پڑھنے والے منارے عظمت (मिनारए अज़मत) پڑھیں گے)۔
(۲) ہاں اب بھی جو منارہ ے عظمت ہے وہ حسینؑ (جیسے عام پڑھنے والا جس کو ہمزہ کے خفیف صوتی آہنگ کی مزاولت بھی نہ رہ جائے گی मिनार ए (منار ے) پڑھے گا)۔ (۳) ہاں اب بھی جو منارے عظمت ہے وہ حسینؑ۔ ایک صورت یہ بھی ہے (جیسے عام پڑھنے والا मनारा न پڑھے گا)۔ کچھ مصرعوں میں نہ یہ صورت پیدا ہو جائے گی اور ان کے معنی بالکل مختلف ہو جائیں گے مثال کے طور پر چند مصرعے ہمزہ کے ساتھ اور بغیر ہمزہ کے استعمال سے دیکھئے اور ان کے معانی پر غور کیجئے

؎ گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں
؎ ہم کو منظور تنگ ظرفیِ منصور نہیں
؎ دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
؎ وصل زنگار رخِ آئینۂ حسنِ یقیں

انھیں بالترتیب یوں لکھیں گے

؎ گفتا ے غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں	(اے! غالب)
؎ ہم کو منظور تنگ ظرفی اے منصور نہیں	(اے! منصور)
؎ دہر جز جلوہ ے یکتائی اے معشوق نہیں	(اے! معشوق)
؎ وصل زنگار رخ آئی نہ ے حسن یقیں	(اے! حسن یقیں)

ان مصرعوں کے مطالب میں بغیر ہمزہ کے استعمال کے کیا تبدیلی ہوگئی یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ اردو کے لب ولہجے سے واقف شخص ایک نظر ڈال کر سمجھ سکتا ہے۔

کچھ الفاظ ایسے ہیں جنھیں ہمزہ ہٹا کر ی سے کام چلانے کا مشورہ ہے۔ ایسے الفاظ کے تلفظ تبدیل ہو جانے کا غلط حد تک امکان ہے (حالانکہ اردو والوں نے بہت سے الفاظ کے تلفظ بدلے ہیں لیکن یہ صورتیں کثرتِ استعمال سے خود ہی بدلتی گئیں) جیسے آئینہ لکھنے کی جو مختلف صورتیں اوپر بتائی گئیں ان میں ایک صورت 'آیینہ' ہے۔ اسے کو منقوط اس لئے کرنا پڑے گا کہ کہیں 'آیے' 'نا' نہیں 'آئے' کے مترادف نہ ہو جائے۔ ساتھ ہی ساتھ آئینہ میں خفیف 'ی' کی آواز کو واضح کرنے کے لئے بھی۔ اسی طرح ہیئت، چاہیئے، خانۂ خدا کو بالترتیب ایسے تلفظ کے ساتھ لوگ پڑھنا شروع کر دیں گے۔

आयेना ، चाह ये (چاہیے) हैयत ، खाना ये खुदा

یہ درست ہے کہ اکثر لوگ اب بھی ایسے کچھ الفاظ اسی طرح پڑھتے ہیں لیکن انھیں ویسا ہی سمجھنا چاہیئے جیسے کچھ لوگ انگریزی صوت A کو یے اور ای پڑھتے ہیں۔ یہاں یہ واضح رہے کہ ہیئت اور چاہیئے کی ہمزہ میں اور ی کی ملی جلی آواز شامل ہے۔ ایک طرح کی DIPTHONGIC آواز جیسے 'چاہیئے' یا 'چاہئے' کی تحریروں سے واضح نہیں کیا جا سکتا۔ لکھنے کی یہ صورتیں ہیں کہ "بہ قدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل" کو "بہ قدر شوق نہیں ظرف تنگ نا اے غزل" لکھیں گی جسے ایک طرف تو قاری ندائیہ پڑھے گا اور دوسری طرف ہمزہ کے استعمال کی نیرنگیوں سے بے خبر ہو کر गजल नज़र आता (ता) پڑھے گا یعنی 'تنگنائے' کے بعد سے غزل کی 'غ' تک جو ایک لپیٹ دار تنائی کی آواز ہے اسے چھوڑ کر 'تنگ نا' سے آواز کا سلسلہ توڑ دے گا اور ہمزہ کی آواز کو الگ الف کی رکاوٹی آواز میں بدل دے گا یا پھر اس کو गजल नाये आता پڑھ پڑھ کر ہندی والوں کی طرح اردو میں واؤ عطف کو بھی 'واؤ بالاعلان' عادتاً پڑھنے لگے گا۔

ہر زبان کی تحریری تاریخ میں ایسی صوتی ناہم آہنگی کی کچھ مثالیں ضرور ملتی ہیں۔ بلکہ پہلوی اور چند کردی قبائل کی تو ایسی زبانیں بھی ہیں جو لکھی تو دوسری طرح جاتی ہیں لیکن پڑھنے میں ان کا تلفظ بالکل دوسرا ہوتا ہے۔ غیر مشتق زبانوں کے گروہ میں جہاں کوئی اصول نہیں بلکہ الفاظ کے ذخیروں کی یادداشت ہی زبان کی تاریخ کے مسافر کو آگے بڑھا سکتی ہے، وہاں علاقائی اثرات صوتی غیر ہم آہنگی سے کیا کیا تبدیلیاں پیدا کرتے ہوں گے؟ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی، طرزِ تحریر اصول صوت کا زیادہ پابند نہیں چنانچہ (کاؤ) اور (لو)، (بٹ) اور (پٹ) ایسے صوتی تغیرات ہیں جن کی تبدیلیوں کی وجہ بیں معلم حیرت زدہ طالب علموں کو نہیں سمجھا سکتا۔ لیکن یہاں "آئینہ" سے "ڈرنا" طرزِ کہن پہ اڑنا" والی بات نہیں سمجھنا چاہیئے۔ اگر بغیر کسی نقصان اور تحریری پیچیدگیوں کو بڑھانے ہوئے زبان صوتی آہنگ کے لحاظ سے ضبطِ تحریر میں آ سکے تو بہت اچھا ہے۔ پرانے لکھنے والے بھی بہت سی بے جا غلطیاں کرتے رہتے ہیں 'بُکئے' خالی ہمزہ سے لکھا جا سکتا ہے۔ اسے مان لینا چاہیئے 'ے' میں نقطے لگانے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اکثر لوگ بائے ہوز اور دوچشمی ہے کے صوتی آہنگ کا خیال نہ کر کے 'کہا' 'بچانے' کو 'کھا' 'بچانے' لکھتے ہیں۔ 'یہاں' بجائے 'جہاں' لکھتے ہیں۔ کئی کئی لفظ ایک ساتھ ملا کر لکھنے کا رواج آج تک چلا ہی جاتا ہے جبکہ بہت سے الفاظ مل کر عجب دھوکا پیدا کرتے ہیں۔ کچھ لوگ 'ہے' دوچشمی ہے سے لکھتے ہیں اور پھر اس کے نیچے 'ہے' کا لکھی بھی لگاتے ہیں 'ہے' اس شکل میں (میں خود بھی غلطی کبھی کبھی کرتا ہوں) اس لئے تعمیری اور ممکن العمل تبدیلیوں کو مان لینا چاہیئے لیکن محض توڑ مروڑ سے گتھیوں کو اور الجھا دینا کوئی دانائی کی بات نہ ہوگی۔ ہمزہ کے استعمال کو ترک کرنے سے مشکلات اور بڑھ جاتی ہیں، حل نہیں ہوتیں۔

جدید طرزِ تحریر جو ہمزہ کو ہٹا کر مختلف صورتیں لفظوں کی بنائے گا، علاوہ ان تحریری اور صوتی مشکلات کے جن کا تذکرہ اوپر کیا گیا، چند اور دقتیں پیدا کرتا ہے۔ اس ترکیب تحریر سے ایک جدید تحریر میں لایا ہوا لفظ، تین تین الفاظ کی جگہ گھیرے گا۔ ان لوگوں کے لئے جو ٹائپ میں لکھنے پر قادر نہیں، اس طریقۂ تحریر میں متعدد بار قلم اٹھانے سے وقت کا صرف بھی کافی ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کشمکش میں اردو کی ملاحت کا حسن بھی

ختم ہو جائے اور ایک وقت وہ آئے کہ ہر حرف الگ الگ ہو کر اپنی ملاوٹ کا اصول ہی فراموش کر دے۔ پھر ایسی زبان کے لئے جس کی اشاعت، طباعت اور قوتِ خرید میں انگریزی اور ہندی جیسا اژدحام بھی نہیں۔ وقت اور کاغذ کے کثرتِ استعمال کا خرچ کیوں برداشت کیا جائے گا کیونکہ پبلشر اپنے خرچ اور منافع پر نظر رکھتا ہے اردو کی اشاعت یا رسم تحریر سے اسے کم دلچسپی یا بالکل دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہی نہیں بلکہ پھر اُردو کو جس کی اشاعت روز بروز رہتی ایک مسئلہ بنتی جاتی ہے اس طرزِ تحریر کے لئے کاتب (اگر مصنف کو ٹائپ پسند نہیں اور زیادہ تر مصنفین اور قارئین ایسے ہی ہوتے ہیں) تربیت کرنے پڑیں گے، جو اس طرزِ املا و انشا سے واقف ہوں۔ بچوں کو پڑھانے کے لئے عام معلم نہیں بلکہ اصولِ صوتیات کے ماہر پروفیسر تلاش کرنے ہوں گے جو سب کے بس کا کام نہیں۔ اپنے بچوں کو دو چار روپے دے کر اس دور میں ایک غیر منافع بخش زبان پڑھانے والا فرد نہ اس کا دماغ رکھتا ہے اور نہ وسعت (کیونکہ زبانی بغیر لوگوں کے پڑھے ہوئے صرف اصولوں کی بنیاد پر نہیں پڑھتی)، اور اس طرح املا و انشا کا طریقہ صرف مدرسہ اور طریقۂ تعلیم کا مسئلہ نہیں رہ جاتا بلکہ معاشی اور اقتصادی مسئلہ بھی بن جاتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب اس نئی طرزِ تعلیم سے واقف ہو کر لوگ نکلیں گے تو پرانا طریقہ املا و انشا خود بخود ختم ہوتا جائے گا۔ دوسری زبانوں کے لئے یہ خیال شاید صحیح ہو (حالانکہ امریکی طرزِ تحریر آج تک ہجے کے معاملے میں انگریزی دنیا کو زیادہ متاثر نہیں کر سکی) لیکن اُردو جس دور سے ہندوستان میں گذر رہی ہے۔ وہاں سکول میں اردو کی معمولی تعلیم کا تو ٹھیک انتظام ہوتا نہیں۔ بھلا یہ سائنٹفک لسانی اصول کون سکھائے گا (ابھی تک جو کتابیں پاکستان سے چھپی ہیں ان میں بھی ایسی رسمِ تحریر دیکھنے میں نہیں آئی جہاں اردو کے لئے یہ مجبوریاں اور دقتیں نہیں ہیں)۔

اردو میں اس طریقۂ جدید کی ترویج و تبلیغ کی کوشش خاص اس وقت پر غالباً اس مسئلے سے شروع ہوتی ہے جو آج کل دو چار غیر ملکی طالب علم کبھی کبھی بھولے بھٹکے اردو پڑھنے آ جاتے ہیں اور جو عام طور پر ایسی یورپی زبانوں کے بولنے والے ہوتے ہیں جن کا رسمِ خط اور زبان کا گینڈا زیادہ سائنٹفک سمجھا جاتا ہے۔ ہندی والوں نے بھی اپنے طرزِ لفظ کو تبدیل کیا ہے لیکن ہم اردو والوں کا مسئلہ بالکل مختلف ہے۔ یہ کہاں کی عقلمندی ہوگی کہ چند غیر ملکی طلبا کی آسانی کی خاطر اپنے ملکی محبانِ اردو کو آسانیوں سے محروم کر دیا جائے جو وقت، معاشیات اور اقتصادیات کی کشاکش نے ان کو محدود طریقے پہلے رکھی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ رسمِ تحریر جس کی ایک روایت رہی ہے اور جو اپنا سلسلہ آج بھی دور دور سے ملائے ہے اس کے ڈھانچے کو بھی متزلزل کر دیا جائے۔ ترقی کی راہیں نکالنا بڑی اچھی بات ہے لیکن ترقی کے ایسے راستے جو اور مشکلوں میں پھنسا دیں انھیں صرف ایڈونچر سمجھنا چاہیئے اور اردو جس منزل سے گزر رہی ہے اسے اپنی روایات چھوڑ کر ایڈونچر کرنے کا ہرگز موقع نہیں جس ڈھرے پر وہ چل رہی ہے فی الحال وہی اس کے لئے سب بہتر اور سیدھا راستہ ہے۔

اسی بحث کے ساتھ ایک سوال اور اٹھتا ہے۔ دنیا میں اس رسمِ خط کے جاننے والے جس میں اردو لکھی جاتی ہے، جزیرۂ عرب کے علاوہ مراقش، مصر، تیونس، الجیریا، سوڈان، سومالی لینڈ، زنجبار، لبنان، شام، عراق، افغانستان، ایران، کردستان، ملایا، جاوا، روس کے چند حصے، اسرائیل اور چین کے کچھ حصے ہیں۔ سب کی رسمِ تحریر کم و بیش یہی ہے۔ ابھی تک ایران[1] و عرب کے چھاپے خانوں سے جو کتابیں شائع ہو کر آ رہی ہیں وہ بھی تقریباً اسی طرزِ املا و انشا کے ساتھ ہیں۔ تو کیا ہمارے ہمزہ کو چھوڑ دینے سے تمام ملک جو سامی رسمِ خط لکھتے ہیں اپنا رسمِ خط بدل دیں گے؟ اگر نہیں تو ہم اپنے بچوں پر سامی علوم کے دروازے بند کر دیں گے (مصری رجحان کی تبدیلی نئی بات نہیں ہے) یا پھر بچوں کو ہمزہ کا استعمال بھی بتایا جائے اور جدید طرزِ انشا بھی جو اتنا آسان کام نہیں جتنی آسانی سے سوچا جاتا ہے۔ کیونکہ جدید طرزِ انشا اور املا کا عادی آسانی کے ساتھ نہ تو ان تحریرات کو پڑھ سکے گا اور نہ ان الفاظ

[1] ایران میں بھی ایک مرتبہ ہمزہ ہٹانے کی تحریک چلی تھی مگر کامیاب نہیں ہوئی۔

کی صحیح صوتی آہنگ کو اپنی ذہنی گرفت میں لے سکے گا۔

وہ ایک دشواریوں کی طرف اور توجہ کر لینی چاہیئے۔ نئے طرزِ انشا میں مروجہ اعراب کے ساتھ ساتھ بہت سے صوتی اعراب کو بھی پابندی کے ساتھ استعمال کرنا ہوگا۔ مثلاً کہاں ہی کی آواز کو کھینچ کر پڑھنا ہے اور کہاں نہیں۔ کہاں حرف ساکن ہے اور کہاں متحرک۔ "کیکئی" لکھنے کے لئے شک کہ "اِیْ" لکھا جائے گا اگر کہ میدہ زیر نہ لگاؤ متحرک اور ساکن حرفوں پر علامت دیکھنے کا عادی اسے ساکن سمجھ بیٹھے گا اور بجز کیک ای پڑھ لینے کے بھی امکانات ہیں (یہ درست ہے کہ موقع استعمال کچھ مدد کرے گا مگر ہمیشہ نہیں) اور اس طرح ایک طرف تو لفظوں کا تلفظ بگڑے گا اور دوسری طرف کتاب کا صفحہ اعراب سے اس قدر بوجھل ہوگا کہ عبارت سے زیادہ نقش و نگار نظر آئیں گے۔ اردو میں پہلے بھی کچھ کتابیں جزم اور مد، سکون و حرکت کے نشانوں کے ساتھ چھپتی تھیں لیکن چھپائی اس قدر بھدی اور بدنما ہو جاتی تھی کہ لوگوں نے اس طریقے کو چھوڑ دیا۔ پھر اردو میں ابھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو الفاظ کے صحیح اعراب سے زیادہ واقف نہیں بلکہ بغیر اعراب لگے الفاظ کو صحیح جانئیے ٹھیک پڑھ لیتا ہے اور ان الفاظ کو نہ جاننے والا کھتا تو اسی مروجہ طریقے سے ہے لیکن پڑھتا اس طرح ہے جس آواز کے ساتھ لفظ اس کی زبان پر چڑھا ہے۔ اب جب کہ ہمزہ کو ہٹا کر اس کی آواز کو اعراب سے ظاہر کرنا ہوگا تو لامحالہ دوسرے الفاظ کو بھی لکھنے والا معرب کرنے لگے گا اور اس طرح لفظوں کے غلط اصوات جو اس کی زبان پر چڑھے ہیں اسی آواز میں معرب ہو جائیں گے۔ ایسی صورت میں اردو الفاظ کے صوتی، نحوی اور تحریری نظام میں غلطیاں بے انتہا ہونے لگیں گی اور ایک غلط قسم کا جاہلانہ تغیر بھی رونما ہوگا۔ ہمزہ یا کسرہ کے خفیف صوتی تغیر کی کیفیت سامانیاں ختم ہو جائیں گی اور اردو میں بھی بعض الفاظ کے نہ لکھ سکنے کی مجبوری پیدا ہو سکتی ہے۔

اسی طرح ہمزہ کو ہٹا کر اس کو مختلف قسم سے صوتی آہنگ کی بنیاد پر لکھنے کی کوشش کرنا کسی خوشگوار تبدیلی کی بشارت نہیں۔ اردو کے حروف اور اعراب، اس کے صوتی، صرفی اور ترکیبی نظام میں کوئی گڑبڑی پیدا نہیں کرتے۔ جو لوگ زبان کی اور صورتوں کو برداشت کرتے ہیں وہ محض اس لئے اردو زبان کو سیکھنے سے پرہیز نہیں کریں گے کہ انہیں ہمزہ کا وجود بیکار اور لکھنے میں مشکل معلوم ہوتا ہے اور اردو کے طالب علم سے یہ امید کرنا کہ وہ ماہر علم زبان اور علم صوت ضرور بن جائے گا اور تب اسے ہمزہ کا مصرف بیکار اور مشکل معلوم ہوگا، اردو والوں کی موجودہ محدود توقعات سے بہت آگے سوچنا ہے ۔۔۔ اتنا آگے کہ جب یہ بھی نہیں بتایا جا سکتا کہ زبان کیا ہو گی۔

ڈاکٹر شوکت جہاں تیموری

ہمارا تہذیبی ورثہ

برصغیر پاکستان وہند تاریخ عالم میں تہذیب وتمدن کے قدیم گہواروں میں شمار ہوتا ہے۔ چین اور مصر کی طرح اس کے تہذیبی کارنامے بھی ماضی کے دھندلکوں میں ہزاروں سال کی تاریخ میں جھلکتے ہیں۔ موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے آثار بتاتے ہیں کہ آج سے کم وبیش پانچ ہزار سال پہلے جو لوگ ان بستیوں میں آباد تھے ان میں اجتماعی زندگی کا شعور پوری طرح موجود تھا۔ وہ زراعت پیشہ تھے اور صنعت وحرفت کو بھی انھوں نے جلا بخشی تھی۔ ان میں لوہار بھی تھے اور سنار بھی اور وہ صناع بھی جو آج سے پانچ ہزار سال پہلے کی حسیناؤں کی زینت وآرائش کے لیے سونے، چاندی، تانبے اور ہاتھی دانت کے زیورات اور دیگر لوازم تیار کرتے تھے۔ ان میں رقاص بھی تھے اور مصور بھی۔ ان کی بنائی ہوئی رقاصاؤں کی مورتیاں اور مہروں پر کھدے ہوئے نقوش ان کی فن کاری کی سند ہیں۔ ان کی کوزہ گری ایک اعلیٰ تہذیبی دور کی ترجمان ہے۔ ان کی بستیوں اور مکانوں کی ترتیب تعمیر، شہر میں پانی کے نکاس کے لئے زمین دوز نالیاں اور نالے۔ اجتماعی تقریبات کے لئے بڑے بڑے کمرے اور تالاب اس دور کی مکمل تہذیب کی یادگار ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ابھی تک تسلی بخش طور پر وادی سندھ کی تہذیب کا رسم الخط پڑھا نہیں جاسکا اور بہت سے آثار قدیمہ ابھی دریافت کے منتظر ہیں۔ اگر ہمارے حالات نے اجازت دی اور بازیافت کا یہ تحقیقی سلسلہ شروع ہوا تو مزید انکشافات کا پورا امکان ہے۔

وادی سندھ کی تہذیب کے وارث وہ آریا تھے جو برصغیر میں آج سے کوئی چار ہزار سال پہلے داخل ہوئے۔ ان کے تہذیبی کمالات کا اندازہ ان ویدوں سے ہوتا ہے جن کی ابتدائی تدوین کوئی ساڑھے تین ہزار سال پہلے شروع ہوئی اور صدیوں تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ نو وارد آریا وادی سندھ وپنجاب سے گزر کر گنگا اور جمنا کے دوآبہ تک پہنچ گئے اور یہ مدھ دیش ان کی تہذیب وثقافت کا مرکز قرار پایا۔ یہی آریائی تہذیب ہے جو برصغیر کی تہذیب وثقافت کی اساس وبنیاد ہے۔ آریوں کے بعد مختلف وقفوں کے لئے اور بیرونی تہذیبی اثرات نے بھی اس تہذیب وثقافت کے پروان چڑھانے میں حصہ لیا ہے۔ مثلاً سکندر اعظم کے حملے کے بعد جب برصغیر کے شمال اور شمال مغربی علاقوں میں کچھ عرصے کے لئے یونانی سرداروں کی حکومت قائم رہی اور ان کے تہذیبی اثرات نے مقامی عناصر میں دخل پایا تو اس ہندی تہذیب وثقافت کو یونانی ثقافت کی آمیزش وآویزش سے توانائی وتقویت نصیب ہوئی۔ یونانیوں کا یہ سیاسی اقتدار دیرپا نہ تھا لیکن ان کے تہذیبی اثرات بڑے نتیجہ خیز اور دوررس ثابت ہوئے۔ آج بھی سوات اور کافرستان، گلگت اور آس پاس کے علاقوں میں آثار قدیمہ کی دریافت کے لئے کھدائی ہوئی ہے اس سے ان یونانی اثرات کی تصدیق ہوتی ہے۔ خاص طور پر مجسمہ سازی میں یونانی اثر صاف جھلکتا ہے۔

برصغیر پاکستان وہند کی تہذیب وثقافت کی تاریخ میں مسلمانوں کی آمد غالباً سب سے اہم واقعہ ہے۔ پچھلے ایک ہزار سال میں اس تہذیب ثقافت کو جو فروغ نصیب ہوا ہے وہ ان ہی مسلمانوں کا رہین منت ہے۔ مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات سندھ سے لے کر دہلی میں مسلمانوں کی سلطنت قائم

حکومت کے مستقل قیام اور استحکام تک یہ اثرات آہستہ آہستہ یہاں کی تہذیبی زندگی میں سرایت کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ مغلوں کے دور میں یہ اثرات ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی ہند اسلامی تہذیب کے انتہائی عروج کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ یہ تہذیب نہ خالص ہندوانہ ہے نہ خالص اسلامی بلکہ دو تہذیبوں اور ثقافتوں کی صحت مند آمیزش کا نتیجہ ہے۔ یہی تہذیب و ثقافت ہمارا تہذیبی ورثہ ہے اور اسی کا مطالعہ ہماری تہذیب و معاشرت کا تاریخی مطالعہ ہے۔ اس طرح کی مختلف تہذیبوں اور معاشرتوں کی آمیزش ارادی اور جبری نہیں ہوا کرتی۔ اس کی رفتار ابتدا میں سست ہوتی ہے۔ بعض ادوار ایسے آتے ہیں جب سیاسی اثرات اس رفتار کو تیز کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی اس تبدیلی اور آمیزش سے گریز اور احتیاط کی تحریکیں بھی زور پکڑتی ہیں اور ثقافتی تبدیلیوں کا رُخ موڑنے یا قدیم تہذیب کی طرف رجعت کرنے کا جذبہ بھی بیدار ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ تحریکات اور جذبات دیرپا نہیں ہوتے اور نہ اس قوت کا مقابلہ کر سکتے ہیں جو نئی جنم لیتی ہوئی تہذیب میں موجود ہوتی ہے۔ اسے تعصب سے زیر نہیں کیا جا سکتا، نہ رجعت پسندی اس کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روک سکتی ہے، نہ ماتم کرنے والوں کے نوحے اس کو متاثر کر سکتے ہیں۔ تبدیلی اور تبدیلی سے توانائی حاصل کرنا تہذیب کا مزاج ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں بعض بنیادی اختلافات کے باوصف برصغیر پاکستان و ہند میں ایک ایسی تہذیب نے جنم لیا جس میں دونوں کے تہذیبی عناصر اور عوامل کارفرما تھے۔

ان عوامل کا تجزیہ کرنے کے لئے ہند و مسلم ثقافت کے بعض بنیادی اختلافات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ ان میں سب سے اہم اور بنیادی عنصر مذہب ہے۔ ہندو مذہب کثرت پرستی اور اصنام پرستی کا مذہب ہے۔ دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش سے بڑھ کر جانوروں، درختوں اور حشرات الارض تک کی پرستش جزو مذہب ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام کی بنیاد عقیدۂ توحید پر ہے اور اصنام پرستی کی اس میں کوئی گنجائش نہیں۔ ہندو مذہب میں برہمنوں کا ایک طبقہ اس مذہب کا اجارہ دار ہے اور بغیر ان کے واسطے اور وسیلے کے کسی زندہ انسان کی دعا اور عبادت مقبول نہیں ہو سکتی اور نہ کسی مردے کے نجات کی توقع ہو سکتی ہے۔ بتوں اور مورتیوں کے لئے ایک پُراسرار ماحول پیدا کرنے کی کوشش میں ہندو مندروں کی تعمیر میں اس کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا کہ جگہ تنگ و تاریک ہو اور روشنی کا گزر یا تو بالکل نہ ہو یا اس طرح ہو کہ نیم تاریکی یا نیم روشنی کی آنکھ مچولی میں پوری فضا پُراسرار بن جائے اور پھر ان مندروں کے پجاری جو قربانیاں اور چڑھاوے وصول کر کے اسے دیوتاؤں اور دیویوں کی خدمت میں پیش کرتے تھے انسانوں کے ان گھروں کے نگہبان سمجھے جاتے تھے لیکن نگہبانی کی بجائے یہ اپنی قیام گاہوں کو اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے اڈے بنا لیتے تھے۔ غرض ہندو مندر اپنے فن تعمیر کے اعتبار سے ایک قسم کی بند بند، گھٹی گھٹی فضا پیش کرتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی مساجد جو عام داخلے کے لئے کھلی ہوتی ہیں، در اصل مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کے ایک سماجی مرکز کا کام دیتی ہیں۔ نماز باجماعت کے لئے جو مسلمان ان مسجدوں میں جمع ہوتے ہیں وہ روزانہ پانچ وقت آپس میں ملتے اور تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ ہر مسجد میں ایک درمیانی گنبد ہوتا ہے اور اس کے چاروں طرف دالان ہوتے ہیں اور ایک بڑا حصہ بطور کشادہ صحن اس میں شامل ہوتا ہے۔ فراخی، کشادگی، روشنی مسجد کے فن تعمیر کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ ان کی خوبصورتی مورتیوں اور بتوں کی مرہون منت نہیں ہوتی، بلکہ ان کا حسن سادہ اور پُرشکوہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ بلند مینار ہوتے ہیں جن پر مؤذن پانچ وقت خدا کے نیک بندوں کو نماز اور صلاح و فلاح کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہے۔ چونکہ مسجد مسلمانوں کے فن تعمیر میں ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے اس لئے مساجد کی تعمیر کے فن نے بالعموم مسلمانوں کے فن تعمیر کو متاثر کیا ہے۔ محرابیں، گنبد، مینار وغیرہ ایسی امتیازی خصوصیات ہیں جو ایک ہی نظر میں مسلمانوں کی تعمیر کردہ عمارات کو غیر مسلم تعمیرات سے ممیز و ممتاز کر دیتی ہیں۔

عمارتوں کی اندرونی تزئین و آرائش کے لئے نقش و نگار سے کام لینے کا رواج بہت قدیم ہے۔ انسانی تاریخ کے ابتدائی ادوار میں جب انسان

قدرتی غاروں میں رہتا تھا اور مکان بنانے کا فن اس نے نہیں سیکھا تھا۔ وہ ان قدرتی غاروں کو سادہ نقوش سے مزین کرتا تھا۔ یہ نقوش اپنی اولین صورت میں عہد حجری میں ملتے ہیں اور اس طرح ان کے آغاز کی تاریخ بیس کم و بیش بیس ہزار قبل مسیح قرار پائی ہے۔ اس قسم کے نقوش میں اریگنا کے نمونے قابل ذکر ہیں جو فرانس میں واقع اس نام کے غار سے منسوب ہیں۔ اسی دور میں آہستہ آہستہ ہڈیوں اور پتھروں سے بنائے ہوئے چھوٹے چھوٹے مجسمے بھی ملنے لگتے ہیں۔ غرض صناعی کے اس فن نے جس قدر ترقی کی، اس کا ایک اندازہ ان یونانی مجسموں سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ جو آج تک دنیا کے عجائب خانوں اپنے فن کاروں کی صلاحیتوں کی شہادت دے رہے ہیں۔ مسلمان نہ شبیہ پرست ہو سکتے ہیں اور نہ بت گر اس لئے ان کی عمارتوں کی تعمیر میں تزئین و آرائش کے دیگر ذرائع اور وسائل مہیا اور استعمال کئے گئے ہیں۔ مثلاً بجائے انسانوں اور جانوروں کی شبیہیں اور مجسمے تیار کرنے کے مسلمان صناعوں اور فن کاروں نے گلکاری کے فن کو ترقی دی اور اسے اس معراج کمال کو پہنچایا جس کا ایک نمونہ تاج محل کی لاثانی اور لافانی گلکاری میں موجود ہے۔ صنعت کاری اور پچی کاری کے فنون کا ارتقا مسلمانوں کے اسی ذوق جمال کی تسکین کی راہیں تلاش کرنے کا مرہون منت ہے۔ اسی طرح مسجدوں، مقبروں اور دوسری یادگار عمارتوں آیات قرآنی کندہ کرنے یا اجاگر لکھنے کے فنون کو ترقی ہوئی جو مسلمانوں کے فن خطاطی کی ترقی کا ایک پہلو ہے۔ مسلمانوں نے اپنے ابتدائی دور میں مصوری کی طرف توجہ نہیں کی لیکن اس کی کمی انہوں نے خطاطی میں کمال حاصل کر کے پوری کر دی۔ خطاطی کی تاریخ میں کوئی دوسری قوم اس فن میں مسلمانوں کے مقابلہ کا دعویٰ نہیں کر سکتی اور ایران و ہندوستان کے مشہور خطاطوں کی لکھی ہوئی وصلیاں، قطعات، کتابیں اور متفرق تحریریں آج بھی ہیروں کے مول بکتی ہیں۔ افسوس ہے کہ طباعت کے جدید میکانیکی ذرائع نے مسلمانوں کے اس قدیم فن کو بڑا صدمہ پہنچایا ہے۔ اب اس کے فن کار جن کو اپنے اسلاف سے کوئی نسبت نہیں، سسک رہے ہیں اور شاید اس نسل کے ساتھ ہی یہ فن بھی رخصت ہو جائے گا لیکن اپنی چودہ سو سالہ تاریخ میں مسلمانوں نے اس میں جن کمالات کا اظہار کیا وہ کتب خانوں اور عجائب گھروں میں مستقبل کے نقادانِ فن کی دلچسپی اور توصیف کا مرکز رہیں گے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کا تہذیبی فرق اور بھی بہت سی چیزوں میں نمایاں ہے۔ ان میں سب سے اہم ذات پات کی تمیز ہے جو ہندو سوسائٹی کی اساس ہے اور جس کے لئے مسلمانوں میں کوئی گنجائش نہیں۔ اگرچہ آریوں کے ہندوستان میں داخلہ سے پہلے ذاتوں کی واضح تقسیم کا پتہ نہیں چلتا اور ہندوستان میں داخلہ کے بعد بھی آہستہ آہستہ تقسیم صرف تقسیم کار کے اصولوں پر مبنی تھی لیکن رفتہ رفتہ برہمن، چھتری، ویش اور شودر ایسی سماجی اکائیاں بن گئے جو ایک ہی ملک کے باشندے ہونے اور ایک ساتھ رہنے سہنے کے باوجود ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ شودروں کا تو ذکر ہی کیا ہے ان کا وجود مطلق ناپاک تھا۔ خود چھتری اور ویش، برہمنوں سے نیچے درجے کی مخلوق سمجھے جاتے تھے اس لئے برہمنوں کو ہی سماج میں سب سے بلند مرتبہ حاصل تھا۔ چھتریوں کا فریضہ دفاع اور جنگی خدمت گذاری تھا۔ ویش، زراعت، تجارت اور کاروبار کے ذمہ دار تھے اس لئے صرف برہمن ہی علوم و فنون کے سرپرست بن سکتے تھے۔ اور یہ روایت اس حد تک بڑھی کہ بالآخر وہی آریوں کی مقدس زبان سنسکرت کے محافظ اور امین قرار پائے برہمنوں نے صدیوں کی کوششوں سے اپنی اس اجارہ داری کو مضبوط سے مضبوط تر بنایا لیکن اس کا نتیجہ تھا کہ بہت جلد سنسکرت زبان ایک زندہ اور بولی جانے والی زبان کی حیثیت سے ختم ہو گئی اور اس کی جگہ ان پراکرتوں نے لے لی جو عوامی بولیاں تھیں اور جن پر آگے چل کر برصغیر پاک و ہند کی جدید ہند آریائی زبانوں اور بولیوں کی بنیاد رکھی جانے والی تھی۔ ان حالات کے برعکس مسلمانوں میں ذات پات کی اس طرح کی کوئی تفریق نہ تھی۔ قرآن حکیم میں مسلمانوں سے صاف کہا گیا ہے کہ بزرگی اور بڑائی کا اصلی معیار تقویٰ اور نیکی ہے اور اللہ کے نزدیک وہی سب سے بڑا ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ انسانیت اور اخوت، مساوات اور برابری کی اسلامی تعلیم محض کتابی نہ تھی مسلمانوں نے عملاً اسے اپنے قول و فعل سے ثابت کیا تھا چنانچہ خود برصغیر پاک و ہند کی ابتدائی تاریخ میں پہلی باقاعدہ سلطنت قائم ہوئی تو اکثر ان لوگوں کو بادشاہت

اور حکومت سونپی گئی جو غلام تھے اور ان ہی کی نسبت سے اس خاندان کو جو اصلاً نسلاً ترک خاندان تھا، غلام خاندان کہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر صاحب اقتدار بنے تھے۔ مسلمانوں میں آزادی اور مساوات کی یہی روح تھی جو اُن کے تہذیبی مزاج کی ایک بڑی پہچان ہے۔ شاعری ہو یا ادب کی کوئی دوسری صنف، فن تعمیر ہو یا خطاطی، مسلمانوں کا آرٹ ان کی اجتماعی کوششوں کا مرہونِ منت ہے اس لیے اس میں زندگی کی ایسی وسعت، ہمہ گیری، اور ولولہ پایا جاتا ہے جو انسانیت کو خانوں میں تقسیم کرنے سے کمزور پڑ جاتا ہے اور فنی تخلیقات کو محدود اور بے اثر بنا دیتا ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہذیبی فرق کو ظاہر کرنے کے لئے کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندو گائے کی پرستش کرتا ہے اور مسلمان اسی گائے کو ذبح کر کے کھا جاتا ہے۔ اگرچہ ہندوؤں میں بھی جانوروں خصوصاً بیل اور گھوڑے کی قربانی کا پتہ چلتا ہے اور ابتدائی ویدک دور میں اس کا رواج موجود تھا لیکن آگے چل کر ہندو بنیادی طور پر ایک سبزی خور قوم بن گئے تھے۔ مسلمانوں میں گوشت خوری کا رواج عام تھا اس لئے قدرتی طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کھانوں اور ان کے آب و رنگ میں بہت فرق پیدا ہو گیا۔ اگرچہ اسلام میں صرف ایک احتیاط لازمی ہے کہ جن چیزوں کو واضح طور پر حرام قرار دیا گیا ہے ان سے پرہیز کیا جائے لیکن اس کے علاوہ ان کو دنیائی نعمتوں سے پوری طرح متمتع ہونے کی اجازت دی گئی ہے اور قرآن حکیم میں اجازت ہے کہ کھاؤ پیو ہاں اسراف نہ کرو۔ اس کھانے پینے کے سلسلے میں مسلمانوں نے اسے بھی ایک فن بنا دیا تھا۔ مسلمانوں کے دور میں روٹی، چاول اور گوشت سے تیار ہونے والے ہزاروں کھانے تیار ہو گئے کہ ان کی لطافت اور نفاست اب صرف ادبی دستاویزوں میں باقی رہ گئی ہے اور جن کی تفصیل کا پتہ لغت کی کتابوں میں بھی نہیں چلتا۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ اس تہذیبی ورثہ کو محفوظ کر لیا جائے ورنہ کچھ زمانہ اور گزر گیا تو پھر ان کی تشریح اور توضیح کی کوئی اور صورت باقی نہ رہے گی۔

بابر کا وہ قول بہت مشہور ہے جو اس نے اپنی تزک میں اپنے عہد کے ہندوستان کی تہذیبی حالت کے بارے میں کہا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "اس ملک میں اچھے گھوڑے نہیں ہوتے، اچھے پھل نہیں ملتے، اچھے لباس کی طرف لوگوں کو توجہ نہیں، اچھی غذا اور کھانوں کا پتہ نہیں چلتا، ٹھنڈا پانی نہیں ملتا، سیب، انار، انگور نہیں ملتے۔" اس سلسلے میں بابر نے آخری بات بڑی پُر لطف کہی ہے۔ وہ لکھتا ہے "یہاں فانوس نہیں، شمع نہیں، شمعدان نہیں۔ لکڑی کا ایک ڈیوٹ ہوتا ہے جو شاہی محلسرا میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جب کبھی راجہ یا مہاراجہ کو قریب سے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے یہی ڈیوٹ اس کے سرہانے لا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ اس پر سرسوں کے تیل کا ایک چراغ روشن ہوتا ہے۔ بقول بابر اس کا دھواں اور بدبو دماغ پریشان کرنے کے لئے کافی ہے۔ برتنوں کا یہ حال تھا کہ عام طور پر لوگ درختوں کے پتوں پر کھا لیتے تھے۔ سبب اس کا یہ تھا کہ چھوت چھات کی وجہ سے جو برتن ایک مرتبہ استعمال ہو جائے اور جھوٹا ہو جائے اس کا دوبارہ استعمال ممکن نہ تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں کسی قسم کے قیمتی ظروف کا استعمال غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ مٹی کے چند برتن کافی سمجھے جاتے تھے جن کو استعمال کے بعد پھینک دیا جاتا تھا۔ مسلمانوں نے جہاں انواع و اقسام کے کھانوں کی ایجاد میں اپنے کمالات دکھائے وہاں ان کے کھانے کے لئے برتنوں اور متعلقہ سامان کو بھی رواج دیا اور اس اعتبار سے ہمارے اکثر و بیشتر ظروف استعمال کے ظروف مسلمانوں کے تہذیبی دور کی یادگار ہیں جن سے ان لوگوں کی نفاستِ طبع، سلیقے اور رکھ رکھاؤ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہی حال لباس کا تھا۔ کچھ یہاں کے موسم اور آب و ہوا کی وجہ سے اور کچھ اس وجہ سے کہ سیاسی یا تہذیبی اعتبار سے ایک مدت تک برصغیر پاک و ہند میں ایک قومی وحدت کا تصور بھی پیدا نہیں ہوا تھا، عام طور پر ایک لنگوٹی مردوں کے لئے کافی تھی اور عورتوں کے لئے ایک بغیر سلا کپڑا جو دھوتی یا ساڑھی کی طرح بدل پر لپیٹ لیا جاتا تھا۔ مسلمانوں نے لباس پر بھی ایسی توجہ کی اور اس میں ایسے ایجادات سے کام لیا کہ اسے بھی ایک فن بنا دیا۔ مسلمان

کاریگروں نے کپڑوں کی بہت سی نئی قسمیں رائج کیں۔ ان میں سے کچھ ایسے کپڑے تھے جو وہ ایران سے اپنے ساتھ لائے تھے لیکن بہت بڑی تعداد ایسے کپڑوں کی تھی جو انھوں نے اس ملک میں آکر رائج کیے۔ پورے ملک میں مسلمان کاریگروں کی بڑی بڑی بستیاں پھیلی ہوئی تھیں اور ان کی صناعی اس درجہ کی تھی کہ ان کے بنائے ہوئے کپڑے دور دراز ملکوں میں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے۔ غیر ملکی تجار جو یہاں آتے تھے یہاں کے گرم مصالحوں اور نیل کے ساتھ یہاں کے کپڑے بھی بطور سوغات لے جاتے تھے اور یورپ کے شاہی خاندانوں اور امراء کے محلوں میں منہ مانگے دام پاتے تھے۔ برطانوی دور اقتدار کے آغاز تک مسلمانوں کا یہ فن ترقی کرتا رہا لیکن یورپ میں کپڑا بننے کی کل ایجاد ہونے پر جب سستا کپڑا بننا شروع ہوا اور انگریزوں کو اپنی مصنوعات کے لئے منڈیوں کی تلاش شروع ہوئی تو ان صناعوں اور کاریگروں کو مٹانے کے لئے باضابطہ کوششیں کی گئیں اور اب یہ داستانیں تو اب بہت مشہور ہیں کہ ڈھاکہ کی ململ تیار کرنے والے کاریگروں کے ہاتھ قلم کر دیئے گئے۔ اس طرح اعلیٰ درجے کے کپڑے کے لئے بہت جلد برصغیر پاک و ہند کے لوگ یورپ کی سستی مصنوعات کے محتاج ہو گئے۔ اب یہ کپڑے کہیں کہیں عجائب گھروں میں ہی نظر آتے ہیں اور وہ بھی آزادی کے بعد بھارت میں رہ گئے ہیں۔ ہمارے قومی عجائب خانوں میں بھی ان کے نمونے باقی نہیں۔ ہاں زبان، شاعری اور ادب میں ان کے نام محفوظ ہیں اور شاید اسی ذریعے سے یہ تاریخ میں باقی رہیں گے۔

تہذیبی زندگی میں میلوں ٹھیلوں اور تہواروں کو بھی ایک نمایاں حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے بڑے تہوار صرف دو ہیں یعنی عیدین۔ ایک عید رمضان اور ایک عید قربان۔ یہ دونوں عیدیں مسلمانوں کے مذہبی نقطۂ نظر کی ترجمان ہیں کہ دونوں کا مقصد ایک فرض کی ادائیگی پر اظہار شکر اور اس کا اظہار مسرت ہے۔ عید رمضان سے پہلے خدا کے نیک بندے اس کے احکام کی تعمیل میں پورے ایک مہینہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک بغیر کھائے پیئے رہ کر تہذیب و تزکیۂ نفس کرتے ہیں۔ اسلام میں رہبانیت کی گنجائش نہیں اس لئے ترک دنیا اور فقر و فاقہ نہ مذہبی نقطۂ نظر سے اور نہ ثقافتی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کی زندگی میں داخل ہو سکتے ہیں لیکن رمضان کے تیس روزوں کا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی ہر طرح کی نعمتوں سے متمتع ہوتے ہیں۔ ان کو ایک طرف تو ان معمولی کھانے اور پینے کی نعمتوں کی اہمیت کا احساس ہو سکے تاکہ وہ ان نعمتوں کے مہیا کرنے والے کا شکر ادا کر سکیں۔ دوسری طرف ان میں کچھ احساس اس تکلیف اور تنگی کا بھی پیدا ہو سکے جو ان چیزوں کی محرومی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے تاکہ سماج میں جو لوگ زیادہ خوش قسمت نہیں ہیں ان کی تکالیف اور درد دکھ کا احساس انسان کو سماجی بہبود کے کاموں کی طرف متوجہ کرے۔ اسلام میں لازمی زکوٰۃ کا بھی مقصد یہی ہے اور خاص طور پر رمضان کا مبارک مہینہ ہی زکوٰۃ اور صدقات کی تقسیم کے لئے موزوں سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح یہ تقریب بنیادی طور پر اظہار شکر اور اعتراف کرم ہے اور عملی طور پر ایک ایسی اجتماعی تقریب جس میں چھوٹے بڑے، امیر غریب سب شریک ہوتے ہیں۔ اور جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں اور کرم ہے وہ اپنے حاجتمند بھائیوں کی اعانت اور استعانت کر کے انھیں بھی اس خوشی میں شریک ہونے کا موقع بخشتے ہیں۔

دوسری عید۔ عید قربان ہے جو ایک تاریخی واقعہ کی یادگار ہے۔ یہ واقعہ جو حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی سے متعلق ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو حکم ملتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کر دیں۔ یہ وقت بڑے ضبط، صبر و استقلال اور امتحان و آزمائش کا ہے کہ ایک بوڑھے باپ سے کہا جائے کہ وہ اپنے جوان بیٹے کو اپنے ہی ہاتھ سے قربان کر دے لیکن ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ خدا کے نیک بندوں میں تھے اور انھوں نے فرمان الٰہی کے سامنے سر جھکا دیا۔ لیکن اصل مقصد تو صرف ایمان کے استحکام کی آزمائش تھی جس میں دونوں باپ بیٹے پورے اترے۔ یہ اسی مبارک دن کی یادگار ہے کہ صاحب نصاب، صاحب استعداد مسلمان اس روز خدا کی راہ میں کوئی جانور قربان کرتے ہیں۔ خدا کو ان جانوروں کا گوشت پوست اور خون یا ہڈی نہیں پہنچتی بلکہ اس طرح قربانی کرنے

والے اپنے جذبۂ ایمانی کی تجدید کرتے ہیں اور اس طرح سنتِ ابراہیمی کو فروغ دیتے ہیں۔ ایثار اور قربانی کی یہی بنیادی رسم ہے جس کی تائید اور تجدید کی بکثرت مثالیں تاریخِ اسلام میں ملتی ہیں جن میں ایک واقعۂ کربلا بھی ہے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی قربانی کی اس مثال کو بے نظیر اور بے عدیل سمجھا جاتا ہے۔ خود برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی ہو یا ۱۹۴۷ء کا انقلاب، ٹیپو سلطان شہید کے معرکے ہوں، یا سراج الدولہ کی شہادت، بہادر شاہ ظفر ہوں یا مولانا محمد علی اور مولانا حسرت موہانی اس قربانی اور ایثار کی روایت کے نشانات مسلسل ملتے ہیں۔

تو یہ تو دو تہوار مسلمانوں کے مذہبی تہوار ہیں لیکن عام تہوار اور تقریبات مختلف ملکوں میں موسموں، فصلوں یا تاریخی واقعات کی یادگار کے طور پر منائے جاتے ہیں۔ ان میں سے سوائے ان تہواروں کے جو خالص غیر اسلامی تھے، مسلمانوں نے ہندی تہواروں اور تقریبوں میں بلا تکلف حصہ لیا اور انہیں اپنی معاشرت کا جزو بنا لیا۔ بلکہ ایسے تہوار جن میں ہندو دیویوں اور دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی، ان کی بھی پوجا کو چھوڑ کر تفریحی عنصر کو قبول کر لیا۔ ان تہواروں اور تقریبوں میں مسلمانوں کی شرکت کا اندازہ اردو ادب کی تاریخ سے بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اردو زبان خود بھی برصغیر میں ہندی اور اسلامی تہذیب کی آمیزش اور آویزش سے بروئے کار آئی تھی۔ حضرت امیر خسرو کی ابتدائی نصف ہندی اور نصف فارسی شاعری سے لے کر دکن میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام تک (جس میں مقامی تہواروں اور تقریبوں پر کئی نظمیں شامل ہیں) اور پھر نظیر اکبر آبادی کی کلیات میں اس کلچر کی بڑی نمایاں تصاویر موجود ہیں جس کو ہندمسلمانی (INDO MUSLIM) کلچر کا نام دیا جا سکتا ہے۔

یہ ہندمسلمانی کلچر مسلمانوں اور ہندوؤں کے کلچر کے میل جول اور ایک پر دوسرے کے عمل اور ردِ عمل کے طور پر پیدا ہوا لیکن خود مسلمانوں کے کلچر میں مختلف عناصر موجود تھے کیونکہ تمام مسلمان جو اس ملک میں کسی نہ کسی حیثیت سے پہنچے ہیں، ایک ہی شہر یا ملک کے رہنے والے نہ تھے اور نہ ایک وقت میں برصغیر میں داخل ہوئے تھے۔ محمد بن قاسم سے لے کر بابر تک فاتحین کا ایک طویل سلسلہ ہے جو اصلاً اور نسلاً ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں عرب بھی ہیں، ایرانی بھی، افغانی بھی، مغل بھی، اور ان میں ہر ایک اپنی ایک الگ کلچر اور ثقافت کا نقیب ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خالص مسلمانی کلچر بھی مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ البتہ درست ہے کہ اس تہذیب و ثقافت پر جسے مسلمانی کلچر کہہ سکتے ہیں، شباب اور نکھار مغلوں کے دورِ حکومت میں آتا ہے کیونکہ سیاسی اور تاریخی اعتبار سے بھی یہی دور ان کی حکومت اور سلطنت کے شباب اور عروج کا دور ہے۔ اس دور میں تان سین جیسا مغنی پیدا ہوتا ہے تاج محل جیسی عمارت تعمیر ہوتی ہے، دلی کا لال قلعہ، دیوان خاص، دیوان عام، لاہور کا شالامار باغ اور شاہی مسجد وجود میں آتے ہیں۔ اسی دور میں فارسی زبان مغلوں اور ایرانیوں کے کلچر کا سب سے بڑا نشان، اس ملک کی سرکاری، عدالتی اور تہذیبی زبان قرار پاتی ہے اور اسی دور میں مغلوں کی فیاضی اور سرپرستی کی داستانیں سن سن کر عالمِ اسلام سے اربابِ علم و فن کشاں کشاں دہلی چلے آتے ہیں اور بلاشبہ دہلی مرحوم کو فخر البلاد بنا دیتے ہیں۔ ان سے مسلمانوں کے فاتح کلچر کی چھاپ تو تہذیب و تمدن پر بھی لگ جاتی ہے اور دوسری طرف اس ملک میں رہتے رہتے میل ملاپ سے یہاں کے تمدن اور معاشرت سے مغائرت اور اجنبیت بہت جلد انس و محبت میں بدل جاتی ہے خاص طور پر اکبر کے دور سے جب ہندوؤں اور مسلمانوں میں سیاسی اور سماجی اتحاد بہت بڑھتا ہے اور ہندو شہزادیاں مغل حرم سرا میں داخل ہوتی ہیں تو یہ اثرات اور بھی زیادہ واضح اور نمایاں ہو جاتے ہیں چنانچہ ان ہی محلات میں وہ تہذیب جنم لیتی ہے جو دورِ آخر میں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت ہے جس میں مسلمانی اور ہندی دونوں عناصر شامل ہیں۔

مسلمانوں نے تو اس طرح کے تہذیبی اور ثقافتی میل ملاپ کو آسانی سے قبول کر لیا لیکن بدقسمتی سے ہندو اس ردِ عمل کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہندوؤں میں ذات پات اور چھوت چھات نے جو شدت اختیار کر لی تھی وہ عام سطح پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے مخلص تہذیبی میل ملاپ کے لئے بھی کوئی مفید صورت پیدا نہیں کر سکی۔ جو ہندو مسلمان کے ہاتھ کا کھانا نہ کھا سکے۔ اس برتن کو ناپاک سمجھے جسے مسلمان نے چھو لیا ہو، جو اپنے

کنویں سے مسلمان کو پانی نہ بھرنے دے، وہ ثقافتی اور تہذیبی ادغام کو کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ چنانچہ صدیوں کی کوششوں کے باوجود مسلمان اس ملک میں ایک مشترک کلچر اور ثقافت کی بنیادوں کو استوار نہ کر سکے۔ انھوں نے اپنی زبان (عربی۔ ترکی۔ فارسی) کو چھوڑ کر یہاں کی اردو، اور دوسری علاقائی زبانوں کو اختیار کر لیا، اپنے لباس اور وضع قطع میں وہ ہندی کہلانے لگے۔ ان کے تہواروں، تقریبوں، میلوں ٹھیلوں میں مشترک تہذیب کے آثار ملنے لگے لیکن ہندوؤں نے اپنے آپ کو الگ تھلگ ہی رکھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی سلطنت میں ضعف آتے ہی یہ قوتیں مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو گئیں شمالی ہند میں سکھوں اور جاٹوں نے مغلیہ سلطنت کا شیرازہ برہم کرنے کا منصوبہ بنایا اور دکن سے مرہٹوں نے اس کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلیہ سلطنت کمزور پڑ گئی لیکن کسی ہندوستانی رئیس کو اس سلطنت کی وراثت نصیب نہیں ہوئی اور یہ ملک کم و بیش دو سو سال کے لئے انگریزوں کی غلامی پر راضی رہا۔ اس طویل عرصہ میں یہ بات روز بروز واضح ہوتی چلی گئی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا راستہ الگ الگ ہے اور اگرچہ سیاسی اتحاد کے لئے بہت سی کوششیں کی جاتی رہیں لیکن اس سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اختلاف کی یہ خلیج بڑھتی ہی چلی گئی۔ کیونکہ اس کی بنیاد دو ایسی ثقافتوں پر تھی جن میں سے کوئی ایک دوسرے کو قبول کرنے یا سمجھوتہ کرنے پر تیار نہ تھی۔ یہی تہذیبی، ور ثقافتی اختلاف دو قوموں کے نظریے کی اصل اساس اور بنیاد ہے اور اسی نے مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ برصغیر میں مسلمانوں کی آبادی کی اکثریت کے علاقوں پر مشتمل ایک آزاد وطن کا مطالبہ کریں۔ یہ وطن انھیں پاکستان کی صورت میں ملا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جس تہذیب اور ثقافت کے تحفظ کے لئے پاکستان کا مطالبہ پیش کیا گیا تھا، اس کے لئے ہم نے کیا کیا اور کیا کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر نذیر احمد

ارتقائے اِنسان

پچھلی صدی کے نصف آخر میں جب ڈارون نے "ارتقائے انواعِ حیات" اور پھر "نسبِ انسان" پر اپنی کتابیں شائع کیں تو انگلستان کا وضعدار اور باوقار طبقہ بلبلا اٹھا۔ بہت سے جلسے جلوس اُس کے خیالات کی تردید اور مذمت میں برپا کیے گئے۔ ڈارون خود ذرا شرمیلے مزاج کا آدمی تھا، خود تو پبلک جلسوں اور مناظروں میں شامل نہ ہوتا تھا لیکن اس کی طرفداری میں تومس ہنری ہکسلے اکثر ان بحثوں کے میدان میں اترآیا کرتا تھا۔ ان مناظروں کی تلخی کا کچھ اندازہ اس ایک واقعے سے ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ جب ہکسلے کا مقابل آکسفورڈ کا لاٹ پادری سیموئل ولبرفورس تھا تو ولبرفورس نے کہا "ہکسلے صاحب یہ تو میں نے مان لیا کہ بندر ہی آپ کا مورثِ اعلیٰ تھا، لیکن یہ بھی تو فرمایئے کہ اس سے آپ کا رشتہ ننھیال کی طرف سے ملتا ہے یا ددھیال کی جانب سے؟"

ڈارون کا نظریۂ ارتقا چاہے کچھ بھی ہو، اس کے مخالفوں کے پاس یہ حربہ بڑا کارگر تھا کہ اس کے حلیفوں پر وہ بندر کی اولاد ہونے کی پھبتیاں اُڑاتے اور ان کا منہ بند کر دیتے۔ اصل بات یہ تھی کہ انسان قدیم زمانوں سے اپنے آپ کو کائنات کا مرکز سمجھتا رہا تھا۔ جب سائنس نے فیصلہ دیا کہ وہ بھی دوسری چیزوں کی طرح قوانینِ فطرت کا تابع ہے تو لوگوں کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا ان کی مسندِ توقیر و سیادت چھین لی گئی ہے۔ جب انگریزی تعلیم ہمارے یہاں آئی تو نوعِ انسانی کی مزعومہ "تذلیل" کا یہی پروپیگنڈہ یہاں بھی اثر انداز ہوا۔ لوگوں کو یہی سمجھایا گیا کہ اگر انسان نے بندر سے ارتقا پایا ہے تو پھر روحانی بلندی اس کا حصہ کبھی نہیں ہو سکے گی۔ اکبر الٰہ آبادی جن کا اثر ہمارے قدامت پسند طبقے پر بہت گہرا تھا۔ فرماتے ہیں:

کہا منصور نے خدا ہوں میں
ڈارون بولا بوزنا ہوں میں

سُن کے کہنے لگے مرے اک دوست
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

حالانکہ یہی دلیل دوسری طرف بھی لے جا سکتی تھی۔ کہا جا سکتا تھا کہ اگر عرصۂ امکان میں اتنی ترقی ہو سکتی ہے کہ بندر بڑھ کر انسان بن جائے تو پھر انسان کیا نہیں بن سکے گا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ دلیل بڑی قوت کے ساتھ دی بھی جا چکی ہے۔ مولانا روم کے خاصے مشہور شعر ہیں، جو انسانی ارتقا کا بیان کرتے ہیں اور یوں شروع ہوتے ہیں ؎

آمدہ اول بہ اقلیم جماد
وز جمادی در نباتی اوفتاد

یعنی ہم اقلیم جمادی سے نباتی میں اور پھر نباتی سے اقلیم حیوانی میں آئے اور آخر کار حیاتِ انسانی میں داخل ہوئے۔ دلیل مولانا روم کی یہ ہے کہ ہمارا ہر نیا مقام پچھلے مقام سے ارفع ہے۔ پس پیچھے دیکھنا ہمیں بکار آمد نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم آگے چل کیا ہو جائیں گے۔ میں یہاں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر روحانی مدارج کے خیالات کے بارے میں ہمیں اکبر الٰہ آبادی یا مولانا روم میں سے کسی ایک کی بات ماننی پڑے تو کم از کم میں تو مولانا روم کی بات کو ترجیح دوں گا۔ اور کیا قرآن شریف میں کسی جگہ نہیں آیا کہ انسان جو زمین پر خلیفۃ اللہ ہے اس کی اصل اور پیدائش ایک گندگی سے ہے۔ تو پھر کیا ہم اپنی اصل ہی کو اپنی ساری

حقیقت سمجھیں! اس سے تو لازم آئے گا کہ ہمیں ہر طرح گندہ ہی رہنا چاہیئے، گندے افکار، گندی گفتار اور گندے عمل ــــ تو میرے کہنے کا ماحصل یہ ہے کہ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ ہماری ابتدا ادنیٰ تھی تو اس سے بدکنا نہیں چاہیئے بلکہ یہ تو ایک خوبی ہے کہ عملِ ارتقا ہمیں سطحِ ادنیٰ سے سطحِ اعلیٰ کی طرف لے جا رہا ہے۔

انسان کے تدریجی ارتقا کے نظریے کے خلاف اہلِ مذہب تو تھے ہی، شروع میں کچھ اہلِ سائنس بھی اس کے خلاف رہے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں لینیئس کا، جو ذوالحیات کی سائنسی قسم بندی کا بابا آدم مانا جاتا ہے، یہ حتمی فیصلہ تھا کہ انواعِ حیات، بالکل الگ الگ ہے کسی ایک کا کسی دوسری سے کوئی جوڑ نہیں، بلکہ ان کی تعداد بعینہٖ اتنی ہے جتنی کہ کبھی کشتیٔ نوح میں داخل ہوئی تھی۔ چنانچہ انسان بھی بطور ایک الگ نوع کے پیدا ہوا تھا اور دوسری انواع سے اس کا کوئی رشتہ نہ تھا نہ ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انسان کا پورا بدن اس نظریے کے خلاف ایک شہادت ہے۔ اگر انسان سچ مچ ایک الگ مخلوق پیدا کیا گیا تھا تو اس کے بدن میں کوئی ایسی فالتو شے نہ ہونی چاہیئے جو اس کے تو کسی کام کی نہ ہو لیکن اس کے نزدیکی جانوروں میں بکار آمد ہو۔ انسان میں دم نہیں ہوتی تو پھر کیوں دم کی ہڈی کچھ مہروں کی صورت میں اس کی ریڑھ کے نچلے سرے پر موجود ہے؟ انسان اپنے کان نہیں ہلا سکتا اور اس کی اسے کوئی ضرورت بھی نہیں تو پھر کیوں کانوں کے ہلانے والے سارے عضلات اس کے سر کی طرفوں پر موجود ہیں؟ کچھ اسی طرح کی شے عقل ڈاڑھ ہے۔ پچیس سال انسان کی عمر عزیز کے گذر جائیں تو تب یہ نمودار ہوتی ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ اب کیا اسے لوہے کے چنے چبانے ہیں جو یہ نکل آئی ہے تو کوئی جواب نہیں ــــ اور یہ بال کیا وبال ہیں، ہمارے کس حیاتیاتی مصرف کے ہیں؟ دوسرے جانوروں میں تو وہ سردی روکنے کا ذریعہ تھے۔ لیا ہماری سردی بھی ان سے رک سکتی ہے؟ انسانی جنین کا مطالعہ کریں تو وہاں بیکار چیزوں کا ٹھکانہ نہیں بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ ایک ایسا مکان ہے جو بیکار چیزوں کا ٹھکانہ ہے۔ انسانی جنین کو دیکھیں تو وہاں مچھلی کے سے گلپھڑے دکھائی دیں گے، لمبی دم ہوگی اور سارا جسم بالوں سے ڈھنپا ہوا ہوگا۔ آخر ان سب بے مصرف اور بیکار چیزوں کے وجود کی کوئی معقول توجیہہ بھی ہے؟ اگر ہے تو صرف یہی کہ انسان بھی دوسری مخلوق کی طرح بتدریج اپنی موجودہ شکل اور عقل کو پہنچا ہے اور وہ ان سے الگ نہیں بلکہ وہ سب ایک ہی خون کے وارث ہیں۔

انسان کے بندروں سے خونی رشتہ رکھنے کی دوسری دلیل ان کی باہمی مماثلت ہے۔ مماثلت کی دلیل دوسرے ذوالحیات کے رشتوں کے بارے میں تسلیم کی جا چکی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ یہاں وہ قبول نہ کی جائے۔ دور نہ جایئے صرف چڑیا گھر تک چلیئے۔ تماشائیوں کی بھیڑ سب سے زیادہ بندروں، لنگوروں اور بن مانسوں کے کٹہروں کے گرد آپ کو نظر آئے گی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ صرف ان جانوروں کی جسمانی ساخت بلکہ ان کی حرکات و سکنات اور عادات بھی تماشائیوں کو اپنے جیسی دکھائی دیتی ہیں۔ چمپنزی کی ماں نہ صرف اپنے بچے کو گود میں لے کے بیٹھتی ہے بلکہ انسانی ماؤں کی طرح کسی وقت اسے جھلاتی بھی ہے، اس کا منہ چومتی ہے اور اس کے سر پر ہاتھ بھی پھیرتی ہے۔ پھر چمپنزی اور گوریلوں کے ہاتھ اور ان کی انگلیاں، انسانی ہاتھوں اور انگلیوں سے اور ان سے جو کام لئے جاتے ہیں ان سے بے حد مماثل ہیں۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ کتوں، گھوڑوں اور ہاتھیوں کو سدھایا اور بہت کچھ سکھایا جا سکتا ہے لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ خود کوئی نئی بات پیدا نہیں کر سکتے۔ ان کا دماغ ایک حد تک چلتا ہے، اس سے آگے نہیں جاتا۔ لیکن چمپنزی کئی دفعہ انسان کی طرح بغیر کسی پرانے تجربے کے نئی چیز اپنے تخیلہ سے پیدا کر سکتا ہے۔ پروفیسر کوہلر نے ایک چمپنزی کو دو ایسی چھڑیاں دیں جن کے سرے آپس میں جڑ سکتے تھے۔ پھر کوئی کھانے کی مرغوب شے چمپنزی کی ایک چھڑی کی دسترس سے باہر رکھ دی۔ کچھ دیر کی الٹ پھیر کے بعد چمپنزی نے ایک چھڑی میں دوسری چھڑی اگلی اور ان کی مدد سے اس کھانے والی شے کو اپنے تک کھینچ لیا۔ بالغ انسان اور بالغ چمپنزی میں جو مماثلت بیان کی گئی ہے، ان کے جنین کی مماثلت اس سے بھی زیادہ ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کا جنین بہت چمپنزی نما اور چمپنزی کا جنین بہت انسان نما ہے۔

شاید کوئی کہے کہ انسان کی غایت درجہ مشابہت چمپنزی وغیرہ سے تو ہم مان لیتے ہیں لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان ان سے پیدا ہوا کیوں کہ مشابہت سے دلیل دوسری طرف بھی جا سکتی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ انسانوں سے پیدا ہوئے ہوں۔ اس شبہے کے رد کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ یہ ہے

کو معلوم کیا جائے کہ کون پہلے وجود میں آئے انسان یا ایپس، اگر اوراق الارض کے مطالعہ پر ایپس ہمیں پہلے نظر آئیں اور اس وقت انسان کا کہیں مذکور بھی نہ ملے تو معقول نتیجہ یہی نکالا جائے گا کہ انسان اپنے مشابہ ترین ایپس سے نکلا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آج تک یہ کھوج نہیں لگایا جا سکا کہ وہ کون سی خاص نوع تھی جس کی تبدیلی اور ارتقا سے انسان بنا۔ سائنس نے کبھی یہ نہیں کہا کہ بندروں کی موجودہ انواع میں سے کوئی ایک نوع، نوعِ انسان کی مورث ہے۔ سائنس کی رو سے موجودہ ایپس کو انسان کے بچھڑے بھائیوں کی مثال سمجھنا چاہیے۔ یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ مختلف ایپس اور انسان کسی ایک ہی بڑے تنے سے ابھرے ہیں لیکن اس تنے کی وہ کون سی خاص شاخ تھی جس سے انسان نکلا، ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی۔ بندروں اور ایپس کی شاخیں اس کے پاس کی شاخیں ہیں۔ بس انھی سے کچھ یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خود اس کی رفتہ و گزشتہ شاخ کی شکل و صورت رکھتی ہوگی لیکن براہ راست ابھی تک اس کے متحجر آثار نہیں دیکھے گئے۔

محققین کے نزدیک قدیم ایپس اور نوعِ انسان کے درمیان واقعی ایک کڑی تھی جسے وہ PITHECANTHAPS کے نام سے پکارتے ہیں PITHECANTHAPS آج سے کئی لاکھ سال پہلے زندہ تھا۔ اسے انسان تو نہیں کہا جا سکتا لیکن وہ اپنی شکل و صورت، قد کاٹھ اور چال ڈھال کے لحاظ سے ایپس سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ اس کی کھوپڑی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا دماغ ایپس سے بڑا تھا اور اس کا قد بھی سیدھا تھا اور وہ ایپس کی طرح آگے کو جھک کر نہ چلتا تھا۔

مجھے توقع ہے کہ آپ جینس اور اسپیشیز کا فرق جانتے ہیں۔ اب تک جن مختلف بن مانسوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ ابھی تک اس جینس کو نہیں پہنچے جسے ”ہومو“ کہا جاتا ہے جینس ہومو کی تین انواع یا اسپیشیز تھیں، جو معدوم ہو چکی ہیں۔ ایک جرمنی کی ہومو اور دوسری جنوبی افریقہ کی HOMO RHODIMENSIS تھی اور تیسری Homo Reandeelthalensis یا انسانی اینڈرتھل تھی۔ یہ تینوں انواع پچھلے پانچ لاکھ سال کے اندر اس دنیا میں موجود تھیں۔ ان میں سے تیسری نوع ایک ایسی معدوم انسانی نوع ہے کہ اس کی بہت سی باقیات ہمارے پاس ہیں۔ اس نوع کی یہ ایک عجیب و غریب رسم تھی کہ وہ اپنے مردوں کو بجائے یونہی پھینک دینے کے باقاعدہ دفن کیا کرتے تھے۔ اور ان کی قبریں ان کے پتھر کے بنے ہوئے اوزار اور دوسری چیزیں رکھ دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بہت سے ڈھانچے اور ان کے استعمال کی بہت سی چیزیں آج کل بھی ملتی ہیں۔ اگرچہ ان کے ایک قسم کے انسان ہونے میں شبہ نہیں لیکن ان کی شکل و صورت موجودہ انسان یعنی ہوموسیپینز سے ایک درجہ مختلف تھی۔ ان کی بھوؤں کی ہڈی بڑی نمایاں ہوتی تھی اور ٹھوڑی تقریباً غائب تھی۔ گردن بڑی موٹی اور ذرا آگے کو بڑھی ہوئی اور ٹانگیں کمان کی طرح ذرا باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ وہ یقیناً ہم سے زیادہ طاقتور جسم رکھتے ہوں گے کیونکہ ان کے ہتھیار اتنے بھاری ہیں کہ ہم انھیں بس چوم کر چھوڑ دیں۔ بعض حکما کا خیال ہے کہ ہماری اپنی نوع یعنی ہوموسیپینز ان انسانوں کے ساتھ بھی کچھ عرصہ رہی ہے اور ان کا کچھ نہ کچھ خون ہماری رگوں میں بھی چلتا ہے جیسا کہ آپ جانتے ہیں ہماری موجودہ نوعِ انسانی جینس ہومو ہی کی ایک نوع ہے اور اس کا سائنسی نام محققوں نے ہوموسیپینز رکھا ہے جس کا اردو ترجمہ ”عقل والا انسان“ کیا جا سکتا ہے۔ یہ نام اس خیال سے ہمیں عطا ہوا ہے کہ ہم اور ہماری نوع میں وہ محقق بھی شامل ہیں جنھوں نے یہ نام رکھا ہے۔

بہرحال موجودہ نسلِ انسانی کی عمر زیادہ نہیں۔ بہت ہوگی تو پانچ لاکھ سال ہوگی ورنہ دو ایک لاکھ سال، جو حیوانات مقارمہ کی پچاس کروڑ اور ہمالیہ کی پندرہ کروڑ سالہ عمر کے سامنے کچھ بھی تو نہیں۔ اور باقاعدہ بستیوں میں رہنے اور دہقان کاری اور زراعت کاری کی مدت تو دس بارہ ہزار سال سے زیادہ نہیں۔ آنے والے وقت کا کوئی انت نہیں، ذہن کی سطح کے حالات سازگار ہیں اور ارتقا کا سلسلہ بند نہیں ہوا۔ انسانی نوع کی تھوڑی سی عمر دیکھ کر نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں کیا کیا امکان پوشیدہ ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان کی رسائی کہاں تک ہوگی اور وہ کیا سے کیا بن جائے گا   سائنس اور شعر میں بڑا فاصلہ ہے لیکن آج کی بات اقبال کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

ڈاکٹر محمد اجمل

نفسیات — ایک سائنس

آخر یہ نفسیات ہے کیا بلا؟ عوام کے لئے اور بہت سے طلباء کے لئے نفسیات جادو کی طرح کوئی کالا علم ہے۔ بہت سے لوگوں کے لئے نفسیات لوگوں کو تنویم کی کیفیت میں لانے کے ملکہ کا نام ہے۔ بہت سے لوگ ماہرینِ نفسیات سے خوف کھاتے ہیں کہ کہیں پہلی ہی ملاقات وہ ہمارے خیالات کا اندازہ نہ کرلیں یا ہمارے سینے کے راز ہائے سربستہ معلوم نہ کرلیں۔ کچھ لوگ نفسیات اور روزمرہ کی سوجھ بوجھ میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ وہ محض کونین کی گولی پر شکر کا لیپ دینے کو نفسیات تصور کرتے ہیں۔ پھر ہر کاروبار گاہ اور کاروبار پرداز اپنے آپ کو ماہرِ نفسیات سمجھتا ہے اور اس لئے ماہرِ نفسیات گویا تو ایک بیکار اور فاضل وجود سمجھا جاتا ہے یا اسے ایک شعبدہ باز کا مقام عطا کردیا جاتا ہے۔

آج ہم جس نفسیات کا ذکر کرنے والے ہیں وہ ایک سائنسی علم ہے۔ جو نہ جادوگری ہے، نہ شعبدہ بازی۔ ماہرینِ نفسیات جب نفسیات کو سائنس کہتے ہیں تو وہ خوب جانتے ہیں کہ نفسیات کو سائنس کا درجہ دینے کا کیا مطلب ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس علم کے نتائج قطعی ہیں اور اس کے اطلاق سے وہی معرکہ آرا کرشمے ظہور پذیر ہوں گے جو طبیعیات اور کیمیا کے اطلاق سے پیدا ہوئے ہوں۔ نفسیات کو ہم سائنس اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے اسالیبِ مطالعہ، سائنس کے اسالیب ہیں۔ ان اسالیب کی بنیادیں دو ہیں۔ ایک مشاہدہ، دوم تجربہ۔ ان اسالیب کے اصولوں کو ہم یوں بیان کرسکتے ہیں۔

ہر ذہنی کیفیت اور خارجی عمل کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے۔

انسان اس امر کی صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ ان اسباب کا مشاہدہ کرسکے، ان کا تجزیہ کرسکے، ان کی پیمائش کرسکے اور ایسے کلیے قائم کرسکے جن کی مدد سے ہم انسانی اور حیوانی کردار کے متعلق پیش گوئی کرسکیں۔

وہ کلیات جو ہم اس کردار کے بارے میں قائم کرتے ہیں وہ اس آسان پیرائے میں بیان ہوسکتے ہیں جس کی وہ توجیہہ کرتے ہیں۔

یہ اصول تمام سائنس کے اصول ہیں۔ ان اصولوں کی پیروی میں ضروری ہے کہ کچھ مفروضے بنائے جائیں اور پھر مشاہدے اور تجربے کے ذریعے ان مفروضوں کی صحت یا عدم صحت کا تعین کیا جائے۔ مثلاً چند ماہرینِ نفسیات نے یہ مفروضہ بنایا کہ غیر ملکی زبانیں پڑھانے کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ جب طلبا تنویم کی حالت میں ہوں تو ٹیپ ریکارڈر انھیں کسی غیر ملکی زبان کا درس دیا کرے۔ چنانچہ اس مفروضے کی صحت کے تعین کے لئے تجربہ کیا گیا کہ چند طلبا پر تجربہ گاہ میں تنویم کی حالت طاری کردی گئی اور انھیں کسی غیر ملکی زبان کا درس دیا گیا۔ تنویم کی حالت سے ابھرنے پر ان سے اس زبان کے متعلق سوالات کئے گئے۔ لیکن یہ دیکھا گیا کہ طلبا اس تنویمی درس و تدریس کے باوجود اس زبان سے نابلد رہے۔ چلئے یہ مفروضہ غلط ثابت ہوا۔

جہاں مفروضوں کے صحیح ہونے کی تاریخ ہے، وہاں سائنس اور نفسیات کی تاریخ بہت سے مفروضوں کے غلط ثابت ہونے کی تاریخ بھی ہے۔ کسی سائنس نے اس طرح ترقی نہیں کی کہ ترقی کے صراطِ مستقیم پر گامزن رہی ہو۔ راہ میں ہزاروں نشیب و فراز آئے، پائے جستجو کو ہزاروں ٹھوکریں لگیں اور تب کہیں حقیقت نے اپنا ایک رخ بے نقاب کیا۔ نفسیات جب پیش گوئی کا ذکر کرتی ہے تو اس تصور پر کئی پابندیاں عاید کردیتی ہے۔ یہ پیش گوئی قطعی اور مطلق کبھی نہیں ہوتی۔ اس میں ساتھ ساتھ کچھ شرائط

بھی لگا دی جاتی ہیں کہ اگر حالات یوں ہوئے تو ممکن ہے یہ واقعہ رونما ہو، اگر حالات یوں نہ ہوئے تو ممکن ہے یہ واقعہ یوں رونما نہ ہو۔ پھر نفسیات غالباً ایک واحد علم ہے جو پیش گوئی کے تصور کے علاوہ "پس گوئی" کے تصور سے بھی کام لیتا ہے۔ مثلاً آپ کسی بالغ شخص میں حد سے زیادہ اکڑ فوں یا بار بار تکبر دیکھتے ہیں، اُس تکبر کی موجودہ کیفیت کے متعلق پوری معلومات حاصل کر کے آپ یہ فرض کرتے ہیں کہ اس شخص کے بچپن میں ضرور ایک دو ایسے واقعات ہوئے ہیں جن کی وجہ سے وہ شدید احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گیا تھا چنانچہ آپ اِس "پس گوئی" کی تصدیق کے لئے اس سے یا اُس کے اعزہ و اقارب سے اُس کے بچپن کے حالات معلوم کرتے ہیں۔ اگر ایسے واقعات مل جائیں تو یہ پس گوئی صحیح ثابت ہوئی اگر نہ ملیں تو غلط نفسیات کی ایک شاخ جسے ہم بچوں کی نفسیات کہہ سکتے ہیں "پس گوئی کی تصدیق کے عمل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ کچھ دیر تو لوگوں نے بلوغت کی کیفیات ہی سے بچپن کے حالات کا اندازہ لگانے کو کافی سمجھا لیکن اس کے بعد ضرورت یہ محسوس ہوئی کہ بچپن کا بھی براہ راست مطالعہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ برطانیہ اور امریکہ میں کئی جگہ ماہرین نفسیات، بچے کا پیدائش ہی سے نفسیاتی مطالعہ شروع کر دیتے ہیں تاکہ اگر بعد میں کوئی بچہ ایک عظیم ہستی بن جائے تو ہمیں اس کے سوانح نویسوں کے تخیل کا رہین منت نہ بننا پڑے اور اگر وہ کوئی مجرم بن جائے تو دستاویزوں میں اس کا سبب موجود ہو۔

فطرت کا مطالعہ کسی قدر آسان ہے کیونکہ فطرت ایک خارجی حقیقت ہے اور انسان اس کا خارجی مشاہدہ کرتا ہے لیکن انسان جب انسانی ذہن کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ خود ہی شاہد ہے اور خود ہی مشہود۔ اس لئے اس کے مطالعہ میں کچھ الجھی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن بعض ماہرین نفسیات ان مشکلات سے بالکل پریشان نہیں ہوئے بلکہ ان کی وجہ سے اُن کی ہمت اور تجسس کو ایک تازیانہ لگا اور انھوں نے انسانی ذہن کے متعلق بہت نادر اور قیمتی انکشافات کئے۔ فرائیڈ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے انسانی ذہن کے متعلق جیسے بھی انکشافات کئے وہ اپنے آپ کے مشاہدے سے کئے اس نے پہلے اپنے خوابوں کا تجزیہ کیا، اپنی ذہنی بیماریوں کا مطالعہ کیا اور اس مشاہدے سے پیدا شدہ مفروضوں کو اپنے مریضوں پر بھی آزمایا لیکن کچھ ماہرین نفسیات ایسے بھی تھے جنھوں نے ان مشکلات کا حل یہ نکالا کہ انسان اپنا مشاہدہ بالکل نہ کرے، بلکہ دوسرے انسانوں کا مشاہدہ کرے اور اس کے ساتھ حیوانوں کا بھی مطالعہ کرے اور جو نتائج اس مطالعے سے مرتب ہوں، وہ اپنے آپ پر عائد کرے۔ اس طرز فکر کا موجد واٹسن تھا جو طبیعیات اور کیمیا کی چکا چوند سے بہت متاثر تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ نفسیات بھی سیاروں پر کمند پھینک سکتی ہے۔ وہ شاید یہ نہیں جانتا تھا کہ یزداں پر کمند پھینکنے کے لئے پہلا اسلوب مشاہدہ بہتر ہے۔

نفسیات کے لئے مشاہدہ کی وہی شرائط ہیں جو کسی اور سائنس میں ہیں۔ مثلاً یہ کہ مشاہدہ غیر جانبدار، اور حتی الامکان تعصب سے عاری ہونا چاہئے لیکن مصیبت یہ ہے کہ ایک ہی عمل کا بار بار مشاہدہ ناممکن ہے کیونکہ قدرت اتنی فیاض نہیں ہے کہ ایک ہی واقعہ کو جوں کا توں دہرائے اس لئے ہمیں تجربہ کرنا پڑتا ہے۔ نفسیات میں تجربے کی نوعیت یہ ہے کہ ایک شخص شاہد بنتا ہے اور دوسرا مشہود۔ شاہد یا عامل، معمول کو کوئی خاص کام کرنے کو کہتا ہے مثلاً یہ کہ چند بے معنی آوازوں کو یاد کرو۔ پھر وہ یہ دیکھتا ہے کہ کتنی مرتبہ کی تکرار سے وہ بے معنی الفاظ کی ایک فہرست یاد کرتا ہے۔ اس تجربے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ معمول کے حافظے کی قوت کیسی ہے۔ افراد سے گذر کر اجتماع پر بھی تجربے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً کوئی پچاس آدمیوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر کے ایک ہی مقام پر چند دن رہنے کا موقع دیا۔ اس کے بعد ان گروہوں کو مختلف قسم کے لباس پہنا دیے۔ ان کے علیحدہ علیحدہ نام بھی رکھ دیئے۔ ان کے رہنے کی جگہوں کو مختلف قسم کی آسائشوں سے آراستہ کر دیا۔ اس کے بعد اُن کے آپس میں میچ کرائے حتیٰ کہ ان میں باہمی مخالفت اور عناد کے جتنے بھی بیج بوئے جا سکتے ہیں بو دیئے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ پھر یہ لوگ ذرا ذرا سی بات پر لڑ پڑتے ہیں۔ اس قسم کے تجربات سے پس یہ پتہ چلتا ہے کہ تعصب اور عناد کیوں کر پیدا ہوتے ہیں۔ اور کیسے پھلتے پھولتے ہیں۔ اب تو نفسیات کی ہر شاخ میں تجربے ہونے لگے ہیں۔ ولیم جیمز نے کہا تھا کہ نفسیات ابھی سائنس نہیں ہے محض سائنس کی امید ہے لیکن یہ بات پرانی ہو چکی۔ اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نفسیات بہت حد تک سائنس بن چکی ہے۔

منٹو بھائی

عطیہ فیضی

کہتے ہیں کہ ایک بار ایک پٹواری کی بڑی چہیتی گھوڑی مر گئی۔ اس گھوڑی کا افسوس کرنے کے لئے دور دراز سے لوگ آئے۔ سات روز تک تعزیتیں ہوتی رہیں، پھر ایک روز خود پٹواری فوت ہو گیا مگر گھوڑی کی تعزیت پر افسوس کرنے والوں میں سے کوئی بھی ماتم پرسی کو نہ آیا کیونکہ بدقسمتی سے اسی روز تحصیلدار کی گائے مر گئی تھی۔

مذکورہ بالا حکایت کا مندرجہ ذیل حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے

بیگم عطیہ فیضی فوت ہو گئیں

مگر صرف عطیہ بیگم ہی فوت نہیں ہوئیں۔

علم و ادب کی ایک صدی بھی ختم ہو گئی ہے۔

فنونِ لطیفہ کا ایک ادارہ بھی ویران ہو گیا ہے۔

علم و حکمت کی ایک دانش گاہ بھی اجڑ گئی ہے

مشرق کا ایک افتخار بھی لٹ گیا ہے

برصغیر کا ایک اعزاز بھی چھن گیا ہے۔

۴ جنوری کو کراچی کے ایک ہسپتال میں اتنے سارے المیے ایک دم اور ایک ساتھ کیسے رونما ہو گئے؟ میری محدود علم اور مختصر عمر کی نسل اس سوال کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اسے تو شاید ان حادثات کے رونما ہونے کی خبر اور ان نقصانات کا احساس بھی نہیں ہے۔

اس سوال کا جواب علامہ اقبال، مولانا شبلی نعمانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور قائد اعظم محمد علی جناح جیسی احسان مند ہستیوں کے آنسو ہی دے سکتے تھے۔ جو عطیہ بیگم کی موت کی قسمت میں نہیں تھے۔

اس سوال کا جواب استنبول کے رئیس حسن علی فیضی دے سکتے تھے جنہوں نے اپنی روشن دماغ بیٹیوں کو مغربی اور مشرقی علم و ادب اور فن کی دولت سے مالا مال کیا مگر وہ غروب آفتاب کی خونیں رنگ شفق کا منظر نہ دیکھ سکے۔

اس سوال کا جواب سلطان عبدالحمید دے سکتے تھے جنہوں نے اپنے ہاتھ سے عطیہ بیگم کو خواتین کا سب سے بڑا اعزاز "شفقت نشان" دیا تھا، مگر وہ ہاتھ اب شفقت نشان کی قبر پر پھول نہیں چڑھا سکتے۔

اس سوال کا جواب بائیڈا ہوک میونک لندن اور کیمبرج کی وہ علمی ادبی اور ثقافتی مجلسیں دے سکتی تھیں جو کبھی عطیہ بیگم تھیں اور جن محفلوں میں فلسفے اور افلاطون کے فلسفے، شاعری، موسیقی اور مصوری پر بحث کی جاتی تھی یہی وہ مجلسیں تھیں جن سے علامہ اقبال نے فکر و نظر کی گہرائی اور گیرائی، لطافت، گداز اور گرمی حاصل کی مگر ان محفلوں

کہ اب عطیہ بیگم کی کتاب "اقبال" اور عطیہ اور اقبال کے چند خطوط کے سوا اور کوئی نشان باقی نہیں رہا۔

اس سوال کا جواب فکری رجحانات کی انقلابی تبدیلیوں کے عوامل کا جائزہ لینے والے وہ ماہرین ادب دے سکتے ہیں جنہیں جاننا چاہیئے کہ لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی" لکھنے والے بانگ درا کے مصنف اقبال کو "پیام مشرق" اور "جاوید نامہ" کا خالق علامہ اقبال کس نے بنایا، اور مولانا شبلی جیسے علم و فضل کے بوجھ تلے دبے ہوئے انتہائی سنجیدہ مفکر کو فارسی کی انتہائی شگفتہ غزلیں لکھنے پر کس نے مجبور کیا۔ مگر یہ ماہرین گندے اور ناپاک جنسی ہتھکنڈوں سے مسموم فضا میں عورت اور مرد کے درمیان جسمانی رشتے کے علاوہ اور کسی تعلق کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اس سوال کا جواب مولانا شبلی کا وہ مضمون دے سکتا ہے جس میں عطیہ بیگم کو پرستش کے لائق قرار دینے میں صرف ایک رکاوٹ محسوس کی گئی تھی اور وہ یہ کہ اسلام میں خدا کے علاوہ اور کوئی پرستش کے لائق نہیں۔ مگر یہ مضمون شبلی کی حیات معاشقہ کے مصنف کی .... قدر ناشناسی اور احسان فراموشی کی نذر ہو گیا۔

اس سوال کا جواب امریکہ کی وہ دانش گاہیں دے سکتی ہیں جہاں بیگم عطیہ نے مشرقی تہذیب و ثقافت پر ۵۵ لیکچر دیئے یا پھر پیرس کی سوربون یونیورسٹی جہاں عطیہ بیگم کے لیکچر علمی خزانے میں نوادر کی حیثیت سے محفوظ ہیں مگر ہماری دانش گاہیں ان علمی خزانوں سے محروم ہیں۔

اس سوال کا جواب بمبئی کا لاکھوں کی مالیت کا ایوان رفعت دے سکتا ہے جسے عطیہ بیگم قائد اعظم کے ایک اشارے پر قربان کر کے کراچی تشریف لے آئیں اور یہاں اپنے نئے وطن میں نیا "ایوان رفعت" قائم کیا جو عالموں سیاست دانوں، ادیبوں اور فن کاروں کا مسکن تھا۔ مگر آج کراچی کا ایوان بھی بمبئی کے ایوان کی طرح ویران ہے۔

اس سوال کا جواب قربانی کا وہ جذبہ دے سکتا ہے جس کے تحت عطیہ بیگم نے ۱۹۵۷ء میں اپنا تمام اثاثہ حکومت پاکستان کے حوالے کر دیا تھا مگر قربانی کے اس جذبے کی کوئی قدر و قیمت ہمارے دلوں میں نہیں ہے۔

اس سوال کا جواب وہ مائیں دے سکتی ہیں جو اپنی بچیوں کا نام عطیہ محض اس امید پر رکھتی تھیں کہ ان میں عطیہ بیگم کی صفات کی کوئی جھلک آ جائے، مگر وہ مائیں بھی اب قصۂ پارینہ بن چکی ہیں۔

اس سوال کا جواب جارج برنارڈ شا بھی دے سکتے تھے جنھوں نے مشرق کو عطیہ بیگم جیسی عظیم خاتون پیدا کرنے پر خوش قسمت قرار دیا تھا۔

خوش قسمتی سے مغرب کا یہ عظیم دانشور جو کسی کی تعریف کرنے میں انتہائی کنجوس تصور کیا جاتا ہے۔ آج اس دنیا میں نہیں ہے ورنہ وہ اس مشرق کی اس نسل کو ضرور بد قسمت قرار دیتا جو صدر کینیڈی کے قاتل اوسوالڈ کو قتل کرنے والے جیک روبی کے بارے میں عطیہ بیگم سے زیادہ معلومات رکھتی ہے۔ موت بہت ظالم ہے مگر اتنی ظالم نہیں جتنی احساس زیاں سے محرومی!

(بشکریہ "اخبار جہاں")

افضل منہاس

(نذرِ شکیب)

○

خوں بھرے ہاتھوں کو جانے کون آ کر دھو گیا
ایک چہرہ سرخ پانی کی تہوں میں کھو گیا

چار جانب سے لگے پتھر تو ٹوٹی شاخ شاخ
پیڑ یوں گھائل ہوا، زخموں سے دُہرا ہو گیا

پہلے موجوں کی فصیلیں ہر طرف تھیں مُستعد!
ایک کشتی ڈوبتے ہی کیوں سمندر سو گیا

دام جب پھیلے ہوئے دیکھے زمیں پر چار سُو
ایک طائر آسماں کی وسعتوں میں کھو گیا

ایسی پتھرائی ہوئی آنکھیں کبھی دیکھی نہ تھیں
جس نے بھی جا کر انھیں دیکھا وہ پتھر ہو گیا

میں نے رو رو کر پڑھی ہے آخری اس کی غزل [1]
جس کو سوچا تک نہ تھا وہ حادثہ بھی ہو گیا

آج سرگودھا کی مٹی کتنی افضل ہو گئی
اُس کے دامن میں شکیب ایسا سخنور سو گیا

[1] مطبوعہ فنون

اقبال منہاس

شکیب کی منفرد غزل

شکیب کا تعلق اس دور سے ہے جب غزل کی نشاۃ الثانیہ کے بعد اس کا زوال شروع ہوا۔ اردو غزل کے لئے یہ دور اضطراب، کشمکش اور بے چینی کا دور تھا۔ مسلسل تدریجی ارتقا کے بعد بلندی سے پستی کی جانب یہ سفر غزل کی صدیوں پرانی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ تھا۔ زندگی کے پیچیدہ تر مسائل کو سمونے والی غزل محدود ہو کر رہ گئی ... میں سمٹنے لگی تھی۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ غزل انکشاف ذات سے شخصی رجحان کے زیر اثر سطحی مسائل کے اظہار کا وسیلہ بننے لگی تھی۔ غزل گو شاعری داخلی زندگی کے محرکات، خارجی دنیا کے تقاضوں اور مشینی دور کے انسان کی بدلتی ہوئی ذہنی کیفیات کو سمجھنے میں ناکام رہے۔ غزل کی رہی سہی عظمت کو ریزہ ریزہ کرنے کے لیے غزل کے مخالفین نے تابڑ توڑ حملوں کا آغاز کیا اور بحیثیت صنفِ سخن غزل کو پامال کرنے کے لئے ایک منظم مہم کی تشکیل کی۔ بے یقینی کے اس دور میں غزل کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کے لئے ایسے نابغہ ذہنوں کی ضرورت تھی جو عقلی دانش، قلم کی حرکت اور معاشرتی سوجھ بوجھ کے سہارے غزل میں بنیادی تبدیلیوں کی صلاحیت رکھتے ہوں، جو ماضی اور حال کے ساتھ ساتھ مستقبل قریب میں پیدا ہونے والے ان مسائل کو سمجھنے اور پرکھنے کا بھی شعور رکھتے ہوں جو ایٹم کی برقی لہروں کے مدوجزر سے پیدا ہو کر صدیوں پرانی اس کائنات کے نظام کو تہہ و بالا کر دیں گے۔

اسے اردو غزل کی خوش قسمتی کہیے کہ ٹھیک اس وقت جبکہ مخالفینِ غزل کے تند و تیز ہاتھ غزل کے شانہ کے اڑتے ہوئے پرندوں کو دھکیل دے رہے تھے۔ غزل کے دھندلائے ہوئے افق پر یکایک کچھ روشن نام طلوع ہوئے۔ جدید تر غزل گو شعرا نے مختلف محاذوں پر طبع آزمائی شروع کی۔ اس دور میں اردو شاعری کے افق پر کئی نئے نام ابھرے۔ ان کی ذہنی توانائی غزل میں اور نئے ولولے اور تیور تشکیل ہونے لگے اور یہیں سے تخریب کے بعد اردو غزل کی تعمیر کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ لیکن تعمیر کا یہ دور بھی مکمل تعمیر کا دور نہیں تھا۔ یہ جدید تر غزل گو شعرا مختلف مکاتبِ فکر سے متعلق تھے اور غزل کے احیاء کے لیے ان کے سامنے واضح نصب العین نہیں تھا۔ بعض نئے غزل گو شعرا نے غزل کی لمحہ لمحہ گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالنے کے لئے ہندی دیو مالا اور اساطیر کا سہارا لیا۔ اگرچہ یہ بڑا صحت مند راہوں کی کھوج میں کامیاب رہے مگر یہ روایت اور مخصوص تہذیبی تصور کو اجاگر کرنے کا رجحان ان کے راستے کی دیوار بن گیا۔ اس طرح ان کی شاعری قومی سطح پر کامیاب ہوتے ہوئے بھی اجتماعی سطح پر کارگر ثابت نہ ہو سکی۔ برصغیر کی آزادی کے ساتھ ہی خونیں واقعات سے متاثر ہو کر ہمارے ہاں سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی غزلیں کہنے والے شاعر و نقاد اپنی ذات کے خول میں سمٹ گئے یا پھر اپنی زبردست فنی اور تخلیقی قوتوں کو صحیح طور بروئے کار نہ لائے۔ اس دوران میں ایک المناک حادثہ یہ ہوا کہ جاندار غزلوں کی تخلیق کرنے والے بیشتر شاعروں نے "جدت برائے جدت" کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اور جدت پسندی کا یہ جنون کبھی کسی شاعر کو "کالی ماتا" کی تلاش و جستجو پر اکسا دیا۔ پھر گلی اس کے گھنگرو ... کی بیری "الجبرا" اور نظم نثیں سرخ سلوٹ کی سنگ آمد سطح، کو ٹٹولنے پر مائل کیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اکثر شاعروں نے غزل کی منجمد سطح کو روانی دینے کے لئے جنس کا مجرب نسخہ پیش کیا اور اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے علامتوں کا استعمال کچھ اس ڈھب سے کیا کہ غزل نکھرنے کے بجائے بکھرنے لگی۔ اور دبستانِ لکھنؤ کے آنگن میں اونگھنے والی گمراہ کن جنسی روایت ایک بار پھر جاگ اٹھی۔ سوقیت،

سطحیت اور ابتذال کے اس اُمڈتے ہوئے سیلابِ بے اماں کو روکنے کے لئے شکیب کی تنومند آواز اُبھری اور لفافۂ ثانیہ کے بعد معرضِ زوال میں آنے والی غزل کے سنبھلنے کے امکانات واضح ہونا شروع ہوئے۔ اس دور کے متعلق جناب احمد ندیم قاسمی کی اس رائے میں بڑا وزن ہے کہ "اگر اس دور میں شکیب جیسے شاعر پیدا نہ ہوتے تو یہ ممکن تھا کہ اردو غزل ایک دم دو سو سال پیچھے چلی جاتی اور آئندہ نسل میں اس کا کوئی نام لیوا باقی نہ رہتا۔ شکیب کی غزل نے اردو شعر و ادب کے قاری کو بتایا کہ غزل گو بیسویں صدی کے نصف آخر کا ایک باشعور ذہن ہو کر بھی غزل کہہ سکتا ہے اور ایسی غزل کہہ سکتا ہے جس میں عصرِ رواں کی روح بول رہی ہو اور جو اس کے باوجود غزل ہو۔"

جہاں تک غزل کے روایتی فنی لوازمات کا تعلق ہے شکیب کے ہاں ایسے کسی فنی انحراف یا بغاوت کی مثال نہیں ملتی لیکن اس الزام کے باوجود روایتی غزل کے پرستاروں کو شکیب کی غزل یقیناً مایوس کرے گی۔ وہ اس لئے کہ شکیب کے ہاں نہ تو پٹے پٹائے موضوعات کی تکرار ہے اور نہ ہی لب و رخسار، زلفِ عنبریں، کاکلِ مشکیں، گیسوئے سیاہ اور گل و بلبل کی بھرمار۔ شکیب کے ہاں ان سب چیزوں کی تلاش سعیِ لاحاصل کے مترادف ہے۔ روایتی غزل کے پرستاروں کے لئے میرے پاس وہی جواب ہے جو نامور مفکر جبران نے اپنی اولین کتاب کی اشاعت کے وقت اپنے معترضین کو دیا تھا۔ جب جبران کی کتاب "پاگل" شائع ہوئی تو دنیائے ادب میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ جبران کی فنی اور تخلیقی صلاحیتوں کو نظر انداز کر کے اُسے پاگل ٹھہرایا گیا۔ منفی تنقید کے اس بپھرے ہوئے اور بے ہنگم طوفان میں جبران کی آواز گونجی:

"میں اس دور کے ہر باشعور فرد سے پچاس برس آگے بڑھ گیا ہوں۔"

یہی بات شکیب کی غزل کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ اس وقت جبکہ بحیثیتِ مجموعی غزل تقلید کی زد میں ہے شکیب یقیناً اپنے ہم عصر غزل گو شعراء میں پچاس پچاس گز اونچا نظر آتا ہے! اور یہ کیفیت اس منفرد طرزِ احساس کی مرہونِ منت ہے جو اُسے ودیعت کی گئی تھی۔ اس وقت جبکہ نظریات میں ہم آہنگی اور نصب العین کا فقدان غزل کو کشمکش اور بیزاری کے ایک عجیب سنگم پر لے آیا تھا۔ شکیب نے اسے بے کیف اور بے رنگ فضاؤں سے نکالنے کی بھرپور جدوجہد کا آغاز کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا نام تخریب کے دور میں تعمیر کی علامت بن گیا۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے جدید شاعری کا محاسبہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے "جدید شاعری کا آہنگ انجنوں کے شور کے مترادف ہے۔" انجنوں کا شور یعنی صنعتی انقلاب اور اس کے پس منظر سے ابھرنے والے ان گنت اور پیچیدہ مسائل کی طرف لے جاتا ہے۔ مشینی دور کے مسائل آج کے انسان کا سب سے بڑا المیہ ہیں اور کوئی بھی باشعور فن کار انھیں نظر انداز کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا لیکن جہاں تک اردو غزل کا تعلق ہے اس کے محدود دائرے کے بند اسلوب کو نئے افکار کے اظہار کے لئے استعمال کرنا کچھ آسان نہیں تھا۔ اس کے لئے غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کی ضرورت تھی جو بدقسمتی سے بہت کم جدید غزل گو شعراء کو میسر تھی۔ اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ جب آغاز میں اردو غزل نے میکانکیت کے پس منظر سے ابھرنے والے مسائل کو سمونے کی کوشش کی تو اس کی روایتی رومانیت، غنائیت اور دھیما پن، بوجھل بھاری بھرکم اور ثقیل الفاظ سے الجھ کر اپنا سوتی تاثر کھو بیٹھا۔ غزل میں مشینی دور کے مسائل کو نبھانے کا تجربہ ناکام رہا تو غزل کے مخالفین نے ایک بار پھر اس کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے صدائے احتجاج بلند کی۔ غزل پر پے در پے حملوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر غزل گو شعراء نے تھک ہار کر قدیم متغزلین کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اور حسن یار کی روایتی اور صدیوں پرانی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ گئے۔ کسمپرسی کے اس دور میں شکیب نے غزل میں کامیاب تجربے کئے اور اس کا تر و تازہ ذہن ایسے اشعار کی تخلیق میں کامیاب رہا جن کا آج کے جیتے جاگتے انسان کی روز مرہ زندگی اور اس کے داخلی اور خارجی مسائل سے گہرا ربط و ضبط ہے۔ شکیب کے ان اشعار پر غور کیجیے۔ ظاہری ہیئت کے لحاظ سے قطعی مختلف ہوتے ہوئے بھی یہ اشعار غزل ہی کے اشعار ہیں۔ شکیب کے مخصوص اسلوبِ فکر نے غزل کو ایک نیا پیراہن بخشا ہے ؎

ملبوس خوشنما ہیں مگر جسم کھوکھلے　　چھلکے سجے ہوں جیسے پھلوں کی دوکان پر

ہر موڑ پر ملیں گے کئی راہزن شکیب   چلیے چھپا کے غم بھی زر و مال کی طرح!

اس شورِ تلاطم میں کوئی کس کو پکارے   کانوں میں یہاں اپنی صدا تک نہیں آتی

کب سے ہیں ایک حرف پہ نظریں جمی ہوئی   وہ پڑھ رہا ہوں جو نہیں لکھا کتاب میں

سماجی سطح پر یہ میکانکی دور ہزاروں برس پرانی اخلاقی قدروں کے زوال کا دور ہے۔ آج دنیا کی آبادی پہلے سے کہیں زیادہ ہے اور تیز رفتار وسائل آمد و رفت کی وجہ سے فاصلے سمٹ آئے ہیں لیکن جہاں تک تنہائی کے احساس کو تعلق ہے وہ پہلے سے کہیں زیادہ کربناک ہے۔ آج کا انسان ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہوئے بھی کوسوں دور ہے۔ جب ہم شخصی غم کے علاج کے لئے کھا گہمی کے امڈتے ہوئے سیلاب میں جھانک کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ راز آشکار ہوتا ہے کہ ہر گوں بازاروں اور گلیوں میں رینگنے والے یہ انسان محض واہمہ ہیں۔ شکیب کے ہاں جب یہی تاثر شعر کے سانچوں میں ڈھلتا ہے تو اجتماعی محسوسات کا امین بن جاتا ہے۔

یہ آدمی ہیں کہ سایے ہیں آدمیت کے   گزر ہوا ہے مرا کس اجاڑ بستی میں

بُرا نہ مانیے لوگوں کی عیب جوئی کا   انھیں تو دن کا بھی سایا دکھائی دیتا ہے

گرد و غبار شکیب کی سوچ کے دھارے بدلتے ہیں اور وہ ایک تلخ حقیقت کی طرف بھرپور اشارہ کرتا ہے۔ یہ تلخ حقیقت ہوتے ہوئے بھی مضطرب احساسات کو سکون بخشتی ہے اور اس طرح جذباتی دھچکے کا اثر بڑی حد تک کم ہو جاتا ہے:

بٹ رہے ہیں پڑوسی کسی کا درد کبھی   یہی بہت ہے کہ چہرے سے آشنا ہے کوئی

بس ایک رات ٹھہرنا ہے کیا گلہ کیجئے   مسافروں کو غنیمت ہے یہ سرائے بہت

جہاں شجر پہ لگا تھا تبر کا زخم شکیب   وہیں پہ دیکھ لے کونپل نئی نکلنے لگی

مجموعی طور پر شکیب کی غزل میں یاسیت کا عنصر زیادہ ہے لیکن یہ رجحان قنوطیت کی حدوں کو نہیں چھوتا۔ شکست خوردگی پیدا نہیں کرتا۔ شکیب کے ہاں یاسیت کی تیرگی اتنی دبیز نہیں کہ روشنی دب جائے۔ قاری ان شعروں کو پڑھنے کے بعد وہی تاثر قبول کرتا ہے جو موسم گرما کی چلچلاتی ہوئی دھوپ اور جھلسا دینے والی لو میں آسمان پر گہرے سیاہ بادلوں کے چھا جانے سے کرتا ہے۔ شکیب اپنے قاری کو یہ امید بندھاتا ہے کہ یاسیت کے یہ بھیانک اور تاریک بادل باران رحمت کی نوید ہیں

ادھر سے بار ہا گزرا مگر خبر نہ ہوئی   کہ زیرِ سنگ خنک پانیوں کا چشمہ تھا

وہ دوریوں کا رہِ آب پر نشان کھلا   وہ رینگنے لگی کشتی وہ بادبان کھلا

وہیں پہنچ کے گرائیں گے بادباں اب تو   وہ دور کوئی جزیرہ دکھائی دیتا ہے

جب بھی نکلا ستارۂ امید　　　کہر کے درمیان سے نکلا

کیوں رو رہے ہو راہ کے اندھے چراغ کو　　　کیا بجھ گیا ہوا سے لہو کا شرار بھی

شکیب کی غزل محض ریزہ خیالی نہیں بلکہ اس کی غزل کے بکھرے ہوئے شعروں میں ایک مربوط نظریۂ حیات ملتا ہے۔ شکیب کے نزدیک زندگی ایک مسلسل سفر اور مسلسل حرکت ہے۔ اسی چیز کے فقدان کو وہ موت کا نام دیتا ہے۔ اسی فلسفے کی رو سے ایک مردہ انسان کا متحرک نام بھی زندگی کی علامت اور ایک زندہ انسان کی غیر متحرک زندگی موت کی دلیل بن جاتی ہے۔ شکیب کے ہاں کسی مخصوص منزل کا حصول ایک نئے سفر کا پیش خیمہ ہے :

اترے تھے ناؤ سے بھی کب سفر تمام ہوا　　　زمیں پہ پاؤں دھرا تو زمین چلنے لگی

ان فاصلوں کے دشت میں رہبر وہی بنے　　　جس کی نگاہ دیکھ لے صدیوں کے پار بھی

اور جب جوسِتہ حیات پر پھیلے ہوئے سایے مہیب ہونے لگتے ہیں تو شکیب کی آواز ایک نئے زاویے سے اُبھرتی ہے وہ علائم و رموز کے سہارے وہ بات بڑی آسانی کے ساتھ کہہ جاتا ہے جو سب کے دل کی آواز ہے :

پھر ہوا سے سلگ اُٹھے پتے　　　پھر دھواں گلستاں سے نکلا

رستہ بھی واپسی کا کہیں بن میں کھو گیا　　　اوجھل ہوئی نگاہ سے ہرنوں کی ڈار بھی

کیا جانئے منزل ہے کہاں جاتے ہیں کس سمت　　　بھٹکی ہوئی اس بھیڑ میں سب سوچ رہے ہیں

ان حوصلہ شکن حالات میں شکیب کی سوچ شکست قبول نہیں کرتی بلکہ ایک نئے عزم کے ساتھ کروٹ لیتی ہے :

ہم اُبھرے بھی ڈوبے بھی سیاہی کے بھنور میں　　　ہم سوئے نہیں شب ہمہ شب سوچ رہے ہیں

ٹھوکر سے میرا پاؤں تو زخمی ہوا ضرور　　　رستے میں جو کھڑا تھا وہ کہسار ہٹ گیا

علامتیں شکیب کی غزل کی آبرو ہیں۔ جہاں تک اُردو غزل میں علامتوں کے استعمال کی روایت کا تعلق ہے شکیب نے اس سلسلہ میں سب سے زیادہ دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ شکیب کی علامتیں الفاظ کے حقیقی مفہوم اور ان کے تاثر کو مجروح نہیں کرتیں بلکہ قاری کے ذہن میں موجود کسی خاکے کے نقش و نگار کو اور بھی واضح کر دیتی ہیں۔ نئی نسل کے شعرا جنسی جذبے کے اظہار کے لئے علامتوں کا جو مضحکہ خیز اظہار کر رہے ہیں شکیب نے اس کے خلاف بھرپور احتجاج کیا اور اپنے اشعار سے یہ ثابت کر دیا کہ غزل میں علامتوں کا صحت مند استعمال سوچ کے نئے دروازے کھول سکتا ہے۔ اس لحاظ سے میں شکیب کو جدید اردو غزل میں صحت مند علامت پسندی کا محرک کہوں گا۔ شکیب کی اسی منفرد خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے احمد ندیم قاسمی نے "فنون" میں لکھا تھا "شکیب کا سب سے موثر ہتھیار اُس کے سمبل ہیں۔ شکیب کے سمبلوں میں نہ وہ کھنگی ہے کہ چھو لو تو بکھر جائیں، نہ وہ جدت (برائے جدت) کہ شاعر حسن آفرینی کی ذمہ داری سے الگ ہو کر صرف چونکانے پر کمر باندھ لے۔ یہ سمبل قاری کے ذہن میں ایک مکمل تصویر لے آتے ہیں اور اس تصویر کے پس منظر میں چھپا ہوا خیال یا جذبہ پورے حسن سے جگمگا اٹھتا ہے"

اگرچہ شکیب کے ہاں علامتوں کی بہتات ہے لیکن اُس کے اشعار میں دو علامتیں بار بار اُبھرتی ہیں۔ یہ علامتیں "صحرا" اور "پانی" سے عبارت ہیں۔ صحرا کی علامت شکیب کی شاعری میں موجودہ مادی دَور کی پیدا کردہ گھٹن اور فرد کی بے بسی کے اظہار کے طور پر اُبھرتی ہے اور پانی کی علامت لق و دق صحرا میں زندگی کی تلاش کی علامت بن جاتی ہے۔ ان علامتوں میں نہ صرف شاعر کا ذاتی احساس تنہائی سمٹا ہوا نظر آتا ہے بلکہ ان کے پس منظر میں آج کے ہر باشعور فرد کو اپنا وجود جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے:

جہاں تلک بھی یہ صحرا دکھائی دیتا ہے　　　مری طرح سے اکیلا دکھائی دیتا ہے

عجب نہیں جو اُگیں یاں درخت پانی کے　　　کہ اشک بوئے ہیں شب بھر کسی نے دھرتی ہیں

وہ کون تھا جو تمہارا سراغ پا نہ سکا　　　کہ میں تو اپنے ہی صحرا کے پار جا نہ سکا

گزری ہے بار بار مرے سر سے موجِ خشک　　　اُبھرا ہوں ڈوب ڈوب کے تصویرِ آب میں

جینے کے ساتھ موت کا ڈر ہے لگا ہوا　　　خشکی دکھائی دیتی ہے سمندر کو خواب میں

ترقی پسند تحریک کے آغاز میں اردو شاعری پر جو اعتراضات ہوئے ان میں سے مجتبیٰ حسین کا اعتراض سب سے زیادہ چونکا دینے والا ہے۔ اُن کے خیال میں سنہ ۱۹۳۶ء کے بعد شاعری نے سوچنا چھوڑ دیا۔ اس اعتراض نے مجھے اکثر اردو کی قدیم شاعری میں سوچ کے عنصر کی تلاش پر اُکسایا ہے۔ اگر سوچ کے دھارے چوٹی، کمر، زلف، مانگ، لب، ناف وغیرہ سے پھوٹتے ہیں تو پھر مجتبیٰ حسین کا اعتراض فی الواقع صحیح ہے۔ اس اعتراض کی ضرورت غالباً اُس وقت محسوس ہوئی جب فلسفیانہ خیالات کے زیر اثر غزل کی شعریت کے مجروح ہونے کا خدشہ پیدا ہوا چونکہ غزل کی صدیوں پرانی روایت میں یہ ایک نیا تجربہ تھا اس لئے اجنبیت کا احساس قدرتی بات تھی۔ غالب کے سے قادر الکلام شاعر نے غزل کی تنگنائے کا شکوہ شاید اسی لئے کیا ہوگا کہ ذہن کی عمیق سلوٹوں میں پیچ و تاب کھانے والے افکار کا اظہار غزل میں اُن کے لئے ممکن نہیں تھا۔ خیال اور اظہار کی درمیانی خلیج کو پاٹنے کے لئے اجتہاد کی ضرورت تھی اور اس اجتہاد کے لئے نابغہ ذہنوں کا وجود ناگزیر تھا۔ شکیب کی غزل میں خیال اور اظہار کے درمیانی بعد کو سمیٹنے کا عمل بڑا واضح ہے۔ وہ عہد حاضر کے فلسفیانہ خیالات کو اپنے نکمۂ تخیل کی روشنی میں بڑی خوبصورتی سے منتقل کرتے ہیں۔ بوجھل خیالات کے باوجود اُن کی شاعری کہیں بھی معمہ بنتی نظر نہیں آتی یا اُن کے فلسفیانہ اشعار اس حد تک دقیق نہیں ہوتے کہ اُن پر گنجلک ہونے کا گمان ہونے لگے۔ رمزیت و اشاریت جو بنیادی شعری حسن ہے شکیب کے ہاں ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ شکیب اپنی غزل میں جب فلسفیانہ نظریات کو سموتا ہے تو اُن کا رنگِ تغزل کچھ اور بھی نکھرنے لگتا ہے۔ انسانی روح کا سراغ ذہن و فکر کے لئے ایک معمہ بنا رہا ہے۔ روح سے متعلق شاید ہمیں شکیب کے خیال سے اتفاق نہ ہو لیکن اس ضمن میں اُس کا نقطۂ ہمیں سوچنے پر مجبور ضرور کرتا ہے:

کب تک رہے گا رُوح پہ پیراہنِ بدن　　　کب تک ہوا اسیر رہے گی حباب میں

یا پھر ان اشعار پر غور کیجئے:

یہ کون بتائے عدم آباد ہے کیسا!　　　ٹوٹی ہوئی قبروں سے صدا تک نہیں آتی

عالم میں جس کی دھوم تھی اُس شاہکار پر   دیمک نے جو لکھے کبھی وہ تبصرے بھی دیکھ

کیا کہوں دیدۂ تر یہ تو مرا چہرہ ہے   سنگ کٹ جاتے ہیں بارش کی اگر دھار گرے

ان اشعار کی روشنی میں شکیبؔ کی شاعری منطقی استدلال کی شاعری کے طور پر اُبھرتی ہے۔ شکیبؔ کے آخری دور کی غزلوں پر اس نظامِ فکر کی چھاپ خاص طور پر بہت نمایاں نظر آتی ہے لیکن یہاں بھی شعر و ادب کی جمالیاتی قدروں کا مکمل احترام ہے اور کہیں بھی کھردرے پن کا احساس نہیں ہوتا۔ شاید اس لئے کہ

تیشے کا کام ریشۂ گل سے لیا شکیبؔ   ہم سے پہاڑ کاٹنے والے بھی ہیں کہیں

تشبیہیں، استعارے اور کنائے اردو غزل کی روایت کا خاص جزو ہیں۔ شکیبؔ نے عصرِ جدید کے بیشتر شعراء کی طرح اس روایت سے انحراف نہیں کیا بلکہ اس کے دامن کو وسیع کرنے کے لئے نئے استعاروں اور کنایوں کا استعمال بڑی چابکدستی کے ساتھ کیا ہے۔ خصوصاً جاندار تشبیہیں شکیبؔ کا خاص سرمایہ ہیں۔ ان اشعار پر ایک لمحے کے لئے غور کیجئے۔ شاعر کے ذہن میں جھلملانے والا تصور ایک تصویر کی شکل میں آپ کی نگاہوں کے سامنے ابھرنے لگے گا:

اک یاد ہے کہ چھین رہی ہے لبوں سے جام   اک عکس ہے کہ کانپ رہا ہے شراب میں

اک یاد ہے کہ دامنِ دل چھوڑتی نہیں   اک بیل ہے کہ لپٹی ہوئی ہے شجر کے ساتھ

وہ اس کا عکسِ بدن تھا کہ چاندنی کا کنول   وہ نیلی جھیل تھی یا آسمان کا ٹکڑا تھا

ہوا نے توڑ کے پتّا زمیں پہ پھینکا ہے   کہ شب کی جھیل میں پتھر گرا دیا ہے کوئی

شکیبؔ کی غزل میں منظر نگاری خاص طور پر دیدنی ہے:

وہی جھکی ہوئی بیلیں وہی دریچہ تھا   مگر وہ پھول سا چہرہ نظر نہ آتا تھا
قریب تیر رہا تھا بطوں کا اک جوڑا   میں آبجو کے کنارے اداس بیٹھا تھا

وہ الوداع کا منظر وہ بھیگتی پلکیں   پسِ غبار بھی کیا کیا دکھائی دیتا ہے

منظر کو دیکھ کر پس منظر بھی دیکھئے   بستی نئی بسی ہے پرانے کھنڈر کے ساتھ!

شکیبؔ کی غزل ایک غیور اور خوددار انسان کی غزل ہے۔

مجھے گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں پہ گروں   جس طرح سایۂ دیوار پہ دیوار گرے

خوددار ہوں کیوں آؤں درِ اہلِ کرم تک   کھیتی کبھی خود چل کے گھٹا تک نہیں آتی!

لوگ کہتے ہیں کہ شکیب نے خودکشی کر لی۔ اختلاف کا حق محفوظ رکھتے ہوئے میں اس خیال سے اتفاق نہیں کروں گا۔ میرے نزدیک اس غیور انسان کی موت ایک حادثے کا نتیجہ تھی۔ اس حادثے کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے؟ — یہ ایک الگ سوال ہے۔ شکیب کی بے وقت موت کے پس منظر سے واقف ہوتے ہوئے بھی میں اس بحث میں نہیں الجھوں گا۔ مجھے تو صرف یہ کہنا ہے کہ شکیب کا انجام اس کی موت سے بہت پہلے اس کی غزل میں جھلکنے لگا تھا:

فصیلِ جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدودِ وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی

لہو لہو ہوں سلاخوں سے سر کو ٹکرا کر
شکیب بابِ قفس کیا کبھی کسی آن کھلا

اگر گرا تھا کوئی پرندہ لہو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر

جھکی چٹان، پھسلتی گرفت، جھولتا جسم
میں اب گرا ہی گرا تنگ و تار گھاٹی میں

غزل کی نشاۃ الثانیہ کے بعد اس کے "دورِ زوال" کے آغاز میں پروفیسر حمید احمد خاں نے غزل سے متعلق اپنے ایک پُر مغز مقالے میں لکھا تھا۔ "متمدن دنیا پر ایک ہزار سال کی فرمانروائی کے بعد غزل آج تنقید کے دربار میں جواب دہ ہے۔" میں پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر شکیب کو جو بقول احمد ندیم قاسمی غزل کی "امید گاہ" ہے۔ تنقید کے دربار میں طلب کیا جائے تو غزل شرمندہ نہیں ہو گی!

انور سدید

ایک اور شہیدِ مے

جب بھی کسی ادیب کے مرنے کی خبر آتی ہے میرا دل یکبارگی دھڑک کر خاموش ہو جاتا ہے۔ شریانوں میں دوڑتا ہوا سیال لہو رکتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے میری اپنی زندگی کے درخت سے ایک پتا سوکھ کر نیچے گر گیا ہے۔ ہر ادیب کی موت سوچ کے ایک نا دیدہ پر مہرِ سکوت ثبت کر دیتی ہے۔ حق کی جستجو اور سچائی کی تلاش کا ایک سلسلہ رک جاتا ہے۔ ایک سقراط زہر کا جام تھام لیتا ہے اور ایک منصور سولی پر چڑھ جاتا ہے۔

شاد امرتسری بھی ایک سقراط تھا جس نے برسوں سے زہر کا جام ہاتھ میں تھام رکھا تھا اور وہ دنیا سے اپنے دکھوں اور غموں کا انتقام لینے کے لئے اس زہر کو قطرہ قطرہ اپنی شریانوں میں اتار رہا تھا۔ شاد امرتسری وہ منصور تھا جو ہر شام سولی پر چڑھتا اور ہر صبح ہنستی مسکراتی زندگی کا سواگت کرنے کے لئے بیدار ہو جاتا ۔۔۔ لیکن کل ایک ایسا بھیانک لمحہ آیا کہ وہ حسبِ معمول سولی پر چڑھا تو سولی اسے چاٹ گئی۔ اس کی رگوں میں زہر تو برسوں سے دوڑ رہا تھا لیکن کل اس زہر نے کڑیالے سانپ کا روپ دھارا اور اس کے دل ہی کو ڈس لیا۔

بارہ اکتوبر کی صبح کتنی سوگوار تھی!

میں انگریزی اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کا ایک ایک گوشہ قتل و غارت، چوری اور ڈکیتی، اغوا اور عصمت دری، ریاست اور سیاست کی چکاچوند خبروں سے منور تھا۔ اسی اخبار کے ایک گوشے میں فوت شدگان کا ایک چھوٹا سا قبرستان ہوتا ہے۔ نئی قبروں پر پھول چڑھانے کے لئے میں روزانہ اس قبرستان کا مطالعہ باقاعدگی سے کرتا ہوں۔ لیکن اس روز میرا دل اداس تھا اور قرار حاصل کرنے کے لئے میں عمومی سرخیوں کے گلستان میں کھو کر اس قبرستان کو بھول گیا تھا۔ شام کو ڈاکٹر وزیر آغا سے ملاقات ہوئی تو وہ بے طرح پریشان تھے۔

"سنا کچھ ۔۔۔ شاد امرتسری ۔۔۔۔۔"

سسکتے سسکتے ان کی آواز بھرا گئی لیکن میں مفہوم سمجھ گیا۔ پھر سجاد نقوی اور نسیم شمائل پوری آئے اور وہ بھی خاموشی سے بیٹھ گئے۔ ہم سب ایک دوسرے کے غم میں شریک تھے:

شاد امرتسری کئی دنوں سے بیمار تھا۔ اس کے پاؤں سوج گئے تھے اور وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ شاید کثرتِ مے نوشی رنگ لائی تھی کہ اس کا جگر اپنا بسی کام کرنے سے عاری ہو چکا تھا۔ ابھی چند روز ہوئے میں لاہور گیا تو خواجہ بشیر سے شاد کا پوچھا کہنے لگے "سیدو آباد سے آ گیا ہے۔ سخت بیمار ہے۔ اسے ضرور مل کر جانا۔ کوئی پتہ نہیں کب ہمیں چھوڑ جائے۔"

میں اسے ملنے کے لئے دل محمد روڈ والے مکان پر چلا گیا۔ بیماری نے اسے نڈھال کر رکھا تھا لیکن آنکھوں میں سکت تھی۔ بوتل اوندھی پڑی تھی۔ اور زندگی کی بشاشت اس کے چہرے پر پوری طرح رونق افروز تھی۔ بوتل کو دیکھا، کھلکھلا کر ہنسا اور کہنے لگا "میں نے توبہ کر لی ہے۔ اب باقاعدگی سے علاج کر رہا ہوں۔ بس

ذرا ٹھیک ہو لوں تو سرگودھے آؤں گا۔ وہاں سے اکٹھے آغا صاحب کے فارم پر چلیں گے۔"

پرسوں شاد امرتسری کی بیماری اسے الوداع کہہ چکی تھی اور وہ پوری طرح صحت یاب ہو چکا تھا لیکن وہ پروگرام جو اس نے میرے ساتھ بنایا تھا سرے نہیں چڑھ سکا وہ اس سے پہلے ہی ایک اور لمبے سفر پر روانہ ہو چکا تھا اور جاتے جاتے پیغام دے گیا کہ:

ہم نہ ہوں گے تو ہمیں یاد کرے گی دنیا

اس روز میں ابھی سو رہا تھا کہ ساتھ کے کمرے میں زور کا چھناکا ہوا اور کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ ساتھ ہی پہلے بیوی کی زوردار آواز گونجی، پھر منجھلے بچے کی چیخ سنائی دی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا اور اس قیامت کو دیکھنے کے لئے دوسرے کمرے کی طرف دوڑا۔ معلوم ہوا کہ بچے نے بلور کا ایک جگ توڑ ڈالا ہے اور بیوی اس نقصان مایہ پر برس رہی ہیں کہ حادثے کی اطلاع پڑوس میں ہو جائے اور شماتتِ ہمسایہ کی تقریب ضائع نہ ہو۔ میں نے کہا "بیگم! جگ ہی ٹوٹا ہے کوئی مر تو نہیں گیا۔ اس مار دھاڑ اور چیخ پکار کا فائدہ؟"

"رو کر کہنے لگی "آپ کو کیا پتہ یہ جگ مجھے نسرین نے تحفہ دیا تھا جو اب اس دنیا میں نہیں!"

مجھے واقعی پتہ نہیں تھا کہ یہ جگ بیوی کو کیوں عزیز تھا لیکن اس شام جب سوگوار اور مغموم وزیر آغا نے مجھے داغِ فراق کا وہ نسخہ دکھایا جس کے اولیں ورق پر شاد امرتسری کے دستخط ثبت تھے تو مجھے پتہ لگ گیا کہ بچھڑ جانے والوں کے تحفے کیوں اتنے عزیز ہوتے ہیں۔

"داغِ فراق" کے سرورق پر شعلوں میں لپٹی ہوئی ایک دوشیزۂ جمال کا چہرہ ہے جس کی مغموم آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ شاد اسی سیم تن دوشیزہ کی آنکھ سے ٹپکا ہوا ایک آنسو تھا۔ یہ لڑکی اس کے دھیان کی سطح پر ابھری اور ایک لمحے میں اپنی چھب دکھا کر اوجھل ہو گئی اور اسے آوارگی کے لمبے چوڑے صحراؤں میں چھوڑ گئی۔ شاد امرتسری کی ساری زندگی کا سرمایہ اسی لڑکی کی یاد ہے جس کے تعاقب میں دکھوں سے چور، زخموں سے معمور، شکستہ آرزوؤں سے بھرپور اور ناآسودہ تمناؤں سے ہمکنار وہ تمام عمر سرگرداں رہا۔ اس البیلی چھب اور نیاری شوبھا والی لڑکی کا تعارف اس نے یوں کرایا ہے:

لمبی چوٹی والی لڑکی جس کی آنکھیں کالی ہیں
اس کے گورے گال اور بھوری آنکھیں دیکھنے والی ہیں
خود کالج میں پڑھتی ہے اور بچوں کی استانی ہے
سر سنگیت کی رسیا ہے اور شعروں کی دیوانی ہے
شعروں اور نغموں کی دھنیں وہ اکثر خود ہی بناتی ہے
مجھ سے ملنے آتی ہے تو اپنی دھنیں سناتی ہے
گاتے گاتے وہ میری آنکھوں کو تکتی رہتی ہے
میرا دل یہ کہتا ہے وہ دل کی باتیں کہتی ہے
گانا گا کر پھر وہ ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتی ہے
اور پھر مجھ سے بائرن شیلے کیٹس کی باتیں کرتی ہے

اسے احساس تھا کہ:

محبت اک سفر ہے تند خو دریا کی موجوں کا
یہ موجیں اپنے سینوں میں کروڑوں بلبلوں کو

جنم دیتی ہیں خود ہی توڑتی ہیں حیلہ سازی سے
کرشمے پھوٹتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں رہ رہ کر
مگر موجیں کہ جن کی برق پائی برق رفتاری
چٹانوں کی سلوں کو ریزہ ریزہ کرتی رہتی ہیں

لیکن وہ ساری عمر اس تند خو دریا کی تیز موجوں سے سر ٹکراتا رہا۔ اسی مجسمے نے اس کے ذوقِ تجسس کو ابھارا اور نروان کی تلاش میں جستجو کے راستے پر ڈال دیا۔ تلاش شاد امرتسری کی شاعری کا محور ہے۔ اس تلاش میں اس کے تلوے راستے کے خاروں سے چھلنی ہو جاتے ہیں۔ ہمت ساتھ چھوڑ دیتی ہے تو وہ بنتِ عنب کا سہارا لے لیتا ہے:

بزمِ گیتی سے بھاگنے والو   ٹھہرو ٹھہرو شراب باقی ہے

شراب اس کے دکھوں کا مداوا بنتی ہے تو وہ خود فراموشی کے عالم کو قائم رکھنے کے لئے زندگی کی موم بتی کو دونوں سے جلا دیتا ہے اور بے تماشا پینے لگتا ہے اور بالآخر اپنی آگ میں خود ہی جل جاتا ہے۔ مرنے کو تو وہ اسی روز مر گیا تھا جس روز کالی زلفوں والی لڑکی ایک جاوداں لمحے کو جنم دے کر اس کی زندگی کو سوگوار کر گئی تھی لیکن جسم و جان کا رشتہ بہر حال برقرار رہا اور سانس کی آمد و شد جاری رہی اور وہ فلک شگاف قہقہے لگا کر کہتا رہا:

شاد امرتسری کو دیکھے گا   اک نہ اک دن خمیدہ سے ہوگا

میں نے انگریزی اخبار پھر اٹھا لیا ہے۔ پانچویں صفحے کے قبرستان میں ایک نئی قبر تعمیر ہوئی ہے جس پر کوئی کتبہ نہیں۔ میں اس قبر کی مٹی کو سونگھ رہا ہوں مجھے اس سے شاد امرتسری کی خوشبو آ رہی ہے اور میرے آنسو بہہ رہے ہیں اور بہتے ہی جا رہے ہیں۔

دیویندر اِسّر

پاپ آرٹ — اِشتہار یا نئی حقیقت پرستی؟

پھلوں کے رس اور سوپ کے ڈبّے، کوکا کولا، وہسکی اور بیئر کی بوتلیں، ماڈرن مِنرو کی تصویریں، کومکس، اشتہاری بورڈ اور روزمرّہ کے استعمال کی بے شمار چیزیں اور مختلف رنگ جب کینوس پر ایک مخصوص انداز اور توازن (اور غیر متوازن انداز) سے یکجا کر دیے جائیں تو یہ پاپ (POP) آرٹ ہے۔

کوکا کولا کی بڑی بڑی بوتلیں، کئی فٹ لمبے سوپ کے ڈبّے (مصوّر: اینڈی وورہول)، ۲۶ فٹ لمبی اور ۸ فٹ اونچی تصویر (مصوّر: جیمز روزن کوسٹ؟) اور تصویر میں گھاس کاٹنے والی مشین (مصوّر: جم ڈائین) پاپ آرٹ کے ہی تو نمونے ہیں۔

جدید دور اشتہار کا دور ہے۔ روزمرّہ کی ضرورت (اور غیر ضرورت) کی چیزوں کے بڑے بڑے اشتہار، بڑے پیمانے پر نشر و اشاعت کے ذرائع سے ہر وقت ہماری نظر کے سامنے جھلملاتے رہتے ہیں۔ وہ ہمارے احساس و فکر کے لازمی اجزا بن چکے ہیں۔ ان اشیاء کی تصویریں ہمارے ذہن میں نئے نئے نمونوں اور نئی نئی علامتوں کو جنم دیتی ہیں۔ بس اسٹاپ اور ریلوے اسٹیشنوں پر، بازاروں اور عام گذرگاہوں پر ہر جگہ بڑے بڑے اشتہار ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اس کشش کے جادو سے بچنا مشکل ہو گیا ہے۔ فلم اسٹاروں کی بڑی بڑی نیم عریاں اور شہوت انگیز تصویریں، کوکا کولا (سافٹ ڈرنکس) کی بڑی بڑی بوتلیں، شوکیس میں ٹوتھ پیسٹ، صابن، پاؤڈر، سوپ اور رس اور آرائش و زیبائش کی طرح طرح کی پُرکشش چیزیں، ہر شے پہلے اشتہار بن کر ہماری نظر کا مرکز بنتی ہے۔ ایک بڑی شکل اختیار کر کے — اور پھر ان چیزوں کے تصوّرات ایک دوسرے میں شامل ہو کر ہمارے ذہن میں کئی طرح کے پیٹرن (PATTERN) کا روپ دھار لیتے ہیں۔ پاپ مصوّر ان کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہی باعث ہے کہ کچھ نقاد پاپ آرٹ کو فنِ اشتہار بازی ہی کی ایک شکل قرار دیتے ہیں۔

کیا پاپ آرٹ اشتہاری فن ہے؟ شاید پاپ مصوّر بھی اس سے انکار نہیں کرتے کیونکہ یہ دور اشتہار کا دور ہے۔ اشتہاری بورڈ، اخبار، رسالے، ریڈیو، ٹیلی ویژن، فلم وغیرہ نے اشتہار کو فن کا درجہ دے دیا ہے۔ پاپ فن کاروں نے ان سب سے اور کومکس، فوٹو گرافس اور سوپر مارکٹ اور ٹریڈ مارک سے اپنے موضوع اور انداز حاصل کیا ہے۔ اس آرٹ نے اپنے تصوّرات بھی ہر دلعزیز، تجارتی اور اشتہاری آرٹ سے حاصل کئے ہیں۔ اس لئے پاپ آرٹ ایک ایسا طرزِ فن ہے جو فنونِ لطیفہ سے کسی حد تک مختلف ہے کیونکہ یہ روزمرّہ کی اشیاء کو ہی فن کا مواد بناتا ہے یا اُن کو فن کی سطح پر لا کر پیش کرتا ہے۔ ان کو حسن کی تمثیل تسلیم کر کے ان کی پرستش کرتا ہے۔

جب بھی پاپ آرٹ کی کوئی بھی نمائش ہوئی آرٹ کی دنیا میں ہلچل پیدا ہو گئی اور اس کے حق اور مخالفت میں دلیلیں پیش کی جانے لگیں۔ ایسی ہی ہلچل اس وقت پیدا ہوئی تھی جب دادا ازم اور سرریلزم اور کیوبزم کے مداح فن کاروں نے آرٹ کی دنیا میں سنسنی پیدا کر دی تھی۔ پاپ آرٹ نے بھی دادا ازم اور سرریلزم سے انسپریشن لی ہے اور اُن سے متاثر ہو کر حقیقت کو نئے روپ اور معنی میں منعکس کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے اسے نئی حقیقت پرستی، دنیا آرٹ، نیا دادا ازم یا نیا سرریلزم، کا پیش رَو تسلیم کیا گیا ہے کیونکہ پاپ آرٹ حقیقت اور رومان کا ایک نیا امتزاج پیش کرتا ہے۔

آرٹ کی دنیا میں دو رجحان مختلف سمتوں میں جاری رہے ہیں۔ ایک رجحان ہے فنونِ لطیفہ کا اور دوسرا مقبول عام فن کا جس کو ماس کمیونی کیشن (MASS COMMUNICATION) اور ماس پروڈکشن (MASS PRODUCTION) سے بڑی تقویت ملی اور انہی کے عکس اس نئے آرٹ میں ملتے ہیں۔ اس کا انسپریشن فنونِ لطیفہ نہیں اشتہاری فن ہے۔ یہی باعث ہے کہ کچھ نقادانِ فن اسے آرٹ کی مملکت سے جلاوطن کرنے پر مصر ہیں محض اس لئے نہیں کہ پاپ آرٹ اشتہارات یا حقیقی اشیا کا مجموعہ، بلکہ اس لئے کہ اس میں مصور کی کوئی ذہنی یا جذباتی شمولیت نہیں کیونکہ وہ میکانکی ازسرِ نو تشکیل کی غیر ذاتی تکنیک کا استعمال کرتے ہیں۔

ان فن کاروں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کمرشل فن کار ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو فنونِ لطیفہ کے ماہر ہیں۔ جیسا کہ جاسپر جانس، لیکن نقادوں میں اس بات پر اختلاف رائے ہے کہ جاسپر جانس پاپ آرٹسٹ ہے یا نہیں، البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پہلا فن کار ہے جس نے فن کاروں کو کچھ مخصوص اشیا کی عکاسی کی قید سے آزاد کیا۔ اس نے بتایا کہ فن کا مواد کوئی بھی شے ہو سکتی ہے۔ فن صرف رنگوں اور خطوط کے توازن تک ہی محدود نہیں۔ جاسپر جانس اور رابرٹ روشن برگ پاپ آرٹ کے صفِ اول کے فن کار سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ انڈریو وارہول، رائے لکشن ٹائن، جیمز روزن کوسٹ، کوزیس اولڈن برگ اور جم ڈائین جیسے مشہور فن کار بھی اس گروہ میں شامل ہیں اور اس تحریک کے پیروکار آج ہر ملک میں موجود ہیں۔

ان فن کاروں کی تصویروں سے صاف واضح ہے کہ پاپ آرٹ کیا ہے یہ کہنا صحیح نہیں کہ پاپ آرٹسٹ حقیقی اشیا کو ہی ان کی اصل شکل میں پیش کر دیتے ہیں، چاہے وہ سوپ کا ڈبہ ہو یا کسی ماڈل لڑکی کی تصویر (شاید کبھی زندہ ماڈل بھی کینوس پر آ جائے) یا بیئر کی بوتل یا یہ کہ وہ ان اشیا ہی کو فن کا مواد سمجھتے ہیں۔ پاپ آرٹ تو اشیا کی ماس کمیونی کیشن کی تمثیلوں پر مبنی ہے۔ ان تمثیلوں سے حقیقت کا نیا احساس پیدا ہوتا ہے جو خارجی چیزوں ہی کی طرح حقیقی ہے یا اُن سے بھی زیادہ سچا۔ اس لئے اُن کے نزدیک رومان خارجی دنیا کی اشیا سے زیادہ حقیقت کا شعور دے سکتا ہے۔ خاص کر اس حالت میں جبکہ پہلے جذبات اور خیالات دقیانوسی روایت بن چکے ہیں۔

پاپ آرٹ کوئی منظم تحریک نہیں۔ ان فن کاروں کا کوئی مشترکہ منشور نہیں۔ ان سب نے آزادانہ طور پر اپنا کام شروع کیا۔ وہ ایک دوسرے سے اپنے مزاج، نقطۂ نظر، پسند، صلاحیت اور طرزِ فن میں مختلف ہیں لیکن ان سب میں کچھ ایسی باتیں مشترک طور پر ملتی ہیں جن کے باعث وہ پاپ آرٹسٹ مانے جاتے ہیں۔ ان میں اظہار اور طرز کا تنوع ہے۔ مثلاً جیمز روزن کوسٹ کے فنی نمونے دیکھئے۔ ان کے نزدیک اشیا کے مکمل روپ بجائے اُن کے اجزا یا حصوں کے زیادہ اہم ہیں۔ اس کی ایک بہت بڑی تصویر کی ٹھوڑی اور پیشانی میں اکیس فٹ کا فاصلہ ہے۔ اس تصویر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ چہرہ عجیب جغرافیہ بن گیا ہے اور ناک یوگوسلاویہ کے نقشے کی طرح دکھائی دیتی ہے اور ہم بڑی بڑی صورتوں میں اشیا کے صرف ٹکڑے ہی دیکھتے ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ ہم زندگی کی مکمل تصویر نہیں دیکھ پاتے بلکہ اُن کے کچھ ٹکڑوں کو ہی دیکھتے ہیں۔ اگر ہم کسی آسمانی قوت کے باعث زندگی کا مکمل اور جامع روپ دیکھ سکیں تو شاید فن کی تخلیق ہی ختم ہو جائے۔ روزن کوسٹ نے اپنی تصویروں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پاپ آرٹ کمرشل آرٹ کی نقل یا بازگشت نہیں بلکہ کامک (تمثیلی) تخلیق ہے۔ یہ آرٹ کا نیا بُعد ہے۔ اس نے فنونِ لطیفہ اور کمرشل آرٹ کی حدوں کو مٹا دیا ہے اور ایک نئے طرزِ فن کو جنم دیا ہے۔

ماس کمیونی کیشن اور اشتہار کے اس دور میں پاپ آرٹ کی تحریک ناگزیر تھی۔ یہ جدید سرمایہ پرست دور کی پیداوار ہے۔ اس نے آرٹ کی دنیا کو نئے موضوعات اور مواد اور اشکال سے روشناس کرایا ہے۔ ایک نقاد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس وقت سوال یہ نہیں کہ کیا پاپ آرٹ عظیم آرٹ ہے بلکہ یہ ہے کہ کیا یہ آرٹ اس دور کے نازک جذبات، شعور اور ماحول کی نمائندگی کرتا ہے یا نہیں یا یہ کہ اس فن کا مواد اور موضوع اور تکنیک فن کے نقطۂ نظر سے موزوں اور جائز ہیں یا نہیں۔ پاپ آرٹ مکمل فن نہیں۔ اس کی کوئی آخری قدر متعین نہیں کی جا سکتی۔ یہی کیا کم ہے کہ پاپ آرٹ نے انسانی پہلو کو پھر سے

اہمیت دینا شروع کر دیا ہے۔ لیو لرسن کے قول کے مطابق پاپ آرٹ میں وہی انسانی اقدار موجود ہیں جو کسی امن موومنٹ یا ایٹمی ہتھیاروں کے خلاف مظاہرے اور بموں سے دہشت زدہ دنیا کے خلاف احتجاج اور بغاوت میں ہے۔

پاپ آرٹ کی پرورش شہری تہذیب میں ہوئی ہے۔ شہری اثرات ہی اس تحریک کا سرچشمہ ہیں اس لئے اس کی معنویت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کئی پاپ فن کار اس تکنیک کو محض سنسنی پھیلانے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور وہ اس فن کی کافی مضحکہ خیز صورتیں پیش کرتے ہیں جن میں چمک دمک اور شور زیادہ ہے اور معنی کی گہرائی کم۔ ان کا فن سماجی تنقید یا طنز کے ناکام اور غیر واضح نمونے پیش کرتا ہے۔ جیرالڈ نورڈلینڈ نے پاپ آرٹ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ غیر مربوط اشیا کو ایک دوسرے سے جوڑ دینا فن کی تعمیری تخلیق کے لئے کافی نہیں۔ فن کار کو یہ اشیاء اس طرح جوڑنی چاہئیں کہ دیکھنے والے کو ان کے ایک دوسرے کے ساتھ آنے سے تحیر اور تسکین کا احساس ہو۔ اگر ہمارے فن کی تخلیق خارجی شعور کے لئے انسانی احساس کے غیر لفظی اظہار کے لئے ہوئی ہے جیسا کہ میں مانتا ہوں، تو پاپ آرٹ حقیر آرٹ ہے کیونکہ اس پر لفظی خیالات حاوی ہیں۔ اس میں ہمدردی اور تنقید نہیں اس لئے یہ صحیح طور ابلاغ کی خوبی سے عاری ہے۔

پاپ آرٹ ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ تہذیب کے موجودہ ملبے میں زندہ رہنے سے کیا احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس تہذیب کے ثبوت کا محض ایک حصہ ہے۔ اس کا سماجی اثر صرف یہی ہے کہ ہم بگاڑ شدہ حقیر اور غیر شائستہ دنیا سے سمجھوتا کر لیں، جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کا اثر اشتہاری فن سے مختلف نہیں۔ بلنٹ کی نظر میں یہ ایک ایسا سمجھوتا ہے جسے آج سب سے زیادہ رد کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی ایک راستہ ہے جس سے فن اور خود زندگی بناوٹی مقبول عام تمثیلوں اور ریاکارانہ تجارت سے بچایا جا سکتا ہے۔

پاپ آرٹ کا شور ہر سو سنائی دے رہا ہے۔ اس کے کئی مداح بھی ہیں اور کٹر مخالف بھی۔ خطرہ یہ ہے کہ پاپ آرٹ نئی حقیقت پرستی کے پردے میں کمرشل فن کا شکار ہو کر نہ رہ جائے اور جدیدیت کے نام پر سنسنی پھیلانے کا سنٹ ثابت نہ ہو۔ اس لئے ایسے فن کاروں سے بچنے کی ضرورت ہے جو فن کے وفادار نہیں اور نہ ہی سنجیدہ ہیں۔ جو محض نقالی پر اپنا کاروبار چمکائے ہوئے ہیں۔ اس صورت میں اس فن کی رو میں کبھی نئے سنجیدہ اور جدید تہذیب کے نمائندہ فن کی نشوونما ہو سکتی ہے جو اپنے دور کی زندگی اور فن میں ایک نیا توازن اور ربط قائم کر سکے گا۔

هدایت اللہ اختر

کشمیری فنون پر عربی اور ایرانی اثرات

طلوعِ اسلام سے قبل ہندوستان کی طرح کشمیر ہم رنگ معاشرے کی دولت سے محروم ضرور تھا لیکن کشمیریوں کے محنتی اور جفاکش ہونے میں کبھی شک وشبہ کی گنجائش ہرگز نہیں۔ کشمیریوں کی جفاکشی اور جاں فشانی ہی کا نتیجہ تھا جس نے ہندوستان اور ہندوستان کے فلک بوس پہاڑوں کے دامنوں میں اشوک اور بدھ مت کے پرچار کے لئے دیوہیکل بت تراشے، مندر کھڑے کئے اور بڑی بڑی چٹانوں پر تختے تراش کر ان پر اشلوک کندہ کرڈالے جنھیں ریت کے طوفان اور باد و باراں کے تھپیڑے نہ مٹا سکے اور جو آج بھی کشمیریوں کے فنِ تعمیر کا پتہ دیتے ہوئے چین کی سرحدوں تک بکثرت ملتے ہیں کشمیری فن کار جب تیشے لے کر پہاڑ پر چڑھتے تو یہ پہاڑ ہوتا اور جب اترتے تو پہاڑ دیوتاؤں کی آماجگاہ میں تبدیل ہوگیا ہوتا۔

یہی عالم پانی کے تہہ خانوں میں تھا۔ جھیل وُلر کی تہوں میں سلطان زین العابدین بڈشاہ نے جب غوطہ خور بھیج کر مندروں کا کھوج لگایا تو پانی کی تہہ میں کئی ایک مندر اور کتنی ہی مورتیاں برآمد ہوئیں یہ سب کشمیریوں کے فنِ گراں بہا کے نمونے تھے۔ بعد ازاں اس آبگیر کے درمیان ایک عمارت کھڑی کردی گئی جس کا نام "زینہ لنک" تھا۔

کشمیریوں نے ظہورِ اسلام سے پیشتر، سنگ تراشی، مصوری، رقص و موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ میں جو کمال حاصل کر رکھا تھا وہ زیادہ تر ہندو دھرم، سنیاس، سادھنا اور ترکِ دنیا کی جانب بہت زیادہ مائل تھا۔ لیکن اسلام کے مبلغ اور عرب کے جفاکش جب اس خطہ حسین میں وارد ہوئے تو انھوں نے اس ملک کے محنت کشوں کو ایک حقیقت سے آشکار کردیا۔ کھیتی باڑی کے ڈھنگ سکھائے، صنعت و حرفت سے روشناس کرایا۔ فنون کے عروج اور تجارت کے اصول بتائے۔ ہندوستان، ایران، افغانستان اور عرب ممالک سے رابطے قائم کئے۔ برہمنوں سے اقتدارِ علم چھینا اور تعلیم ہر فرد پر لازم کردی۔ دیوتاؤں کی زبان سنسکرت ان کھنڈروں میں دفن ہو گئی جنھیں کشمیریوں نے کندہ کیا تھا اس کی جگہ فارسی نے لے لی اور کشمیر کی مقامی زبان کشمیری کے لئے رسم الخط بھی فارسی ہی سے لیا گیا۔ مندروں کی جگہ مسجدوں نے لی وقد بت تراشی ختم ہوگئی۔ مسجدوں کی دیواروں پر قرآن کی آیات کندہ ہونے لگیں۔ شعر و نغمہ پر بھی ایرانیت چھا گئی۔

مصوری میں شہزادوں اور پری زادوں کی تصاویر کی بجائے خوبصورت بیل بوٹے بننے لگے اور خطاطی ہونے لگی۔ تلوار کے پھلوں، توپ کے دہانوں اور خنجروں کے دستوں پر جہاں خونخوار درندے اور برہنہ راکشس بنائے جاتے تھے، پھول پتیاں کندہ کی جانے لگیں اور عربی حروف میں اشعار صیقل ہونے لگے۔ ان میں زرد جواہر سے مرصع ہتھیار مثلاً خنجر، زرہ، کٹار، خود، تلوار جو اثرات لئے ہوئے ہیں ان سے ایرانی سلاحِ جنگ کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ لباس میں ڈھیلا فرغل، سر پر پگڑی ٹانگوں میں شرعی پاجامہ، کاندھے پر چادر ہندو مسلمان سبھی یہی لباس اپنانے لگے کہیں کہیں کرتہ، ہندو لنگوٹی میں نظر آتے ہیں ورنہ کا ٹھیٹھ لباس اوپر بیان کردیا گیا ہے اور یہی کشمیریوں

کا قومی لباس ہے جو قطعی طور پر قدیم ایران سے ملتا ہے۔ عربی اور ایرانی تمدن کے اپنائے جانے پر ساگ پات کی جگہ گوشت نے لی۔ اور گوشت کے پکوان اب تک خاص طور پر ایرانی اور عربی چلے آتے ہیں جس طرح عرب ایک ہی تھال پر بیٹھ کر کھاتے ہیں اور ایرانیوں کی قالین اور گبھوں پر نشست ہوتی ہے بالکل وہی طور و طریق کشمیریوں کے ہیں غرضیکہ کشمیری معاشرے کے جس شعبے کا تجزیہ کیا جائے۔ اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ کشمیر نے زندگی کے ہر شعبے میں عربی تمدن اور ایرانیت کو اپنایا ہے اسی لئے کشمیر کو ایرانِ صغیر بھی کہا جاتا ہے۔ افغان عہدِ حکومت میں کشمیری صنعت کا یہ عالم تھا کہ یہاں کی بنی ہوئی شالیں، افغانستان، ایران، ترکستان اور روس تک جاتی تھیں۔

جارج فاسٹر اپنے ۱۷۸۳ء کے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ کشمیر میں نہ صرف شمالی ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں سے آئے ہوئے سوداگر اور تجارت پیشہ لوگ نظر آتے ہیں بلکہ تاتار، ایران اور ترکی کے سوداگر بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں جو خوب پیسہ کمانے کے ساتھ ساتھ کشمیر کی آب و ہوا اور دلکش مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

کشمیر کی مشہور للہ دید شومت کی پیرو ایک درویش خاتون تھی جو وحدت الوجود کے فلسفہ کی قائل تھی۔ حضرت شاہ ہمدانؒ کی کشمیر میں آمد پر اس نیک سیرت خاتون نے اسلام کی تعلیمات کو اپنایا۔ وادی میں اسلام کے آغاز کا اثر یہ تھا للہ عارفہ کا صوفیانہ کلام جسے اس نے کشمیری زبان کا جامہ پہنایا بچے بچے کی زبان پر آگیا، اور اس کے دوہے گوشے گوشے میں گائے جانے لگے۔ کشمیری عوام شروع شروع میں فارسی اور عربی سے نابلد تھے۔ ان کی زبان کشمیری تھی لیکن شاہ ہمدانؒ کے ہمراہ آئے ہوئے سات سو مبلغین اور معلمین نے بڑی جلدی کشمیری زبان میں مہارت حاصل کی اور اسی زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر کشمیریوں کو عربی، فارسی اور ترکی الفاظ و تراکیب سے روشناس کرا دیا، آہستہ آہستہ سنسکرت جو سرکاری زبان تھی متروک ہوگئی اور پورے کشمیر میں اسلامی علوم اور اسلامی تعلیمات کا عروج شروع ہوگیا۔

یہ دور کشمیری شاعری کا دورِ اول کہلاتا ہے۔ اور اس دور کے نمائندوں میں شتی کنٹھ، للہ عارفہ اور شیخ نور الدین ولی قابلِ ذکر ہیں۔

مغل عہد کی آمد آمد تک کئی عرب اور کتنے ہی ایرانی فاضل سرزمینِ کشمیر میں آکر اپنے علم کا کمال اور حکمت کے موتی بکھیر چکے تھے چنانچہ مرزا حیدر نے تاریخِ رشیدی کشمیر ہی میں لکھی۔

امیر فتح اللہ شیرازی خوراک کی بے اعتدالی سے بیمار ہوئے اور ۹۹۵ھ میں سری نگر میں انتقال ہوا اور کوہِ سلیمان پر دفن کر دیئے گئے۔ مغل شہنشاہ اکبرِ اعظم کو امیر کی وفات سے بہت صدمہ ہوا ابو الفضل فیضی نے مرثیہ لکھا: ؎

دگر ہنگام آں آمد کہ عالم از نظام افتد

جہانِ عقل را در نیم روز علم شام افتد

۱۰۰۵ھ سری نگر ہی میں اکبر نے جمال الدین حسین انجو کو فارسی میں لغت مرتب کرنے کو کہا۔ یہ فرہنگ اکبر کے زمانے میں شروع کی گئی اور عہدِ جہانگیری میں مکمل ہوئی۔ بارہ برس کی محنت سے تمام قدیم شعراء کے کلام میں سے تمام تر الفاظ یکجا کیے گئے۔ تزکِ جہانگیری میں درج ہے کہ جمال الدین حسین انجو کو شہنشاہ نے "عز الدولہ کا لقب دیا اور جمال الدین حسین انجو بہار کے گورنر ہوئے"

اسی طرح ملا محمد علی کاشمیری، کشمیر سے احمد نگر گئے۔ پہلے نظام شاہی میں ملازم رہے۔ پھر سلطان برہان الملک کے دربار سے وابستہ رہے۔ عبدالرحیم خانخاناں کو متاثر کیا چنانچہ خانخاناں نے عربی کی مشہور کتاب "علامۃ العلما خواجہ حسین الدین" کا فارسی میں ترجمہ کرایا۔ اسی طرح ملا باقر کشمیری جہانگیر کے دربار سے وابستہ تھے۔ ملا محمد یوسف کشمیری ہمدانی ایک مشہور شاعر اور انشا پرداز تھے۔ ملا یوسف ایک نامور سپاہی تھے اور یہ

مشہور عالم محمد صادق کشمیری کے بھائی تھے جو "طبقات شاہجہانی" کے مصنف تھے۔ غرضیکہ ایران اور کشمیر کے باہمی روابط نہ صرف مذہبی اور روحانی بلکہ علمی اور لسانی بھی تھے۔ کیونکہ ایران اور کشمیر کے مذہبی، روحانی اور ثقافتی ربط وضبط کا ذریعہ فارسی زبان تھی، جو وسط ایشیا کی سب سے عظیم علمی اور تہذیبی زبان تھی۔

کشمیریوں نے نہ صرف اسے اپنایا بلکہ غنی کشمیری جیسے نامور شعرا پیدا کئے جن سے ایران کے مشہور شعرا صائب اور کلیم فارسی اشعار کا مفہوم سمجھنے کشمیر آتے تھے۔

یہی عالم موسیقی کا ہے کشمیری مغنی اپنے کمال کی وجہ سے اتنی شہرت رکھتے تھے کہ اکبر جیسے جلیل القدر بادشاہ کے دربار میں ہندی، ایرانی، تورانی اور تان سین جیسے باکمال ہنرمند مغنیوں کے ساتھ وہ بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں چونکہ ہندی موسیقار کثرت سے تھے اس لئے کشمیری مغنی ان کی صحبت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ ان کشمیری مغنیوں نے اپنے وطن واپس آکر جب ہندوستانی راگ راگنیاں بیان کیں تو کشمیری موسیقی ہندی اور ایرانی موسیقی کے اشتراک سے ایک جدید قالب اختیار کرتی چلی گئی

اکبر اعظم سے ڈیڑھ صدی قبل زین العابدین بڈشاہ شہنشاہ کشمیر نے ملا عودی اور ملا جمیل جو علم موسیقی میں صاحب تصانیف اور کئی راگ راگنیوں کے بانی تھے، خراسان سے بلوائے اور ان کو انعامات سے سرفراز کیا۔ ایران کی راگنیاں جو کشمیر کے سازندوں اور مطربوں نے اختیار کرلیں۔ ان کے نام ساکا راست، نوا، نے ریز، چراغ وغیرہ ہیں۔

محمد ایوب اولیاء

برٹش میوزیم میں ایشیائی مخطوطات کی نمائش

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم نے جس دورِ آزمائش میں یہ شعر لکھا تھا وہ واقعی ابتلا اور ذہنی کش مکش کا زمانہ تھا ـــ یہ ایک غلام قوم کا حکمران طبقے کے خلاف توجہ تھا ـــ اپنی محرومیوں اور حسرتوں کو دل پذیر انداز میں بیان کرنے کا ذریعہ تھا ـــ اب کہ الحمد للہ ہم آزاد اور خود مختار ہیں تو اس شعر میں وہ گرفت، اور توازن قدرے کم پایا جاتا ہے جو اس کے زمانہ تحریر میں تھا ـــ اب بھی لاکھوں، کروڑوں مسودے مخطوطے، شاہی فرامین، قلمی نسخے، شبیہیں، رنگین قلمی تصویریں اور کتابیں یورپ کے عجائب گھروں اور لائبریریوں میں موجود ہیں لیکن ہم ان کی بازیابی کے لئے وہ واویلا اور دہائی نہیں کرتے جو تقسیمِ ملک اور حصول آزادی سے قبل ہمارا نعرہ تھا ـــ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ؎

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ہمارے دل میں لاکھوں شکایتیں اور ہزاروں تلخیاں ہی کیوں نہ ہوں لیکن اس بات سے کسی منخرے کو ہی انکار ہوگا کہ جس طرح یورپین اقوام خصوصاً انگریزوں نے ہمارے علمی ذخائر اور قلمی و ادبی شہپاروں کی نگہداشت اور حفاظت کی ہے وہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی ـــ اس بات کی شہادت برٹش میوزیم میں ایشیائی مخطوطوں کی نمائش واضح اور مناسب طور پر دے سکتی ہے ؎

غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن | کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

لندن کے رسل سکوئر میں لندن یونیورسٹی سے گزریں تو سامنے برٹش میوزیم کی عظیم اور جہازی عمارت پڑتی ہے۔ اس کے شمالی دروازے سے داخل ہو کر آگے بڑھیں تو کنگز روم آتا ہے جس میں یہ نمائش ترتیب دی گئی ہے ـــ اس کا آغاز سامی حروفِ تہجی اور رسم الخط سے ہوتا ہے۔ جس کے تحت پیلایو PALAEO، عبرانی، سمارٹین، آرمینک، پہلوی، میتڈے اک، ہیبرک اور عربی وغیرہ زبانیں آتی ہیں ـــ اس کیس میں پہلا نظم طہ چھٹی صدی قبل مسیح کا عبرانی زبان میں دیکھا جا سکتا ہے جو خاص کی چیز ہے اور زبانوں کے طالب علم کے لئے نہایت دلچسپی کا باعث ہے۔ اس کے بعد عربی زبان کا نمبر آتا ہے۔ مروجہ عربی زبان دراصل شمالی عربی ہے۔ جو NABATAEANS لوگوں کے حروفِ تہجی سے اختراع کی گئی تھی۔ یہ لوگ کوہِ سینا کے شمال مشرق اور جنوب میں رہائش پذیر تھے۔ قدیم ترین عربی نسخہ جو NABATAEANS رسم الخط میں پایا جاتا ہے، وہ ۲۶۷ء بعد از مسیح کا ہے۔

دراصل اہلِ عرب تحریر میں بہت کم دلچسپی لیتے تھے۔ اور اس کرۂ ارض پر وہ واحد مثال ہیں جو زبان دان اور زبان دان اور شاعری کے دلدادہ ہوتے ہوئے بھی عموماً ان پڑھ تھے ـــ عربی شعرا جو دوسری اقوام کو عجمی یعنی گونگا سمجھتے تھے، اپنی نظمیں زبان زدِ زندہ الفاظ سے دوسروں تک پہنچاتے

تھے اور یہی وجہ ہے کہ ہر شاعر اپنے ساتھ دو سائیوں کو رکھتا تھا تاکہ وہ اُن کے کلام کو ازبر کرسکیں۔ مگر اسلام کی عالمگیر تحریک اور مذہب نے ان کو فن خطاطی سے روشناس کرایا۔ چونکہ اسلام میں انسانی مصوری کی ممانعت تھی اس لئے مسلم خطاطوں اور کاتبوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو حسن قلم پر صرف کیا۔ اور دو سو سال سے بھی کم عرصے میں، وہ اس فن شریف میں اس قدر مشاق اور ماہر ہوگئے کہ آج تک ان کا کوئی مثیل و ہمسر نہیں۔ تحریر کی تزئین و آرائش کے لئے بہت سے انداز وضع کئے گئے۔ جن میں مکی، مدنی، کوفی اور بصری خط خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

۷۵۰ء میں جب بغداد میں عباسیوں کی خلافت قائم ہوگئی تو فن خطاطی اسلامی فنون لطیفہ میں سے نمایاں ترین سمجھا جانے لگا۔ اس دور کے مشہور خوش نویس ابن مقلہ، ابن البواب اور یاقوت تھے۔ برصغیر پاک و ہند میں اعلیٰ پایہ کے خطاط پیدا ہوئے۔ افریقہ کا خط مغربی بھی اپنے جلو میں اپنی تمامتر رعنائیاں رکھتا ہے۔

عربی زبان کا قدیم ترین قلمی نسخہ جو یہاں دیکھا جاسکتا ہے وہ PAPYRUS کے پتوں پر لکھا ہوا پاسپورٹ ہے۔ بچھڑے کے چمڑے کی جھلی پر لکھا ہوا قرآنِ کریم بھی رسم الخط میں ہے۔ اس کے علاوہ خطِ نسخ اور دیگر اسالیب میں بھی لکھے ہوئے قرآن کریم کے نسخے قلب و نظر کو تازگی بخشتے ہیں۔

فارسی زبان اور خط نستعلیق میں لکھے ہوئے ادب پارے اپنی نظیر آپ ہیں۔ یہاں روغنی مجلد خمسۂ نظامی خطِ نستعلیق میں دیکھا جاسکتا ہے یہ نایاب نسخہ چوالیس ہزار پونڈ مالیت کا بتایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں دیوانِ خاقانی (نسخ میں)، دیوان سلمان ساوجی (نستعلیق میں) اور عشق وامق و عذرا از نامی خطِ شکست میں لکھے ہوئے موجود ہیں۔

اردو کا قلمی نسخہ رتن سین اور پدماوتی کا عشق از ہنس بھی آپ یہاں دیکھیں گے جو اٹھارویں صدی عیسوی میں خطِ نسخ میں لکھا گیا تھا۔ پنجاب کا جغرافیہ پنجابی گورمکھی میں، ہولی بائبل ملتانی زبان اور رسم الخط میں، گجراتی میں دی نیو ٹسٹامنٹ، مراٹھی زبان میں بیتال پچیسی بھی آپ کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گی۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور کی تصنیف پالی پراکرت کا کلکتہ کا چھپا ہوا بنگالی زبان میں نسخہ بھی یہاں رکھا ہے جو ۱۸۰۶ء میں طبع ہوا اٹھارویں صدی کا لکھا ہوا بنگالی میں مہابھارت کا نسخہ بھی قابلِ قدر ہے۔

علاوہ ازیں ترکی، ملائی، پشتو، سندھی اور اردو کے مخطوطے عربی خط تحریر میں لکھے ہوئے موجود ہیں، جو اعلیٰ انسانی ذوق، محنت اور پاکیزگی کی غمازی کرتے ہیں۔

یہ تو رہی افقی رسم الخط کی بات ــــ اب آیئے ذرا عمودی خط تحریر کا جائزہ لیں۔ جس کے تحت چینی اور جاپانی زبانیں آتی ہیں چینی طرز تحریر کی ابتدا سادہ تصویروں کے ذریعے ہوئی جو زندگی کی روزمرہ کی چیزوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ یہ زیادہ طور پر اسماء ہوتے تھے ــ فعل کے لئے دو اشاروں یا نشانوں کو مجتمع کرنا پڑتا تھا جس سے کسی کام کا ہونا پایا جاتا تھا۔ اس بات سے اس زبان کے اشکال کو سمجھا جاسکتا ہے۔ ہزاروں قسم کے اشاروں تصویروں اور اُن ملی ہوئی شکلوں کو یاد کرنا پڑتا ہے ــــ جاپانی اگرچہ بنیادی طور پر اس زبان سے مختلف ہے۔ بایں ہمہ جاپانیوں نے رسم الخط چینیوں سے مستعار لیا ہے اور بعد کو اس میں ایزاد و ترمیم کی ہے۔ چینی خط میں سب سے پرانی تحریر ایک ہڈی پر دیکھی جاسکتی ہے، جو ایک ہزار سال قبل مسیح کی ہے۔ اور جاپانی زبان کی ٹائپ میں چھپی ہوئی (متحرک بلاک کے ذریعہ) سترھویں اور اٹھارویں صدی کی کتابیں بھی آپ یہاں ملاحظہ کرسکتے ہیں۔

قاضی عبدالقادر

تجریدی مُصوّری اور تفہیم کا مسئلہ

(۱)

مصوری، صورت گری، مجسمہ سازی اور سنگتراشی کی یہ کم نصیبی رہی ہے کہ فنون لطیفہ کی ان اصناف پر تنقید مصوروں اور مجسمہ سازوں کی بجائے فلاسفہ ماہرین نفسیات، ادیبوں اور شاعروں کے ہاتھوں میں رہی جو اپنی تنقیدوں اور تبصروں میں اپنے منتخب میدان کے خیالات اور تصورات لے آئے مثلاً فلسفہ و منطق سے، ریاضی سے، نفسیات و تحلیل نفسی سے، ادب و شعر سے۔ اور اس طرح فنی تنقید یعنی صورت گری کی مختلف اصناف پر تنقید کو سائنیاتی، ریاضیاتی فلسفیانہ، نفسیاتی، ادبی اور شاعرانہ بنا دیا گیا۔

افلاطون سے لے کر جان ڈیوی اور کولنگ وڈ تک سوائے دو ایک کے ایسی مثالیں نہیں ملتیں جہاں خود مصور بھی نقاد ہو۔ میری مراد لیونارڈو، رینالڈز اور بال کلے سے ہے۔ یہ مصور بھی تھے اور نقاد فن بھی۔ ان کے علاوہ ایسی قابلِ ذکر مثال نہیں ملتی جہاں ایک اچھا نقاد اعلیٰ درجہ کا مصور بھی ہو یا ایک بلند پایہ مصور ایک اچھا نقاد فن بھی ہو۔ ہمیں سروکار دوسرے درجہ کے مصور نقادوں سے نہیں جن کی تعداد یقیناً خاصی ہوگی۔ انھوں نے نہ ہی تو فن کو کچھ دیا اور نہ تنقید فن میں کچھ کیا۔ اگر کچھ دیا بھی ہے تو وہ اختلالِ ذہنی سے مختلف نہیں۔

مصوری اور تجریدی مصوری کے بارے میں جو خیالات ایک عرصے سے پھیل رہے ہیں اور فنون لطیفہ کے اس پہلو پر ایک مدت سے جو لعن طعن ہو رہی ہے اس کی تاریخ نصف صدی سے زیادہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہی خیالات اب اس ملک میں پھیلتے نظر آ رہے ہیں اور یہاں بھی اس گفتگو کا آغاز ان نقادوں ہی سے ہوا ہے جو خود مصور نہیں۔ اور اسی سبب سے مصوری کے مقصد، تصویر اور مجسمے کی غرض و غایت، اور "معنی و مفہوم" کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایک مختلف عالمِ تخلیق میں رہ کر کہا گیا ہے جو کسی اعتبار سے مصوری و صورت گری پر منطبق نہیں ہوتا۔

واقعہ تو یہ ہے کہ مصوری پر یہ بحث، موضوع بحث سے عدم واقفیت کی صورت میں ہوئی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی یہ کہے کہ یہ ساری گفتگو بے معنی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ صورت گری پر تنقید کے پیچھے یہ تصور ہے اور غالباً اس پر سب متفق ہیں کہ فن یا مصوری ایک لسان و زبان ہے اور چونکہ زبان افہام و تفہیم کا ذریعہ ہے اور خود اس کی تفہیم بھی ممکن ہے۔ لہٰذا اگر کسی تصویر میں یہ وقوفی عنصر نہ ہو یا کم ہو تو اسی اعتبار سے وہ تصویر کم اہم، بے معنی اور بے مقصد ہوگی۔ تجریدی مصوری پر جو اعتراضات ہوتے رہے ہیں اسی خیال کے تحت ہوئے ہیں کہ وہ سمجھ میں نہیں آتی۔ غرض روایتاً مصوری لسان و ابلاغ کی ایک قسم سمجھی جاتی رہی ہے لیکن یہ روایت نادرست بنیادوں پر استوار ہوئی ہے۔ مجھے بہر حال اس تصور کو قبول کرنے میں تامل ہے کہ مصوری ایک زبان ہے۔ لیکن اس سے قبل کہ اس تصور پر تنقید کی جائے مناسب یہ ہے کہ خود اس تصور کی توضیح کر دی جائے۔

(۲)

صرف یہ کہ مصوری ایک زبان ہے بلکہ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہر مصور کی اپنی زبان، اپنی ابجد اور اپنا طرزِ تحریر بھی ہوتا ہے۔ ایک مصور نیلے رنگ

کو اپنی تصویر میں زیادہ مقام دیتا ہے، دوسرا زرد کو، تیسرا گلابی کو زیادہ استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح بعض مصور خاص موضوعات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ کوئی میلے ٹھیلوں کی تصویریں بناتا ہے، کوئی نوجوان لڑکیوں کی۔ اسی طرح مختلف فن کاروں کی تکنیک مختلف ہوتی ہے۔ اب کہا جاتا ہے کہ وہ مخصوص رنگ جو ایک مصور استعمال کرتا ہے، موضوعات جن کا وہ انتخاب کرتا ہے، تکنیک جو وہ برتتا ہے اس کی زبان کے الف بے ہیں جس مخصوص انداز میں مصور کاغذ یا کپڑے پر خطوط کھینچتا ہے، برش چلاتا ہے اور رنگ پھیلاتا ہے وہ اس مصور کی تحریر ہے۔ مثال کے طور پر چند تصویریں جو ایک عرصے تک پکاسو اور میرو کی سمجھی جاتی رہی تھیں۔ ان کے بارے میں ماہرین نے جب یہ فیصلہ سنایا کہ یہ فی الحقیقت پکاسو اور میرو کی نہیں ہیں تو یہ فیصلہ انہیں نکات کے پیش نظر دیا گیا تھا کہ ماہرین نے پکاسو کی تصویری تحریر اور ان جعلی تصویروں کے نقوش میں کوئی مماثلت نہیں پائی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ تصویریں جو اب تک پکاسو کی کہلاتی تھیں، پکاسو کی نہیں ہیں کیونکہ ان میں پکاسو کی تحریر کی "شوخی" نہیں۔

اس قسم کی باتوں سے کہنے والے کی مراد یہ ہوتی ہے کہ ہر فن کار مختلف صورتوں اور رنگوں یا خطوط کو نقش کرتے ہوئے ایک مخصوص وزن دیتا ہے جو اس کی تمام تخلیقات میں مشترک پایا جاتا ہے اور جب کبھی اس مصور کی تصویروں کے اصلی ہونے کے بارے میں سوال اٹھے تو صرف انہیں چیزوں کی روشنی میں یہ مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔ یہ گویا ادبیات سے اسٹائل بیمائی کے طریقہ کا فنی تحقیق میں اطلاق ہے۔ جہاں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ایک تحریر فلاں شخص کی تحریر ہے یا نہیں شخص مذکور کی تسلیم شدہ تحریروں کی طرز نگارش، جملوں کی ساخت وغیرہ اور تحریر زیر بحث کی ہیئت کا مقابلہ اور موازنہ کیا جاتا ہے "ادبیاتی تحقیق" اور "مصورانہ تحقیق" کی اس مماثلت میں یہی تصور کام کرتا ہے کہ مصوری ایک زبان ہے اور تصویر ایک تحریر ہے اور جس طرح ادبی تحریر کی قدر و قیمت کا انحصار اس کی "خیال آفرینی" میں ہے، بعینہ ایک تصویر کی خوبی اس کے خیال و فکر میں مضمر ہے۔

مصوری سے گذر کر کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ مصوری ہی نہیں بلکہ فنون لطیفہ کی دوسری اصناف مثلاً موسیقی، مجسمہ سازی وغیرہ بھی مختلف زبانیں ہیں اور جو خیال ایک صنف میں ادا کیا گیا ہے اس کا اظہار یا ترجمہ، دوسری میں ہو سکتا ہے۔ نازی بربریت کا اظہار ایک مجسمہ میں بھی ہو سکتا ہے۔ اسی بات کو ساز و آواز کے آہنگ میں بیان کیا جا سکتا ہے، کاغذ پر رنگ روپ میں مقید کیا جا سکتا ہے اور الفاظ و اوزان کا پابند بنا کر نظم میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایک تصویر یا مجسمے میں کچھ کہا گیا ہے تو اس کا اظہار نظم و شعر میں، یا نثر و تقریر میں ہونا چاہیئے اور اگر یہ ممکن نہیں اور ایک زبان کے "خیالات" دوسری میں بیان نہ ہو سکیں تو دونوں میں سے ایک زبان ناقص، کم ترقی یافتہ اور اسی اعتبار سے کم قدر و اہمیت کی حامل قرار دی جائے گی یا پھر یہ کہا جائے گا کہ ایک زبان میں بات ہی بے معنی کہی گئی ہے ورنہ دوسری زبان اور دوسرے پیرائے میں اس کا اظہار ہو سکتا تھا۔

اہل ریاضی، ریاضی کی مختلف اصناف کے مابین اسی قسم کا تعلق بتاتے ہیں۔ ان کے خیال میں، جو کچھ اقلیدس میں کہا جائے وہ کلاسیکی الجبرا کے قضایا میں بیان ہو سکتا ہے اور الجبرا کے مسائل کو ہندسہ کی زبان میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح افلاطون نے ان تصورات و خیالات کو ایجابی قدر دینے کی سفارش کی تھی جو ریاضیاتی خصوصیات رکھتے ہوں اور وہ خیالات اور اصناف فن جو کسی قسم ریاضیاتی تحلیل کی متحمل نہیں ہو سکتیں معقولیت کے دائرہ سے خارج متصور کی جائیں گی۔ غالباً اسی سبب سے افلاطون نے موسیقی کو مصوری اور مجسمہ سازی سے اعلیٰ قرار دیا تھا کیونکہ موسیقی کی اساس ریاضیاتی ہے جبکہ مجسمہ کے خد و خال ریاضیاتی اور ہندسی تصورات میں احسن طور پر تحویل پذیر نہیں۔

دور جدید میں غیر تشبیہی، یا تجریدی مصوری کو اسی وجہ سے ہدف ملامت بنایا جاتا ہے لیکن اس پر اعتراض اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ یہ ریاضیاتی نہیں، بلکہ یہ ایسی زبان ہے جس کی تفہیم نہایت موضوعی ہے اور روایتی اصولوں سے آزاد ہے۔ ماہرین نفسیات البتہ تجریدی مصوری کو ایک اعتبار سے اہمیت دیتے ہیں۔ یہ اہمیت و قدر طبی اور نفسیاتی ہے۔ ان کے لئے ایسی تصویریں نفسیاتی رپورٹیں ہیں جن میں ماہر نفسیات مصور کی شخصیت کے ارتقا کے خطوط

پڑھتا ہے۔

لیکن مصوری اور تجریدی مصوری کے بارے میں یہ خیالات اور نظریات کسی اعتبار سے بھی اس فن کا حق ادا نہیں کرتے۔ اس طرف اشارہ آج سے نصف صدی قبل (۱۹۱۶ء) پکاسو اپنے مخصوص انداز میں کر چکا تھا جب نقادوں نے اس کی مکعبی تصویروں کے رنگ روپ کے امتزاج پر تنقید کے بجائے ان میں فلسفۂ حکمت کے نکات اور ریاضی و منطق کے تصورات اور تحلیل نفسی کے حقائق پڑھنے چاہے تھے۔ پکاسو نے بتایا کہ مکعبیت کی آسان توجیہ کرنے کے لئے لوگوں نے اسے ریاضی، موسیقی، تحلیل نفسی، کیمیا اور نہ جانے کس کس سے متعلق کرنا چاہا ہے۔ ان ساری کوششوں کو اگر حماقت نہ کہا جائے تو ادب محض کہہ لیجئے۔ بہرحال اس طرز فکر کے کوئی بہت عمدہ نتائج نہیں نکلے اور ان گوناگوں نظریات نے لوگوں کی آنکھیں چندھیا دیں" لیکن ایک مصور کے اس احتجاج کے باوجود نقاد اس کی اور اس جیسے دوسرے فن کاروں کی تخلیقات میں فلسفہ و حکمت کے مسائل اور ادب و اخلاق کے اصول تلاش کرتا رہا اور مصر رہا کہ مصورانہ تجربہ کا اظہار ہے، وہ اشارتی ہے اور اس کی حقیقت لسانیتی ہے۔

اس ساری گفتگو سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ معترضین کے لئے تصویر ایک قسم کی فلسفیانہ یا نفسیاتی تصنیف ہے اور اس کے بارے میں اسی طرح رد و قدح ہونی چاہیئے جو ایک عالمانہ تحریر پر ہو سکتی ہے اور جب جدید نقاد تجریدی مصوری پر تنقید کرتے ہیں تو اسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ تجریدی مصوری ایک مبہم اظہار ہے۔ اس کے منطقی محاسن کے بارے میں گفتگو نہیں ہو سکتی اور کیونکہ تجریدی تصویر کو اس قسم کی بحث کا موضوع نہیں بنایا جا سکتا لہذا وہ کسی اعتبار سے لائق اعتنا نہیں۔

یہ کہ تجریدی مصوری معقول گفتگو کا موضوع نہیں بن سکتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ نہایت مغلق زبان ہے۔" اس کی ابجد عجیب ہے۔" جو کچھ اس میں کہا جاتا ہے اسے معقول پیرائے میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔" یہ غیر معقول و لایعنی ہے اور یہ سارا عمل تضیع اوقات ہے۔" اور اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ یہ مصوری سماجی قدر و اہمیت کی حامل نہیں۔ یہ تصویریں ضائع کرنے کے ہی لائق ہیں اور وہ جو ایسی تصویریں بناتے ہیں اگر قابل گردن زدنی نہ بھی ہوں تو کم از کم ان کی کوششیں قطعی ناقابل ستائش ضرور ہیں۔

(۳)

مصوری کے مندرجہ بالا نظریات اور مصوری پر ساری تنقید، جیسا کہ ہم نے دیکھا، اس بنیادی غلطی کا شکار ہیں کہ مصوری ایک زبان ہے۔ اس غلطی کو میں "معقولاتی مغالطہ" کہوں گا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ بحث جو ایک تصور کے تحت ہونی چاہیئے وہ بے محل ہو جاتی ہے۔ یہ مغالطہ میرے خیال میں تحریری زبان کو فن تحریر یا خطاطی سے خلط مبحث کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ نکتہ وضاحت چاہتا ہے۔

زبان اشاروں اور علامتوں کے برتنے کا وظیفہ ہے۔ عام طور پر زبان کے لئے یہی کہا جاتا ہے کہ وہ اشاری ہے اور اشاروں کا نظام ہے جہاں علامات افراد کی حرکات و سکنات، انسان و حیوان کی آواز، کاغذ یا تختہ پر بنائے ہوئے نقوش اور خطوط اپنے سے ماسوا کسی اور شے یا تصور کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کو دیکھ کر یکلخت ہاتھ کا ماتھے تک اٹھ جانا "جذبات خیر سگالی کا اظہار ہے۔ اسی طرح چوراہے پر سرخ، سبز اور زرد روشنیاں شہر کے حسن میں اضافہ کے لئے نہیں لگائی جاتیں۔ ان کی اہمیت اشارتی[۱] ہے۔

اگر قدیم مصری زبان کا مطالعہ کریں تو ہم وہاں یہی دیکھتے ہیں۔ یہ تصویری زبان کی کلاسیکی مثال ہے۔ اس زبان میں لکھنے کے لئے کہ "بلی چٹائی پر بیٹھی ہے"

---

[۱] ملاحظہ ہو میری تصنیف: تعارف منطق جدید (باب دو: زبان اور منطق) شائع کردہ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی ۱۹۶۵ء

چنانچہ کی ایک تصویر پر بلی کی ایک تصویر بنا کر دکھانا پڑتا ہے کہ یہاں کس خیال یا واقعہ کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے یعنی ہر تصویر اپنے سے سوا ہر خیال یا واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اس اعتبار سے ہر تصویر اشاری ہے لیکن رفتہ رفتہ مکمل تصویر کی جگہ ایک نشان یا خفیف سی علامت خیالات کے اظہار کے لئے کافی سمجھی جانے لگی اور اسی سے ہماری ترقی یافتہ تحریری زبان کا تصور سامنے آیا جس کی مثال اس مضمون کی تحریر و زبان پیش کرتے ہیں۔

لیکن ہم جب تصویری زبان کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو صرف یہ کہتے ہیں کہ کون سے نقوش اور خطوط کن حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہاں زبان تصویری ہے، اس زبان کے اشارات تصویری ہیں۔ ان کی حیثیت عملی اور وظائفی ہے جو ہر زبان کا خاصہ ہے لیکن تصویریں جن پر یہ زبان مشتمل ہے، ہمیں ان سے بحیثیت تصویر کے سروکار نہیں۔ ہم ان تصویروں کا بحیثیت تصویر کے مطالعہ نہیں کرتے یہاں ہم وہی فرق قائم کرتے ہیں جو صوت و آواز کے دو مختلف پہلوؤں کے مابین قائم کرتے ہیں۔ آواز کو تقریر اور خیالات کی ترسیل کا ذریعہ بھی سمجھا جا سکتا ہے اور آواز کا مطالعہ اس کی اپنی طور پر بھی ہو سکتا ہے۔ موسیقی میں ہم آواز کو اسی انداز سے مطالعہ کا موضوع بناتے ہیں یا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم تحریری زبان میں "تحریر" اور "زبان" کو ایک دوسرے سے جدا کر کے تحریر بحیثیت ایک صنفِ فن اور زبان، خیالات کی ترسیل کے ذریعہ کی حیثیت سے امتیاز قائم کر لیں گے اور یہ مطالعہ کے دو مختلف اور ایک دوسرے سے قطعی آزاد موضوع قرار دیئے جائیں گے۔

تحریر کو جب ہم موضوع گفتگو بناتے ہیں یا جب ہم خطاطی کے نمونوں کے بارے میں حکم لگاتے ہیں تو ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں ہوتی کہ خطاطی کے ان نمونوں میں کیا کہا گیا ہے بلکہ یہ کیسے لگ رہے ہیں۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ تحریر کیا کہہ رہی ہے بلکہ وہ کیسی نظر آتی ہے بعینہٖ جب ہم کلاسیکی موسیقی یا آواز بحیثیت موسیقی کو موضوع مطالعہ بناتے ہیں تو یہ جاننا نہیں چاہتے کہ اس میں کیا کہا گیا ہے بلکہ یہ کان کو کیسی لگ رہی ہے، سماعت پر بار تو نہیں ہے۔

موسیقی کا سارا دار و مدار صوت و آواز کے آہنگ اور سماعت پر ہے۔ مصوری کی کل کائنات خطوط، رنگ اور نظری صورتیں نیز ان کی ترتیب امتزاج ہے۔ اس میں خیالات و تصورات کا کوئی گذر نہیں اور اسی وجہ سے ان کی افہام و تفہیم کے بارے میں سوال کرنا مصوری کی حقیقت سے عدم واقفیت کا اظہار کرنا ہے۔

(۴)

مسئلہ اب یہ ہے کہ مصوری اور تصویر کی حقیقت کیا ہے؟ اس بیان سے کیا مراد لی جائے کہ تصویر کے معنی و مفہوم کے بارے میں سوال ہی لغو اور بے معنی ہے اور یہی بحث کا دشوار گذار پہلو ہے۔

مصوری کی ایک ایسی تعریف دینا جو تحلیلی اور لفظی نہ ہو بلکہ معلوماتی بھی ہو اور جس پر سب متفق ہوں مشکل کام ہے لیکن اپنے وسیع ترین معنوں میں مصوری سے مراد تجربہ کے خالص نظری (Visual) عناصر یعنی رنگ، خطوط اور بناوٹ (Texture) کو ان کی یک سطحی اور دو جہتی (طول و عرض) حالت میں برتنا ہے۔ انھیں نظری عناصر کے اجتماع کو نظری صورت (Visual) کہتے ہیں۔ اگر اس میں درف طول و عرض ہے تو وہ تصویر ہے اور اگر عمق یا گہرائی کا عنصر بھی شامل ہو گیا تو پھر گفتگو تصویر یا مصوری سے نکل کر مجسمہ اور سہ جہتی صورتوں میں داخل ہو جائے گی۔ ہمیں فی الوقت بحث صرف مصوری اور تصویر سے ہے۔ مصوری کی تعریف کے بعد اب تصویر کے لئے یہ کہا جائے گا کہ وہ رنگ، خطوط اور بناوٹ کا تفاعل (Function) ہے۔ انھیں تین عناصر پر تصویر مشتمل ہوتی ہے اور انھیں کے تفاعل کا نام تصویر ہے۔ ایک تصویر میں سے رنگ، خطوط وغیرہ کو نکال دیجئے تو سادہ کاغذ رہ جائے گا۔

اب یہ دریافت کرنا کہ ان عناصر کی ترکیب کیوں کر ہوتی ہے، تصویر کے اصول ترتیب کے بارے میں سوال کرنا ہے جو تضاد، تکرار اور مشابہ یا مشابہت ہیں۔ عصر جدید کی تصویروں میں اصول تضاد نمایاں ہے جبکہ کلاسیکی مصوری میں مشابہت کا اصول کارفرما ہے اور قرون وسطیٰ کی تصویروں میں تکرار کا اصول غالب نظر آتا ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ تاریخ مصوری کو اس طرح تین واضح ادوار اور اصولوں کی روشنی میں ہی سمجھا جا سکتا ہے کیونکہ انسان کے اور دوسرے کارناموں کی طرح اس میں بھی مستثنیات ملتے ہیں۔

یہ بحث قطعی مختلف ہوگی کہ تصویر میں تضاد ہو یا تکرار۔ ہمارے سامنے مسئلہ صرف تصویر کی ہیئت ترکیبی کا ہے۔ اور ہم نے یہ دیکھا ہے کہ نظری عناصر کا اجتماع نظری صورت کا نام ہے۔ اب یہ کہنا کہ یہ نظری صورت کسی شکل سے مشابہت رکھتی ہے یا نہیں، یہ نظری صورت گلاب کے پھول جیسی ہے یا مکان اور درخت جیسی معلوم ہوتی ہے۔ دراصل ایک نظری صورت میں اپنے سابقہ تجربے کی جھلک دیکھنے کی کوشش ہے اور اس کی تمام تر ذمہ داری تصویر دیکھنے والے پر آتی ہے۔

ایک تصویر جو ممکن ہے ایک سے زیادہ نظری صورتوں پر مشتمل ہو اگر اس میں کوئی جانی پہچانی شکل وصورت نظر آئے تو بھی اس سے تصویر کی قدر و قیمت میں نہ اضافہ ہوتا ہے نہ کمی۔ یہ اتفاق ہے کہ ایک نظری صورت جانی پہچانی بھی ہو لیکن اس کے لئے یہ کسی طور بھی ضروری نہیں کہ اسے کسی سابقہ تجربے سے منسوب بھی کیا جائے۔

مصوری کے تاثیریتی اور بعد تاثریت مدرسوں میں غالباً اسی سبب سے "مشابہتوں کی تصویر کشی" کے خلاف جنگ نظر آتی تھی[۵۱] پچھلی صدی کے اواخر میں کیمرے کی ایجاد کے بعد مصوروں نے یہی کہا تھا کہ جہاں تک تجربے کی ہو بہو عکاسی مطلوب ہے یہ کام کیمرہ بھی کر سکتا ہے لیکن مصور کو سروکار نظری تجربے کی اس ابتدائی اور اساسی صورت سے ہے جہاں نظری عناصر اپنی حقیقی صورت میں نظر آتے ہیں یعنی مصور کا موضوع وہ رنگ اور خطوط اور ان کا امتزاج اور ترتیب ہے جنھیں ابھی ہم نے اپنی نفسیات میں نہیں رنگا ہے اور جو ہماری موضوعیت سے پاک ہیں۔ فلسفہ میں یہی چیز ہسرل کی مظہریت کی شکل میں ظاہر ہوئی اور جدید مصوری اسی تصور کی روشنی میں دیکھی جانی چاہیئے۔

اس کل بحث سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ تصویر اپنی حقیقت میں نہ اشاری ہے نہ وہ خیال اور تصور کی علامت ہی ہے۔ اسی سبب سے اس کے بارے میں یہ سوال کرنا مناسب نہیں کہ "اس تصویر کا کیا مطلب ہے؟" "اس تصویر میں کیا خیال پیش کیا گیا ہے"۔ اور تصویر زبان یا اشارہ نہیں لہذا اس کی حیثیت نہ عملی ہے نہ وظائفی۔ تصویر کا اساسی طور پر کوئی وظیفہ نہیں۔ یوں تصویر کو مختلف مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن تصویر کا تصویر ہونے کے لئے یہ قطعی ضروری نہیں کہ وہ کسی مقصد کے لئے استعمال بھی کی جائے۔

لہذا مصوری چاہے وہ تجریدی ہو یا حقیقی (اور اس بحث کے بعد تو یہ فرق بھی لغو معلوم ہوتا ہے)، اس پر اس اعتبار سے تنقید کرنا کہ اس سے زندگی کے کون کون سے مسئلے حل ہو سکتے ہیں، ایک بے معنی بات کرنا ہے۔ اور اسی طرح ایک "تجریدی تصویر" میں کسی جانی پہچانی شکل (انار، انسانی روپ کتاب) کو تلاش کرنا اور اسے نہ دیکھ کر اعتراض کرنا کہ اس میں کوئی جانی پہچانی شکل نظر نہیں آتی، دراصل تصویر میں اس چیز کو دیکھنے کی ہوس کا نہ خواہش ہے جو نہ تصویر میں ہے اور نہ مصور نے وہاں بنانی چاہی تھی[۵۲]۔

---

۵۱ ملاحظہ ہوں میرے مضامین (a) Dawn Karachi 24 Nov. 1960: What is abstract Art?

(b) Khyber Mail (Peshawar) 22 Feb. 1965: Pioneers of Modern Art.

۵۲ اسی سبب سے بیشتر جدید مصور اپنی تصویروں کو کسی قسم کے عنوان نہیں دیتے اور اگر تصویر کو عنوان دیا تو اس کا مقصد دیکھنے والے کو یہ بتانا ہوتا ہے کہ تجربے کے کس پہلو کی نظری تحلیل (Visual Analysis) اس تصویر کا سبب ہی۔

فراق گورکھپوری

○

اوروں سے کیا کہہ پاؤ گے، کیا بیان کر پاؤ گے
وہ چہرہ دیکھو گے تو یارو، دیکھتے ہی رہ جاؤ گے

ان کو دیکھ کے آنے والو، باخبری کی تم کو قسم
کیسے ہیں وہ اور کہاں ہیں، اتنا بھی نہ بتاؤ گے؟

دل کے کاروبار میں یارو، ہشیاری ہی خطرہ ہے
عقل و ہوش سے کام نہ لینا، اک دن دھوکا کھاؤ گے

میرا قرب غنیمت جانو، ورنہ کچھ ہی دنوں کے بعد
دور دور تک ڈھونڈو گے لیکن تم مجھ کو نہ پاؤ گے

وہ نغمے چھوڑے جاتا ہوں بعد مرے اے ہم نفسو
دیر دیر تک سر دھن دھن کر اوروں کو بھی سناؤ گے

میرے جیتے جی تم سن لو، سازِ غزل کے یہ نغمے
اور بھی شاعر آئیں گے لیکن کہاں فراقؔ کو پاؤ گے

فراق گورکھپوری

○

دارالسلطنتوں کو بنایا دولت مند انسانوں نے
نغموں کا اک شہر بسایا میرے دل کے ترانوں نے

عشق کے تکیے ہیں آئے ہو با ادب اہلِ عزت و جاہ
اس مٹی کو سلام کیا ہے بڑے بڑے ایوانوں نے

آج وہی دل گلیوں گلیوں مارا مارا پھرتا ہے
وہ دل جس کا طواف کیا ہے کعبوں نے، بت خانوں نے

لاعلمی، ناواقفیت، ناتجربہ کاری، معصومی
سوچو تو، کیا کیا نہ دیا داناؤں کو نادانوں نے

وہم و یقین، ایمان و تشکک، اقرار و انکار و سکوت
کیا کیا مجھ کو سکھایا تیری ان آنکھوں کے بہانوں نے

شعر و شاعری بڑی پرانی چیزیں ہیں، لیکن مجھ کو
اپنی طرف بلایا تھا اس فن کے نئے عنوانوں نے

کرشن و محمدؐ و عیسیٰ[2] نے کس ظلمت میں آنکھیں کھولیں
کیسے کیسے چراغ جلائے دنیا کے غم خانوں نے

جن کو حجابِ اکبر کہیے، جن تک ہاتھ پہنچ نہ سکے
وہ پردے بھی چاک کیے، کیا غضب کیا انسانوں نے

اوروں کی آنکھوں کو ملی ہے کب وہ دولتِ نظارہ
شاہدِ ہستی کو دیکھا تو دیکھا ہم حیرانوں نے

کچھ غمِ دوراں، کچھ غمِ جاناں، کچھ غمِ انساں، کچھ غمِ عشق
ایک مہابھارت لکھ ڈالی ان دو چار افسانوں نے

نا گھر تیرا، نا گھر میرا، چڑیا رین بسیرا ہے
یادِ رفتگاں کی تصویریں کھینچی ہیں کاشانوں نے

دھرتی کے اے المیو! تم اس فراق کی قدر کرو
نغمۂ خلد سنایا تم کو آج اسی کے ترانوں نے

فیض احمد فیضؔ

○

کیے آرزو سے پیماں جو مآل تک نہ پہنچے
شبِ و روزِ آشنائی، مہ و سال تک نہ پہنچے

وہ نظر بہم نہ پہنچی کہ محیطِ حسن کرتے
تری دید کے وسیلے خد و خال تک نہ پہنچے

وہی چشمۂ بقا تھا جسے سب سراب سمجھے
وہی خواب معتبر تھے جو خیال تک نہ پہنچے

ترا لطف وجہِ تسکیں، نہ قرار شرحِ غم سے
کہ ہیں دل میں وہ گلے بھی جو ملال تک نہ پہنچے

کوئی یار جاں سے گزرا، کوئی ہوش سے نہ گزرا
یہ ندیمِ یک دو ساغر مرے حال تک نہ پہنچے

چلو فیضؔ دل جلائیں کریں پھر سے عرضِ جاناں
وہ سخن جو لب تک آئے پہ سوال تک نہ پہنچے

فارغ بخاری

○

کفر کا رنگ جھلکتا ہے نہ اسلام کا رنگ
کچھ عجب ہے مرے افکار کے اصنام کا رنگ

چند افراد یہاں رنگوں کے سوداگر ہیں
کتنے چہرے ہیں کہ جن پر ہے فقط نام کا رنگ

منجمد غم کی فصیلوں میں گھرے ہیں ہم لوگ
دل کے آئینے میں ہے حسرتِ ناکام کا رنگ

وہ بھی زندوں میں گنے جاتے ہیں جن کے دل میں
کسی چلمن کی ہے خوشبو نہ کسی بام کا رنگ

گردشِ جام نے رنگین بنا رکھا ہے
ورنہ بے رنگ سا ہے گردشِ ایام کا رنگ

حسن سلمائے حقیقت کا کوئی رنگ نہیں
جو مئے ناب کا ہے رنگ، وہی جام کا رنگ

کتنے افسانے حوادث سے جنم لیتے ہیں
ہے مرے نام میں فارغ مری ہمنام کا رنگ

قتیل شفائی

○

تہہ میں جو رہ گئے وہ صدف بھی نکالیے
طغیانیوں کا ہاتھ سمندر میں ڈالیے

اپنی حدوں میں رہیے کہ رہ جائے آبرو
اوپر جو دیکھنا ہے تو پگڑی سنبھالیے

خوشبو تو مدّتوں کی زمیں دوز ہو چکی
اب صرف پتّیوں کو ہوا میں اُچھالیے

آہیں جو بچ رہی ہیں الٰہی اُنہی کی خیر
نغموں کی موت پہ بہت آنسو بہالیے

صدیوں کا فرق پڑتا ہے لمحوں کے پھیر میں
جو غم ہے آج کا اُسے کل پر نہ ٹالیے

کہہ دو صلیبِ شب سے کہ اپنی منائے خیر
ہم نے تو پھر چراغ سروں کے جلا لیے

آیا ہی تھا ابھی مِرے لب پہ وفا کا نام
کچھ دوستوں نے ہاتھ میں پتّھر اُٹھا لیے

دنیا کی نفرتیں سبھی مجھے قلّاش کر گئیں
اک پیار کی نظر مرے کاسے میں ڈالیے

ساحل کے انتظار میں چکرا گیا ہوں میں
مجھ کو مری وفا کے بھنور سے نکالیے

رسوائیوں کا آپ کو آیا ہے اب خیال
ہم نے تو اپنے دوست بھی دشمن بنا لیے

محسوس ہو رہا ہے کچھ ایسا مجھے قتیلؔ
نیندوں نے جیسے آج کی شب پر لگا لیے

قتیل شفائی

یہ مانا پیار اب بھی جان کا آزار ہے یارو
مگر یہ زہر پینے پر مجھے اصرار ہے یارو

میں اُتروں بھی تو میدانِ وفا میں کس طرح اُتروں
مقابل دوستوں کا لشکرِ جرار ہے یارو

میسر جس کو صحرا ہو وہ کیوں دریا تک جائے
بگولا بھی تو اک اُڑتا ہوا منجدھار ہے یارو

نہیں ہے کوئی سدِ راہ اطمینان سے بڑھ کر
نہ ہو ساحل اگر کوئی تو بیڑا پار ہے یارو

یہ منظر بھی کوئی دیکھے شبستانِ تحیّر کا
مقدّر سو رہا ہے آدمی بیدار ہے یارو

بھروسہ کر ہی لو اپنے مخاطب کی ذہانت پر
خموشی بھی تو اک پیرایۂ اظہار ہے یارو

کہاں تک حسنِ یوسف اپنی مجبوری پہ روئے گا
یہاں تو ہر قدم پر مصر کا بازار ہے یارو

گئی رُت میں بھی جو اکثر ہمیں پہنائی جاتی تھی
اب اس زنجیر میں شامل نئی جھنکار ہے یارو

بھٹکنے میں قتیلؔ اپنی الگ اک شان رکھتا ہے
وگرنہ میکدے میں ہر کوئی مے خوار ہے یارو

ادا جعفری

○

سچ کو زہر کہتے ہیں   زہر پی لیا ہم نے

راہ میں کہاں چھوڑا   دل سا رہنما ہم نے

تنگ و تیرہ گلیوں میں   شہر کھو دیا ہم نے

ظرف اپنا اپنا ہے   منہ سے کچھ کہا ہم نے!

خوابِ دل کا سرمایہ   اور لٹا دیا ہم نے

ہٹ گئے ہیں رستے سے   کچھ کہا سنا ہم نے؟

یاد آنے والوں کا   نام بھی لیا ہم نے؟

دیکھنے کو دیکھا تھا   کوئی خواب سا ہم نے

برگِ گل سے کیوں پوچھا   دل کا راستہ ہم نے

کر لیا ہے کس دل سے
اپنا سامنا ہم نے

افضل پرویز

○

بجز بن اُس کی سبھا میں کیا کسی کو چارہ تھا
واں تو ہر شوریدہ کے سر پر چمکتا آرہ تھا

ہائے وہ دن جب کسی فریاد پہ قدغن نہ تھی
درد کی ہر لہر زمزمہ اور میں اکتارہ تھا

اُس نے دل میں جھانکنے کی مجھ کو مہلت ہی نہ دی
شوخ کے طرزِ تکلّم ہی میں کیا چٹخارہ تھا

شاہ کے دربار میں ٹوڈی[1] کے سُر محبوس تھے
آہوئے دل اُس گھڑی صحراؤں میں آوارہ تھا

حُسن تیرا برگِ گُل تھا یا پرِ طاؤس تھا
دل مرا دینِ مبینِ عشق کا سیپارہ تھا

وصل اک لمحہ تھا لیکن نقش ہو کر رہ گیا
ورنہ کہنے کو غزالِ دشت کا طرّارہ تھا

کتنے چاؤ سے کیا تھا ہم نے آغازِ سفر
زادِ رہ معصوم آشاؤں کا اک پشتارہ تھا

گاؤں کو پرویز نے تیاگا تو پھر لوٹا نہیں
ایک جھونکا تھا کوئی جوگی تھا یا بنجارہ تھا

[1] ایک راگنی جس کے متعلق روایت ہے کہ اس کے اثر سے آہوانِ صحرا کھچے آتے ہیں۔

مظفر علی سیّد

○

آگ سی ایک، دل میں لگی چاہیے
زندگی چاہیے، رَوشنی چاہیے

قہقہوں میں ہمارے فقط زہر ہے
مسکراہٹ ہمیں آپ کی چاہیے

اِک طلب ہو تو اللہ سے مانگیں دعا
کچھ بھی ملتا نہیں، اور سبھی چاہیے

بَچ گئے تم سے جب اس کے دیوار و در
غیر کو اور کیسی خوشی چاہیے

دل جلاشن کے عشّاق کی گفتگو
عشق بھی آج کل سرسری چاہیے

جس کو دیکھوں اُسے میں ہی چاہا کرُوں
آپ بھی تو کسی کو کبھی چاہیے

اور کچھ مے سے یاروں کو مطلب نہیں
بس رگ و پے میں اک سنسنی چاہیے

تم تو سیّد فقیری میں خوش ہو گئے
وہ بھی ہیں جن کو آسودگی چاہیے

مظفر علی سیّد

○

تراشو اینٹ پتھر کی پناہیں
مساجد، مدرسے اور خانقاہیں
ہمارے سر پہ سایہ ہے فلک کا
غنیمت ہیں یہ مٹیالی سی راہیں
سنبھل کر بیٹھیے گا میکدے میں
یہاں پیہم اچھلتی ہیں کلاہیں
حکومت کیا چلے مٹی پہ اُس کی
کہ جس کی آسماں پر جلوہ گاہیں
کجا دوزخ، کہ جنت میں بھی ہم نے
دبی آہیں سُنیں، زخمی کراہیں
نہیں دولت کبھی ملنے کی ہم کو
ملے گی کیسے کہ جب تک ہم نہ چاہیں
وہاں کیجے تو کیسے پیار کیجے
جہاں پل میں بدلتی ہوں نگاہیں
نہ اُن کے ہاتھ آؤں گا میں سیّد
بُلایا ہی کریں گی اب وہ باہیں

صہبا اختر

○

ہر عالم برابر لکھ رہا ہوں
میں پیاسا ہوں، سمندر لکھ رہا ہوں

نہ جانے کیا بلا ہے حرفِ زندہ
غمِ جاں سے گزر کر لکھ رہا ہوں

نظر پروازِ آدم پر جمی ہے
ستاروں کا مقدر لکھ رہا ہوں

سلامت ہے یہ کیوں تجھ سے بچھڑ کر
میں اپنے دل کو پتھر لکھ رہا ہوں

مئے لب سے مجھے خوش کرنے والو
تمھارے نام کوثر لکھ رہا ہوں

صہبا اختر

○

اُن کو مرے علوئے سخن سے ہے کیوں حسد
ماچس کی تیلیوں کے برابر ہیں جن کے قد

سینے میں ناچتی ہے زمیں، دل میں آسماں
چھوتا ہے دستِ فکر مہ و مہر کے جسد

مجھ کو یہ فخر ہے کہ میں فرزندِ خاک ہوں
خورشید و ماہتاب نہیں میرے اب و جد

آغاز بھی حیات ہے انجام بھی حیات
اک روشنی ازل ہے تو اک روشنی ابد

صہبا نثار اُس پہ سخن کے ہزار رنگ
جس نے مری غزل کو دیئے ہیں یہ خال و خد

سجاد باقر رضوی

○

راہوں کے اُونچ نیچ ذرا دیکھ بھال کے
ہاں رہروِ مراد، قدم رکھ سنبھال کے

فتنوں کو دیکھ، اپنے قدم روک، بیٹھ جا
راتیں یہ آفتوں کی ہیں، یہ دن وبال کے

لمحوں کی لَے پہ گزری ہیں راتیں نشاط کی
کس دھن میں دن کٹیں گے یہ رنج و ملال کے

میں سرگراں تھا ہجر کی راتوں کے قرض سے
مایوس ہو کے لوٹ گئے دن وصال کے

کچھ یہ نہ تھا کہ میں نے نہ سمجھی بساطِ دہر
میں خود ہی کھیل ہار گیا دیکھ بھال کے

سامانِ دل کو بے سر و سامانیاں ملیں!
کچھ اور بھی جواب تھے میرے سوال کے

تخلیق ہے مری، تری تخلیق سے الگ
میں بھی بناتا رہتا ہوں پیکر خیال کے

پیاسی زمینِ دل ہے، پڑا قحطِ فصلِ شوق
ہاں اے ہوا، کدھر گئے دن برشگال کے

باقر یہ دانت نیچ زباں بند کیوں ہوئی
قائل تو آپ بھی تھے بہت قیل و قال کے

سجاد باقر رضوی

○

ظرفِ عالی ہوں کہ بھر کر بھی کبھی چھلکا نہیں
ہوں وہ دریا جو کناروں پر کبھی بہتا نہیں

ہوں وہ پیمانہ کہ محفل جس کو ہاتھوں ہاتھ لے
میں وہ نشہ ہوں جو سر چڑھ کر کبھی اترا نہیں

کشتِ ہستی! تو مجھے پہچان، تیری آس ہوں
میں وہ بادل ہوں جو اب تک ٹوٹ کر برسا نہیں

خواب ہوں لیکن اگر تعبیر خود اپنی کروں
میں نہیں یا پھر مری دنیا کا یہ نقشہ نہیں

دوں کسے آواز! اپنے آپ کو کیسے جگاؤں
تو مرے دل میں تو ہے لیکن مری سنتا نہیں

اس فقیری میں بھی للچاتی ہے دُنیا کی جھلک
میں کہوں کیسے کہ اُس کے پاس سے گذرا نہیں

تھا ہواؤں میں مگر پہنچی تھی کچھ ایسی اُڑان
میں یہ سمجھا دل پہ اُترے گا، مگر اُترا نہیں

فاصلے قربت بنے، اب قربتیں ہیں فاصلہ
وہ جو پہلو میں ہے میرے دھیان میں آتا نہیں

دیکھتے ہو تم جسے ہر آن میرے ساتھ ساتھ
وہ مری آشفتگی ہے، وہ مرا سایہ نہیں

عزّتِ سادات ہے محفوظ باقرؔ میرے پاس
میں وہ عاشق ہوں جو اب تک شہر میں رسوا نہیں

صادق نسیم

○

ہر لفظ میں مہتاب معانی کی ضیا ہوں
نادیدہ نگارانِ تصور کی ادا ہوں
احساس کے غنچوں کی چٹک ہے مری آواز
میں سینۂ آفاق میں دھڑکن کی صدا ہوں
ادراک کے شعلوں کا چمن ہے مرا آہنگ
میں برگِ خزاں ہو کے بھی گلزار نما ہوں
ہر تلخ حکایت پہ ہے شیریں مرا لہجہ
میں زہر کے ساغر میں بھی رس گھول رہا ہوں
محدود ہے کیوں حدِ طلب تک مری آواز
میں موجِ صبا ہو کے بھی زنجیر بپا ہوں
جب دشتِ الم سے کوئی جھونکا کبھی آیا
میں لالۂ خود رَو کی طرح اور کھلا ہوں
اب قصرِ تمنا کے دریچے ہیں مرے زخم
میں خوں میں نہایا ہوں تو شہکار بنا ہوں
اک نغمۂ رنگیں ہوں لبِ سازِ مژہ پر
صادق جرسِ غنچہ ہوں تصویرِ صدا ہوں

صادق نسیم

○

بیدل کا تخیل ہوں نہ غالب کی نوا ہوں
اُس قافلۂ رفتہ کا نقشِ کفِ پا ہوں

رقصاں ہے چراغانِ تمنا مرے ہر سُو
وہ روشنیاں ہیں کہ میں سائے سے جُدا ہوں

ہر عکسِ مقابل سے نمایاں ہے مرا نقش
دنیا میں ہوں یا آئینہ خانے میں کھڑا ہوں

ظلمات اماں بھی ہیں، اجالوں کا امیں بھی
میں صبح کے تارے کی طرح ڈوب رہا ہوں

افلاک رسی سے بھی تلافی نہیں ہوتی
کس عزم کی آن دیکھی چٹانوں سے گرا ہوں

ہر چند کہ نس نس میں نہاں برقِ تپاں ہے
کھل کر بھی برستا ہوں کہ گھنگھور گھٹا ہوں

ایک ایک کرن میں ترے سو رنگ نظر آئے
جب پچھلے پہر چاند کے ہمراہ چلا ہوں

خود اپنے تصور سے لرز اُٹھتا ہوں صادق
کس کاکلِ پُرخم کی جنوں خیز صبا ہوں

جاوید شاہین

○

اب یہاں لوگوں کے دکھ سکھ کا پتا کیا آئے

بند ہوں گھر تو مکینوں کی صدا کیا آئے

ڈوبتے دن کے جلو میں نہ سکوں ہے نہ فراغ

شفقِ شام سے چہروں پہ ضیا کیا آئے

سرد سینوں میں پنپتے ہی نہیں درد کے بیج

ان خرابوں پہ برسنے کو گھٹا کیا آئے

دور ہو جیسے ترے جسم، تری جاں کی گھٹن

تنگ ہے بے روزن و در گھر میں ہوا کیا آئے

خشک پتے ہیں کہ جھڑتے ہی نہیں پیڑوں سے

کیسے تبدیل ہو رُت، رنگ نیا کیا آئے

کھو چکے لطفِ سحر خیزی، گراں خواب مکیں

صبحدم، بند دریچوں میں صبا کیا آئے

گرمِ ہنگامہ کرے کون رگوں میں شاہینؔ

خشک ندیوں میں کوئی موجِ بلا کیا آئے

محمد علوی

○

زمین لوگوں سے ڈر گئی ہے
سمندروں میں اتر گئی ہے

خموشیوں میں صدا گجر کی
خیال کے پر کتر گئی ہے

کھڑے ہیں بے برگ سر جھکائے
ہوا درختوں کو چر گئی ہے

ہمیں تو نیند آئے گی نہ لیکن
یہ رات بھی تو ٹھہر گئی ہے

کہاں بھٹکتے پھرو گے علوی
سڑک سے پوچھو کدھر گئی ہے

○

خرابے میں تنہائی کے کیوں پھروں
ملے جسم کا شہر تو جا رہوں

ابھی ساتھ چلتا ہوں ٹھہرو ذرا
جدائی کی پوشاک تو جھاڑ لوں

سنوں بند کمروں کی سرگوشیاں
کواڑوں کی درزوں سے جھانکا کروں

نئی نظم تو لے اڑے چھوکرے
میں بوڑھی غزل سے ہی جی خوش کروں

پتا نام چاہو تو لکھ لو میاں،
میرا نام علوی ہے گجراتی ہوں

محسن احسان

○

کتنی کڑی سزا ملی ہے دل کی بھول پر
اب قہقہے لگاتا ہوں اپنے اصول پر

غم کی مہیب آندھیاں چلنے کے باوجود
یادوں کا خون جم گیا لمحوں کی دھول پر

اب کے برس بہار نے ہر وار سہہ لیا
دستِ خزاں کا کوئی نشاں تھا نہ پھول پر

پاؤ گے اور کچھ نہ بجز زخمِ زندگی
انگور کو چڑھا کے نہ دیکھو ببول پر ؎

آئی ہوائے شوق تو سب نقش مٹ گئے
تحریر کوئی بھی نہ ملی دل کی دھول پر

محسن کبھی نہ آئیں گی اڑ اڑ کے تتلیاں
گلدان میں سجے ہوئے کاغذ کے پھول پر

؎ لگ گئے انگور چڑھایا ہر گچھا زخمیا

محسن احسان

○

سمجھ میں آتا نہیں، انتظار کیسا ہے
وہ پاس بھی ہے، پہ دل بے قرار کیسا ہے

امیرِ قافلۂ شہر! کچھ بتا تو سہی
جبینِ رہرواں پہ غبار کیسا ہے

نہ برق ہی کہیں تڑپی، نہ آگ ہی بھڑکی
مگر دھواں سا سرِ شاخسار کیسا ہے

نہ کارواں کوئی بھٹکا، نہ کوئی دل دھڑکا
مگر یہ شور سرِ رہگزار کیسا ہے

ہر ایک بات میں پنہاں ہے طنز کی تلوار
مجھے خبر ہے مرا غمگسار کیسا ہے

پرو دیئے مری پلکوں پہ جس نے پیار کے پھول
خدا ہی جانے وہ جانِ بہار کیسا ہے

ہو لئے دشتِ محبت! اسنادؔ محسنؔ کی
وہ بے مراد، غریب الدیار کیسا ہے

سیف زلفی

○

جو لوگ شور کرتے نہیں، ڈھول کی طرح
ذہنوں میں گونجتے ہیں، بڑے بول کی طرح

کھل کر بھی منتظر، کہ ملے زندگی کی بھیک
ہر گل ہے شاخسار پہ، کشکول کی طرح

اتنا گھنا ہے ذہن کہ پل بھر سکوں نہیں
شور اپنی سوچ کا ہے کسی غول کی طرح

جھانکا جو دل کے بیچ تو عریاں تھیں خواہشیں
اوپر سے اوڑھ لی تھی انا، خول کی طرح

یہ جان لے کہ سستا نہیں ہے ہر ایک شخص
میں بھی بہت گراں ہوں، ترے مول کی طرح

ہیں ذہن کھوکھلے کہ ذرا نغمگی نہیں
پڑتے ہی تھاپ بجنے لگیں، ڈھول کی طرح

اس ان سنی سی شکل کی تفسیر کیا کروں
دل میں اتر گئی جو نئے بول کی طرح

زلفی وہاں وہ چاہ کا دریا بھی خشک ہے
میں بھی یہاں ہوں، سوکھے ہوئے ڈول کی طرح

سیف زلفی

○

کب تک یہ التفات، یہ پتھراؤ دوستو
پھر تم نہ گن سکو گے میرے گھاؤ دوستو

سینہ سپر ہوں میں بھی سرِ مقتلِ حیات
اب تم بھی خندقوں سے نکل آؤ دوستو

میں موجِ تند و تیز ہوں، ہٹ جاؤ راہ سے
کاغذ کی کھے رہے ہو کہاں ناؤ دوستو

پایا ہے تم نے اپنا خریدار بھی کوئی
پوچھا ہے تم نے اپنا کبھی بھاؤ دوستو

پہلے تم اپنے اپنے گریباں میں جھانک لو
پھر داغ ماہتاب کے گنواؤ دوستو

اپنی ستائشوں کے کنویں میں مگن رہو
خود اپنی عظمتوں کے بھجن گاؤ دوستو

تم چپ رہو تو اس میں تمہارا بھرم بھی ہے
یوں سب کے سامنے تو نہ ہکلاؤ دوستو

خنجر بدست آج تو بگڑے گئے ہو تم
اپنے کیے پہ آج تو شرماؤ دوستو

اچھی نہیں ہے ذہن پہ کائی جمی ہوئی
ہے مرگِ آب، جھیل کا ٹھہراؤ دوستو

کہتے ہیں جس کو شعلۂ احساسِ آگہی
اس کو لہو کی آنچ سے بھڑکاؤ دوستو

وہ سوچ جس سے گوہرِ انسانیت ملے
اس سوچ کے بھنور میں اتر جاؤ دوستو

وہ عطر، جس کا نام خلوصِ حیات ہے
اُس عطر سے مزاج کو مہکاؤ دوستو

وہ سوچ جس سے ذہن کے گوشے مہک اُٹھیں
اُس سوچ کی کرن سے لپٹ جاؤ دوستو

زلفی کے دل میں گردِ کدورت ذرا نہیں
تم بھی اِسی اصول کو اپناؤ دوستو

تخت سنگھ

○

ہر آنکھ تری، جھیل ہے نکھرے ہوئے جل کی
ہر جھیل میں خوشبو ہے اُجالے کے کنول کی

ہر اور دکھتی ہیں تجھے گھورتی آنکھیں
کیوں خیر مناؤں نہ ترے رُوپ رسیَل کی

چاندی کی ڈلی بن کے مری رُوح میں جھلکی
مُسکان تری نین کٹوروں سے جو چھلکی

ہوتا ہے تری چاپ کا دھوکا جو کہیں سے
پڑتی ہے بھنک کان میں ہلکی سے بھی ہلکی

دھوپ "آج" کی ہرچند کڑی ہے، پر ابھی تک
سپنوں کے گھنے پیڑ تلے چھاؤں ہے کل کی

رہ جائیں نہ آشاؤں کے یہ پھول جُھلس کر
حالات کے جھونکوں میں تپی ریت ہے تھل کی

لگتا ہے، ہری ہونے کو ہے ڈال سمے کی
کونپل سی تو پھوٹی ہے نئی بھور کے پل کی

کشور ناہید

○

ضبط اتنا بھی نہ کر، احساس مرجھا جائے گا
سرخ گالوں کا چمکتا رنگ زردا جائے گا

ایک ہی ہے سوچ کا انداز، دن یا رات ہو
لاکھ کیجے ترکِ صحبت، ربط بڑھتا جائے گا

ان گنت لوگوں کی چاہت نے اُسے دھندلا دیا
وہ کہاں تک اپنی صورت کو بدلتا جائے گا

روح بھی تشنہ رہے گی ریگِ ساحل کی طرح
جسم بھی شوقِ تعلق میں اُجڑتا جائے گا

ڈھیر ہو جائے گا سورج ایک دن جل جل کے آپ
چاند پتوں کی طرح آخر کو مرجھا جائے گا

شامِ غم جس سے ملوں پہروں وہ یاد آئے گا پھر
ہاں مگر کچھ دن میں وہ چہرا بھی دھندلا جائے گا

زعم ہے اس سے بچھڑ کے بھول جائیں گے اسے
کب مگر اپنی طبیعت ہی کو بدلا جائے گا

میں تری خوئے تلون کے کھلے صحرا میں ہوں
مجھ سے ہی کب تیرے گھر کا رستہ ڈھونڈا جائے گا

رنگ دکھلائے گا کچھ آخر شکستوں کا شمار
ہونٹ سی لو گی تو آنکھوں میں اُبھرتا جائے گا

تشنۂ گریہ ہوں مدت سے، تماشہ ہوں ترا
تو کہاں تک اپنے سائے سے الجھتا جائے گا

اندمالِ غم بھی ہے ناہید طرحِ تازہ غم
تشنگی جتنی بڑھے، شعلہ بھڑکتا جائے گا

اسلم انصاری

○

درسِ آدابِ جنوں یاد دلانے والے
آ گئے پھر مری زنجیر ہلانے والے

کس طرح کھوئے گئے عکسِ رواں کی صورت
شہرِ ہجراں میں ترا کھوج لگانے والے

خمِ محراب پہ صدیوں کی سیہ گرد بھی دیکھ
طاقِ ویراں میں لہو اپنا جلانے والے

غور سے دیکھ، کوئی ہے پسِ تصویرِ خزاں
ورنہ کس سمت گئے رنگ جمانے والے

فصلِ بے برگ کچھ ایسی بھی تو بے رنگ نہیں
داستاں عہدِ بہاراں کی سنانے والے!

زہر اب زہر ہے، بنتا نہیں کارِ تریاک
مر گئے زہر کو تریاک بنانے والے

دفِ گل ٹوٹ گئی دستِ صبا میں لیکن
رقص کرتے ہی رہے وجد میں آنے والے

بجھ گئے شوخ دریچوں میں سلگتے مہتاب
سو گئے رات کی تقدیر جگانے والے

منتظر سب ہیں، مگر سب کو یہی دھڑکا ہے
اِس خرابے کو پلٹتے نہیں جانے والے

اسلم انصاری

○

لرز لرز کے دلِ ناتواں ٹھہر ہی نہ جائے
فراقِ ساز، کہیں روحِ نغمہ مر ہی نہ جائے

اُتار لے کسی شیشے میں ساعتِ نغمہ
صدائے قافلۂ گل کہیں بکھر ہی نہ جائے

سنا بھی دے کسی گل کو فسونِ تنہائی
رہِ خیال سے یہ کارواں گزر ہی نہ جائے

کسی کو مہلتِ ہستی بھی دے غمِ جاناں
یہ کیا کہ آئے کوئی تو پلٹ کے گھر ہی نہ جائے

ہے ایک قلزمِ خوں قریۂ جنوں سے ادھر
یہاں جو آئے کوئی اس کی پھر خبر ہی نہ جائے

نگاہِ یار۔۔ غمِ جاں گسل کا کیا ہوگا
ترے کرم سے نصیبِ ٹ فا سنور ہی نہ جائے

وہ خوش مزاج ہے اس کو الم سے کیا نسبت
سنا نہ عشق کا غم، عشق سے وہ ڈر ہی نہ جائے

بجا کہ جاں سے گزرنا بہت کٹھن ہے، مگر
ترے نثار، کوئی ایسا کام کر ہی نہ جائے

بہا دے آج کچھ آنسو، کہ پھر غنیمت ہیں
چڑھا ہے آج جو دریا، وہ کل اُتر ہی نہ جائے

سلیم شاہد

○

کھلتی ہے گفتگو سے گرہ پیچ و تاب کی
پر کس سے کھُل کے بات کریں اضطراب کی

کافی نہیں ہے چشمِ تماشا کو رنگِ گُل
لائیں کہاں سے زخم میں خوشبو گلاب کی

اپنی برہنگی کو بچا تیز دھوپ سے
کرنوں میں بُو ہے جلتے ہوئے آفتاب کی

کچھ میں شجر سے ٹوٹ کے بے خانماں ہوا
ہاں کچھ ہوا نے بھی مری مٹی خراب کی

اک عمر ہو گئی ہے کہ میں جاں کنی میں ہوں
ایسی ٹھہر گئی ہے یہ ساعت عذاب کی

آہٹ نہ کر کہ میں تجھے جی بھر کے دیکھ لوں
ایسا نہ ہو کہ گر پڑے دیوارِ خواب کی

احساس تیرگی ہے تو سورج اچھال دے
ورنہ دعا نہ مانگ یہاں انقلاب کی

محکوم بستیوں سے سرکنے لگی ہے دھوپ
وہ عہد ہوں کہ جس نے شفق بے نقاب کی

بجلی چلی گئی تو وہ آنکھوں میں رہ گیا
اب چھُو کے پڑھ رہا ہوں عبارت کتاب کی

شاہد کہاں سے ہو کے گزرتی ہے آبِ جُو
رنگت تمام سرخ ہے کیوں سطحِ آب کی

بشیر احمد بشیر

○

اک دن میں پلک تک کوئی خونِ جگر آیا ——— برسوں میں کہیں چشمِ رواں کو ہنر آیا

اتنا ہی بس اب ربط ہے وحشت ہوئی جب بھی ——— دیکھ آیا در و بام کو، اک آہ بھر آیا

ہو کون یہ اس دشت میں، کس کی ہو یہ آواز ——— آفت زدہ ہوگا کوئی، آیا ٹھہر آیا

ق

محسوس ہوئی چاپ سی آتی ہوئی نزدیک ——— دیوار پہ سایہ سا لرزتا نظر آیا

دیکھا جو پلٹ کر تو ہے اور نہ دریچہ ——— ہنستا ہوں میں اب، رات مگر کتنا ڈر آیا

ہر ثابت و سیار کی گردش رہی موقوف ——— پھر ماہِ مبیں فرشِ زمیں پر اُتر آیا

ق

بخشا گیا پھر اذنِ سفر ہر سفری کو ——— پھر قافلۂ صبحِ ازل موج پہ آیا

یکتا ہوئے، کامل ہوئے افسانہ گری میں ——— اچھا ہوا یارو، تمھیں یہ بھی ہنر آیا

میں ساعتِ رفتہ، مری امید نہ رکھیو ——— گزرا ہوا لمحہ بھی کبھی لوٹ کر آیا

پہلے تو بشیرؔ اک یونہی سادہ سی لگی بات

پرکھا تو سخن گنج جواہر نظر آیا

جون ایلیا

○

حال یہ ہے کہ خواہشِ پرسشِ حال بھی نہیں
اپنا خیال بھی نہیں، اُس کا خیال بھی نہیں

اے شجرِ حیاتِ شوق، ایسی خزاں رسیدگی
چادرِ برگ و گل تو کیا، جسم پہ چھال بھی نہیں

تو مرا حوصلہ تو دیکھ، داد تو دے کہ اب مجھے
شوقِ کمال بھی نہیں، فکرِ زوال بھی نہیں

مجھ میں وہ شخص مر چکا جس کا کوئی ثبوت تھا
سود ہے کیا، زیاں ہے کیا، اس کا سوال بھی نہیں

خیمہ گہِ نگاہ کو لوٹ لیا گیا ہے کیا؟
آج افق کے دوش پہ گرد کی شال بھی نہیں

اُف یہ فضائے احتیاط، تاکہیں اُڑ نہ جائیں ہم
بادِ جنوب بھی نہیں، بادِ شمال بھی نہیں

مست ہیں اپنے حال میں دل زدگان و دلبراں
صلح و سلام تو کجا، جنگ و جدال بھی نہیں

وجہِ معاشِ بیدلاں یاس ہے اب، مگر کہاں
تیرے ورود کا گماں فرضِ محال بھی نہیں

پہلے ہمارے ذہن میں حسن کی اک مثال تھی
اب تو ہمارے ذہن میں کوئی مثال بھی نہیں

میرے زمان و ذات کا ہے یہ معاملہ کہ اب
صبحِ فراق بھی نہیں، شامِ وصال بھی نہیں

غارتِ روز و شب تو دیکھ، وقت کا یہ غضب تو دیکھ
کل تو نڈھال بھی تھا میں، آج نڈھال بھی نہیں

میں بھی بہت عجیب ہوں اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

انور شعور

○

کیا چاہیے نہ تھا یہ کبھی پوچھنا تمھیں
کیسے ہو تم شعورؔ یہ کیا ہو گیا تمھیں

ماتھا جلا ہوا ہے کڑی دھوپ سے، اور آنکھ
کہتی ہے رات رات کا جاگا ہوا تمھیں

کیا اضطراب تھا کہ سکوں چھین لے گیا
کیا انقلاب تھا جو نہ راس آسکا تمھیں

کس سمت سے چلی تھی کس آنگن سے آئی تھی
بادِ سموم، جس نے پریشان کیا تمھیں

کیوں گرد گرد ہے یہ قبا جس کے باب میں
تھا ناگوار لمسِ لطیفِ صبا تمھیں

عرصے سے کیوں غزل کوئی شائع نہیں ہوئی
کیوں نشر گاہ سے نہ کسی نے سنا تمھیں

وہ جمگھٹا وہ بھیڑ وہ جلسے کہاں گئے
چھوڑا تمھارے چاہنے والوں نے کیا تمھیں

رہتے ہو کیوں اکیلے اکیلے اُداس اُداس
کیا دوستوں سے آنے لگی ہے حیا تمھیں

مَیں نے تو کوئی دکھ تمھیں ہر گز دیا نہیں
پھر دو جہاں کا کون سا غم کھا گیا تمھیں

میں سامنے ہوں جان ذرا آنکھ تو اٹھاؤ
مدت ہوئی ہے دیکھے ہوئے آئینہ تمھیں

اقبال ساجد

○

غار سے سنگ ہٹایا تو وہ خالی نکلا
کسی قیدی کا نہ کردار مثالی نکلا

چڑھتے سورج نے ہر اک ہاتھ میں کشکول دیا
صبح ہوتے ہی ہر اک گھر سے سوالی نکلا

سب کی شکلوں میں تری شکل نظر آئی مجھے
قرعۂ فال مرے نام پہ گالی نکلا

راس آئے مجھے مرجھائے ہوئے زرد گلاب
غم کا پرتو مرے چہرے کی بحالی نکلا

کٹ گیا جسم مگر سائے تو محفوظ رہے
میرا شیرازہ بکھر کر بھی مثالی نکلا

رات جب گذری تو پھر صبح خمار نگ ہوئی
آسماں جاگی ہوئی آنکھ کی لالی نکلا

رات مجھ سے بھی تو ہر گھر کے در و بام سجے
چاند کی طرح مرا عکسِ خیالی نکلا

آہ پھنکار کی مانند دلوں سے نکلی
کوئی بھی گھر نہ یہاں سانپ سے خالی نکلا

تخت خالی ہی رہا دل کا ہمیشہ ساجد
اس ریاست کا تو کوئی بھی نہ والی نکلا

صمد انصاری

○

محرابِ جنوں میں سرِ منبر نہیں پہنچے
جو لوگ غمِ ذات سے باہر نہیں پہنچے

گزرے ہیں کسی راہ سے مقتل کے مسافر
پہنچے ہیں سرِ دار تو مُڑ کر نہیں پہنچے

گرتا ہے جہاں تازگیِ فکر کا جھرنا
اُس چشمۂ حیواں پہ سکندر نہیں پہنچے

وہ تیر بھی سینے میں کھٹکتے ہیں ہدف کے
وہ تیر جو ترکش سے کماں پر نہیں پہنچے

الفاظ کو دیتے ہیں جو الہام کی صورت
بازارِ سخن میں وہ پیمبر نہیں پہنچے

مہکے ہیں وہی رات گلابوں سے زیادہ
وہ داغ جو زخموں کے برابر نہیں پہنچے

جو دل میں اُتر جاتے ہیں بے لفظ و معانی
فن تک وہ صمدؔ حسن کے تیور نہیں پہنچے

صدیق افغانی

○

بوالہوس ہم بھی نہ تھا، وہ بُت بھی ہرجائی نہ تھا
پھر بھی ہم بہروپیوں کو خوفِ رسوائی نہ تھا
آندھیوں نے سب مٹا ڈالے نقوشِ رہگزر
ریت کے سینے پہ داغِ آبلہ پائی نہ تھا
رات کے کالے کنوئیں میں چھپ گیا سایہ مرا
اس سے پہلے تو کبھی یہ رنگِ تنہائی نہ تھا
درد کا گرداب، موجِ اشک، سیلِ آرزو
دل میں اک ناسور تھا زخمِ شناسائی نہ تھا
وہم کا پیکر تھا آویزاں در و دیوار پر،
کھڑکیوں میں چاند، محوِ جلوہ آرائی نہ تھا
سبز پیڑوں کے تنے کٹ کٹ کے کیوں گرنے لگے
اے ہوا! میں قتل و غارت کا تمنائی نہ تھا
کیا تر و تازہ تھا آبِ صبح سے نخلِ شفق
بجھتے سورج میں تو یہ اندازِ رعنائی نہ تھا
ایک اک کردار تھا اپنی اداکاری میں گم
اِس تماشا گاہ میں کوئی تماشائی نہ تھا
مرگیا صدیق کوہِ غم سے ٹکّر مار کر
سر میں سودا تھا، مگر ذوقِ جبیں سائی نہ تھا

صدیق افغانی

○

شعبدہ تھا یا حقیقت، ذہن تاریکی میں تھا

جل رہا تھا آگ میں جنگل، دھواں پانی میں تھا

سبز ٹہنی پر جما تھا قطرۂ خونِ گلاب

لوگ یہ سمجھے کہ سونے کا اثر مٹی میں تھا

جنبشِ موجِ ہوا سے چھڑ گیا سازِ شمیم

ورنہ ہر گُل مضطرب زندانِ خاموشی میں تھا

کُھل گئیں جب انگلیاں کتنی پشیمانی ہوئی

بند اک پھیلا ہوا صحرا مری مٹھی میں تھا

بزم میں آ کر بجھا، میری طبیعت کا چراغ

میں کہ صدیوں سے فروزاں کنجِ تنہائی میں تھا

چھُو لیا جب میں نے وہ پیکر تو میلا ہو گیا

اب کھُلا یہ راز۔ چاہت کا مزا دوری میں تھا

میں نے جب صدیقؔ دوڑائی زمانوں پر نظر

اک جہاں سمٹا ہُوا لمحے کی پہنائی میں تھا

ریاض مجید

○

چھوڑ میرا ساتھ، خود کو ختم کرنے دے مجھے
زندگی اے زندگی! مت روک، مرنے دے مجھے

منزلوں کی راہ تکتے تکتے آنکھیں بجھ گئیں
چلتے چلتے تھک گیا ہوں، اب ٹھہرنے دے مجھے

روزِ پیدائش سے زنجیرِ سفر میں قید ہوں
اے دلِ آوارہ! اب آرام کرنے دے مجھے

ہو گیا ہے ختم کھارے پانیوں کا سلسلہ
دیکھ، دھرتی آ گئی ہے، اب اُترنے دے مجھے

مجھ کو اَن دیکھی زمینیں دیکھنے کا شوق ہے
میں ہواؤں کی امانت ہوں، بکھرنے دے مجھے

سب مرے بوسیدہ خدّ و خال سے بیزار ہیں
اے بدن، اب اور کوئی سوانگ بھرنے دے مجھے

روح کا کانٹا ہے، نا آسودہ خواہش کی خلش
جو مرا دل چاہتا ہے، کر گزرنے دے مجھے

میرے مردہ جسم سے کچھ اور پتھّر باندھ دے
موج اُبھارے بھی اگر، تو مت ابھرنے دے مجھے

اے گلی کوچوں کے شور و غل، مرے پیچھے نہ آ
اپنے اندر کی صدا پر کان دھرنے دے مجھے

سہہ چکا ہوں ہر سمے کا قہر اپنی جان پر
اے ریاض، اب اپنے بال و پر کترنے دے مجھے

ریاض مجید

○

رات دن محبوس اپنے ظاہری پیکر میں ہوں
شعلۂ مضطر ہوں میں لیکن ابھی پتھر میں ہوں
اپنی سوچوں سے نکلنا بھی مجھے دشوار ہے
دیکھ میں کس بے کسی کے گنبدِ بے در میں ہوں
دیکھتے ہیں سب مگر کوئی مجھے پڑھتا نہیں
گزرے وقتوں کی عبارت ہوں عجائب گھر میں ہوں
جرم کرتا ہے کوئی اور شرم آتی ہے مجھے
یہ سزا کیسی ہے؟ میں کس عرصۂ محشر میں ہوں؟
میرا دکھ یہ ہے میں اپنے سابقوں جیسا نہیں
میں بہادر ہوں مگر ہارے ہوئے لشکر میں ہوں
تجھ کو اتنا کچھ بنانے میں مرا بھی ہاتھ ہے
میری جانب دیکھ میں بھی تیرے پس منظر میں ہوں
کون میرا پوچھنے والا ہے جو آگے بڑھے
میں اکیلا دیوتا جلتے ہوئے مندر میں ہوں
مجھ سے بھی اڑتے ہوئے لمحے نہ پکڑے جا سکے
میں بھی دنیا کی طرح حالات کے چکر میں ہوں

گوہر ہوشیارپوری

○

شاعری بات، نہیں گرمِ سخن ہونے کی
شرط ہی اور ہے شائستۂ فن ہونے کی

ہیں کہ ہر دم مجھے بالیدگیٔ روح کی فکر
روح کو فکر ہے وارستۂ تن ہونے کی

پرتوِ رنگ سے گلگوں ہوا معمورۂ چشم
دھوم ہے کوئے تماشا کے چمن ہونے کی

رم بہ رم سلسلۂ موجِ غزالانِ خیال
وحشتِ غربت کو بشارت ہو وطن ہونے کی

حق پرستی کو یہاں کون ہے آمادۂ دار
کس کو توفیق ہے بے گور و کفن ہونے کی

یا بچے گا نہ سحر تک کوئی درماندۂ شب
یا سحر ہی نہیں "خاکم بدہن" ہونے کی

درد کی سالگرہ خیر سے گزرے گوہر
آ گئی رات وہی چاند گہن ہونے کی

فضیل جعفری

○

روز و شب چلتے ہیں لیکن نہیں پاتے خود کو
ہائے یہ دور کہ اب اپنے ہی سائے ہوئے لوگ

کو بہ کو پھرتے ہیں بے نام بگولوں کی طرح
دل میں سو طرح کے ارمان بسائے ہوئے لوگ

راستہ بھول گئے جسم کے صحراؤں میں
آرزوؤں کے سمندر میں نہائے ہوئے لوگ

○

شہر لب و رخسار میں مرنے نہیں دیتیں
کچھ مصلحتیں حد سے گذرنے نہیں دیتیں

ایسا کوئی جادو تری یادوں نے کیا ہے
نہ خانوں سے ماضی کے اُبھرنے نہیں دیتیں

آوارہ حسیناؤں کے مانند ہوائیں
منزل پہ مسافر کو ٹھہرنے نہیں دیتیں

زاہد فارانی

○

ہے میرے سر سے کوئی بوجھ اتارنے والا
پکارتا ہے یہ ہر دم پکارنے والا

پھرا ہے یوں وہ رُخِ آئینہ نما مجھ سے
کوئی نہیں مری صورت سنوارنے والا

بنا ہوں سینۂ دریا کا بوجھ مدت سے
کوئی رہا ہی نہیں پار اُتارنے والا

بدلتی جاتی ہے حالت زمیں کے چہرے کی
کہ آسماں ہے نیا روپ دھارنے والا

اتر کے کارگہِ فن میں فتح یاب ہوا
بساطِ دہر پہ ہر روز ہارنے والا

میں اپنے عہد کا صنّاعِ شعر ہوں زاہد
مرا قلم ہے نئے نقش اُبھارنے والا

○

ستارے چپ ہیں کہ نغمہ سرا سمندر ہے
شبِ خموش کے دل کی صدا سمندر ہے

سکوتِ لب کو صداؤں کا پیش رو سمجھو
کہ رود بار کے آگے کھُلا سمندر ہے

وہ دیکھتا ہے مرے اضطراب کو ہنس کر
میں تیز رو ہوں، وہ ٹھہرا ہوا سمندر ہے

مہ و نجوم دکھاتے ہیں آئینہ اس کو
فلک کے سامنے چہرہ نما سمندر ہے

مٹا چلے ہیں مسافت کا نقش اہلِ طلب
ہوا سروں میں ہے اور زیرِ پا سمندر ہے

نظر میں صورتِ ساحل ابھی نہیں آئی
مرے سفر کا ہر اک مرحلہ سمندر ہے

کیفی جامپوری

○

بلبلو! وقتِ نوا تو دیکھو
اور گلشن کی فضا تو دیکھو
کس کو آوارہ سری تھی منظور
دشت کے صبح و مسا تو دیکھو
ایک دامن بھی سلامت نہ رہا
شوخیِ دستِ صبا تو دیکھو
میرے اشکوں میں وہ سرخی نہ سہی
اپنے ہاتھوں کی حنا تو دیکھو
ہنستے ہو چاک گریبانوں پر
تم ذرا اپنی قبا تو دیکھو
لطفِ نغمہ پہ مٹے جاتے ہو
سینۂ نغمہ سرا تو دیکھو

○

سامنے دشتِ وفا ہو جیسے
راہبر و آبلہ پا ہو جیسے
ترے لہجے کا یہ دھیما پن بھی
عالمِ رنگ و نوا ہو جیسے
چاندنی رات کے سناٹے میں
کوئی دل چیخ رہا ہو جیسے
میں نے محسوس کیا ہے اکثر
تو ابھی اٹھ کے گیا ہو جیسے
اہلِ دل کا یہ سکوتِ پیہم
ماتمِ مرگِ وفا ہو جیسے
ہم ہیں بدنامِ تمنا ہم سے
شہر کا شہر خفا ہو جیسے

ظفر ابنِ متین

○

سوچتا ہوں کہ میں آج رازِ نہاں کھول دوں
بند کمرے میں گھٹتا ہے دم، کھڑکیاں کھول دوں

کیا کروں، میرے لب ہیں شکایت سے نا آشنا
ورنہ اک دن بھرم تیرا اے مہرباں، کھول دوں

پڑھ لیا دل کا مضمون چہرے کے عنوان سے
تو نہ مانے تو میں آج سب سرخیاں کھول دوں

میری چپ ہی بھری بزم کا اب تو موضوع ہے
کیا بنے اہلِ محفل پہ گر میں زباں کھول دوں

چپ رہوں میں تو اک نقطۂ بے حقیقت سے کم
اور بولوں تو ہر رازِ کون و مکاں، کھول دوں

○

ویراں روش روش ہے، چمن جا کے کیا کریں
اڑتی ہے سر پہ خاک، ہوا کھا کے کیا کریں

جنگل سہی، سکوں تو ہے پیڑوں کی چھاؤں میں
گھر تپ رہا ہے دھوپ سے، گھر جا کے کیا کریں

رہتے ہیں اور لوگ بھی کچے مکان میں
بادل گرج رہے ہیں تو گھبرا کے کیا کریں

پہنچے گی کیا نحیف صدا بامِ عرش تک
صحرائے بے کنار میں چلا کے کیا کریں

ساری فضا ہے کرب کی چیخوں سے ہمکنار
ایسی اداس رت میں غزل گا کے کیا کریں

اختر انصاری اکبر آبادی

○

یوں وہ اک مہ جمال ساتھ رہا
جیسے کوئی خیال ساتھ رہا

کوئی ماضی نہ کوئی مستقبل
ہر زمانے میں حال ساتھ رہا

اب کہاں وہ رفیقِ تنہائی
دل تھا جب تک، ملال ساتھ رہا

تم کہاں اور تمہاری بزم کہاں
ہاں تمہارا خیال ساتھ رہا

چھٹ گئے سب رفیق دُنیا کے
ایک میں خستہ حال ساتھ رہا

ناصر صدیقی

○

نہ اجنبی کی طرح اور نہ آشنا کی طرح
وہ میرے پاس سے گذرا مگر ہوا کی طرح

سمٹ نہ جائے کہیں آہٹوں میں لرزشِ دل
مٹا رہا ہے کوئی مجھکو نقشِ پا کی طرح

ہوا سے دُور رہی تیری بات کی خوشبُو
کوئی بھی جھونکا نہ آیا تری صدا کی طرح

تمام عمر اُسی چُپ کی جستجو میں رہا
مرے وجود میں اُتری تھی جو صدا کی طرح

یہ واقعہ ہے کہ انساں کے بھیس میں ناصر
ہر ایک شخص دکھائی دیا خدا کی طرح

ارشد ملتانی

○

صبحِ عشرت سے حدِ شامِ فغاں تک دیکھا
دلِ گم گشتہ کو کیا کیسے کہاں تک دیکھا

فصلِ گل تو فقط آغاز ہے بربادی کا
ہم نے آشوبِ بہاراں کو خزاں تک دیکھا

دل کے جل بجھنے کا عالم بھی عجب عالم تھا
کوئی شعلہ نظر آیا نہ دھواں تک دیکھا

تابِ نظارا کہاں، حوصلۂ دید کسے ؟
آئینے ٹوٹ گئے تم نے جہاں تک دیکھا

دلِ مضطر ہی سے قائم ہے محبت کا فسوں
سلسلۂ شوق کا بے تابیٔ جاں تک دیکھا

مسعود جاوید

○

پھر جینے کے لیے مرتا ہوں
میں بھی سورج کی طرح ڈھلتا ہوں

چاند سے مجھ کو یہی شکوہ ہے
میں اسے چوم نہیں سکتا ہوں

وقت پاگل نہ بنا دے مجھ کو
میں بھی احساسِ زیاں رکھتا ہوں

عشق نے جس کو چمن زار کیا
جانے اس آگ سے کیوں ڈرتا ہوں

یہی معیارِ وفا ہے مسعودؔ!
آگ بجھتی ہے تو میں جلتا ہوں

روحی کنجاہی

○

ہر شخص ترے شہر میں کیوں شعلہ بپا ہے
کیا اس کے تعاقب میں کوئی سیلِ بلا ہے

تسکین کی خواہش سے ہوا کوئی نہ آزاد
کشکول لیے ہاتھ میں ہر شخص مِلا ہے

آنکھیں کہیں پاؤں کہیں اور ہاتھ کہیں ہیں
کیا جانیے کیا چیز بشر ڈھونڈ رہا ہے!

موضوع اُبھر آئے مرے ذہن میں کیا کیا
جلتا ہوا کاغذ جو کہیں دیکھ لیا ہے

اُس کو بھی زمانے نے بہت سخت سزا دی
یہ جان کے روحی مرا دل چیخ اُٹھا ہے

○

مل سے دشمن نے مرا ہاتھ ہٹایا کیسا
شہر خوباں کا سمندر میں بہایا کیسا

میں کہ ہر بات پہ رو دیتا تھا بچوں کی طرح
آج چپ چاپ ہر اک صدمہ اٹھایا کیسا

اب کوئی حادثہ شاید کبھی چونکا نہ سکے
مجھ کو بے حس تری یادوں نے بنایا کیسا

لفظ اُبھریں بھی تو مفہوم سے خالی ہی رہیں
ذہن پر پھیل گیا وہم کا سایا کیسا

آج روحی مجھے خود سے بھی نہیں کوئی غرض
اپنے رستے سے ہر اک سنگ ہٹایا کیسا

شمیم حنفی

○

کچھ تری بے مہریاں ہیں اور کچھ میری خطا ہے
میں بھی اک پیاسا سمندر، تو بھی اک خالی گھٹا ہے

ہر طرف منظر بچھے ہیں خشک پتھریلی زمیں پر
ہر طرف اُلجھی ہوئی تنہائیوں کا سلسلہ ہے

لوگ تجھ سے دُور رہنے کی قسم کیوں لے رہے ہیں
سوچتا ہوں اب یہی کہہ دوں کہ تو میرا خدا ہے

خواب کی زنجیریوں کب تک مجھے رُسوا کرے گی
ایک مرجھایا ہوا پتہ بھی دامن کھینچتا ہے

تیری آنکھوں میں نہ جانے کیا نظر آیا تھا مجھ کو
کیسے بتلاؤں کہ پچھلی شام سے کیا ہو گیا ہے

○

لوگوں نے افسانہ بنایا، ایک ذرا سی بات کا
میرے کاندھوں پر سایہ تھا، شاید اس کے ہات کا

تیرا قصہ، میرا قصہ، سب کا قصہ ایک تھا
اس نگری میں رنگ ایک تھا ہم سب کے حالات کا

ہرا بھرا سا باغ تھا جس میں، سُورج مُکھی کے پھول تھے
رُت بدلی تو منظر دیکھا، پت جھڑ کے صدمات کا

گیان دھیان کے موتی چمکے، کن آنکھوں کے تھال میں
سُورج کوسوں دُور تھا لیکن، جادو ٹوٹا رات کا

درد کی اس گھاٹی سے لگ کے ایک انوکھا موڑ ہے
دل میں آگ سی جلتی ہے جب، موسم ہو برسات کا

خالد احمد

○

کس قدر کرب سے اک کرب کا اظہار رہا
عجزِ اظہار مری راہ کی دیوار ہوا

صبح کی چاہ میں پتھرا گئیں میری آنکھیں
ایک آزار مجھے دیدۂ بیدار ہوا

فکرِ فنکار کی ضربوں کے نشاں ہیں اس پر
ایک پتھر فقط اس بات پہ شہکار ہوا

مجھ کو لے ڈوبا مرے کھوکھلے پن کا احساس
میری ناکامی کا باعث مرا معیار ہوا

کل حقیقت ہے فسانوں کی طرح بھول نہ جائے
گم فسانوں میں اگر آج کا فنکار ہوا

○

ڈھونڈتی ہیں کب سے جیون کے سپنوں کی تعبیر
میری خالی آنکھیں میرے خوابوں کے نخچیر

بُت جب ٹوٹا، خود میرے اندر کا بُت چلّایا
مجھ پر گرز اٹھانے والے میری کیا تقصیر

پیار کے قیدی کب کرتے ہیں، اپنی رہائی قبول
کیسی حسرت سے تھامے ہیں ٹوٹی ہوئی زنجیر

رنگوں میں جب تک نہ ملا تھا رنگ حقیقت کا
خاکے خاکے ہی کہلائے ہو نہ سکے تصویر

ہنستے ہنستے میں نے کہہ دی اپنی کہانی آج
تنہائی میں کب تک تنہا کوئی بہائے نیر

خالد شیرازی

○

تری طلب سے کہیں بے خبر نہ ہو جاؤں
میں پانیوں میں اُتر کر گہر نہ ہو جاؤں

مری اُکھڑتی ہوئی سانس دے اگر فرصت
تو اے چراغو! قریبِ سحر نہ ہو جاؤں؟

کسی شجر کی طرح میں بھی صبح کہرے سے
پلٹ تو جاؤں، مگر بے بصر نہ ہو جاؤں

مجھے یہ ڈر ہے کہ اس دھوپ کی قلمرو میں
گنواؤں سایا تو گردِ سفر نہ ہو جاؤں

وہ خواب ہوں جسے دھڑکا لگا رہا خالدؔ
اُچٹ کے آنکھ سے بے بام و در نہ ہو جاؤں

○

اگرچہ مجھ کو نہیں اعتبارِ موسمِ گل
میں کر رہا ہوں مگر انتظارِ موسمِ گل

خزاں نے چھیڑ دی رُوداد جلد پت جھڑ کی
گوارا کر نہ سکی اقتدارِ موسمِ گل

نہ جانے کتنی ہولوں کی خاک چھان چکا
میں ایک برگِ غریب الدیارِ موسمِ گل

مجھے نہ لے کے چلو، خاک اُڑ رہی ہے جہاں
میں کیسے دیکھ سکوں گا دیارِ موسمِ گل

اگرچہ دونوں مکیں ایک ہی دیار کے تھے
میں بے کلاہ تھا، وہ تاجدارِ موسمِ گل

عبداللہ جاوید

○

دنیا کی رسم و راہ سے بیگانگی ہے یہ
سچ پوچھیے، وفا نہیں، دیوانگی ہے یہ

وہ بھی بدل رہے ہیں جنھیں پُوجتا ہے دل
بدلے نہیں جو آپ، بڑی سادگی ہے یہ

بڑھتے چلو کہ منزلِ جاناں ہے ایک وہم
یارو، سفر سے کام رکھو، زندگی ہے یہ

جو سنگِ در کسی کی جبیں کا ہو منتظر
اسی سنگِ در پہ سر نہ جھکے، خواجگی ہے یہ

دستِ دعا اٹھیں بھی تو لب پر دعا نہ ہو
جس پر خدا بھی ناز کرے، بندگی ہے یہ

جاوید زندگی کے حقائق سے انحراف
جھوٹے تصورات سے وابستگی ہے یہ

○

شدت کا درد اور مزا دے گیا ہمیں
مل کر ترا بچھڑنا بھی کیا دے گیا ہمیں

اک رسم ہے کہ ہم بھی تجھے بے وفا کہیں
سچ پوچھیے تو وقت دغا دے گیا ہمیں

اب اس غزال چشم کی وحشت کو کیا کہیں
سوغات میں جو دشتِ بلا دے گیا ہمیں

ہم چل پڑے ہیں موجۂ نکہت کے ساتھ ساتھ
جھونکا ہوا کا تیرا پتہ دے گیا ہمیں

مدت ہوئی بچھڑ کے، مگر یہ نہیں کھلا
وہ درد دے گیا کہ دوا دے گیا ہمیں

جاوید اس کی یاد کے افسانے بن گئے
وہ اک طلسمِ ہوش رُبا دے گیا ہمیں

احمد ندیم قاسمی

○

سب نے انسان کو معبود بنا رکھا ہے
اور سب کہتے ہیں — انسان میں کیا رکھا ہے

یوں بظاہر تو دیا میں نے بجھا رکھا ہے
درد نے دل میں الاؤ سا لگا رکھا ہے

منصفو! کچھ تو کہو، کیوں سرِ بازارِ حیات
مجھ کو احساس نے سُولی پہ چڑھا رکھا ہے

جس کے ہر لفظ سے ہو حشرِ صداقت پیدا
میں نے وہ گیت قیامت پہ اٹھا رکھا ہے

ہاں — میں خاموش محبت کا بھرم رکھ نہ سکا
ہاں خدا کو تو ترا نام بتا رکھا ہے

لاکھ فتنہ انگیاں میرے جنوں کے صدقے
میں نے لُٹ کر بھی غمِ عشق بچا رکھا ہے

اور تو کوئی چمکتی ہوئی شے پاس نہ تھی
تیرے وعدے کا دیا راہ میں لا رکھا ہے

میری امّید کی پتھرا گئیں آنکھیں، لیکن
میں نے اس لاش کو سینے سے لگا رکھا ہے

گھومتی پھرتی ہیں لیلائیں، بگولوں کی طرح
قیس نے دشت میں اک شہر بسا رکھا ہے

حسنِ تخلیق کی دھرتی میں جڑیں کیا پھیلیں
تم نے انسان کو گملے میں سجا رکھا ہے

الطاف فاطمہ

گواہی

بیس تاریخ کے بعد ہی سے چاند کے دن اور تاریخوں کے چرچے چل نکلے تھے۔ جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے اور ہوتا چلا جائے گا۔ ہم اپنے خالی وقفوں میں اسٹاف روم کے سیمنٹ کے فرش والے نئے طویل افسردہ برآمدے کے گملوں سے خالی دروں کے ستونوں کے ساتھ کاسنی پلاسٹک سے بُنی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے دنیا جہان کی باتیں کرتے کرتے گھوم پھر کر چاند کی بات پر آ ہی جاتے اور خیال آرائیاں شروع ہو جاتیں۔ چاند انتیس کا ہوگا، چاند تیس کا ہوگا۔ عید جمعرات کی ہے، عید جمعے کو ہونا چاہیئے۔ چاند گیارہ کو دکھائی دے گا، چاند بارہ کو......

چاند! چاند! اوہ یہ چاند صاحب بھی کتنے "امپورٹنٹ" ہو جاتے ہیں...... اور خلا، والی پبلک اپنے حساب سمجھ رہی ہے کہ اس نے اب جا کر چاند پر چھاپہ مارا ہے اور یہاں یہ ہے کہ یار لوگ تیرہ سو سال پہلے ہی اس پر قبضہ جما چکے ہیں...... میں نے کرسی کو ذرا اور دھوپ کی تلاش میں ادھر سے اُدھر کھسکا کر ٹانگیں پھیلا لیں۔ مگر شاید میرے چہرے پر اس ہنسی کے آثار تھے جو میں نے اپنے دل میں محسوس کی تھی یوں کہ اب ارجمند نے اپنے مخصوص جارحانہ اور کھلے دل والے انداز میں ہنسی کا سبب دریافت کیا تھا اور جب آپ کو کسی کا جارحانہ انداز دلچسپ معلوم ہوتا ہے تو اس کی بات کا جواب دینا بھی ضروری ہوتا ہے۔

"اچھا تو کیا میں ہنس رہی تھی؟"

"تو اور نہیں تو کیا؟"

ارے بھئی تو ہنسنے کو یہ تھوڑی بات ہے کہ میں بیمار ہوں اور سخت دکھیا ہو رہی ہوں۔ اور پھر بھی اتنی صبح صبح سردی میں بستر علالت سے اٹھ کر یہاں آنا اور پھر واپس جا کر اس کو بسانا پڑتا ہے۔"

یہ کتنی اچھی بات ہے کہ اسٹاف روم کے اس طویل افسردہ برآمدے کے گملوں سے خالی دروں کے درمیان بیٹھ کر ہم اصل بات قبول دینے کے بجائے کوئی بات بھی بنا سکتے ہیں اس لئے کہ پینتالیس منٹ کے اس مختصر سے خالی وقفے میں ہم کو بہت باتیں کرنا ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک کی ہوئی بات اور اس کا جواب بہت جلد غیر ضروری اور فرسودہ ہو جایا کرتا ہے...... ورنہ اگر انسان جرح کرنے اور دل کی اصلی اور مخلص سوچوں کو قبولوانے بیٹھ جائے تو کتنی مشکل آ پڑے اس لئے کہ انسان کی سوچ کا بیشتر حصہ احمقانہ ہوا کرتا ہے۔

چنانچہ یوں عید کے دن قریب سے قریب تر آتے گئے اور اسی حساب سے چوڑیوں، جوڑوں، جوتوں اور پروگراموں کے تذکروں میں بھی شدت آ چکی تھی، سو ہم کو یہ بھی باور کرنا پڑا کہ عید ایک نہ ایک دن آ دھمکے تو کچھ بعید نہیں مگر کس دن؟ اس سے مجھے اس مرتبہ یوں دلچسپی نہ تھی کہ اگرچہ بوجہ علالت انسان تلے اوپر اتفاقیہ چھٹیاں تو نہیں لے سکتا تاہم وہ اپنے آپ کو روزے سے "مستثنٰی" ٹھہرانے کا مجاز ضرور ہوتا ہے اور انتیس تیس کے پھیر میں بھی نہیں پڑتا۔

چھٹی کا نوٹس میں نے بار بار پڑھا۔ پتہ نہیں کیوں اعتبار نہیں آرہا تھا چنانچہ اسی بے اعتباری کے عالم میں ارجمند اور میں رینگتے سسکیاتے اپنی منزل کی طرف آگے بڑھے تو معلوم ہوا کہ عید تو یہاں سے وہاں تک پھیلی پڑی ہے۔

"کیوں نہ ہم لوگ آج ہیڈن سے نکلیں۔" فوراً ہی صلاح بن گئی اور ہیڈن کے اندر یہ عالم تھا کہ جو کچھ اور جہاں کہیں تھا سر بازار آ گیا تھا۔ سر پر چھائے ہوئے شامیانوں اور ان کے رنگ برنگے بانسوں والے دروں میں سے گذرتے ہوئے برات والے گھر کا سا سماں لگ رہا تھا۔

ہر چیز کی کتنی افراط ہے اور کتنی کثرت۔ اجناس اور اشیا کا ایک سیلاب ہے جو حواس گم کئے دیتا ہے۔ اتنے کہ آٹے اور گھی کی گمشدگی اور ہر چیز کے چڑھے ہوئے نرخوں تک کا احساس رخصت ہو چکا ہے

"ارے بھئی میں یہاں ٹھہر کر یہ سجی ہوئی مٹھائیاں ضرور دیکھوں گی۔" ارجمند نے تقریباً مچل کر کہا تھا۔ "مجھے یہ نظارہ بہت اچھا لگتا ہے۔"

"ضرور دیکھو اور اگر مقدور ہو تو کیمرہ اٹھا کر تصویر بھی کھینچو۔"

"مگر مجھے تو یوں لگتا ہے ——— "

"کیا؟"

کیا یہ ضروری ہے کہ انسان اپنی ہر ادھوری بات کو پورا اور مکمل کرے۔ بہرحال میں نے اپنی بات مکمل نہیں کی۔ بھلا یہ بھی کوئی کہنے والی بات تھی کہ ہیں تو سارے بازار کی بیچ و بیچ سے آگے نکل بیٹھنے والی دوکانوں کو دیکھ کر بنات النعش گردوں والی پارٹی کا خیال آتا ہے کہ وہ شام ڈھلے سوا لنگوٹ کے ساتھ سر راہ آ بیٹھتی ہے لیکن کسی نظارے کا یہ کچھ کم احسان ہے کہ وہ آپ کو بہت سی باتوں کے وجود سے لاتعلق کر دے اور آپ کو یہ بھی نہ یاد رہے کہ زندگی میں کچھ خلا بھی ہیں اور ہم نے کچھ کھویا ہے۔ اس لئے کہ زندگی کا بہاؤ بہت چڑھ گیا ہے چنانچہ یہ ہوا کہ ہم خاموشی سے آگے بڑھے اور سویوں کے کافوری اور گلابی ڈھیر پر جھلکتے ہوئے چاندی کے ورق نے مجھے آنکھ ماری۔

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے"

"کیا کہا!"

آؤ سویاں خریدیں۔"

"یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی کا جہاز عید کے تند تھپیڑوں میں گھر گیا ہو۔ پھر ارجمند نے عید کے جوڑے اور پروگرام کے متعلق پوچھ ہی ڈالا۔

"چنانچہ اب ہم بھی کپڑوں اور جوتوں کی باتیں کرتے ہیں۔"

"ارے میں گڑبڑا گئی عید کے دن کا پروگرام! یار کیا سوال ہے تمہارا بھی کہ بھئی عید کے دن ......"

مگر ہاں واقعی ..... ارجمند کے سوال کی معنویت اور حقیقت پر غور کرنے کے بعد اپنی ذات کس قدر حقیر شرمناک اور بے ضرورت محسوس ہوئی جواب کے سارے الفاظ حلق میں اٹکے پڑے تھے اور مجھے اپنی ذات نہایت واہیات نظر آئی۔

مگر جس کو اپنی ذات جس درجے واہیات نظر آتی ہے اسی درجہ وہ اکڑتا اور اپنی خودی کو بلند کرتا ہے

چنانچہ میں نے بھی اپنی ذات کے گرد والی فصیل کو اونچا اور مضبوط کرنے کی کوشش کی۔

ارے بھئی عید کے پروگراموں کا کیا ہے۔ ایک پروگرام یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آدمی لحاف میں دبک کر مزے سے کتاب پڑھتا رہے اور یہ دیکھو میں نے آج یہ کتاب ٹائکر سے خریدی ہے۔ اور بھئی روز روز کپڑے بدل بدل کر آتے رہو تو عید کے دن تو کپڑوں کی چھٹی ہونا چاہئے

سخت محنت اور ریت کا کام ہے کپڑے بدلنا۔"

"اچھا!" لیکن مجھے معلوم تھا کہ ایسی باتیں کرتے وقت ہر انسان کے منہ پر سخت پھٹکار برسنے لگتی ہے۔ چنانچہ اس روز اپنے کمرے میں گھستے ہی آئینے کی پیشی میں جانا پڑا تھا۔ یا ہے اس وقت تک وہ پھٹکار تحلیل ہو چکی تھی اور یوں ایک بار پھر میں نے شیر ہو کر سوچا تھا: "اور جو اس وقت میں ایک عدد پُر مغز اور مختصر سی تقریر جھاڑ دیتی تو بتا دیتی یہ سب تو فروعات ہیں، عیاشی ہے، کہ تم جس کو ثقافت اور روایتوں کا نام دیتے ہو وہ تو تری سوٹے بازی ہے مال کی بکری اور نکاس کے ڈھنگ ہیں اور زندگی کے بھاؤ چڑھ جانے کے اصلی سبب ..... " تو بھی کوئی میرا کیا بگاڑ سکتا تھا۔

لیکن جب اپنی شال اور سویٹر واپس رکھنے کے لئے الماری کھولی تو ہاتھ نے خود بخود سیدھے ہاتھ والی دراز کو کھینچ لیا۔ فوم پلاسٹک کے مربع ڈبے پر رکھی سرمئی فائل بلا ارادہ ہاتھ میں آ گئی۔ یا پھر ہو سکتا ہے کہ اس میں اپنا ارادہ بھی شامل ہو۔ الماری کے قریب والی چوکی پر بیٹھ کر احتیاط سے سرمئی فائل کو کھولا نسخوں اور ڈاکٹری رپورٹوں کے نیچے ایکسرے تھا۔ سیاہی اور سفیدی مائل بھورے پن میں ابھرتے ہوئے لیبلوں کے پنجر کے اس طرف۔ ایک بیمار، مغموم اور مایوس دل تھا، معمولی سا انسانی دل ــــ اس وجود کا حصہ جسے دنیا کے سارے چراغ جلا کر بھی ڈھونڈ لینا میرے بس میں تھا۔

پھر مجھے ہمیشہ کی طرح نا وقت باتیں یاد آئیں۔

اور مجھے لڑکی یاد آئی جو برف باری میں لالٹین اٹھا کر اس راستے پر جا کھڑی ہوتی تھی جس راستے اس کی ماں کو کام پر سے واپس آنا تھا۔ رات اندھیری تھی اور برف و باد کا طوفان تند۔ لڑکی کو ڈر تھا کہ ماں راستہ نہ بھٹک جائے

پھر یوں ہوا کہ وہ لالٹین اونچی کئے اندھیرے راستوں کو تکتی رہی۔ برف کے گالے چپکے چپکے اس کے وجود پر برستے رہے حتیٰ کہ وہ ان کی مکمل حفاظت میں آ گئی۔ اور وہ لالٹین برف کے ڈھیر پر بے سود ٹمٹماتی رہی۔ یوں کہ ماں نے اپنا راستہ بدل لیا تھا۔

میں نے احتیاط سے فائل بند کی اور وہ بیمار اور مغموم دل فائل کے گتوں کے درمیان چھپ گیا۔ جس نے انجانے میں ہر سال عید کا جوڑا تیار کیا تھا۔ میں نے فائل دراز میں واپس رکھ دی۔

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

"ہیں کیا کہا؟" کسی نے مجھ سے سوال کیا۔

میں ایک لفظ بھی نہیں بولی ہوں میں نے اپنے آپ اپنی گواہی دی۔

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

کوئی بار بار میرے اندر گنگنائے جا رہا تھا۔

اس شام چاند دیکھنے کی ذرا بھی خواہش نہ ہوئی اس لئے کہ میری طبیعت بدستور خراب تھی اور اس دفعہ بھی پروگرام کے مطابق میں اس بستر علالت پہ دراز تھی جو صبح سے خالی پڑا تھا۔

شیر خرمہ تیار تھا۔ اور سویوں کے موعفر کا پروگرام ناشتے کے بعد تھا۔ گرم گرم چائے دان میز پر آ چکا تھا چنانچہ بستر چھوڑنا اب ضروری قرار پایا۔ پھر یوں ہوا کہ منا شپ شپ کرتے چڑھے۔ آنکھوں پر عینک غائب تھی۔

"آج عید نہیں ہے!"

"ارے جاؤ۔ عینک لگا کر اخبار پڑھو پھر اطلاع دو۔"

"اونہوں، اخبار کی کیا بات ہے۔ رات اعلان ہوا ہے۔"

"مگر رات تو چاند کا اعلان بھی ہوا تھا۔"

"مگر یہ اعلان آدھی رات کو ہوا تھا۔"

"منتظم صاحب، تم جب کوئی خبر لاؤ گے ایسی ہی لاؤ گے خلافی جگہ کر ہو گیا، وزارت بدل گئی، سفارت اکھڑ گئی، کہیں حکومت کا تختہ الٹ گیا۔ حد یہ کہ شاستری مر گیا۔ آج سے کے صبح صبح عید صاف کروا دی۔"

"پھر کیا خیال ہے؟"

"تم بتاؤ، روزہ کھول رہے ہو؟"

"اب جو سب لوگ فیصلہ کریں۔" اس کی آنکھوں کی گہری آسمانی رنگت ایسے میں اور بھی دلچسپ ہو جاتی ہے۔

"اچھا پھر جاؤ، تم فیصلے کا انتظار کرو۔"

میری نظر کھڑکی کے شیشوں سے باہر نکلتی چلی گئی۔ جنرل صاحب کے طویل سیاہ دروازوں اور سیاہ ستونوں والے گیٹ سے کچھ پرے جھگیوں والوں کے بچوں کے دو گروہ آمنے سامنے کھڑے تھے۔

"آج عید نہیں ہے!" ایک گروہ نے لے سے کہا اور نفی میں گردنیں ہلائیں۔

"آج عید ہے!" دوسرے گروہ نے اسی انداز میں دعویٰ کیا اور ان کی ہلتی ہوئی گردنوں کا پوز اثباتی تھا۔

"آج عید ہے ..... آج عید ہے۔" اثباتی گردنیں اچھل اچھل کر کہہ رہی تھیں۔

میں نے شیر خرمے کا پیالہ دوبارہ اپنے سامنے کھسکا لیا۔

نیچے نہانے کے پانی ٹھنڈے ہوتے جا رہے تھے۔ کندھوں پر تولئے ڈالے مرد آپس میں بحث رہے تھے۔

"جی تو کیا آپ کا خیال ہے کہ شہر شہر کا اپنا چاند نکلوایا جائے؟"

"ارے میاں۔ گواہ ـــ گواہ ـــ گواہی کی شرائط ہیں جن کا گواہوں میں ہونا ضروری ہے۔"

"تو پھر عید ہو چکی ..... کون ہے گواہی کے قابل آپ کہیں؟" اب سب خاموش ہیں!

پھر یہ ہوا کہ گھرانا دو فریقوں میں بٹ گیا۔

میں نے بیماروں والے مخصوص ڈھیلے پن اور بے دلی سے صفائی شروع کر دی تھی۔ اس لئے کہ بلو کا موڈ آف ہو چکا تھا اور اس نے پھر سے لحاف میں گھس کر بستر کو اور بھی اجاڑ دیا تھا

"ارے بھئی تم کیوں غصہ ہو رہی ہو؟ مسلمان ایسے ہی عید مناتے ہیں۔

مجھے تو یہ خیال آ رہا ہے کہ بچارے میٹو کی پہلی تو عید ہے اور اس میں جھگڑا پڑ گیا۔"

"ارے بھئی میٹو کی فکر نہ کرو۔ اس کی عید کے امکانات روشن ہو گئے ہیں اس لئے کہ اس کے ابا جان نے غسل خانے کا دروازہ بند کر لیا ہے۔"

چنانچہ روزہ ترک کرنے کے باوجود نمازی بٹ چکے تھے، جنرل صاحب کے گیٹ سے اس طرف متعدد لوگ اس حال میں کھڑے تھے کہ اوپر سے قمیص بدل چکے ہیں اور ٹانگوں میں پاجامہ میلا ہے۔ کسی کا دھڑ رمضان منا رہا ہے تو ٹانگیں عید۔ ایک صاحب کے سر پر فقط ٹوپی نئی تھی، باقی جسم پر میلے کپڑے ـــ

اور بحث جاری تھی۔ پھر میں نے کونے میں حبیب کو دیکھا جو کوراجوڑا پہنے بیساکھی کے سہارے اپنی بیکار ٹانگ کو گھسیٹتا خاموشی سے نماز پڑھنے چلا جا رہا تھا۔ اس کے چیچک مارے چہرے پر تنہائی کا شدید احساس تھا۔ اس لئے کہ وہ غول جس کے ساتھ وہ چھپاتا ہوا نماز کو جاتے ہوئے اپنی ساری محرومیوں کو بھول جاتا تھا تکبیروں میں نماجمعہ میں مشغول تھا۔

میں کھڑکی کے قریب سے ہٹ آئی تھی " بھلو اب اٹھ کر کپڑے بدل ڈالو۔ آئندہ سے ہم کرسمس منائیں گے "

" کیوں ؟ "

" کیا کریں پھر ؟ "

" اگر حبیب کے چیچک مارے چہرے پر تنہائی کا وہ بھیانک احساس نہ نظر آتا تو ہو سکتا تھا کہ لحاف میں دبک کر کتاب پڑھنے والا پروگرام ملتوی ہوتا۔

اور اب ملنے والی پارٹیاں آرہی تھیں جو بعض جگہوں سے منہ کی کھا کر آرہی تھیں، اس لئے کہ بعض گھرانوں میں عید نہیں آئی تھی، اور جب پارٹی آوازوں پر آوازیں دینا شروع کر دے تو انسان کو جس حال میں بھی ہو اسی حال میں حاضری دینا پڑتی ہے۔

اب عید منانے اور عید کا بائیکاٹ کرنے والی دونوں پارٹیاں آمنے سامنے تھیں اور بحث ہو رہی تھی۔ میں نے کھانے والوں کے لئے سویاں اور دوسرے لوازمات لاتے ہوئے اُلجھے ہوئے فقرے سُنے۔

چاند ...... گواہی ...... رویت ہلال ...... گواہی ..... گواہ کے لئے ضروری ہے ....

گواہی! گواہی! میں گواہی دیتی ہوں کہ ہم میں سے کوئی گواہی کے قابل نہیں کہ گواہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ صادق، صالح اور مرد مومن ہو۔ چنانچہ طے یہ پایا کہ اب میں کرسمس مناؤں گی۔ میں نے دوبارہ لحاف میں لیٹ کر سوچا تھا۔ اس لئے کہ جھگڑا تو کھیے۔ اور یہ کہ کرسمس میں گواہی کی حاجت نہیں۔

" اور جو جس قوم کی تقلید کرتا ہے وہ اسی قوم کے ساتھ اٹھایا جائے گا "

میں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا اور لحاف کے اندر منہ کر کے سوچا مگر یہاں تو کوئی نہیں بجز آندرے ژائد کے جو اپنی تصنیف کے ایک گوشے پر چپ چاپ کھڑا ہے چنانچہ میں نے اس کی تصنیف کو پرے کھسکا دیا اور نہایت ضدی پن سے سوچا تھا۔

ٹھیک ہے۔ جو جس قوم کی تقلید کرتا ہے وہ اسی کے ساتھ اُٹھایا جائے گا۔ چنانچہ میں کرسمس منانے والوں کے ساتھ اٹھائی جاؤں گی۔

لیکن شاید یہ میرا مقدر نہیں کہ میں ان کے ساتھ اٹھائی جاؤں اور منصوبے میں ہونے والی اس امکانی تبدیلی کی تفصیل یوں ہے کہ .....

جوں ہی یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے سفید برآمدے میں قدم رکھا معلوم ہوا کہ ہمشیرہ عزیزہ کے علاوہ گھر کے باقی لوگ بھی آؤٹ ہیں۔ اور یہ اطلاع مجھے تیتی نے دی تھی جو عموماً اکیلے گھر میں رہ جانے پر عموماً دل گرفتہ نظر آتی ہیں، مگر آج خلافِ معمول ان کے چہرے پر انار سے چھوٹ رہے تھے۔

" اوہ ..... ہلو ..... بیگم آؤٹ " پھر وہ " مرکیسی ہیپی عید "

دونوں عیدوں کو گذرے بھی ایک دن ہو چکا تھا۔

" اوہ مسز میک! میں شکریہ خاک ادا کرتی، جبکہ یہ طے تھا اور ان کو نہیں معلوم تھا کہ ——"

——" کہ میں ان ہی کے ساتھ اٹھائی جانے والی ہوں "

پھر اچانک ہی تیتی اپنی عادت کے مطابق اکسائٹڈ ہو گئیں۔

" پتہ ہے کون آیا ہے ؟ "

"کون ؟" میں نے بے دلی سے پوچھا۔

وہ اور بھی اکسائٹڈ ہوگئیں اور میز پر رکھے کچھ کیلوں' الائچی کی تھیلی اور ایسی ہی چند چیزوں کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ دیکھو! اب بتاؤ کون آیا ہے ؟"

"کوئی بنگال سے آیا ہے ؟"

"نہیں۔ نہیں" وہ ان کا سر خوشی سے اِدھر اُدھر ڈول رہا تھا۔

اور اب میں سمجھ گئی تھی کہ آنے والا کہاں سے آیا ہے۔ ایک دم کو میرے اندر اکسائٹمنٹ نے جھرجھری سی لی۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کے بعد پہلی مرتبہ کسی شخص کے متعلق سننے میں آیا ہے کہ وہ اُدھر سے آیا ہے مگر وہاں سے کون آسکتا ہے۔ میں سوچنے لگی۔

"تمہیں معلوم ہے کیا ہوا۔ میں یہاں اس کرسی پر بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی، کہ مجھے محسوس ہوا کوئی جھکا ہوا مجھے غور سے دیکھ رہا ہے۔ میں نے نظر اٹھائی ...." اور وہ ایک دم ضرورت سے زیادہ اکسائٹڈ ہوگئیں اور لرزتی ہوئی آواز میں کہنے لگیں "میں چونک پڑی میں نے اٹھ کر اسے گلے سے چمٹا لیا۔

"اوہ مائی ڈارلنگ، مائی ڈیئر فرینڈ ـــــ پھر وہ کہتی رہیں "میرا ہم رقص ..... اوہ ہی ڈانسز سو ویل ...." وہ سفید چکنے برآمدے کے فرش پر یہاں سے وہاں تک رقص کے انداز میں لہراتی چلی گئیں .... یہاں تک کہ ان کو دروں میں جڑے ہوئے جالیوں اور روغن کے منتظر کوری لکڑی کے فریم کا سہارا لینا پڑا۔

پھر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

یو نو! جب لڑائی ہو رہی تھی تو میں اس لڑکے کے لئے کتنا پریشان ہوتی تھی۔ مجھے خیال آتا تھا کہ وہ اب کاہے کو کبھی آئے گا .... اوہ یہ لڑکا ہی از اے تھرو جنٹلمین ...." وہ پھر رکیں۔

"ارے میں تو بھول ہی گئی۔ تمہارے لئے چائے لاؤں ؟" انھوں نے رک کر پوچھا

"نہیں شکریہ۔ امینی مجھے پاندان لادو، میں پان کھاؤں گی۔ میرا گلا بہت دکھ رہا ہے۔"

"پاندان لا کر رکھنے کے ساتھ ہی انھوں نے سلسلۂ کلام جوڑ لیا۔

"میں نے ان کو بتایا کہ جب بھی بچے والز کے ریکارڈ لگاتے ہیں تو میں ہمیشہ یاد کرتی ہوں کہ دو سال پہلے کرسمس ایو پر اسی برآمدے میں ہم نے تم نے رقص کیا تھا.... اُف توبہ، یہ لڑکا کتنا اچھا والز کرتا ہے۔ میں نے کتنا چاہا تھا کہ وہ ایسٹر پر یہیں موجود ہو لیکن اس کا ویزا ختم ہو چکا تھا...."

میں نے دیکھا ان کا بوڑھا اور پرشکن چہرہ خوشی سے تمتمایا ہوا تھا اور آنکھوں میں کچھ پالینے والی سچی چمک....

میں نے کرسی سے ٹیک لگالی.... دن دھندلا اور مطلع ابر آلود تھا... اور میرے سامنے برآمدے کے سفید فرش پر کھڑی وہ بوڑھی عورت تھی جو اندر سے بہت تنہا تھی اور جس پر ہر دوسرے تیسرے مہینے افسردگی کے دورے پڑتے رہتے تھے اور واقعی یہ احساس کتنا شکست خوردہ اور پسپا کن ہو سکتا ہے کہ بچے اب بڑے ہوتے جا رہے ہیں۔ اب مجھ سے کپڑے بھی نہیں بدلواتے۔ اپنی ذات کی بے مصرفی اتنی ہی تھکا دینے والی ہوتی ہے کہ پھر انسان بچوں کے کمرے میں نیچی سی کرسی پر اسکارف باندھ کر اور بائبل ہاتھ میں لے کر بیٹھ جائے۔

اور یہ کتنی اچھی بات ہے کہ تمہارا بوڑھا دل مسرور ہے چنانچہ میں تم کو یہ یاد دلانے کی کوشش نہیں کروں گی کہ تم جس شخص کی آمد پر اتنی خوش

تو اس کا تم سے اسی قدر واسطہ ہے کہ تم اس گھر میں بچوں کی دیکھ بھال پر مقرر ہو جہاں وہ مہمان آیا ہے۔ . . . . وہ عمر میں تمہارے اس بیٹے سے بھی بہت چھوٹا ہے جس سے تم نے اس بنا پر قطع تعلق کر لیا کہ اس نے کیتھولک فرقے میں شادی کر لی تھی اور اب لاپتہ ہے۔

پھر بھی وہ شخص محض تم کو خوشی دینے کی خاطر تمہارے ساتھ رقص بھی کر لیتا ہے اور بڑے لگاؤ اور توجہ سے تمہارے ساتھ پیش آتا ہے، اس لئے کہ تمہارے روپ میں اس کو وہ نینیاں اور گورنسیں بھی نظر آجاتی ہیں جنھوں نے اس کو پالا، پروان چڑھایا اور تربیت دی اور یہ کہ تم ان سب باتوں کے علاوہ اس حقیقت سے بھی واقف ہو کہ وہ آپ بھی اندر سے تمہاری طرح تنہا ہے جیسے ویرانے میں کھڑا ہوا ایک تنہا درخت۔

میں چپ چاپ بغور اس تمتمائے چہرے کو دیکھتی رہی جس کے ساتھ میں اُٹھائی جانے والی تھی۔

نہیں معلوم کہ مسیحا و خضر کی ملاقات کا کیا انداز رہتا ہوگا لیکن یہ مجھے خوب معلوم تھا کہ ہمدم دیرینہ سے لوگ باگ کس انداز سے ملتے ہوں گے اور جبکہ ایک دو نہیں متعدد ہمدمانِ دیرینہ جمع ہوں۔ چنانچہ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ صاحبانِ خانہ گھر آنے پر جب آنے والے کے کوائف سے آگاہ ہوں گے تو کس انداز کی غلغل مچے گی۔ لہذا میں نے یہی مناسب جانا کہ کمرے میں جا کر لحاف میں دبک جاؤں۔ عزیزی ہمشیرہ سے گپ لگانے کا امکان ختم ہو چکا تھا کہ ان کو مہمان کو ایٹ ہوم کرانا اور کھانا کھلانا ہوگا۔ اور مجھے تو نینی نے اپنے اکسا ٹمنٹ میں بچوں کے ساتھ ہی کھلا دیا تھا کہ گھر والوں کی آمد دس بجے سے پہلے ممکن نہ تھی۔ اور مہمان اپنی رپٹ لکھوانے تھانے جا چکا تھا۔

ایسے دھندلے دھندلے دنوں میں سو جاؤ تو رات کا دھوکا کھا کر بھولا بھٹکا کوئی خواب بھی آ نکلتا ہے لیکن ابھی خواب کے بکھرے بکھرے اور مختلف سین فٹ بھی نہ ہو پائے تھے کہ محسوس ہوا کہ کسی نے مجھے یوں آوازیں دینا شروع کر دیں جیسے بھونچال آ گیا یا پھر کسی کو جگانے کے چھوٹے پیگ کی یاد پھر سے آگئی ہو۔

ناچار ہڑبڑا کر لحاف پھینک کر باہر نکلنا پڑا۔ میں چائے کی ٹرالی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تو نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ سب کے سب چائے کا دور چلا رہے تھے اور عزیزی ہمشیرہ اپنے مخصوص نان سیریس انداز میں سگرٹ کے کش لگا لگا کر کہہ رہی تھیں "ارے کچھ سنا یہ کیا کہہ رہے ہیں ان کی باتیں تو سنیئے۔"

میں نے کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے اس مہمان کی طرف دیکھا جو ان سرحدوں کو عبور کر کے آیا جن کو کچھ دن پہلے ہم دشمن کے علاقے اور سرحدوں سے یاد کیا کرتے تھے۔

میرے سامنے جانے پہچانے عینک کے اُجلے اور نفیس شیشوں کے اُس طرف جھانکتی ہوئی آنکھوں میں بڑی خاموشی اور عجیب سی بے حسی تھی کہ دیکھنے والے کا دم سا گھٹنے لگے اور ان آنکھوں کو اپنے محیط میں لئے ایک چہرہ تھا جسے پہلی نظر میں دیکھنے والا متانت کہہ تو سکتا ہے مگر اپنے اس فیصلے پر مطمئن نہیں ہوتا چنانچہ اسی افراتفری کے عالم میں اور اوپر نگاہ دوڑائی۔

"ارے امیری نظر تھک گئی . . . . تو تم بھی انھیں انسانوں میں سے ہو جن پر سے وقت یوں گذرتا ہے جیسے . . . . خیر کوئی بات نہیں وقت نے اکثر ایسے ستم فرمائے ہیں۔

"اچھا تو کیا کہہ رہے تھے آپ؟" میں نے صاحب سلامت کے بغیر ہی سوال کیا۔

"کچھ نہیں!" آنے والے کا چہرہ ہر قسم کے جذبے اور تاثر سے عاری تھا۔

میں اس مختصر سے جواب سے یوں مطمئن ہو گئی تھی کہ یہ تو عزیزی ہمشیرہ کا قاعدہ ہے کہ یوں ہی زور و شور سے آوازیں دیں گی اور بعد میں پتہ چلے گا کہ بات تو کچھ تھی ہی نہیں چنانچہ میں نے چائے کی پیالی سنبھالی اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ دن کے اس پچھلے پہر سماں اور بھی دھندلا گیا تھا۔ آسمان بہت بھورا اور بُرا سا ہو رہا تھا کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ بادل اور دھند بارش بھی لائے ہیں یا نہیں۔ پھر گہرے رنگ کے سفید برآمدے کے دروازے بغیر جالی اور بغیر پینٹ والے فریم تنہا ادھورے پن کے احساس کو اور بھی چمکا دیا تھا تو خیر اس طرف پھیلی ہوئی لان کی سبزی اور فضا میں دھرے دھرے چلتے ہوئے ہوائی جہاز کی آواز کسی حد تک زندگی کا احساس دلا رہی تھی۔

"کچھ نہیں کیوں! ابھی جو آپ بتا رہے تھے، بتائیے نا نہیں، چائے اور ڈالوں آپ کی پیالی میں؟"

"کیا بات؟" میں نے پھر سوال کیا اور بے وقوفوں کی طرح سب کی طرف دیکھا۔

"بھئی وہ سفید پوشوں والی بات بتاتے کیوں نہیں؟"

"ہاں وہ میں یہی بتا رہا تھا کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک کی پشت پر ایک سفید پوش کھڑا ہے۔"

"کیا!" میں نے اپنی کرسی اس درجہ آگے کی کہ ٹرالی گھوم کر آگے جا پہونچی۔ "آپ سے کس نے کہا..... جھوٹ..... ہوں..... جھوٹ!"

آواز پر وہی بے حسی طاری تھی: "ہم کیا جانیں، ہم کوئی محاذ پر گئے تھے ہم سے تو انھوں نے کہا جو آپ سے لڑنے آئے تھے۔"

"فوجیوں نے؟"

"جی فوجیوں سے میرا مطلب سپاہی نہیں، افسروں نے کہا تھا۔"

"اللہ جانتا ہے!"

آنے والا عجیب بے بسی سے مسکرایا۔

"تو اس کا مطلب ہے ہم جن باتوں کو افواہیں، ایوٹرن اور من گھڑت کہہ کر ٹالتے رہے ہیں....."

"وہ تو یہ تک کہتے ہیں جب بھی لاہور پر بم پھینکنے کی کوشش کی کسی سفید پوش نے اپنی چادر میں سمیٹ لیا۔"

"اب یہ آپ نے دل سے گھڑ لیا۔"

تب میری بے اعتباری پر اس شخص نے اس انداز سے دیکھا کہ مجھے محسوس ہوا جیسے کہہ رہا ہو — جیسے کہہ رہا ہو — مجھے کیا غرض پڑی ہے جو باتیں دل سے گڑھ گڑھ کر سناؤں اور وہ بھی تمہارے اپنے شہر کے متعلق۔

"اچھا ایک بات بتائیے۔ بالکل سچ سچ — یہ باتیں مسلمان فوجیوں کی زبانی سُنی ہوں گی؟"

"اس بات کی میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ اس موضوع پر کسی مسلمان فوجی سے قطعی گفتگو نہیں ہوئی۔"

"تو پھر!..... تو پھر........"

میرے کانوں میں وہ آواز گونجی جو اکتوبر ۱۹۶۵ء کی صبح بہت سویرے سویرے چائے کی میز کے قریب سُنی تھی۔

"چونڈہ میں کیا ہوا..... کیا بتاؤں! اگر کچھ کہوں گا تو یقیناً تم لوگ کہو گے — پھر گپ ٹھونکی!"

"ہاں مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اکثر اور بار ہا گپیں ٹھونکی ہیں لیکن اگر اس وقت میں کچھ بتاؤں تو وہ گپ ہرگز نہیں ہوگی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ وہ بھی گپ کی مد میں ڈال دی جائے گی.... مگر میں بیان ضرور کروں گا اس لئے کہ اگر میں نے اب نہ بیان کیا تو شاید......" پھر وہ آواز بھاری ہو گئی تھی۔ اور مسلسل میرے کانوں کے پردوں کے اس طرف اترتی چلی جا رہی تھی — یہاں تک کہ میں نے سُنا:

"تب اس شخص نے کہ جس کا چہرہ چادر کی اوٹ میں چھپا تھا۔ اس جیپ کے ڈرائیور سے کہا، تم مجھ سے سوال کر کے میری راہ کھوٹی نہ کرو حسنؓ اور حسینؓ آگے جا چکے ہیں اور اب میرے نام کا ڈنکا بجنے والا ہے — اس نے یہ کہا اور آگے بڑھ گیا۔"

تب میں نے نظر اٹھا کر اس شخص کی طرف دیکھا جو میجر عمر تھا اور جو صبح منہ اندھیرے چائے پینے کے لئے ہمارے پاس کچھ دیر کو رک گیا تھا آنسو اس کی آنکھوں سے سرک سرک کر اس کی وردی پر گر رہے تھے۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے میز کو مضبوطی سے پکڑ کر کہا: "پھر میں نے جب اس ڈرائیور سے اس واقعہ کا وقت پوچھا تو مجھ پر سناٹے کا عالم طاری ہو گیا۔ یہی وہ وقت اور محاذ تھا جہاں ہم نے پہلے دن یا علیؓ کا نعرہ لگایا تھا۔"

"ہو سکتا ہے اس ڈرائیور کو الیوژن ہوا ہو۔"

"الیوژن...." وہ ہنسا تھا۔ "اچھا پھر یہ کرو کہ تم میرے ڈرائیور کو ایک پیالی چائے بھجوا دو.... اور اب ہم چلے۔"

اور اب اس دھندلائی ہوئی سہ پہر میں چائے کی اس ٹرالی کے قریب بیٹھا وہ شخص، جو ابھی ابھی ان سرحدوں کو عبور کر کے آیا تھا جن کو ان دنوں ہم دشمن کی سرحدیں کہا کرتے تھے، کہہ رہا تھا: "وہ کہتے ہیں کہ ایک تو جب وہ نعرے لگاتے تھے تو ہمارے جوان بدحواس ہو جاتے تھے۔ جیسے پیروں تلے کی زمین سرک جاتی تھی۔"

وہ شخص آج ان سب باتوں کی گواہیاں دے رہا تھا کہ جن کو ہم نے الیوژن، افواہ اور گپ کی مد میں ڈال دیا۔ اور یہ کہ وہ ان صالحین میں سے ہرگز نہ تھا جن کی گواہیوں پہ عیدیں منائی جا سکتی ہیں لیکن خیر اس سب سے مجھے کیا، میرا تو پروگرام بدل چکا ہے۔

اور جو جس قوم کی تقلید کرے گا، وہ......"

ٹیرو ویسنو اب وہ پوچھ رہا ہے۔ "اور یہ تو جی اسکاؤٹس کون ہیں...." اور اب وہ ایک اسکاؤٹ گرل کی جوانمردی کا قصہ سنا رہا ہے.... اور اب ہم پہ صداقت آشکار ہو رہی ہے۔ اس شخص کا ان محاذوں سے کیا واسطہ۔ یہ قصے تو ان ہی کے ذریعے پہونچ سکتے ہیں جو ہمارے محاذوں تک آئے ہوں گے۔

"بات یہ ہے کہ ہمارے فوجی جب نعرے لگاتے تھے......"

"تمہارے فوجی" "نہ جانے کس نے ٹوک دیا ہے۔

بات کرنے والا سٹپٹا گیا ہے....اور دوسرے لمحے سر اٹھا کر اس نے کہا ہے...... اس نے کہا ہے...."او ٹھیک ہے.... تمہاری فوج...."

اتفاقاً میری نظر شفاف شیشوں کے اس طرف ٹکرائی ہے.... ان میں ہر ایک حق اور ہر ایک بات سے دستبردار ہو جانے والی کیفیت کتنی شدید ہے.....

اور ایک خفیف سی دھندلاہٹ بھی۔ اور اس مرتبہ ان کی طرف دیکھ کر وہ دم گھٹنے والا احساس نہیں ہوا بلکہ مجھے کچھ یوں لگا جیسے میں نے الماری کھولی ہے اور بے خیالی میں سیدھے ہاتھ کی دراز سے ایک فائل نکالی ہے اور فائل میں سے ایکسرے نکالا ہے۔ دھندلائی ہوئی آنکھوں کی طرح دھندلا دھندلا ایکسرے اور ان میں ایک مٹھی بھر دل ہے اور اس دل میں ہر طرف برف کے ڈھیر ہی ڈھیر ہیں اور ہر ڈھیر پر ایک ننھا سا دیپ جھلملا رہا ہے.... مجھے ایک بار پھر وسی یاد آ رہی ہے.....

وسی جو اپنی ماں کی راہ میں روشنی کرتے نکلی تھی اور اس کی ماں نے پرانا راستہ بدل لیا تھا۔ اس لئے کہ اس کو ایک قریبی اور سہل راستے کا بھی علم تھا.... اور پھر یوں ہوا کہ تمام رات برف کے نرم نرم گالے اس کے وجود پر چپکے چپکے برستے رہے، حتیٰ کہ برف کے ڈھیر پر اس کی چھوٹی سی لالٹین ٹمٹماتی رہ گئی......

اور وسی کی یہ کہانی بچپن سے لے کر آج تک میرے لئے پریشان کن رہی ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ بھی یہ کہانی سن کر اپنے چھوٹے سے نرم نرم تکئے میں منہ چھپایا تھا۔ اور جب اس کا ایک کونا بھیگ جاتا تھا تو میں چپکے سے اپنی آنکھیں سرکا کر کسی دوسری طرف رکھتی رہی تھی، چنانچہ اب بھی میں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں دوسری طرف کر لی تھیں اور یہ سمت تھی سامنے بیٹھے ہوئے انسان کا وہ سر جس پر وقت سے بہت پہلے برف سی جمتی جا رہی تھی۔ اس لئے کہ جب کچھ لوگ راستہ بدل لیتے ہیں تو ——

تو خیر یہ تو لوگوں کے اپنے مسئلے ہیں۔

پر میرا تو انفرادی مسئلہ کسی قوم کے ساتھ اٹھائے جانے یا نہ جانے کا ہے۔ اب میں کیا کروں کہ اب اگر میں ان کے ساتھ اٹھائی جاؤں تو پھر میری پشت پناہی کے لئے سفید پوشوں کی ضمانت کون دے گا۔

اور عید کے منانے یا نہ منانے کا یہ ہے کہ چاند کی گواہی کے لئے تو ضروری ہے کہ گواہ کچھ ضروری شرطوں پر پورا اترتا ہو چنانچہ طے یہ پایا کہ چاند کی گواہی دینے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ مومنین اور صالحین میں سے ہو لیکن بعض گواہیوں کی فضیلت اور صداقت کی دلیل ہی یہ ہے کہ گواہی دینے والے مومنین اور صالحین میں سے نہ ہوں۔ چنانچہ افواہوں، گپوں اور الیوژن کی گواہی کے بعد میرے لئے یہ فیصلہ مشکل ہے کہ کس قوم کے ساتھ اٹھائی جاؤں۔

مسعود مفتی

نئے پیمانے

ایک افسر تبدیل ہو گیا ــــ دوسرا آ گیا۔

ملاقاتی کمرے میں علاقے کے معتبرین بیٹھے تھے اور باری باری دفتر میں ملاقات کے لئے جا رہے تھے۔ جہاں سے چپراسی نے قریشی صاحب کے نام کی تختی اتار دی تھی اور اب نئی تختی لگا رہا تھا۔

لوگ دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ موضوع نئے افسر کی ذات تھی کس قسم کا ہے۔ پہلے کہاں کہاں رہا ہے۔ وہاں وقت کیسے گذارا ہے۔ وغیرہ وغیرہ کسی کا چچا ماموں، کسی کا لڑکا، کسی کی لڑکی کا سسرال، کسی کی برادری کا کوئی دور دراز کا رشتہ دار اور کسی کا ملنے والا ضرور کسی ایسے علاقے میں رہتا ہوتا جہاں اس افسر نے پہلے ملازمت کی تھی۔ تبادلے کی خبر کے ساتھ ہی خطوط چل پڑے تھے۔ اب اُس کے ماضی کی واضح تصویر ملاقاتیوں کے سینوں میں موجود تھی اور وہ دبی آواز میں اپنی اطلاعات کا تبادلہ کر رہے تھے۔

اتنے میں دو آدمی ملاقاتی کمرے کی طرف آتے دکھائی دیئے۔ صاحب کا چپراسی لپک کر بنچ سے اُٹھا۔ جھک کر فرشی سلام کیا۔ مصافحہ کر کے اپنا ہاتھ سینے پر رکھا اور آگے بھاگ کر ملاقاتی کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

جب وہ اندر داخل ہوئے تو سب ملاقاتی کھڑے ہو گئے۔ دو ایک نے اپنی کرسیاں ان کے لئے چھوڑ دیں۔ باقی سمٹ سمٹ کر بیٹھنے لگے۔

انھوں نے سرسری انداز میں دو چار لوگوں کا حال پوچھا۔ چند ایک انکسار سے آگے بڑھے تو اُن کے ساتھ برتری سے ہاتھ ملایا اور خاموشی سے بیٹھ گئے۔

"جناب کی اطلاع اندر دوں؟" چپراسی خوشامد سے دانت نکال رہا تھا

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ــــ سوچا ــــ پھر ایک بولا۔ "کتنی دیر ملاقاتی لے رہا ہے؟"

"بس جی پانچ منٹ۔"

"تو بس ٹھیک ہے۔ جب سب فارغ ہو جائیں گے تو ہم اطمینان سے ملیں گے۔"

"بہتر حضور۔"

ان میں سے ایک بھاری بھرکم تھا۔ کوئی پچاس برس کا۔ سر پر سنہری کلاہ اور سفید کلف دار پگڑی، بھاری مونچھیں۔ توند کے اوپر اچکن پھنسی ہوئی۔ جیبی گھڑی کی زنجیر اچکن کے بٹن اور جیب کے درمیان لٹکتی ہوئی۔ ہاتھ میں مرصع چھڑی۔

دوسرا آدمی لمبا اور دبلا تھا۔ عمر سے پہلے ڈھلا ہوا قیمتی سوٹ میں ملبوس۔ سر کے کھچڑی بال سلیقے سے سجے ہوئے۔ ہونٹوں میں سگریٹ اور چہرے پر بے نیازی آنکھیں سنہری فریم والے کالے شیشوں سے ڈھکی ہوئی۔

ملاقاتی باری باری اندر جا رہے تھے۔ جب آخری آدمی گیا تو صرف یہ دونوں کمرے میں رہ گئے

اچکن والے نے سوٹ والے کی طرف دیکھا اور بولا "کیا خیال ہے جی آپ کا؟"

دوسرا خاموشی سے سگریٹ کا کش لگاتا رہا۔

"کچھ سنا آپ نے صاحب کے متعلق؟" اُس نے پھر پوچھا۔

سوٹ والے نے کش ختم کرکے راکھ جھاڑی۔ اطمینان سے دھوئیں کے دو تین چھلے منہ سے اُگلے اور طنزیہ بولا "سنتے ہیں سخت افسر ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"یہی کہ پچھلی جگہ دو تین کلرکوں کو رشوت لینے کی وجہ سے نوکری سے برطرف کر دیا تھا۔" اس نے دوسرے کی نظروں میں نظریں ڈال کر استہزا آمیز انداز میں کہا ـــــ دو تین لمحے ایسے ہی دیکھتا رہا۔ پھر خود ہی ہنسنے لگا۔

اچکن والے نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔ "ہاں چھوٹے دل کا آدمی ہے۔ کسی کو پیسے بناتے نہیں دیکھ سکتا ـــــ بالکل تنگ نظر ہے۔"

دونوں کی آنکھوں میں حقارت لہرائی۔

"آپ شیخ انتظام الدین کو جانتے ہی ہیں؟"

"کون وہ جو اسمبلی میں ہیں"

"ہاں ہاں وہی ـــــ اب آپ ہی سوچیں کتنے بڑے زمیندار ہیں۔ لاکھوں کی جائداد۔ علاقے میں دور دور تک نام۔ مگر سنا ہے کہ انہوں نے ایک دو کام کرنے کے لئے صاحب سے کہا تو اس نے انکار کر دیا۔"

"نہ صرف یہ جی" سوٹ والا بولا "بلکہ میں نے سنا ہے کہ سرکاری قرضہ جات کی وصولی کے لئے اُسے جیل میں ڈالنے کی دھمکی دی۔"

"بالکل ٹھیک سنا آپ نے۔" اچکن والا سر ہلا کر بولا "توبہ توبہ..."

چند منٹ خاموشی رہی اور پھر اچکن والا بولا "دراصل جی قصہ یہ ہے کہ صرف خاندانی آدمی ہی خاندانی کی قدر کر سکتا ہے۔ مجھے تو یہ صاحب کوئی خاندانی نہیں لگتا ـــــ اب بھلا اس میں بات ہی کیا تھی۔ اگر شیخ انتظام الدین کی عزت کے لئے چند کنجڑوں اور چماروں کو دبا دیتا اور ان کے خلاف فیصلہ کر دیتا۔"

"بالکل بالکل..." دوسرے نے فوراً سر ہلایا اور سگریٹ کا لمبا کش لیا۔ پھر نتھنوں سے دھوئیں کی لہر چھوڑتے ہوئے بولا: "پھر جی ایسوں کا حشر بھی تو دیکھ لیں نا، تار کے ذریعے تبادلہ ہوا۔"

دونوں خاموشی سے سوچنے لگے۔

اتنے میں چپڑاسی آیا "آئیے جناب"

اچکن والا اُٹھ کر دفتر کی طرف بڑھا۔

صاحب نوجوان سا خوش خلق آدمی تھا۔ اس نے اُٹھ کر اخلاق سے ہاتھ ملایا، حال احوال پوچھے گئے۔ نئی جگہ کی باتیں ہوئیں ـــــ پچھلی جگہ کا ذکر ہوا۔ ملاقاتی نے اپنے خاندان کے دو چار ایسے لوگوں کا بار بار ذکر کیا جو صاحب کے خاندان کے دو ہر داز کے لوگوں کو جانتے تھے۔ باتوں باتوں میں دیگر تعارف بھی کرایا گیا۔ "میرے دادا سادے پنجاب میں پہلے خان بہادر تھے ـــــ ۱۸۵۷ء کے غدر کے فوراً بعد انہیں سرکار کی طرف سے خدمات کے عوض خلعت بھی ملی تھی۔"

صاحب نے مروت سے مسکرا کر سر ہلایا۔

"اور بھی میرے والدین پر بھی سرکار بڑی مہربان تھی۔ ۱۹۱۱ء میں دہلی میں جو دربار ہوا تھا اُس میں اُن کو خاص طور پر قطار کے سرے والی کرسی ملی تھی۔۔۔۔ اور پھر شاہ ایڈورڈ انگلستان کے تخت پر بیٹھا تو وہ تاجپوشی میں شرکت کے لئے ولایت بھیجے گئے تھے۔"

صاحب نے متاثر ہونے کے انداز میں ابرو اوپر اٹھائے۔

ملاقاتی تھوڑے ہنسا "بہت خدمات تھیں جناب ہماری۔ میرے والد پر انگریز خاص طور پر مہربان تھے سب افسر شکار کیلئے ہماری زمینوں پر آتے تھے۔"

صاحب سر ہلاتا رہا اور ملاقاتی اپنا تعارف کراتا رہا۔ وہ ایک دفعہ صاحب نے اپنی گھڑی کی طرف بھی نگاہ کی مگر وہ نظر انداز کر گیا اور اپنے بزرگوں اور انگریزوں کے تعلقات کے قصے سناتا رہا۔

کیا زمانے تھے جناب وہ بھی ـــــ انگریز کا راج ـــــ اب بھی یاد آتے ہیں تو دل کھل جاتا ہے۔"

صاحب کھڑا ہو گیا اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "اچھا ملک صاحب، پھر کسی وقت تفصیل سے بات کریں گے۔"

ملاقاتی بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور قریب ہو کر قدرسے دھیمی آواز میں بولا "ہم لوگ سرکار کے پرانے خدمت گار ہیں۔ کل دو بھینسیں بنگلے پر بھجوا دوں گا جب سوکھ جائیں گی تو اُن کی جگہ دوسری آجائیں گی۔"

"نہیں نہیں ملک صاحب" صاحب نے ہنس کر کہا "آپ یہ تکلیف نہ کریں۔"

"تکلیف کیسی جناب! میں نے تو درجن بھر گائے بھینسیں رکھی ہی افسروں کے لئے ہیں۔ میرا کون سا اپنا کام رک رہا ہے ـــــ وہی بھجوا دوں گا جو شیخ صاحب کو دی تھیں۔ اُنھوں نے بھی تین سال استعمال کی ہیں۔ مجھے کیا فرق پڑے گا۔"

"نہیں نہیں۔ آپ بالکل تردد نہ کریں" صاحب نے ذرا بے چینی سے کہا۔

"اچھا تو" وہ اور قریب ہو گیا "آج کل نئی فصل آئی ہے۔ دانے اور گھی بھجوا دوں گا۔"

صاحب نے بے صبری سے انکار میں سر ہلایا۔

"میرا کیا جاتا ہے جناب۔ گھر کے دانے ہیں۔ گھر کا گھی ہے۔ جہاں ہمارا اتنا بڑا کنبہ کھاتا ہے، ایک آپ کے کھانے سے کون سا فرق پڑے گا۔"

صاحب انکار کرتا گیا مگر ملاقاتی نے اصرار جاری رکھا تو اس نے ذرا سختی سے کہا "ملک صاحب یہ میرا اصول نہیں ہے۔ آپ مجھے مجبور نہ کریں۔"

ملاقاتی نے مایوسی سے اُسے دیکھا۔ مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

"تمہاری گندم تیار رہے" وہ چپڑاسی سے سرگوشی میں بولا "آ کے لے جانا۔"

چپڑاسی نے جھک کر سلام کیا۔

سوٹ والا اندر چلا تو اس نے اچکن والے سے کہا "آپ ذرا انتظار کریں۔ میں فارغ ہوتا ہوں تو اکٹھے چلیں گے۔"

وہ اندر گیا تو صاحب بڑی خوش خلقی سے ملا۔ دو چار باتیں ہوئیں۔ پھر صاحب نے خود ہی پوچھ لیا "آپ کی مل کیسی چل رہی ہے؟"

"کون سی؟"

"وہ جو یہاں ہے۔"

"اچھا اس کا کہہ رہے ہیں۔ میں نے سمجھا آپ نئی مل کا ذکر کر رہے ہیں" پھر سگریٹ کا کش لگا کر بولا "یہاں والی بھی اچھی ہے مگر میں اُسے بیچ رہا ہوں

کوئی سٹرانگ پارٹی مل جائے تو بارگین کروں۔"

"کیوں بیچ رہے ہیں آپ؟"

دراصل جی یہ میری سب سے پہلی مل تھی۔ اس کے منافع سے اب تک سات فیکٹریاں اور لگا چکا ہوں۔ کچھ اس کی مشینری بھی پرانی ہو چکی ہے
میں نے کہا (آنکھ مار کر) کک اِٹ!"

اپنی عقل کی داد لینے کے لئے اُس نے فخریہ قہقہہ لگایا اور نکٹائی کی گرہ درست کی۔

صاحب بھی ضابطے سے مسکرایا "آپ کو تو شروع میں انکم ٹیکس بھی تو معاف ہوتا ہے نا۔"

"جی جی۔ لیکن وہ وقت اب ختم ہو گیا ہے۔ اس لئے اُسے بیچ کر اب نئی لگاؤں گا تاکہ اس پر ٹیکس ہالیڈے مل جائے —— کیا خیال ہے آپ کا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ کاروباری چیزیں تو آپ ہی بہتر سمجھتے ہیں۔"

"جی نہیں کاروبار تو ہر ایک کو کرنا چاہئے۔ اسلام نے بھی تجارت پر زور دیا ہے —— آپ کو بھی کاروبار کرنا چاہیئے۔"

افسر خفیف سی ہنسی ہنسا۔

"نہیں نہیں۔ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ اگر آپ کی ڈی زائر ہو تو میری نئی فیکٹری میں شیئرز خرید لیجئے۔"

اب کے صاحب نے قہقہہ لگایا "تو بہ کریں جی۔ ہمارے پاس اتنا پیسہ کہاں۔ تنخواہ میں بمشکل سفید پوشی سے گزارہ ہوتا ہے۔"

"نو۔ نو۔ نو۔ آپ فکر نہ کریں۔ ڈونٹ یو وری اباؤٹ منی۔ ہمارے پاس ایک فنڈ ہے جس میں سے اپنے مہربانوں کو قرضے دے سکتے ہیں۔"

"نہیں قرضہ ادا کرنے کو پیسے کہاں سے لائیں گے۔"

"دیٹ اگین اِز ناٹ ڈی فی کلٹ یو کین پے اِٹ بیک آؤٹ آف دی انکم آف شیئرز۔"

افسر نے نفی میں سر ہلایا "کہتے ہیں جس کا کام اسی کو ساجے۔ آپ کاروبار کریں۔ ہم تو نوکریوں کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اسی سے گزارہ کریں گے۔"

ملاقاتی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ جیب سے سونے کا سگریٹ کیس نکالا اور کھول کر صاحب کو سگریٹ پیش کیا۔

"معاف کیجئے میں تو پیتا نہیں۔"

اُس نے خود ایک سگریٹ نکالا۔ ڈبہ بند کر کے سرے کو اس پر مارا اور ہونٹوں میں دباتے ہوئے بولا "بہرحال ..... یو کا ملی تھنک اباؤٹ اِٹ۔"

پھر ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

"یہاں کام تو کافی ہو گا آپ کے لئے" ملاقاتی نے کہا۔

"جی ہاں کام تو کرنا ہی پڑتا ہے، ملازمت جو ہوئی۔"

"اگر کبھی بور ہو جائیں تو ریلیکس کرنے کے لئے لاہور مری وغیرہ کا چکر لگا لیا کریں۔"

صاحب مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

"فورآنسٹلی لاہور، مری، کراچی اور راولپنڈی میں میں نے بنگلے بنوائے ہیں۔ وچ آر ایٹ دی ڈسپوزل آف فرینڈز۔ آپ وہاں جائیں
سفتہ ون دل کسے، رہیں، مائی سرونٹس ول لوک آفٹر یو۔"

افسر نے مسکراتے ہوئے کہا "کون جائے جی اتنی دور۔ یہاں سے ہی فرصت ملنا مشکل ہے۔"

"تو کوئی بات نہیں۔ وی کین ایرینج اے گیٹ ٹو گیدر"

افسر کھڑا ہوگیا: "اچھا جی۔ پھر ملیں گے"۔

ملاقاتی بھی کھڑا ہوگیا اور ہاتھ ملاتے ہوئے بولا "ہاں کبھی فرصت میں آؤں گا۔ بہر حال دِس از این اوپن آفر ٹو یو"

"خدا حافظ" صاحب نے کہا

ملاقاتی چلا۔ دروازے پر رک کر مڑا: "میرے پاس کچھ اچھی انگلش وسکی آئی تھی۔ میں ایک کریٹ چپڑاسی کے پاس چھوڑ جاؤں گا"

افسر مسکرا دیا "نہیں بھائی میں تو ڈرنک نہیں کرتا"

"اچھا تو پھر گڈ بائی"

باہر نکلے تو اچکن والا ملاقاتی بھی تیار کھڑا تھا۔ دونوں کار کی طرف بڑھے۔ ڈرائیور نے گاڑی چلائی تو اچکن والے نے پوچھا: "کیسی رہی ملاقات؟"

"بوگس آدمی ہے" دوسرا بولا

پھر دونوں اپنی اپنی ملاقات کا حال ایک دوسرے کو سنانے لگے۔

کار چل رہی تھی اور وہ باتیں ختم کرکے خاموش ہوچکے تھے۔ اچکن والا سوچ سے نکل کر بولا "خدا بھی ایسے لوگوں کو افسر بنا دیتا ہے جنھیں افسری کرنا ہی نہیں آتی"

سوٹ والے نے اثبات میں سر ہلایا "اب آپ شیخ صاحب ہی کو لیں۔ کیا ریل پیل تھی ــــ کیا رونق تھی ــــ گندم آرہی ہے، گھی کے ٹین اتر رہے ہیں۔ دربار لگا ہے۔ دعوتیں اڑ رہی ہیں خاندانی لوگوں کو سر پر بٹھا رہے ہیں۔ جس کام کے لئے کہا جیسے بھی ہوا کر دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"وہ تو جی یاروں کا یار تھا" اچکن والا بات کاٹ کر بولا "کیا بات تھی۔ افسری تو وہ کر گیا ہے"

پھر دونوں اپنی پچھلی یادوں میں کھو گئے۔

کار چل رہی تھی۔

معاً اچکن والا "مگر نہیں جلدی پیچھا چھوٹ جائے گا اس سے"

"ہاں جی" سوٹ والے نے زور سے سر ہلایا "کچھ کرنا ہی پڑے گا"

"کار چلتی گئی ــــ انجن غرا رہا تھا ــــ

ام عمارہ

آگہی کے ویرانے

"آپا، آپا! میری ماں کو رکھ لیجئے" بادشاہ نے چائے کی پیالی ہاتھ میں تھماتے ہوئے سرگوشی کی۔

کیوں بھلا تمہاری ماں کو کیوں رکھوں؟ وہ تو خود چلی گئی۔ اب ـــــ" آسیہ نے چائے کی پیالی لیتے ہوئے بادشاہ کی طرف دیکھا۔ اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر اس کی زبان رک گئی۔ بادشاہ کا پھول جیسا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور اس کے ہر وقت مسکراتے ہوئے ہونٹ ایک سوال میں تبدیل ہو گئے۔

"کیوں بادشاہ خیریت تو ہے؟"

آپا۔ آپا میری ماں کہتی ہے کہ اگر آپ اسے نہیں رکھیں گی تو وہ مجھے بنگلے کے گھر لے آئے گی اور نیلو کی ماں مجھے مارے گی ـــــ اور ـــــ اور آپا وہ مجھے عید میں کپڑا بھی نہیں بنا دے گی۔ پھر میں عید میں نیا پینٹ اور شرٹ کہاں سے کہاں سے ـــــ" بادشاہ کی بڑی بڑی آنکھوں سے موتی جیسے آنسو ٹپکنے لگے۔

"چپ، چپ بادشاہ میں تیری ماں کو رکھ لوں گی۔ بس ـــ" ننھے سے بادشاہ کے آنسو دیکھ کے وہ چائے کا گھونٹ بھرنا بھول گئی بادشاہ جس کے ننھے منے ہاتھ بکے ہوئے تھے جسے ایک مٹھی بھات اور ایک پینٹ اور قمیص کے لیے صبح سے شام تک ایک پاؤں پہ کھڑے رہنا پڑتا تھا۔ پھر بھی وہ بادشاہ تھا۔ یہ ماں باپ نام رکھتے وقت کیوں نہیں سوچتے۔ مایوسی کی تصویر بادشاہ پر ایک نظر اس نے ڈالی۔

"بادشاہ! اے او بادشاہ، کہاں مر گیا ـــــ" رفو کی تیکھی آواز کان چھید گئی۔

"جاؤ بادشاہ ورنہ آپا خفا ہو جائے گی" اس نے آہستہ سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"اونہہ، اسی پیار نے اس کا دماغ خراب کر رکھا ہے ـــــ" رفعت نے چولہے کے پاس سے ہانک لگائی۔

"نوکر نہ ہوا پورا بس مالک لیا گیا ہے کمبخت کی خاطریں ہو رہی ہیں ـــــ" اس نے جھنجھلا کے چائے کی کیتلی اتنے زور سے پٹخی کہ چھناکے کے ساتھ آسیہ کا کلیجہ دہل گیا۔

"کیا ٹوٹا رفعت؟" آسیہ نے آہستہ سے پوچھا۔

"کچھ نہیں" رفعت نے چائے دانی کی ٹوٹن آنگن میں پھینکتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا "چائے دانی ٹوٹ گئی"

"چائے دانی ٹوٹ گئی اور تم کہتی ہو کہ کچھ نہیں ٹوٹا"

"ٹوٹنے کی چیز تھی، ٹوٹ گئی۔ میں کیا کروں ـــــ" رفعت نے بکھری ہوئی چائے کی پتی جھاڑو سے سمیٹ کے نالی میں گراتے ہوئے ایسے کہا جیسے تیرہ روپے کی چائے دانی کا ٹوٹنا کوئی بہت ہی معمولی سی بات تھی اور ایسی ایسی چائے دانیاں جب چاہے آ سکتی ہیں۔ اس کے اس رویہ سے

آسیہ کو سخت تکلیف ہوئی۔

"تیرہ روپے کی تھی یہ کیتلی اور تم کہتی ہو کہ —" آسیہ نے افسردگی سے چائے کی پیالی اُٹھا کے ٹھنڈی چائے ایک ساتھ حلق میں انڈیل لی۔

"کون سا فرق پڑ جائے گا، کیتلی ٹوٹ گئی ٹوٹ گئی۔ تیرہ روپے ہی کی تو تھی۔ آپ آسیہ آپا ایک ایک پیسے کے پیچھے ایسے مرتی ہیں جیسے پیسہ ہی آپ کا سب کچھ ہے۔ اور پھر —"

"تم نہیں بولو گی تو اور کون بولے گا رفو۔ جب نمک کی ایک کنکری سے لے کے تمہاری شلوار کے ریشم تک کے بارے میں سوچنا پڑے تو تیرہ روپے بھی تیرہ سو کے برابر ہوتے ہیں۔" آسیہ نے آہستہ سے کہا۔

ابھی پرسوں ہی رفو نے اس سے فرمائش کی تھی اب کے عید پر وہ اس کے لئے سیاہ ریشمی شلوار اور جاپانی چکمی کی قمیص بنوا دے۔ دوپٹہ بنوانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پچھلی عید کا شفان کا دوپٹہ اب تک ویسے ہی نیا پڑا ہے۔ اس نے بڑی فراخ دلی سے کہا تھا جیسے دوپٹہ نہ بنوا کے وہ اس پر بہت بڑا احسان کر رہی ہے۔

"اوہ آپ کو میری ریشمی شلوار کھل رہی ہے۔ چلئے میں نہیں بنواتی شلوار قمیص بھلے کو آپ اس بادشاہ کے سنگار میں لگے ڈوبے، ہمارا آپ کیا واسطہ۔" رفو تنتنائی۔

"کیا بکتی ہو رفو۔ یہاں بادشاہ کا کیا ذکر۔ تمہارا اس سے کوئی مقابلہ بھی ہے؟"

"وہ تو صرف کہنے کی باتیں ہیں۔ ابھی ابھی بادشاہ آپ سے میری شکایت کر رہا تھا اور آپ مزے سے سن رہی تھیں —"

"اور اسی جھنجھلاہٹ میں تم نے کیتلی پٹخ ڈالی، خدا کسی کو عقل کا اندھا نہ بنائے"

"میں آپ نے میری شکایت سُن سُن کے اس بے ہودے کا دماغ آسمان پر کر دیا ہے —" رفو کو بادشاہ کے ہنستے مسکراتے چہرے سے نفرت تھی۔ "یہ کیا کہ ہر وقت بتیسی نکالے جا رہے ہیں۔" اس نے ایک دن اعتراض کیا تھا۔

"اتنی ظالم مت بنو رفو۔ تمہیں کسی کی ہنسی پر کوئی اختیار نہیں۔ خدا کا شکر کرو کہ وہ اتنا ہنس مکھ ہے ورنہ روتی بسورتی شکل دیکھ کے تو میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔"

"مگر آپا —"

"بس چپ رہو، یہ بادشاہ نام کا نہیں دل کا بھی بادشاہ ہے۔ کیوں بادشاہ؟" اس نے مسکرا کے بادشاہ کی طرف دیکھا تھا۔

اور جب سے لے کے آج تک رفو کی دشمنی پکی ہو گئی تھی۔ موقع بے موقع اس کے کان اینٹھ دینا، دو چانٹے لگا دینا اور بات بے بات ڈانٹنا تو بہت ہی معمولی سی بات تھی۔

"مگر یہ وقعہ ہے آسیہ آپا کہ بادشاہ کو آپ نے بہت سر چڑھا رکھا ہے اور اب یہ بادشاہ ہر وقت —"

"تمہارا دماغ سچ مچ خراب ہو گیا ہے رفو —" آسیہ نے تعجب سے رفو کو دیکھا۔

رفو جو اس کے رشتہ کی بہن تھی لیکن اپنی بہنوں سے زیادہ پیاری۔ تنہائی کے اس کڑے وقت میں جب ایک ایک کر کے سارے رشتہ دار منہ موڑ گئے اور آسیہ تن تنہا وسیع دنیا میں ایک ایک کا منہ دیکھتی رہ گئی تھی تو اچانک آنگن کا دروازہ کھلا اور چھوٹے چچا ہمیشہ کی طرح آنگن کے چبوترے پر براجمان تھے۔

"اب انہیں کون سی مصیبت یہاں کھینچ لائی؟"

آسیہ ان کی صورت دیکھ کر لرز گئی۔ خاندان کے سب سے گئے گزرے انسان جنہیں دیکھ کے ابا کے پتنگے لگتے تھے اور اماں کی چابی کی ڈھنڈیا پڑ جاتی

تھی چھوٹے چچا کون تھے، کیا تھے؟ اس کے بارے میں اسے کوئی پتہ نہیں تھا۔ ان کا شمار گھر کے قریبی لوگوں میں ہوتا تھا اور بس ۔۔ وہ یہ البتہ ضرور جانتی تھی کہ چھوٹے چچا ان کے اپنے چچا نہیں ہیں ـــــــ اور یہ انکشاف بھی اس پر اس دن ہوا تھا جب اس نے چھوٹے چچا کی گود میں بیٹھ کے مارے سوالوں کے ان کا ناک میں دم کر دیا تھا کہ:

"آپ اگر ابا کے بھائی ہیں تو ان کی طرح لمبے کیوں نہیں؟ آپ کی آنکھیں سیاہ ہونے کی بجائے بھوری کیوں ہیں، آپ مرچ کی طرح سوکھے کیوں ہیں جبکہ ابا اتنے مجیم شحیم ہیں؟ آپ کے سر کے بال وہ بھی لمبے لمبے اور سنہرے کیوں ہیں؟ آپ کی ناک ابا کی طرح اونچی اور چوڑی کیوں نہیں؟"

تو چھوٹے چچا نے جل کے کہا تھا "میرے ماں باپ الگ اور تمہارے دادا کے الگ۔ بھائی ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ میرے اپنے بھائی تھوڑے ہی ہیں۔"

"ہائیں ـــ یعنی کہ ـــــ"

"ہاں ہاں۔ بالکل۔ تمہارے ابا میرے ماموں کے بیٹے ہیں اور ـــــــ"

"یعنی میرے دادا آپ کے ایسے ماموں تھے جیسے اماں کے ماموں ہیں جنید نانا؟"

"ہاں ہاں ـــــ"

اللہ توبہ ـــ اسے دادا کے تصور ہی سے گھن آنے لگی۔ اتنی بڑی تڑی شخصیت کا اتنا وقار بیٹا ـــــ "جنید نانا تو ایک دم مکوڑے جیسے ہیں جی اب بھلا ابا کے ابا ایسے تھے تو پھر آپ ابا کے اپنے بھائی کیوں نہیں ہو سکتے ہیں؟ کیوں جی؟" اس نے اپنے جانتے عقلمندی کی بات کی ـــ

"ارے نہیں بیٹی ـــ تمہارے دادا تو تمہارے ابا سے زیادہ ہاتھ پیر والے تھے۔ تم کیا جانو میرے ماموں کو۔ ان کے آگے بڑے بڑے جتیا تو بس کچھ بھی نہیں ہیں ـــ"

"کمال کرتے ہیں چچا۔ ابھی خود ہی کہہ رہے تھے کہ آپ کے ماموں جنید نانا جیسے تھے اور اب ـــــ"

"اُف۔ اوہ۔ تو میں نے تمہیں اپنا رشتہ سمجھایا تھا"

"یعنی کہ ـــ"

"یعنی کہ کچھ نہیں۔ چلو بھاگ جاؤ میرے پاس سے ـــ"

"اماں اماں۔ یہ چھوٹے چچا کہتے ہیں کہ وہ ابا کے اپنے بھائی نہیں ہیں اور میرے دادا جنید نانا کی طرح مکوڑے جیسے تھے جو ان کے ماموں تھے ـــ پھر خود ہی پلٹتے ہیں کہ وہ"

"چپ کرو آسیہ تم کو کیا لینا ان سب باتوں سے۔"

"ایں مگر یہ چھوٹے چچا بھلا ہمارے اپنے نہیں ہیں؟"

"اپنے ہی تو ہیں۔ تمہارے باپ کی پھوپھی کے بیٹے ہیں۔"

"اوہ! اب سمجھی میں چھوٹے چچا کی اماں، ابا کی ایسی پھوپھی تھیں جیسے میری فریدہ پھوپھی ہیں ایں؟"

"نہیں، فریدہ تمہاری پھوپھی ویسی نہیں ہیں۔ تمہاری کوئی پھوپھی ہیں ہی نہیں۔ تمہارے باپ اپنے ماں باپ کے اکلوتے ہیں" اماں نے فریدہ پھوپھی کے نام پر تیوری چڑھائی۔

"پھر چھوٹے چچا بھی اپنے نہیں، فریدہ پھوپھی بھی اپنی نہیں ـــــ" چھوٹے چچا کے اپنے نہ ہونے کا تو اسے ایک ذرا بھی افسوس نہیں تھا۔ کبھی دو پیسے کی بیری بھی تو نہیں دلوائی۔ اُلٹے اس کے دو چار پیسے بیڑی پینے کے بہانے مار لیتے تھے ـــــ لیکن فریدہ پھوپھی کے اپنے نہ ہونے کا اسے رہ رہ کے

افسوس ہو رہا تھا۔

اتنی پیاری سی تھیں، اتنی نازک سی زبیدہ پھوپھی کہ بس اور اسے کتنا پیار کرتی تھیں — جب دیہات سے آتی تھیں تو کہیں میتھی کے لڈو ہیں تو کہیں روغنی ٹکیے ہیں — خوشبودار چھوارے جیب میں بھر بھر دیتیں اور چھیبہ بھر بھر کے ٹکی، شکر پارے اور پتہ نہیں کیا کیا الا بلا لاتی تھیں ہر وقت اسے گودی میں ڈھوئے چلتیں۔ اماں سے لہک لہک کے باتیں کرتیں — مگر اماں کی بھویں جب تک فریدہ پھوپھی رہتیں دودھاری تلوار بنی رہتیں۔ لیکن فریدہ پھوپھی کے رویے میں کوئی فرق نہ آتا — کہیں اماں کی ساڑی زبردستی دھوئی جا رہی ہے تو کبھی اس کے لئے فراکیں سل رہی ہیں اور رات کو مزے سے ابا کی چارپائی پر بیٹھی ایک پاؤں کلیجے سے لگائے بلبل کی طرح چہک رہی ہیں۔ ساتھ ساتھ اسے قصے بھی سنا رہی ہیں، ابا کا پیر دب رہا ہے۔ ملازموں کو انعام واکرام بھی مل رہے ہیں — اور جب وہ جانے لگتیں تو ذکر چاکر، ابا اور وہ خود سب کے سب رنجیدہ ہو جاتے۔ بس ایک اماں اور دوسرے چھوٹے چچا (اگر وہ ہوتے تب) کے چہروں پر اطمینان کی لہریں دوڑ جاتیں — جیسے بڑی بلا ٹل گئی ہو۔

ایک دفعہ جب فریدہ پھوپھی ایسے ہی گئیں تو چھوٹے چچا نے اماں سے پوچھا "ٹل گئی بلا؟"

"ہاں مگر چھوٹے، یہ بلا تو تم نے سر چڑھا رکھی ہے۔ میاں گھوڑی تو تمہاری ہے لیکن نہ تم اسے لگام دے سکے اور نہ ہی سیدھے رستے پر چلنا سکھایا۔ کیسے سوار ہو میاں؟" اماں ہنسیں

"آپ ٹھیک کہتی ہیں بھابھی یہ کمبخت بڑی منہ زور ہے اور سچ پوچھیے تو وہ نام کو میری گھوڑی ہے ورنہ سوار تو وہی پرانا ہے — صرف نام بدل گیا ہے۔"

"میاں تم سخت بزدل ہو —"

ایسی بات نہیں بھابھی۔ دراصل ان سب باتوں کے باوجود میں ان کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ اور اب سچ پوچھیے تو وہ میرے دل پر چڑھتی بھی نہیں۔ بھلا آپ ہی بتلائیے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ خدا کے بعد اگر کسی کو عزت کے قابل سمجھتا ہوں تو وہ —"

"مگر چھوٹے میاں یہ بھی تو سوچو یہ میرا جلاپا؟"

"یہ ناانصافی ہے بھابی۔ دائی بنا کے رکھا ہے بھابی انھوں نے آپ کو کہیے نہیں — ؟ بس یہ ذرا سا شوق ہے اور یہ تو آپ سے پہلے کا ہے۔ اسی لئے انھوں نے مجھے — خیر چھوڑیئے —"

"دیکھو میاں، میں عورت ہوں اور مجھ سے یہ سب کچھ، یعنی کہ — اور تم کیسے مرد ہو کہ کچھ محسوس نہیں کرتے۔ کمال ہے۔"

"بات یہ ہے بھابی کہ میں نے کبھی اس کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ اور وہ میری ملکیت تھی ہی کب جو میں محسوس کروں۔ میں تو بس محض بٹ ناٹ کا پردہ ہوں — اونہہ —"

اور آتیہ منہ کھولے چھوٹے چچا اور اماں کی مکالمہ بازی سنتی رہی — اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ اور تو اور اماں جو ہر لمحے چھوٹے چچا سے چڑی رہتی تھیں اس طرح گھل مل کے باتیں کر رہی تھیں کہ اسے سخت تعجب ہو رہا تھا۔ ورنہ اماں تو بس اٹھتے بیٹھتے سخت سخت باتیں کہنے کی عادی تھیں۔ جہاں چھوٹے چچا آئے اور اماں نے ہتھیار سنبھال لئے۔ ویسے چھوٹے چچا تھے بھی سخت اٹھائی گیرے۔ انھوں نے اسے بیٹیوں کی طرح گودوں کھلایا تھا — اور پھر ایک دن مزے سے اس کے ہاتھوں کے کڑے لے کے پردیس سدھار گئے، اور اس کا ذرہ بھر بھی خیال نہیں کیا کہ اماں اس کے ہاتھوں میں کڑے نہیں دیکھیں گی تو اس کا کیا حشر ہوگا۔ اماں نے مارے غصے کے دھواں دھوں پیٹ کے رکھ دیا اور ابا نے قسم کھائی کہ زیور نام کی کوئی چیز اسے نہیں بنا دیں گے۔

اب یہ بھی ہونے والی بات تھی کہ ابا نے قسم کچھ ایسے وقت کھائی تھی کہ سرتا سر پوری ہو گئی اور دو دن کے اندر ابا کا جنازہ بیچ آنگن میں دھرا تھا۔

اور وہ دن اور آج کا دن اس کی قسمت میں سونے کے کڑے تو بڑی چیز تھے تار کا چھلا بھی نہیں تھا۔ اور اماں ابا کی بچی رفیق تھیں۔ ابا کے بعد ان کو یہ دنیا اتنی ناپسند ہوئی کہ سال لگتے لگتے انھوں نے اپنا راستہ لیا اور جب آسیہ کو ہوش آیا تو اپنے چاروں جیسے آنگن میں تنہا تھی اور اوپر آسمان اور نیچے زمین، اور اردگرد بڑے بڑے برآمدے، دیو جیسے اونچے ستون اور اژدہے کی طرح منہ کھولے ہوئے کمرے جن کے بڑے بڑے دروازے اب نگلنے کے لئے ہی کھلے تھے ــــ اس نے اجنبی نظروں سے چاروں طرف دیکھا، گھر کا ایک ایک تنکا اس کا دیکھا بھالا تھا لیکن ہر چیز نے جیسے اس کے لئے اپنی پہچان کھو دی تھی ــــ اس نے حیران و پریشان ہو کے ادھر ادھر دیکھا۔ "تو ایسے بھی ہوتا ہے اللہ میاں کہ انسان اتنا بے سہارا ہو جائے کہ اسے سہارے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہو اب ــــ اب میں کیا کروں۔ اتنا بڑا مکان اور ایک اکیلی ذات، تنہائی میں اس کا دم الجھنے لگا۔ اس نے گھبرا کے آنگن کے دروازے کی طرف دیکھا تھا جیسے اس کی دیکھ بھال کے لئے ابھی ابھی اسی دروازے سے کوئی داخل ہوگا اور اس نے نظر اٹھائی تو چھوٹے چچا چھوٹی رقو کا ہاتھ پکڑے سامنے کھڑے تھے جنھیں دیکھ کر وہ ایک دم لرز گئی۔ اس کی نگاہیں کلائیوں کی طرف گئیں۔

سونے کے کڑے تو خیر کانچ کی دو چوڑیاں بھی اس کی بھری بھری کلائیوں میں نہیں تھیں ــــ پتہ نہیں اب کیا نحوست پھیلائیں گے۔ اسے اپنے کڑوں اور ابا کی موت میں نہ جانے کیا مماثلت نظر آئی۔ چھوٹے چچا کی نحوست کے بارے میں اس کا عقیدہ اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ وہ ان کی صورت دیکھتے ہی کانپ گئی۔ جی چاہا کہدے "اب کس لئے آئے ہیں چچا، گھر تو آپ کی نحوست کی بدولت کھنڈر بن گیا اور میں بے یار و مددگار اس بھری پُری دنیا میں صرف ــــ لیکن اس کی فطری نیکی سامنے آگئی۔ اسے یاد نہیں تھا کہ کسی سے سخت لہجہ میں گفتگو بھی کبھی کی تھی۔

"کیسے آئے چچا؟ کدھر کدھر سے؟" اپنی تمام نفرت کے باوجود اس کے لہجہ میں سختی نہیں آسکی۔

"میں نے سوچا آسیہ منی ــــ بھیا بھابی کے بعد میری بیٹی اکیلی گھبرائے گی ــــ سو اس رفعت کو لے آیا تمہاری دوسرا تو رہے گی اور اسے بھی دنیا میں رہنے کا سلیقہ آ جائے گا۔ ورنہ یہ تو ــــ" چھوٹے چچا نے پکوڑی پکڑ کے رفعت کو اس کی طرف دھکیل دیا جو سیدھی اس سے آ ٹکرائی۔

"یہ کس کی لڑکی پکڑ لائے چچا؟ سونے چاندی کے کاروبار سے لڑکیاں چرانے کا پیشہ یقیناً ــــ" وہ پھٹ پڑی۔

"کیا بکتی ہو؟ یہ میری بیٹی ہے۔ جس سے جی چاہے پوچھ لو۔" چھوٹے چچا اس کی بات کا برا ماننے کی بجائے کھلکھلا کے ہنس پڑے۔

"یہ آپ کی بیٹی ہے!" آسیہ نے بے اختیاری سے بڑے چچا کو دیکھا۔ اور پھر موٹی موٹی آنکھوں والی گول مول رقو کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس سوکھے مارے انسان اور اس گول مٹول لڑکی میں اسے کوئی مناسبت نظر نہ آئی۔

"کیوں چچا اب پھر کوئی نیا گل کھلانے کا ارادہ ہے۔" اس نے لرز کے چچا کو دیکھا ــــ آج کل ویسے ہی اغوا کی داستانیں سننے میں آتی رہتی ہیں آئے دن ریڈیو سے اعلان ہوتا رہتا ہے۔ اخبارات کے کالم کے کالم اس قسم کی خبروں سے سیاہ ہوتے ہیں۔ اور چچا جس قماش کے آدمی ہیں ان سے تو کسی قسم کا کام بعید نہیں ــــ آسیہ پریشان ہو گئی

"دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ہے تمہارا؟ چلو ہمارے گاؤں جس سے جی چاہے پچھوا دوں ــــ یہ میری بیٹی ہے ــــ بڑا افسوس تو یہ ہے کہ تم نے کبھی گاؤں کا منہ ہی نہیں دیکھا۔ بھابی تو صرف بیاہ کے آئی تھیں اور پھر جب سے آج تک بس کبھی کبھی بھیا جاتے رہتے تھے ــــ"

"ہو گا چچا، اب آپ ہی دیکھئے۔ آپ نے خود ہی کبھی نہیں بتایا کہ آپ کی شادی ــــ پھر ــــ پھر آپ کی یہ بیٹی ــــ چچا آپ سے تو ذرا بھی ملتی ہے ــــ" آسیہ نے سادگی سے کہا۔

"پاگل ہوئی ہے لڑکی۔ گاؤں میں سے جس سے جی چاہے پوچھ لینا یہ میری لڑکی ہے۔ لو بیٹی ذرا غور سے دیکھو ــــ اس کا چہرہ۔ اس کی پیشانی ہونٹوں کا خم پتلی سی ناک کے ساتھ پھیلے ہوئے نتھنے اور آنکھوں کا بھورا رنگ ــــ" چچا نے اپنی بھوری بھوری آنکھیں چمکائیں ــــ

اگر اور کوئی وقت ہوتا تو آسیہ ہنس پڑتی ۔ لیکن اس وقت وہ بیچ بیچ متفکر تھی چھوٹے چچا کو اس نے بے اعتباری سے دیکھا ـــــ ان کی شخصیت کے بارے میں وہ بچپن سے سنتی آئی تھی کہ اگر سچ کو چھوٹے کا سایہ بھی پڑ جائے تو وہ آسانی سے جھوٹ میں بدل جائے ۔ اور آج وہ اتنا بڑا جھوٹ سچ میں تبدیل کرنے پر مصر تھے ـــــ وہ پریشان سی سوچ رہی تھی ۔ اور چھوٹے چچا رفو کا ہاتھ پکڑے ، بڑے غور سے اس کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھ رہے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور فریدہ پھوپھی جو اماں کو سن کرائی تھیں ، برآمدے میں آگئیں " اچھا آپ کب آئے ، اور اس بار صاحبزادی بھی ساتھ ہیں ـــــ اب آپ کے سسر کے پاس کھلانے کو کچھ نہیں رہا کیا ؟"

فریدہ پھوپھی کی بات سن کے آسیہ کی جان میں جان آئی ۔ تو یہ سچ سچ چھوٹے چچا کی بیٹی ہے ۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا ۔ فریدہ پھوپھی اس کی کیسی پھوپھی ہیں ، اس کے بارے میں مرتے دم تک اماں نے کچھ نہیں بتایا لیکن پھر بھی وہ اسے اپنی پھوپھی لگتی تھیں ۔ چھوٹے چچا جو اس کا نمونہ تھے ـــــ فریدہ پھوپھی جن کی رشتہ داری بس یونہی تھی لیکن دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا ۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے ۔ چھوٹے چچا جہاں سارے زمانے کے چہیتے مشہور تھے ـــــ وہاں فریدہ پھوپھی کی گھر باہر سوائے اماں کے سب ہی عزت کرتے تھے ۔ اور ان کی محبت کے قائل تھے ان کا وقار تو ایسا تھا کہ چھوٹے چچا جیسے منہ پھٹ آدمی بھی ان کا لحاظ کرنے پر مجبور تھے ـــــ ان کو دیکھتے ہی چھوٹے چچا کی نگاہیں جھک جاتیں ۔ چہرے پر عجیب سی مسکینیت چھا جاتی تھی ۔ یہ اس نے بچپن سے دیکھا تھا اور اس وقت بھی فریدہ پھوپھی کی آواز سن کے ان پر نسیان چھا گیا ۔ انھوں نے نظریں اٹھا کے ایک بار فریدہ پھوپھی کو دیکھا اور خاموشی سے اپنے جوتوں کے تسمے کھولنے لگے ۔

" ارے چھوٹے میاں جواب کیوں نہیں دیتے " فریدہ پھوپھی نے بڑی محبت سے رفعت کے سر پر ہاتھ پھیرا ۔ لیکن بڑے زور سے کانپ گئیں اور ان کا ہاتھ ایک جھٹکے سے الگ ہو گیا جیسے بجلی کا شاک لگ گیا ہو ۔

جواب کیا دوں اس کی خالہ اور نانا تو آنے ہی نہیں دیتے تھے لیکن میں نے سوچا ، آسیہ اکیلی رہے گی ۔ اور پھر میں نے سوچا اس کے ساتھ رہ کے یہ بھی آدمی ہو جائے گی ۔ ورنہ وہاں رہ کے تو کچھ دنوں بعد اس میں اور کسی جانور میں فرق کرنا بھی مشکل ہی ہوتا ۔ اب اسی وقت دیکھ لو سلام نہ پیام بس آنکھیں پھاڑے ایک ایک کو دیکھ رہی ہے ۔ جیسے ـــــ " چھوٹے چچا نے جھلا کے بیٹی کی طرف دیکھا اور انھیں آسیہ کا بچپن یاد آ گیا ۔ جب وہ اتنی سی تھی تو ہر نئے آنے والے کو بڑے ادب سے سلام کرتی ، پان پیش کرتی اور میٹھی میٹھی باتیں کرتی اور اب یہ ـــــ چھوٹے چچا نے رفو کی طرف دیکھا جو بڑے اطمینان سے انگوٹھا چوس رہی تھی ۔

" تو دیکھو تو ابھی خاصی دس گیارہ سال کی لڑکی انگوٹھا چوس رہی ہے ، ٹوسی منہ پر اسے میں تمہارے باپ کے آستانے پر چھوڑ آتا ! " چھوٹے چچا نے جل کے فریدہ پھوپھی کی طرف ہاتھ چلایا ۔

اور فریدہ پھوپھی کا چہرہ ایسا ہو گیا جیسے غشی کی کے گرنے والی ہوں ۔ وہ کپکپا کے زمین پر بیٹھ گئیں ۔ آسیہ حیرانی سے کبھی چھوٹے چچا کو دیکھتی اور کبھی فریدہ پھوپھی کو اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے انجانے لوگوں میں گھر گئی ہے اور چھوٹے چچا اسے دوسرے دنوں کے مقابلے میں زیادہ ہی پر اسرار معلوم ہو رہے تھے ۔

" فریدہ پھوپھی کے ابا تمہارے سسر ہیں چچا ؟ " اس نے تعجب سے چھوٹے چچا کو دیکھا

" میرے کیوں ہوتے ۔ وہ تو تمہارے ـــــ "

اچانک چھوٹے چچا کی نظریں فریدہ پھوپھی پر پڑ گئیں اور وہ ایسے رک گئے جیسے یکایک کسی نے ان کی زبان میں تالا ڈال دیا ۔

" کیا ہوا ہے ؟ " آسیہ نے تعجب سے انھیں دیکھا ۔

"کچھ نہیں سودا میں یہ کہہ رہا تھا کہ تمہاری چچی زبیدہ پھوپھی کے گاؤں کی بیٹی تھی۔ اور اس ناطے گاؤں کا ہر بڑا بوڑھا میرا سسر تھا۔ گاؤں کے رشتے ناطے ایسے ہی ہوتے ہیں بیٹی۔ جیسے میرا سسر تمہاری زبیدہ پھوپھی کو بیٹا کہتا ہے ——— اور ——— بس یوں سمجھ لو گاؤں میں لوگوں کے ایسے ہی اَن ٹوٹ رشتے ناطے جوڑا کرتے ہیں۔ ویسے کوئی رشتہ نہیں لیکن اگر دیکھا جائے تو یہ تمام ناتا رشتے خون کے رشتوں سے بھی زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ یعنی کہ جیسے ——— اور چھوٹے چچا بے پناہ کوشش کے باوجود آسیہ کو مافی الضمیر نہیں سمجھا سکے۔ آخر جھلا کے چپ ہو رہے۔

زبیدہ پھوپھی آہستہ آہستہ زمین پہ سے اٹھیں اور ساڑی جھاڑتی ہوئی کھڑکی سے دوسرے آنگن میں چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد چھوٹے چچا قریب آئے "یہ لو آسیہ بٹی اب یہ زبیدہ تمہاری بہن ہے۔ لاوارث سمجھ کے اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنا" چھوٹے چچا رک کر آسیہ کے پاس چھوڑ کے دروازے کی طرف بڑھے۔

"پر آپ جا کہاں رہے ہیں چھوٹے چچا؟ اتنی سی زبیدہ کے ساتھ اتنے بڑے ڈھنڈار گھر میں اکیلے کیسے رہوں گی؟" آسیہ کو پہلی مرتبہ اپنی تنہائی کا احساس ہوا۔

"وہ تمہاری زبیدہ پھوپھی تو ہیں ہی۔ اس لئے ———" چھوٹے چچا نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ سامنے سے زبیدہ پھوپھی ہاتھ میں اپنا سوٹ کیس لئے برقع ڈالے چلی آ رہی تھیں۔

"کہاں چلیں پھوپھی اتنی جلدی؟" آسیہ نے تعجب سے پھوپھی کی طرف دیکھا۔ ابھی صبح تو وہ اسے دلاسا دے رہی تھیں کہ ——— اب اسے چھوڑ کے گاؤں نہیں جائیں گی ——— اور اس وقت ———

"بات یہ ہے بیٹی کہ تمہارے یہ چچا اور بہن آ گئے ہیں، اسی لئے میں نے سوچا ———"

"لیکن پھوپھی، چچا تو ——— اور یہ اتنی سی ہے ———" اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اکیلے ہو جانے کے تصور ہی سے اس کی روح نکلی جا رہی تھی ——— پھوپھی کا سہارا بہت تھا۔ وہ اسے بچپن سے مانتی تھیں۔ لیکن آج اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہ سہارے کتنے کمزور ہوتے ہیں ———

"میں رہ جاتی میری گڑیا۔ لیکن میرے پیچھے گاؤں میں گھر برباد ہو جائے گا۔ اور پھر تمہاری حویلی کا بھی برا حال ہوگا۔ یوں بھی اس کی دو طرف سے دیواریں گر گئی ہیں ———"

"اونہہ! حویلی کی فکر بیکار ہے۔ جہاں سب گیا وہیں وہ بھی جائے گی۔ البتہ آپ کا اپنا گھر ہے تو پھر شوق سے جائیے ——— آخر ہم ہیں کون آپ کے" آسیہ نے کچھ مایوسی اور کچھ غصے سے کہا۔

"میں پھر آؤں گی گڑیا رانی۔ لیکن ابھی تو مجھے جانے ہی دو مجھے اس گھر کے کونے کونے سے جیسے آواز آتی ہوئی سنائی دیتی ہے ——— اور ———"

"رکشہ آ گیا بی بی جی" بیگم کی ماں نے بات کاٹ دی اور زبیدہ پھوپھی دو ہفتے پہلے جس خاموشی سے گھر میں آئی تھیں۔ ویسے ہی آنگن کے دروازے سے باہر چلی گئیں ——— سڑک پر رکشے کی گھنٹی گونجی اور پھر ایک بے کراں سناٹا چھا گیا ——— وہ ویران آنکھوں سے پاٹوں پاٹ کھلے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سڑک کے کنارے پانی کے نکلے چپ دستور بالٹیوں پر بانیاں بج رہی تھیں۔ گھر سے لوٹ رہے تھے، یا تھا پانی ہو رہی تھی۔ مزدور اپنے سروں پر سبزیوں کی ٹوکریاں اٹھائے ہاٹ کی طرف جا رہے تھے۔ باہر کی دنیا میں کوئی فرق نہیں آیا تھا لیکن یہ اتھاہ سناٹا کیوں ——— اس نے اپنی آنکھیں دوپٹے کے آنچل سے پونچھ لیں۔ کالج کی بس اس کے پھاٹک پر سے گذر گئی اور سامنے اسمٰعیل میاں کے لوہے کے پھاٹک پر رک گئی۔ اس نے دیکھا اسمٰعیل میاں کی چھوٹی لڑکی برقع لپیٹے بس میں بیٹھ گئی ———

آج ایک مہینے سے وہ کالج نہیں جا رہی تھی۔ زندگی کا نیا سفر جاری رکھنے کے لئے اسے اسکول میں ملازمت کرنی پڑی تھی ورنہ زندگی، جو خدا کی امانت تھی بجائے رواں دواں گزرنے کے گھٹ گھٹ کے مفلوج ہو جاتی ——— اسے کتنا شوق تھا ایم۔ اے پاس کر کے کالج میں پڑھانے کا۔ لیکن اب وہ وہ کبھی کالج میں

نہیں پڑھ سکے گی، اوہ — اور اپنی محرومی کے احساس پر اس کے آنسو بہہ نکلے۔

"ارے... ارے آسیہ بیٹی — چھوٹے چچا اپنا سوٹ کیس برآمدے میں رکھتے ہوئے ٹھٹک گئے۔

"کچھ نہیں چچا مگر یہ آپ جا کہاں رہے ہیں۔

چھوٹے چچا کے ہاتھ میں میلا چکٹ بستر دیکھ کر جو رسیوں سے بندھا ہوا تھا۔ اس نے تعجب سے انہیں دیکھا — "بھلا میں اکیلے کیسے رہوں گی —" اس کے لہجے میں سارے زمانے کا دکھ تھا۔

"میں کہیں جا تھوڑے ہی رہا ہوں — باہر سامان پڑا تھا اسے زینے سے رکھ تو لوں — چھوٹے چچا بستر کو چوکی پر رکھ کے بیٹھ گئے۔

اب ہمیں چھوڑ کے آپ کہیں نہیں جائیں گے نا — اس نے پرامید نظروں سے چھوٹے چچا کو دیکھا۔ زبیدہ پھوپھی کے رویئے سے اسے بڑی سخت مایوسی ہوئی تھی "خواہ مخواہ اپنی محبت کا ڈورا ڈالتی تھیں مجھ پر —"

"اونہہ میں کیوں جانے لگا اپنی رانی بیٹی کو چھوڑ کے — ارے میں تو کبھی بھی یہاں سے نہ جاتا۔ بس یوں سمجھو آسیہ بیٹی! سر پر شیطان کا سایہ پڑ گیا تھا۔ اگر وہ گلبیا کمبخت میرے پیچھے نہ پڑتی تو بھلا میں بھیا کے قدموں کو چھوڑ کر کہاں جاتا۔ وہ تو — چھوٹے چچا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو ٹپکنے لگے — "قسمت میں آخری دیدار نہیں لکھا تھا ورنہ وہ کمبخت دھوکے باز —" اور آسیہ پر چھوٹے چچا کی پہلو دار شخصیت کا ایک اور پہلو نمایاں ہو گیا۔

تو بھلا یہ کیسے آدمی ہیں کہ دوسرے کی بہو بیٹیوں کو — اور پھر وہ گلبیا کمبخت کتنی پارسا بنتی تھی۔ اوپر سے باپ کی عمر کے چھوٹے چچا — اونہہ کتنی معصوم بنتی تھی اور کرتوت ایسے۔ کیسے کیسے اس کا شوہر ڈھونڈتا پھرتا تھا — اور یہ چچا — گاؤں سے کتنے آدمی ڈھونڈنے آئے تھے اسے — وہ اس پراسرار طریقے سے غائب ہوئی تھی کہ سب ہی حیرت زدہ تھے — لیکن کسی نے چچا کا ذکر بھی نہیں کیا۔ گھر میں کسی نے ان کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ تو اس کے کرتے سے کر بھاگے تھے۔ مگر کسی کے ذہن میں یہ بات آئی ہی نہیں کہ وہ ایک کرتا پہننے والی بھی اپنے ساتھ لئے جا رہے ہیں۔

"کس گنوارن کی نذر کر دیا چچا۔ پورے چار تو سلے تھے میرے کرتے" اس نے چچا کی طرف دیکھا جو سر جھکائے چوکی کے کونے پر بیٹھے تھے۔ اور سارے جہان کی مسکینیت ان کے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔

"کیسے سیدھے بنے بیٹھے ہیں بے چارے جیسے کچھ جانتے ہی نہیں لے کے میرا کرتا —" اسے چچا کے وجود سے پھر سے نفرت ہونے لگی۔

"تم اپنے کرتوں کے لئے تو بہت روئی ہو گی آسیہ — میں لے تو نہ جاتا تمہارا کرتا پر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وہ گلبیا کمبخت —"

"کیوں نہیں چچا وہ کرتے تو سچ مچ گلبیا کے ہاتھوں کی زینت ہی بن سکتے تھے۔ ورنہ میرے ہاتھوں میں تو —" اس کی آواز رندھ گئی۔

"اوہ! ارے آسیہ منی میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا میں کہہ رہا تھا کہ اگر وہ کمبخت میرے پیچھے نہ پڑی ہوتی تو میں کبھی تمہاری چیز کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھتا۔ آخر اسے لے جانے کے لئے پیسوں کی ضرورت بھی تو تھی — میں نے تو اسے گاؤں میں ہی گھر رکھ دیا تھا بھلا اس کا منہ تھا کہ —"

چھوٹے چچا بغیر سوچے سمجھے اپنی صفائی میں نہ کہنے والی باتیں بھی کہتے چلے جا رہے تھے۔

"لیکن چچا، وہ کے ہوتے آپ کو ایسی ویسی حرکت نہیں کرنی چاہئے تھی" — مجھے تو پتہ بھی نہیں تھا کہ آپ کی شادی ہو گئی ہے اور یہاں آپ کی اتنی بڑی لڑکی بھی ہے۔

"شادی کس منحوس نے کی ہے" —

"ہائیں کیا کہہ رہے ہیں آپ، بغیر شادی کے ہی یہ آپ کی بیٹی ہے" منی نے کراہیت سے ناک سکوڑی —

"میں کب کہتا ہوں کہ شادی نہیں ہوتی۔ بس یوں سمجھو کہ دنیا کے کہنے سننے سے شادی بھی ہو گئی بیٹی بھی ہو گئی۔ اور ــــ لیکن میں اُسے کوئی اہمیت نہیں دیتا ــــ شادی تو محض دو دلوں کے ملاپ کا دوسرا نام ہے لیکن میرا دل کبھی لڑکی کی ماں سے ملا ہی نہیں اور ملتا بھی کیسے ــ یہ جو تمہاری فریدہ پھوپی ہے نا، جو ایک ہی نٹ کھٹ ہے۔ اب اس وقت دیکھئے اس کے پیچھے ــــ اس سے کوئی دل بھی لگا سکتا ہے بھلا، وہ تو تمہارے ــــ"

"کیسی باتیں کرتے ہیں۔ فریدہ پھوپھی کا آپ کی شادی سے ۔ یا لڑکی سے کیا تعلق ــــ"

اب وہ بات یہ ہے آسیہ، میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا ہے نا کہ تمہاری ماں فریدہ کے گاؤں کی تھی۔ در اصل یہ فریدہ بڑی دو ہے۔ بلکہ یوں سمجھو اس کے دو روپ ہیں ــــ میری زندگی تباہ کرنے میں اس کا بہت بڑا ہاتھ ہے ــــ"

کیا کہہ رہے ہیں چچا؛ آپ پہلے آدمی ہیں جو پھوپھی کے بارے میں ایسی باتیں کہہ رہے ہیں۔ انھوں نے تو اپنی ساری عمر برباد کر دی ــــ ایک دن کہہ رہی تھیں کہ ان کا شوہر ان سے الگ ہو گیا اور اکلوتی بیٹی کو بھی لے گیا ــــ سچ ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے ــــ"

"اچھا!"

"ہاں اور کیا۔ سچ سچ مجھے ان کے میاں پر غصہ آتا ہے۔ موا مونڈی کاٹا ــ پھوپھی تو اتنی اچھی ہیں بے چاری، آج تک اس کے گھر میں بیٹھی ہیں۔ دکھڑے کئے، سلائیاں کیں، لیکن کبھی اپنے باپ کے یہاں تک نہیں گئیں۔ میں نے ان کے میاں کو برا بھلا کہا تو کہنے لگیں کہ ان کا شوہر فرشتہ تھا وہی اس کے قابل نہیں تھیں۔ ــ"

"سچ وہ ایسا کہتی ہے!" چھوٹے چچا اچھل کے چوکی پر سے آنگن میں آگئے

"اور کیا ــ آپ کو تعجب کیوں ہو رہا ہے؟ جس سے جی چاہے پوچھ لیجئے ــــ"

"اچھا! تعجب ہے فریدہ اور اتنی رواداری! مجھے سچ سچ بڑی حیرت ہو رہی ہے تم سے یہ باتیں سن کر۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ فریدہ ایک نمبر کی فراڈ ہے، سمجھیں منی؟ ــــ اس سے بچ کے رہنا اور اگر یقین نہیں آتا تو گاؤں چلو وہاں ہر شخص میری اس بات کی تائید کرے گا۔ میں نے یونہی تو اسے ــــ"

"کمال کرتے ہیں چچا۔ آپ کو پھوپھی کے بارے میں ایسے الفاظ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی؛ وہ تو اتنی اچھی ہیں کہ میں تو خیر محلے کا بچہ بچہ ان کا نام احترام سے لیتا ہے اور آپ ــ" آسیہ نے برا مانتے ہوئے کہا۔

"دیکھو آسیہ منی! تمہاری فریدہ پھوپھی کو جتنا میں سمجھتا ہوں اتنا کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا ــــ تم ابھی چھوٹی ہو اور لوگوں کو پہچاننے کے لئے ایک عمر چاہئے ــ" چھوٹے چچا نے چڑ کر کہا اور سامان درست کرنے لگے۔

"چھوٹے چچا ہم اس چھٹی میں گاؤں کیوں نہ چلیں؟ ــــ اسکول میں جب موسم خزاں کی چھٹی ہوئی تو اس کا دل اپنا گاؤں دیکھنے کے لئے مچل اٹھا۔ آج تک وہ وہاں نہیں گئی تھی۔ اماں کو گاؤں کے نام سے نفرت تھی اور ابا کبھی اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ اب کے جب چھٹی ہوئی تو وہ خود مختار تھی۔ نہ ابا تھے اور نہ ہی اماں کی جلتی ہوئی آنکھیں انھیں گھورنے کے لئے زندہ تھیں۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے گاؤں جانے کی۔ اس ویرانے میں اب کیا رکھا ہے۔ جب اچھے دنوں میں نہیں تو اب جانے کا فائدہ؟ خواہ مخواہ ــ" چھوٹے چچا نے بات کاٹ دی۔

"نہیں چچا، بس ایک بار چلی جاؤں۔ آخر میں بھی تو دیکھوں کہ ابا کا گاؤں کیسا ہے جہاں رہ کے ابا کی روح جوان ہوا کرتی تھی اور ــــ"

"پھر ٹھیک ہے۔ میں تمہیں پہنچا کے چلا آؤں گا۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں اس اجڑی نگری سے۔ پھر ان دنوں اکیلی رہے گی ــــ چھوٹے چچا اس کے اصرار سے

عاجز ہو گئے رہے۔

"زبی چلے گی ہمارے ساتھ۔ میں بس دو دن وہاں رہوں گا۔ چچا۔ پھر ہم ساتھ ہی واپس آجائیں گے۔"

"بہت اچھا ۔۔۔"

اسے گاؤں آئے ہوئے دوسرا دن تھا۔ حویلی جس کا ذکر وہ بچپن سے سنتی آئی تھی اور جس کا ہیولیٰ اس کے ذہن میں اونچے پرانے محل سے کم نہیں تھا، کچھ بھی نہیں، مٹی کا بہت بڑا مکان تھا جس کی کچی دیواریں دو طرف سے ڈھے گئی تھیں اور دن دہاڑے لونڈے آنگن میں لگے ہوئے امرود، شریفے اور شفتالو کے لئے چلے پڑتے تھے۔ تنگ آ کے زبیدہ پھوپھی نے تاڑ کے بڑے بڑے بلکوں سے بیہودگی ہوئی دیواریں گھروا دی تھیں۔ دوپہر کی خاموشی میں چلتی ہوئی ہوا جب پتے کی دیواروں سے ٹکراتی تو یہ پتے جھنجھنا کے بج اٹھتے اور سناٹے میں اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے بھوتوں کی بارات آ رہی ہے اور یہ پتے تالیاں بجا بجا کے اس کا استقبال کر رہے ہیں۔

دو دن میں اسے کچھ نہیں تو سیوں مرتبہ اپنا شہر اور گھر یاد آیا ۔۔۔ زبیدہ پھوپھی ہر وقت اس کے ساتھ سائے کی طرح لگی رہتی تھیں۔ گاؤں کی دور و نزدیک کی رشتہ دار عورتیں اس سے ملنے آئیں لیکن زبیدہ پھوپھی نے اسے پہلے ہی ڈرا دیا تھا کہ ان سے گھل مل کے باتیں کرنا گویا اپنا اسکینڈل بنانا ہے۔ چنانچہ اس کی ہوں ہاں سے عاجز ہو کے عورتوں کی بھیڑ خود بخود چھٹ گئی اور گاؤں والیوں نے متفقہ طور پر اسے بد دماغ کا خطاب دے دیا۔

ویسے بھی اسے اپنی یہ پھوپھی اور چچیاں ذرا بھی اچھی نہیں لگی تھیں۔ پہلے ہی دن اسے ابا اور چھوٹے چچا کو دیکھ کے انھوں نے اتنی کھسر پھسر کی اور اتنا ہنسیں کہ ان کی بدتمیزی اور گنوار پنے کا سکہ اس کے دل پر جم کے رہ گیا تھا۔ اور وہ اکتائی اکتائی سی دو دن گذرنے کا انتظار کر رہی تھی ۔۔۔ "اللہ یہ ابا کی مسرتوں کا گہوارہ ہے جس کی تعریف کرتے ابا کی زبان نہیں تھکتی تھی۔ پتہ نہیں ان کو کیا مزا آتا تھا اس اجڑی دنیا میں ۔۔۔ اس نے چٹیل میدان کھیتوں کی طرف دیکھا جہاں بارش نہ ہونے کی وجہ سے خاک اڑ رہی تھی۔ اور گاؤں کے کاشتکاروں کی نگاہیں بادل کی تلاش میں آسمان سے ٹنگ کے رہ گئی تھیں۔

"کب چلئے گا چچا؟" اس نے اکتا کے چھوٹے چچا سے پوچھا "میرا تو اس اجڑی دنیا میں ایک لمحے کو بھی جی نہیں لگا۔ اور یہ حویلی ۔۔۔ یہ تو مجھے بھوتوں کا مسکن نظر آتی ہے ۔۔۔" اس نے اونچے شہتیروں والے کھپریلی کمروں کی طرف دیکھا جن میں جا بجا ایسی مسہریاں بچھی ہوئی تھیں۔ اس نے سوچا صفائی وغیرہ کرا دے لیکن ایک ہی کمرہ جھاڑتے جھاڑتے اس نے اتنی خاک پھانکی کہ اس کے گلے میں خراش پڑ گئی۔

خواہ مخواہ کی باتیں کرتی تھیں پھوپھی۔ حویلی کی دیکھ بھال پتہ نہیں کیا کرتی ہیں یہ موٹی موٹی شہتیریاں دیمک کی نذر ہو رہی تھیں اور باہر کے بیٹھکے میں چوکی بچھی ہوئی قالین پر تو جیسے دیمکوں نے ایک جال بن کے رکھ دیا تھا۔

"پھوپھی آپ نے اس قالین کو دھوپ ہی دکھا دی ہوتی ۔۔۔" آسیہ کو بار بار افسوس ہو رہا تھا "اتنی قیمتی قالین اب کہاں سے آئے گی۔ خواہ مخواہ اپنے یہاں چھوڑ رکھی تھی۔ کون یہاں رہنے آ رہا ہے۔"

"یہ تمہاری اماں کی جہیز کی قالین ہے بیٹی اور جس دن وہ بیاہ کے آئی تھیں تب سے یہ آج تک یہ ایسی ہی بچھی ہے ۔۔۔ انھوں نے مجھے قسم دے دی تھی کہ ان کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگاؤں، سو میں ان کی قسم سے مجبور تھی" زبیدہ پھوپھی نے چوروں کی طرح اسے دیکھا۔

"اوہ تو اتنی نفرت کرتی تھیں اماں ان سے ۔۔۔" اس نے ایک نظر زبیدہ پھوپھی کے معصوم چہرے پر ڈالی۔ سفید آنچل میں گھرا ہوا چہرہ فرشتوں کی طرح معصوم تھا ۔۔۔ کیا ایسی صورت سے نفرت بھی کی جا سکتی ہے! اس نے تعجب سے چھوٹے چچا کو دیکھا جو اس دو دن کے اندر نہ جانے کتنی باتیں زبیدہ پھوپھی کے خلاف کہہ چکے تھے اور اب واپس جانے کے لئے سامان ٹھیک کر رہے تھے ۔۔۔ اور وہ جلدی جلدی کچے پکے امرود، اور شریفے بڑی سی ٹوکری میں بھر رہی تھی۔ اس نے ایک نظر دونوں باپ بیٹی پر ڈالی۔ اور خاموشی سے چھوٹے آنگن میں چلی گئی جہاں زبیدہ پھوپھی رہتی تھی اور اس وقت بڑے زور شور

سے پڑوس میں رہنے والی سکینہ بوا سے بحث کر رہی تھیں ——— سکینہ بوا اسے دیکھ کے خاموش ہو گئیں۔ ورنہ وہ نہ جانے کس بات پر پھوپھی کی اوقات پر تھوک رہی تھیں۔ اور پھوپھی کا چہرہ سُرخ ہوا جا رہا تھا ———

"ہم لوگ آج جا رہے ہیں پھوپھی ——— سواری کے لئے کہلا دیجئے گا ———"

"ہوں، اچھا، مگر آج رک جاتیں تو بہتر تھا ——— میں نے تمہارے ———" فریدہ پھوپھی کچھ کہتے کہتے رُک گئیں اور سکینہ بوا کی طرف دیکھنے لگیں — جو منہ ٹیڑھا کئے چولھے میں آگ کریدے جا رہی تھیں۔

آسیہ نے ایک نظر سکینہ بوا کو دیکھا اور خاموشی سے چولھے میں ناچتے ہوئے شعلے کو تکتی رہی۔

"ابا بلا رہے ہیں ——— باجی ——— رفو نے پیچھے سے اس کا آنچل کھینچا ———

"اچھا ——" وہ کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہے چھوٹے چچا؟"

"چلنا نہیں ہے کیا ———" چھوٹے چچا نے چڑ کر کہا اور پھر سامان باندھنے بیٹھنے لگے ———

"چھوٹے چچا، آج ہم لوگ نہیں جا رہے ہیں۔ کل چلیں گے۔ آج فریدہ پھوپھی نے ہمیں روک لیا ہے۔ شاید کوئی نیاز وغیرہ ہے۔ کہنے لگیں مت جاؤ۔" وہ کچھ ایسی محبت سے بولیں کہ میں ناں نہیں کہہ سکی ———" آسیہ نے آہستہ سے کہا اور چھوٹے چچا بھڑ گئے۔

"کمال کرتی ہو۔ کل اسکول کھل جائے گا۔ نوکری کا معاملہ ہے کچھ ہو ہوا گیا تو روٹی کے لالے پڑ جائیں گے۔ پھر فریدہ پھوپھی تمہارے کیا کام آئے گی ———

"اور ———"

"کیا اور؟ میری طبیعت خود یہاں اُلجھتی ہے۔ سیدھی طرح چلی چلو ——— میں دیکھ رہا ہوں اس فریدہ کی محبت تمہیں کسی کام کا نہیں رکھے گی ———"

چھوٹے چچا کو فریدہ پھوپھی سے اللہ واسطے کا بیر تھا

"نہیں کھلے گا سامان میں نے گاڑی کے لئے نتھو کو کہہ دیا ہے ——— بس کوئی دم میں سواری آجائے گی۔ ———" چچا اڑیل ٹٹو کی طرح اپنے فیصلہ پر اڑ گئے۔

خوب تھی وہ سواری بھی ——— وہ سوچتے سوچتے زیرِ لب مسکرا پڑی۔ بیل گاڑی پہ چھوپڑا ڈال دیا اور ایک پلنگ ڈال کے گاؤ تکیے سے لگے بیٹھے ہیں اور بیل کے گلے کی گھنٹی جیسے جرس کارواں تھی کہ بجتی چلی جا رہی تھی اور اس نے اپنے آپ کو کسی شہزادی سے کم کیا محسوس کیا تھا۔ جیسے وہ سواری گاڑی ایک تختِ رواں تھی اور راستے بھر چھوٹے چچا کس محبت سے طرح طرح کے قصے سناتے رہے تھے۔ ورنہ گاؤں سے اسٹیشن تک کا دو میل کا سنسان راستہ طے کرنا قیامت سے کم کب تھا۔ اور آج۔

آج انہی چھوٹے چچا کی بیٹی پر پابجولاں رہی تھی۔ باپ بیٹی دونوں ہی سخت "جھکیل" قسم کے تھے۔ جیسا کہ اس کی ایک کلیگ نرگس کہتی تھی۔ ان دونوں نے مل کے زندگی اجیرن کر دی تھی۔ چھوٹے چچا تو پھر بھی من موجی آدمی تھے۔ غائب ہوتے تو ہفتوں کی خبر لیتے لیکن رفو چچا کا وہ عطیہ تھی جس کے کرم کی بارش سے وہ ہمیشہ مستفیض ہوتی رہتی تھی ——— تیسرے دن ایک نہ ایک آفت بھی رہتی تھی ——— اور ابھی جس فراخ دلی سے اس نے چائے دانی توڑی تھی، اس سے اس کے دل و دماغ دونوں کھٹے ہو کے رہ گئے تھے ——— جی چاہ رہا تھا کہ اپنا سر جلتے ہوئے چولھے میں گھسیڑ دے یا پھر رفو کا اور نہیں تو دونوں ہی کا ——— لیکن وہ کچھ نہیں کر سکی۔ وہ تو دو سخت جملے بھی رفو کو نہیں کہہ سکی۔ ایسا نہ ہو کہ رفو محسوس کرے کہ آسیہ باجی کا بھی اور اس کی حیثیت بن بلائے مہمان کی سی ہے یا اس بے زیب رشتہ دار کی سی جس کا کوئی دوسرا آسرا نہیں۔ کبھی کبھی اسے چھوٹے چچا پر بے پناہ غصہ آنے لگتا۔ اچھے آئے کہیں سے بے چارے رفو کے میرے سر پر ایک عذاب ڈال دیا اور صاحبزادی کا یہ عالم ہے جیسے یہاں رہ کر مجھ پر احسان کر رہی ہیں جب دیکھو منمنا رہی ہیں ——— مرلے بادشاہ کی چکنی چاندی پر چپت لگا رہی ہیں۔ کبھی اس کے کان کو چابی کی طرح گھما رہی ہیں ——— اور نہیں تو اس کے

اسکول جانے پر اعتراض کیا جا رہا ہے۔ آخر کوئی ان سے پوچھے کہ آپ کو کیا تکلیف ہے جو اس غریب لڑکے پر اتنی نوازش ہے ــــ آخر اس نے آپ کا کیا بگاڑا ہے لیکن ــــ آسیہ نے کبھی رفو سے اُلجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کیونکہ اس کے مزاج کی اُفتاد سے وہ بہت خائف رہنے لگی تھی۔ جہاں کچھ سمجھانے کی کوشش کی اور یہ تنتنا کے کھڑی ہو جاتی۔

"اب کے ابا کے ساتھ نانا میاں کے یہاں چلی جاؤں گی واہ ہم بھی کسی کے باندی غلام ہیں کیا۔ جب جی چاہے گا چلے جائیں گے۔ ابا آئیں تو میں صاف کہہ دوں گی۔ آپ نے تو مجھے ان کی تنہائی کا ساتھی بنا کے یہاں چھوڑا تھا۔"

"یا اللہ یہ کس گناہ کی سزا ہے۔" آسیہ نے ٹھنڈی سانس بھر کے رفعت کی طرف دیکھا جو کواڑ دھڑ دھڑاتی ہوئی اپنے کمرے سے نکل رہی تھی ــــ

کیا پاکیزہ صورت ہے۔ لگتا ہی نہیں یہ چھوٹے چچا کا پروڈکشن ہے۔ یہ تو بس میری بہن لگتی ہے ــــ آسیہ نے غور سے رفو کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ بھرا بھرا چہرہ اور بھرے بھرے موٹے موٹے ہونٹ۔ اوپر سے کھڑی اور نیچے سے کچھ چوڑی ناک۔ بہت ہی دیکھا بھالا چہرہ اور بہت ہی مانوس۔ کس کے ایسی ہے یہ۔ آسیہ نے سوچتے سوچتے نظریں اُٹھائیں۔ سامنے چھوٹے چچا اپنا میلا چکٹ بستر کاندھے پر لادے گھر میں داخل ہو رہے تھے۔ بڑا اچھا ہوا یہ آ گئے۔ بس آج کہہ دوں گی انھیں۔ لے جائیں اپنی لاڈلی کو ــــ مجھ سے صاحبزادی کی نازبرداری نہیں ہو سکتی۔ میرے ناتواں وجود میں شہزادی صاحبہ کے ناز نخرے برداشت کرنے کی سکت اب نہیں رہی۔ مارے غصے کے اس کا خون کھول گیا۔

آنگن میں رفو چھوٹے چچا سے لپٹی پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔ اونہہ اسی کا نام ہے مکاری۔ خواہ مخواہ مظلومیت طاری کرنے کی کوشش۔ اس وقت آسیہ کو اپنا وجود سب سے زیادہ قابلِ رحم محسوس ہوا۔ کیا مصیبت سی مصیبت گلے پڑی ہے میرے مالک۔ وہ دل ہی دل میں دہائی دیتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف جانے کو مڑی ــــ

یہ رفو اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے۔ باپ ایسے ہیں کہ میرے تیرے دروازے گھوم گھوم کے وقت کاٹتے پھرتے ہیں۔ دو وقت کی روٹی اپنے قوتِ بازو سے حاصل کرنے کی توفیق نہیں ہوئی ــــ اور بیٹی صاحبہ کے طنطنے کا یہ عالم ــــ معاذ اللہ! انھوں نے رفو کی طرف دیکھا جو اب تک چھوٹے چچا سے لپٹی روئے چلی جا رہی تھی۔

اس نے ایک نظر اپنے ماضی اور حال پر ڈالی۔ بچپن میں کبھی ضد کی ہو تو کی ہو۔ بڑی ہونے کے بعد اس نے کبھی مزاج کی گرمی شاید ہی کبھی دکھائی۔ اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ ابا کی موت ہونے کے بعد اس نے کسی سے اونچی آواز سے بات بھی کی ہو۔ وہ تو ایسی بردبار ہو گئی تھی کہ اس کی جوانی بھی اس بردباری اور سنجیدگی کی نذر ہوئی جا رہی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد ہے کہ اماں جب ابا کے بعد بے قرار ہو کے روتی تھیں تو سینکڑوں نشتر سے اپنے دل میں ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ لیکن وہ عالی ہمتی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے آنسو پی کر اماں سے لپٹ جاتی۔ "دیکھئے اماں! ابا مر گئے ہیں۔ میں تو ابھی ابھی زندہ ہوں۔ کیا ہوا جو ابا نہیں ہیں اور میرا کوئی بھائی نہیں ہے ــــ میں بیک وقت آپ کا سہاگ اور بیٹا دونوں بن جاؤں گی۔ بیٹا بن کے کما کے کھلاؤں گی اور بیٹی بن کے خدمت کروں گی۔ اماں، میری اماں ــــ" وہ اپنے لب و لہجے سے تمام غم جھٹک دیتی۔ لیکن چہرے کو کیا کرتی جس پر یتیمی اور دکھ کی چھاپ اتنی گہری تھی کہ اماں کے آنسو اس کی باتیں سُن کے تھمنے کی بجائے اُبل اُبل کے بہنے لگتے تھے۔ اور وہ تمام تر عزم کے ساتھ مردانہ وار دکھوں کا مقابلہ کرنے پر تلی ہوتی اسی دکھ کے دھارے میں بہہ جاتی۔ اور پھر جب اماں نے ابا کی رفاقت میں اس کا ساتھ چھوڑ دیا تو دنیا اندھیر ہو گئی ــــ اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کے اس نے اپنے راستے کا تعین کیا اور پھر خاموشی سے اس راستے پر چل نکلی جو اس کے گھر سے ہوتا ہوا ضلع ہائی اسکول کی سفید عمارت کو جاتا تھا ــــ زندگی خود بخود ایک ڈھرے پر آ گئی ــــ اور رفتہ رفتہ وہ اپنے شب و روز کی عادی ہوتی چلی گئی ــــ اور اب جبکہ وہ ایک ذمہ دار انسان تھی

اور اپنی استطاعت پھر آرام بھی بیسیر تھا، تب بھی اسے غصہ ایک دم نہیں آتا تھا — اس کا غصہ تو جیسے اس کے جذبات کی آگ کی طرح ہمیشہ کے لئے برف کے تودے تلے دب چکا تھا۔ وہ ہر ایک کی بات سن لیتی تھی مگر کبھی کسی کو اُلٹ کے جواب نہیں دیتی تھی اور نہ ہی کسی پہ خفا ہوتی تھی۔

یہ کس چیز پر پھولتی ہیں بیگم صاحب۔ آخر انھیں کس بات پر اتنا ناز ہے۔ آپ نے سوچتے سوچتے کتاب اٹھالی۔

ٹھیک ہے کل میں انھیں رخصت ہی کردوں گی۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری اس نے کتاب کے اوراق پلٹتے ہوئے سوچا میں نے تو کبھی ناز نخرے نہیں کئے لیکن میرا کون بیٹھا ہے ناز برداری کے لئے۔ جبکہ رفو کے پانچ ہاتھ کے دادا اور نانیہال کا بھرا پُرا کنبہ موجود ہے۔ اور یہاں بس اللہ کا نام ہے۔ اماں تو اکلوتی تھیں۔ قدرت کی بھی کیا ستم ظریفی ہے۔ اب جبکہ رفو کو کسی کی ضرورت نہیں تو اس کے سب موجود ہیں اور یہاں اپنا نام کا کوئی رشتہ دار نہیں — چلو اچھا ہے رفو بی بھی چلی ہی جائیں۔ آخر انھیں کیا ضرورت ہے میرے ساتھ لاوارثیت کی زندگی بسر کرنے کی — ان کا تو سب سے بڑا ستون خدا رکھے چھوٹے چچا کی موجود ہے۔ — وہ بڑے اطمینان سے پلنگ پر لیٹ گئی اور کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے — لاحاصل باتوں میں اُلجھ کے کون اپنے ذہن کو کڑا کرے۔ اس نے دل جمعی سے کتاب کھول لی اور مزے سے پڑھنے لگی۔

کتاب اتنی دلچسپ تھی کہ وہ کھو سی گئی۔ کب اس کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ کس وقت چھوٹے چچا اس کے کمرے میں آکے بیٹھے، اسے پتہ نہیں چلا۔ الفاظ آپس میں گڈمڈ ہونے لگے تھے کہ — ایک دم برقی روشنی چمک اُٹھی اور ساتھ ہی چھوٹے چچا کی جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی: "اسی لئے آنکھوں پر یہ موٹا چشمہ چڑھ گیا ہے۔ ایسی بھی کیا لاپرواہی۔ اندھی ہوجاؤگی تو کون پوچھے گا تمہیں — " زندگی میں پہلی بار چچا کی آواز میں دبدبہ تھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو چچا کا انداز بڑا ہی مسکین ہوتا تھا اور اسے چچا کے نیازمندانہ لہجے سے الجھن ہونے لگتی تھی۔

"آپ کب آئے چچا؟" چچا کی باتوں نے اس پر خوشگوار اثر ڈالا اور ان کے اپنے پن نے اس کی شگفتگی واپس لادی۔

"ارے واہ ری لڑکی میں کب آیا؟ گھر میں آتے تم نے نہیں دیکھا تھا؟ تمہارے سامنے ہی تو آیا ہوں، وہ جب تم اسارے میں کھڑی تھیں — "

"میرا مطلب یہ نہیں، میں نے یہ پوچھا تھا چچا کہ آپ میرے کمرے میں کس وقت آئے "

"یہی کوئی آدھے گھنٹے سے بیٹھا ہوں۔"

"پھر مجھے پکار لیتے مجھے تو پتہ پتہ ہی نہیں چلا — کوئی ضروری کام ہے کیا؟"

"ہاں میں نے سوچا تم سے دو باتیں کر ہی لوں — " چچا کے لہجے میں بڑی بہادری تھی۔

"کیوں کیا ہوا؟"

"ہوا کچھ نہیں۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ میں نے اپنی بیٹی اس لئے چھوڑی تھی تمہارے پاس کہ آدمی بن جائے گی اور تم تنہا بھی نہیں رہو گی مگر تم نے اسے انسان بنانے کی بجائے چولہے کی باندی بنا دیا۔ کیوں؟"

"یہ سراسر الزام ہے چچا! میں نے رفو کو اپنی بہن سے کم نہیں سمجھا۔"

"بس اب رہنے دو یہ باتیں۔ بہن کی طرح سمجھتی تھیں اس لئے آج تک اس کے لئے کالا اچھر بھینس برابر ہے اور تم خود ٹھاٹ سے امتحان پر امتحان پاس کئے جا رہی ہو۔"

"یہ تو اپنا اپنا شوق ہے۔ رفو کو پڑھنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اور میں نے ہمیشہ ایم اے پاس کرنے کا خواب دیکھا۔ پھر — "

"کیوں نہ ہو! کیوں نہ ہو، ماشاء اللہ پڑھے لکھے باپ کی بیٹی ہو کیوں نہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خواب دیکھتیں — "

دیکھئے چچا! آپ تو طعنے دینے بیٹھ گئے ہیں۔ میں نے جو کچھ حاصل کیا ہے اپنی محنت اور اپنے زور بازو سے کیا ہے — ملازمت کی، خود پڑھا اپنے ساتھ آپ کی صاحبزادی کے دوزخ بھرنے کا سامان کیا۔ ان کے فیشن کی چیزیں پوری کیں اور — "

"کس نے کہہ دیا تھا تمہیں اسے اپنے ساتھ لئے لئے پھرنے کو۔ نہ تم اسے باہر لے کر گھومتیں اور نہ اسے یہ لت لگتی۔"

"حد ہوگئی چچا۔ جیسے میں تو باہر نہیں جاتی۔ پھر مجھ پر کیوں نہیں فیشن کا بخار چڑھا۔ یہ تو اپنی اپنی پسند ہے۔"

"خیر میں نے بہن دی تھی۔ باور چین نہیں۔ تم نے اس سے کام کرا کرا کے دیوالہ کر دیا ہے اس کا ــــ سچ ہے کوئی بھی نہیں چاہتا کہ کوئی اس کی برابری میں آئے وہ تو کوئی اور لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں کے لئے دنیا تیاگ دیتے ہیں اور پھر بھی ــــ"

"بس ہوا چھوٹے چچا۔ بند کیجئے اپنی بکواس۔ میں جوگن نہیں ہوں کہ دنیا تیاگ دیتی ــــ"

"نہیں جی، وہ تو میں تھا جس نے تم لوگوں کی بہتری کے لئے اپنا آپ برباد کر لیا ــــ"

"بڑی نوازش آپ کی۔ اب مزید احسان کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ لے جا سکتے ہیں اپنی صاحبزادی کو ــــ" آسیہ نے تلخی سے کہا۔

"کیوں تجھے کیا پڑی ہے۔ جو دوسروں کا پاپ ڈھوتا پھروں ــــ تم ہی بھگتو ــــ" چھوٹے چچا نے حقارت سے کہا۔

"خوب، اب یہ اپنی لڑکی بھی کسی اور کے سر تھوپنے پھرتے ہیں۔" آسیہ کا سارا غصہ ہوا ہو گیا۔ اس نے تعجب سے چھوٹے چچا کی طرف دیکھا جو اپنی بھتیجی جا گتی جوان بیٹی کو دوسرے کا پاپ کہہ رہے تھے۔ اوہ تو پہلے دن جو میں نے سمجھا تھا صحیح تھا۔ چچا اسے کہیں سے اغوا کر لائے ہیں اور اب ــ اب کیا ہوگا۔ وہ آنے والے خطرے کی آہٹ محسوس کر رہی تھی ــــ

آپ بھی تماشہ ہیں چچا۔ جب آپ رقو کو یہاں لائے تھے تو اپنی صورت ملا ملا کے اسے اپنی بیٹی ثابت کر رہے تھے اور جب میں نے آپ کی بیٹی سمجھ کے اسے اپنا لیا تو آپ مجھے نیا دھوکا دے رہے ہیں ــــ"

"دھوکے کی کیا بات ہے ــــ"

"آپ اسے اغوا کر کے نہیں لائے تھے؟"

"پاگل ہوئی ہو۔ میں بردہ فروش ہوں کیا!" چھوٹے چچا غصے سے چیخ اٹھے۔

"پھر؟"

"پھر کیا۔ یہ ہے تو میری بیٹی پر اپنی نہیں ــــ" چھوٹے چچا سنبھل سنبھل کے سوچتے ہوئے بول رہے تھے۔

آپ کی اپنی بیٹی نہیں، کیا ــــ" حیرت سے اس کا منہ کھل گیا۔

"نہیں۔ میں نے تو شادی ہی صرف اس کے لئے کی تھی۔"

"کیا مطلب؟ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں چچا ــــ" اس نے الجھ کے پوچھا۔ چچا کی باتیں اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔

"میں بیٹی مجھے ــــ دنیا کو جہیز میں دولت ملتی ہے اور مجھے یہ لڑکی ملی تھی ــــ" چچا نے مظلومیت سے کہا۔

"اچھا آپ کی شادی بیوہ سے ہوئی تھی ــــ"

"نہیں تو ــــ"

"میں سمجھ گئی آپ کے ساتھ دھوکا کیا گیا تھا ہے نا؟"

"اے کوئی میرے ساتھ کیا دھوکا کرتا۔ میں نے تو جان بوجھ کے مکھی نگلی تھی۔ صرف ایک ایسے شخص کی خاطر جسے میں خدا کے بعد خدا سمجھتا تھا ــــ"

"اس آپ کو ابا نے اس گڑھے میں پھینکا تھا؟" اس کے لئے آج ہر بات نئی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ چھوٹے چچا ابا ہی کو خدا کے بعد خدا کہتے تھے۔

"بات یہ ہے بیٹی کہ کبھی کبھی خدا بھی عیش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور تمہارے ابا تو انسان تھے۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں ــــ" چچا کی باتیں سن سن کے اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

باسط بھیے جیتی کہ ــــ اور ــــ بس یوں سمجھو کہ بیچ انھوں نے ڈالا اور پھل میں نے پایا ”

اوہ ــــ یہ چھوٹے چچا کیا بک رہے ہیں۔ ہوش کے حواس گم ہوئے جا رہے تھے ــــ سراسر میرے فرشتہ صفت ابا پر اتہام۔ کمال ہے۔ اچھا بدلہ دیا انھوں نے ان کی نیکی اور میرے سلوک کا بہت ہوئی رشتہ داری ــــ میں باز آئی ان کی سرپرستی سے۔ واہ کمال ہے جس تھالی میں کھائیے اسی میں چھید کیجئے۔ یہ اچھے آدمی ہیں کہ جس درخت کے سائے میں پروان چڑھے آج اسی کی بیخ کنی کرنے پر تیار ہیں ــــ

اسے چھوٹے چچا کے وجود سے نفرت ہو گئی جو سر جھکائے بڑی سکینیت سے بیٹھے تھے۔ جیسے انھوں نے کچھ کہا ہی نہ ہو۔

”بہت ہوا چچا۔ آج تو آپ اپنی صفائی میں میرے باپ پر اتہام لگا رہے ہیں کل کہیں میرا ہی گناہ ثابت کرنے کی ضرورت نہ پڑ جائے آپ کو۔ وہ غصہ سے دل ہی دل میں کھول رہی تھی۔

”اتہام؟ اتہام کی کیا بات ہوئی اس میں ــــ“ چھوٹے چچا نے تیز نظروں سے اسے گھورا۔

”بس بس۔ اب آپ مع اپنی بوٹی صاحبزادی کے یہاں سے بستر گول کیجئے میں آپ لوگوں کی ہمدردی کے بغیر بھی مزے سے زندہ رہوں گی۔“ وہ ایک دم سے آگ ہو کر چھوٹے چچا پر لپکی۔

”کون حرامزادہ تمہارے ساتھ ہمدردی کرنے آیا ہے ــــ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ جس کا باپ اس کی گردن۔ سنبھالو تم اپنے باپ کی تخلیق کو ــــ جان چھوٹے ہماری ــــ“

چھوٹے چچا کے لہجے میں سارے جہان کی پھٹکار تھی۔

”اتنے بڑے اتہام کے لئے آپ کو جواب دہ ہونا پڑے گا۔ یہ میرا گھر نہیں کہ آپ نے ڈکار لیا اور کوئی فرق نہیں پڑا آپ ــــ آپ ــــ“ وہ کانپ کے اپنے بستر پر بیٹھ گئی ــــ

”سچ کڑوا ہوتا ہے صاحبزادی لیکن یہ حقیقت ہے کہ رقو میری اتنی ہی رشتہ دار ہے جتنی تم۔ فرق صرف یہ ہے کہ تمہارے ماں باپ دونوں مر گئے ــــ اور اس کی ماں ابھی زندہ ہے ــــ“

آسیہ کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چھوٹے چچا اتنی بڑی بات کہہ گئے تو اب تک وہ ہوش میں کیسے ہے۔ اس نے چھوٹے چچا کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا جن کے چہرے پر سکینیت چھا رہی تھی ــــ اور ایکدم سے چھوٹے چچا اور اماں کی مکالمہ بازی اس کے ذہن میں گھوم گئی۔ اماں کی آنکھوں کی نفرت۔ چھوٹے چچا کی سکینیت ــــ اور ایک ــــ ایک قدآور انسان سامنے آ گیا۔ سانولا رنگ۔ بلند پیشانی اور روشن آنکھوں والا پُرتمکنت چہرہ ــــ زبیدہ پھوپھی ــــ دبلی پتلی دودھ کی طرح سفید ہلکی ہلکی جھریوں سے بھرا ہوا چہرہ۔ پیشانی پر نماز کا گھٹا سکینہ بوا کا گستاخانہ انداز ــــ اور ــــ اور گاؤں میں تو سنا تھا کہ رائی کا پہاڑ بن جاتا ہے لیکن اتنی بڑی بات اس تک کیسے نہیں پہنچی۔ جیسے جیسے ــــ وہ سر پکڑ کے بیٹھ گئی ــــ اس کا کلیجہ بیٹھا جا رہا تھا۔

”آسیہ ــــ“ چھوٹے چچا نے اسے آہستہ سے پکارا

”جی ــــ“ اس نے آہستہ سے نظریں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں سے زندگی کی روشنی معدوم ہوتی جا رہی تھی ــــ

”مجھے معاف کر دو بیٹی ــــ“ چھوٹے چچا نے اپنے پرانے انداز سے گڑگڑانا شروع کیا۔

”آپ نے میرا کیا بگاڑا ہے چچا۔ آپ کس چیز کی معافی مانگ رہے ہیں ــــ“ اس نے کرب سے چھوٹے چچا کو دیکھا۔

”میں ــــ میں بیٹی ــــ میں رقو کو لئے جا رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ رقو اپنی نظروں میں آپ ذلیل ہو جائے ــــ سے میں نے بیٹی سمجھا ہے۔ اور وہ میری بیٹی ہے ــــ“

چھوٹے چچا جلدی جلدی بول رہے تھے ــــ

اس نے بے جس نظروں سے چھوٹے چچا کو دیکھا جو رقو کے لئے سب کچھ تھے اور اس کے کوئی بھی نہیں ــــ زبیدہ پھوپھی کی ماحتا کہاں مر گئی ــــ سنتے آئے تھے کہ ماحتا سات پردوں کے پیچھے بھی سامنے آ جاتی ہے۔ لیکن یہ کیسی ماں تھیں ــــ

اس کا معطل ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا ماضی کی ایک ایک بات ذہن کے پردے پر چلی آ رہی تھی ــــ چھوٹے چچا ــــ جو سارے زمانے کے لپاڑئیے مشہور تھے آج اتنا بڑا سچ اس کے سامنے پیش کر گئے تھے کہ اس کی تپش سے وہ ایک دم راکھ کا ڈھیر ہوئی جا رہی تھی۔

”یا اللہ، یا اللہ ــــ“ وہ گھبرا کے کھڑی ہو گئی اسے اپنا دم اپنے سینے میں گھٹتا محسوس ہوا پسینے کے قطرے پیشانی سے ڈھلک ڈھلک کے چہرے پر بہہ رہے تھے اور اس کی آنکھوں میں پورا ریگستان بسا ہوا تھا۔

نکہت حسن

نوشتۂ دیوار

دیوار کے اوپر اور دیوار کے پیچھے ایک دنیا آباد تھی۔ سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی دیوار پر مرزا صاحب ہر سال سفیدی کراتے تھے لیکن دو ایک دن بعد ہی دیوار کا سفید رنگ محلے والوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگتا تھا اور وہ جلد اپنی پرانی شکل وصورت میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ دھندلے اور گہرے نقش اُبھرتے، کوئلے اور پنسل سے تصویریں بنتیں۔ گالیاں اور شعر ساتھ ساتھ لکھے جاتے۔ کوے کا دھڑ اور انسان کا سر دیکھ کر مستری چراغ دین پھر مغموم ہو جاتا اور پیچ وتاب کھا کر رہ جاتا۔ یہ نام اور یہ تصویر اس کے لئے جان کا عذاب بن کر رہ گئی تھی۔ لوگ اس کے نام چراغ دین کو بھول کر اسے کوؤں کا سردار ہی کہنے لگے تھے۔ ماسٹر یوسف کی بیوہ پھر دھڑلے سے محلے میں نکلتی اور برقعے کے اندر ہی اندر اپنے بے ڈھنگے اور بھدے جسم کو عجیب ہوشربا انداز میں ہلاتی ہوئی اپنے گھر میں چلی جاتی۔ ہاتھی کے جسم پر عورت کا منھ، اور نیچے لکھی ہوئی عبارت ——

'تیری بیوی —— میری بیوی —— سب کی بھاوج —— رنڈی'

دلوں کی قربت اور دوری کا اندازہ اس محلے میں اسی طرح لگایا جاتا تھا۔ دیوار کے قریب سے جو بھی گزرتا تھا وہ لمحے بھر کو ٹھہرتا ضرور تھا۔ صاحبِ ذوق ہوتا تو پڑھتا بھی اور اپنی طرف سے کچھ اصلاح اور کچھ اضافہ بھی کر دیتا۔ کچھ نہیں تو جاتے جاتے حروف کے نقطے ہی درست کر دیتا یا 'ب'، 'ت'، کی کمانوں کو پوری لمبان دے کر گزر جاتا۔ پر جہاں ذوقِ سلیم کا فقدان تھا وہ بھی پڑھتے تو ضرور تھے۔ بعد میں گردن جھٹک کر استغفراللہ، استغفراللہ کہہ کر نکل جاتے تھے۔ اس کے علاوہ اس دیوار پر پورے محلے کی اموات اور پیدائش کا ریکارڈ مع نام اور تاریخ کے درج تھا۔ اگر کوئی ڈاکو بھی مر جاتا تھا تو اس کا نام دیوار پر لکھا جاتا تھا:-

نام :- نیک دل زماں

تاریخ پیدائش :- ۱۹۱۹ء —— تاریخ وفات :- ۱۹۶۰ء

پہلا ڈاکہ :- ۱۹۳۶ء —— دوسرا :- جیل سے نکلنے اور بارہ سال سزا کاٹنے کے بعد۔

سیرت :- امیروں کو لوٹ کر غریبوں کو بانٹنا

سلسلۂ نسب :- سلطانہ ڈاکو سے ملتا تھا۔

صورت :- کبھی بھیگی بلی اور کبھی خوفناک شیر سے مل جاتی تھی۔

خدا مغفرت کرے خوب مرد تھا ؎

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں　　یہ حقیقت میں ہم سے جدا ہوتے نہیں

بچہ ماں کے پیٹ سے بعد میں نکلتا تھا۔ دیوار پہ اس کا نام اور سن پیدائش پہلے رقم ہو جاتا تھا۔ پیدائش کے بعد یا تو ماں باپ کو نام تبدیل کرنا پڑتا تھا یا پھر جنس تبدیل کروانے کی فکر سوار ہو جاتی تھی۔ ہاں جو سہل پسند ماں باپ تھے وہ ان جھمیلوں میں سرے سے پڑتے ہی نہیں تھے اس طرح اس محلّے میں بہت سی محمود، نثار اور شوکت نام کی لڑکیاں اور انجم، سعیدہ اور ناز نام کے لڑکے دیوار کے سائے سائے پل رہے تھے جو اپنے ساتھی لڑکے لڑکیوں کے چڑانے پر آنکھوں میں آنسو بھر بھر کر اور اپنی قمیضوں کے دامن اٹھا اٹھا کر یقین دلانے میں لگے رہتے تھے۔ لیکن دیوار کا لکھا قسمت کی لکیر تھا اس طرح اس دیوار نے بہتیرے مردوں کو عورت اور عورتوں کو مرد بنا کر رکھ دیا تھا۔

مرزا صاحب کا اکیلا دم تھا۔ سوچتے تھے محلے والوں سے بگاڑ کر کے کیا کرنا ہے۔ باہر ہی کی تو دیوار تھی۔ اندر تو مرزا صاحب نے گھر میں کسی عبادت گاہ کی سی فضا پیدا کر رکھی تھی۔ دیواروں پر جگہ جگہ اللہ، محمدؐ لکھے ہوئے کلینڈر لٹکے ہوئے تھے۔ طاقوں اور کارنسوں پر دانت بلیاں والے نقش فریم کئے ہوئے دھرے تھے۔ بیٹھک میں جہاں وہ صبح و شام بیٹھتے تھے وہاں کارنس پر رحل میں سرخ کار چوبی کا جزدان چڑھا ہوا قرآن شریف رکھا ہوا تھا دیوار پر سامنے کی طرف مخمل کی ہری جا نماز کو کیلوں سے جوڑ کر لٹکایا تھا کھونٹیوں اور سوراخوں میں جگہ جگہ اڑسی ہوئی تھیں۔ ایک کھونٹی پر کھجور کی گٹھلی کی ہزار دانوں والی تسبیح لٹکی ہوئی تھی اور اس کے برابر ہی مرزا صاحب کی مرّی کی کڑھائی کی دوپلی ٹوپی، جس کا چھاپہ اور کڑھائی اب صرف یادگار زمانہ تھی اور صرف بیٹھک کی آرائش کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ نماز کے لئے مرزا صاحب رامپوری ٹوپی استعمال کرتے تھے، جو رامپور سے نہ آسکنے پر بھی ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں آسانی سے مل جاتی تھی۔ مرزا صاحب نے اپنی زندگی کی تمام جمع پونجی صرف کر کے یہ مکان بنوایا تھا۔ بڑے بڑے کمروں اور روشن کھڑکیوں والا مکان مرزا صاحب کی کل ملکیت تھا۔ ماشاء اللہ کنبے والے آدمی تھے۔ بیوی نوجوانی میں مر چکی تھی۔ پر بہوئیں، بیٹیاں، بیٹے اور پوتے، نواسے سب تھے۔ یہ دوسری بات تھی کہ ان میں سے کوئی بھی مرزا صاحب کے ساتھ اب نہیں رہتا تھا ایک تو نوکری چاکری کا معاملہ دوسرے محلے کا تنگ اور گھٹا ہوا ماحول، بہوؤں، بیٹیوں کو تو آتے ہی خفقان ہونے لگتا تھا۔ پھر نہ کوئی پاس نہ پڑوس۔ دیوار سے لگے ہوئے گھوسیوں کے دو تین کچے مکان تھے یا پھر قصائیوں، نائیوں اور گدیوں کی آبادی۔ مرزا صاحب نے اپنے اور قصبے کی آبادی کے درمیان پکی پختہ دیوار تو کھڑی کروائی تھی۔ پھر بھی اچھی بری خوشبوئیں، دودھ نکالنے اور گائے بھینس کے ڈکرانے کی آوازیں اور بے تکا بے تکا شور سب کچھ صاف سنائی دیتا تھا۔ پھر کسی کھاتے پیتے زمیندار کے ہاں بھینس کا چارہ کاٹنے والی مشین چلتی اور مرزا صاحب کی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے گھر کی عورت پٹنے لگتی۔

جما کی بیوی رشیدہ روز پٹتی تھی۔ وہ روز گنڈاسا ایک طرف پھینک کر اور اکڑ کر بیٹھ جاتی تھی اور بڑبڑانے لگتی تھی: "مشین لگوا دو جی۔ مجھ سے نہیں کٹتا ہے چارہ۔" وہ بڑی ادا سے اپنے بھاری بھاری ہاتھ دبا دبا کر پھونکیں مارتی۔

اور جما گنڈاسا اٹھا کر اس کے سر پر سوار ہو جاتا: "اب کاٹتی ہے کہ نہیں یا اڑاؤں تیری گردن!" وہ شیر کی طرح چنگھاڑتا اور رشیدہ جب بھی نہیں اٹھتی تو وہ اپنے سیدھے ہاتھ کی کٹی ہوئی انگلیاں دکھا کر کہتا "پتہ ہے یہ اسی مشین میں آکر کٹی ہیں جس کی دہائی تو روز رات کو دیتی ہے!" اور رشیدہ کی بتیسی سی بجنے لگتی۔ وہ کپڑے جھاڑ کر اٹھ بیٹھتی اور گنڈاسا لے کر ذرا سی دیر میں ڈھیر کا ڈھیر چارہ کاٹ کر رکھ دیتی۔ پھر دوسرے دن شام تک وہ پھر بھول جاتی اور پھر گنڈاسا ایک طرف ڈال کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتی۔ جما پھر اس کو دھمکاتا اور اپنا کٹا ہوا ہاتھ دکھاتا۔ رشیدہ پھر گھگیاتی اور پھر چارے کا ڈھیر لگ جاتا۔

رات کو جب وہ دونوں لیٹتے تو جما اس کی ٹھوڑی ہلا کر کہتا: "شکر کر رشیدہ، جو مرزا صاحب کی دیوار کھڑی ہوئی ہے اور سر چھپانے کو انھوں نے زمین دے رکھی ہے کسی اور محلے میں رہتی تو تیرا روز تماشا بنتا۔ بچے بڑے سب تالیاں پیٹتے۔"

رشید، پلنگ پر لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر دیوار کو چھو کر دیکھتی۔ ٹھنڈی یخ دیوار کے لمس سے اس کو جھرجھری سی آتی اور رجا کو موقع ملتا۔ مرزا صاحب کسی مزدور سے صحن میں سے گزرتے تو ان کو دیوار کے پیچھے سے سانپ کی سی پھنکار سنائی دیتی اور وہ ٹارچ لے کر اِدھر اُدھر جھانکتے۔ جاگتے کچے مکان میں مردہ مردہ سی روشنی دیکھ کر وہ پُرمعنی ہنکارا بھرتے اور پھر اندر جا کر دعائے گنج العرش کا ورد کرتے کرتے سو جاتے۔

مرزا صاحب کے مکان کی دیوار محلے میں ہونے والی تمام اچھی بُری باتوں کا کھلا ہوا اشتہار تھی۔ تمام اچھی بُری باتیں یہیں سے شروع ہوتی تھیں اور یہیں ابھر کر پھیلتی تھیں۔ کتنے ہی چھوٹے بڑے عشق اس دیوار کے سایے سایے پروان چڑھے۔ کچھ پھلے پھولے اور کچھ بِن کھلے مرجھا گئے۔ نصرو اور سکینہ کے عشق نے پورے محلے کے مردوں کو فکر کا ایک نیا رخ دیا تھا ورنہ اب سے پہلے وہ اس کو جوانی کا جوش سمجھ کر پھبتیوں میں اڑا دیا کرتے تھے۔ سکینہ دیوار کی اوٹ میں ہو کر کھڑی ہو جاتی تھی اور نصرو کبھی سڑک پر سے کنکریاں پھینکتا رہتا تھا۔ کنکری جب لڑھکتی ہوئی سکینہ کے پیر کے قریب آکر گرتی تو وہ سمجھ جاتی: "تھوڑی سی پی لی ہے اور دل میں رہ رہ کر میٹھا میٹھا سا درد اٹھ رہا ہے۔ پہ ملنے کی خواہش ابھی نہیں ہے۔" پھر دوسرے دن ایک کے بعد ایک دو تین کنکریاں پے در پے آکر پڑتیں اور سکینہ سمجھ لیتی: "دیدار کی خواہش ہے۔ صرف شکل دیکھ کر قرار حاصل کرنا مقصود ہے۔" پھر اس سے اگلے دن کنکریوں کی بوچھار سی ہونے لگتی۔ سکینہ کے پیر کا انگوٹھا بھی زخمی ہو جاتا۔ وہ پھونک مار مار کر زخم خشک کرتی اور بے چین ہو جاتی: "ملنے کی خواہش ———!" وہ آنسو بھری آنکھوں کو دیوار پر ٹکا دیتی۔ دیوار پر بنی ہوئی بہت سی تصویریں اور نقش بولنے سے لگتے اور اس کو کچھ ڈھارس سی بندھتی۔ وہ زمین سے کچی مٹی کا ایک ڈھیلا اٹھا کر پھینکتی جو راستے میں ہی بکھر جاتا اور نصر اللہ سمجھ جاتا: "معاملہ ٹھیک ہے، سکینہ راضی ہو چکی ہے۔" پھر رات کے اندھیرے میں دیوار کے پیچھے دو سایے سے کانپتے۔ سرگوشیوں اور سسکیوں کی آواز ابھر کر مرزا صاحب کے صحن میں پھیلنے لگتی۔ وہ چارپائی پر لیٹے لیٹے کھنکارتے اور نصرو اور سکینہ دیوار چھو کر اقرارِ محبت کرتے ہوئے جدا ہو جاتے۔

مرزا صاحب کی دیوار کے سائے سائے نصر اللہ اور سکینہ کا عشق پروان چڑھ رہا تھا۔ پکی پختہ دیوار ایسی بڑی آڑ تھی کہ سکینہ کا وجود اس میں پورا کا پورا چھپ جاتا تھا اور وہ بے جھجک اشارے کنائے کرتی رہتی تھی۔ پھر ایک دن دیوار سے لگے ہوئے سکینہ کے گھر میں زور سے ڈھولک بجی اور سکینہ ہیرا چھپانے کے لئے بلبلائی بلبلائی پھرنے لگی۔ وہاں اُپلوں کے ڈھیر میں نہ ہیرا تھا اور نہ پتھر۔ وہاں تو بس ایک دھیمی دھیمی آنچ تھی جس کی تپش کو سینے سے لگائے لگائے سکینہ ڈولی میں سوار ہو گئی ——— دولہا گھوڑی پر سوار ہونے کے لئے آگے بڑھا تو اس کی نظر دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے شخص پر پڑی۔ اُجڑے بال، گریبان چاک، آنکھوں میں اُداسیاں اور خالی ہاتھ۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور چھپائی ہوئی اکنی نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ صبح کو دیوار پر ایک اور نقش ابھرا:

"نوجوان عاشق کی حسرت ناک موت"

نام:۔ نصر اللہ خاں

پیدائش:۔ ———

وفات:۔ ———

سلسلۂ نسب:۔ مجنوں، فرہاد اور پنجاب کے عاشقوں سے ملتا تھا۔

سیرت:۔ خون کے گھونٹ پی کر خاموش رہنا۔ اور خاموشی سے مرجانا۔

ع حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مرجھا گئے

ہمیشہ کی طرح سب نے مزے لے لے کر نئی لکھی ہوئی عبارت کو پڑھا۔ بیکار گھر میں بیٹھنے اور چرچر کرنے والے بڈھوں نے بھی، کام کاج پر جانے

والے مردوں نے بھی اور اوباش قسم کے چھوکروں نے بھی۔ پر کسی کے خون نے جوش نہیں مارا۔ وہ سب اس کو ہنسی دل لگی سمجھ کر پڑھتے، دو چار باتوں کا اضافہ اپنی طرف سے کرتے، اور پھر قہقہے لگاتے ہوئے یا توبہ توبہ کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے۔ مرزا صاحب صبح سے اپنے دروازے پر کھڑے ہوئے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ان کو نصراللہ کی جواں مرگی کا افسوس بھی تھا اور سکینہ کی معصوم محبت کے پامال ہونے کا غم بھی۔ انھوں نے بارہا سکینہ کو دیکھا تھا۔ وہ گٹھے ہوئے جسم کی ایک دراز قد لڑکی تھی۔ ذری ذری آنکھیں، کپکپاتی ہوئی بھچی سی ناک، اور تھرتھراتے ہوئے گداز ہونٹ۔ اس کے جسم کا رواں رواں کانپتا تھا، عجیب بوڑھی مٹی سے اللہ میاں نے اس گٹھے ہوئے جسم کی لڑکی کو بنایا تھا۔ وہ روز صبح سویرے کچے دودھ کا جھاگ بھرا کٹورا مرزا صاحب کے لئے لے کر آتی تھی اور ایسے اوندھے سیدھے قدم اٹھا کر چلتی تھی کہ دودھ اس کے اپنے گھر کے دروازے سے جو چھلکتا تو مرزا صاحب کے کمرے کی میز پر رکھنے کے بعد بھی تھوڑی دیر تک کٹورا ہلتا ہی رہتا تھا۔ میز پر جو بوندیں گرتیں ان کو سکینہ اپنے سر کی اوڑھنی اتار کر جلدی جلدی صاف کرنے لگتی۔ اتنی دیر میں مرزا صاحب سلام پھیر کر اس کی طرف مڑتے تو وہ لڑھکتی ہوئی واپس جاتی ہوئی دکھائی دیتی۔ دروازے پر اس کے ٹھوکر لگتی تو مرزا صاحب چیختے "ہوش میں سکینہ ہوش میں" پر سکینہ روز بروز اور بے ہوش ہوتی گئی۔ پھر ایک دن جب وہ دودھ کا کٹورا میز پر رکھنے لگی تو کٹورے کے ساتھ ساتھ خود بھی اوندھی گر پڑی۔ مرزا صاحب نے اس کا بازو پکڑ کر اس کو سیدھا کھڑا کیا تو وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر مرزا صاحب کو غصہ بھی آیا اور رحم بھی۔ انھوں نے اس کو نرمی سے سمجھا کر کہا "یہاں کون تجھے کھا رہا ہے؟ ہوش میں رہ" پر وہ اپنے گول مٹول جسم کو لٹو کی سی چکر پھیریاں دیتی ہوئی دروازے سے باہر نکال لے گئی

گھر جا کر اس نے اپنی ماں سے صاف صاف کہہ دیا۔ "تم خود دودھ دے آیا کرو یا ابا آپ ہی دے آئے گا۔"

"پر تو کیوں نہیں جائے گی؟" اس کی ماں نے کریدا۔

"بس نہیں،" وہ بھیگی بلی کی طرح پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"بات تو بتا،" ماں کو کرید سی لگ گئی۔

تب سکینہ نے اپنے پھولے پھولے گالوں کو پچکا کر زور سے آواز نکالی "ہوش میں، ہوش میں"

اور پھر دونوں ماں بیٹی ہنستے ہنستے پلنگ پر گر پڑیں۔ دوسرے دن سے نورا خود کھیت پر جاتے ہوئے مرزا صاحب کو دودھ کا کٹورا دیتا جاتا تھا۔ پھر بھی مرزا صاحب کسی نہ کسی بہانے سے سکینہ کو بلواتے ہی رہتے تھے۔ کبھی چلم بھرواتے اور کبھی تازہ مکھن منگواتے۔ اور سکینہ ویسے ہی ہمیشہ کی طرح لڑھکنیاں کھاتی ہوئی آتی اور سٹر پٹر کام کر کے تیر کی طرح نکل جاتی —— اور اب کچھ دن سے تو نہ اسے ہوش تھا اور نہ فرصت۔ پہلے بے دھیانی میں نصراللہ سے دل لگا بیٹھی اور کبھی ڈلی پھینک کر اقرار بھی کر لیا، پھر معلوم ہوا کہ وہ دوسرے گھر میں مانگی ہوئی ہے تو پلنگ پر اٹواٹی کھٹواٹی لے کر لیٹ گئی، بالکل روٹھی رانی کی طرح جو نہ منہ سے بولے اور نہ سر سے کھیلے۔ ماں نے ٹٹولا تو بس خاموش خاموش گونگوں کی طرح تکنے لگی۔ ماں نے جلتا ہوا اپلا پکڑا دیا کہ مرزا صاحب کی چلم میں ڈال آ۔ وہ کئی مرتبہ آ کر کہہ گئے ہیں، تب بھی ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ وہ تو برات والے دن بھی بس لاش کی طرح اٹھی ہوئی ڈولی میں جا بیٹھی تھی۔

مرزا صاحب نے حقے کے گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے اس کے اٹھتے ہوئے قدموں کو گنا تھا۔ اس نے دو قدم کا فاصلہ بارہ پندرہ قدموں میں طے کیا تھا۔ وہ، جو قلانچیں بھرتی تھی، مرے بیل کی طرح چل رہی تھی۔ اور جب ہی سے مرزا صاحب بے چین تھے۔ مسجد کی دیوار پر لوگوں نے اس کا اور اس کی محبت کا تماشہ بنایا ہوا تھا۔

"بڑے افسوس کا مقام ہے۔ انسانی ہمدردی سرے سے مفقود ہے۔" مرزا صاحب نے دل میں سوچا۔ انھوں نے دیوار کے قریب کھڑے ہوئے مجمع پر نظر ڈالی اور پھر خود بھی چلتے ہوئے مجمع کے قریب آئے اور ایک نوجوان کی کلائی پکڑتے ہوئے بولے "میاں کچھ خوف خدا بھی ہے! بڑے شرم کی بات

ہے! اور یہ تو ہے شیرا! اوروں کو تو چل جانے دے۔ پر تو عقل اور طاقت دونوں رکھتا ہے۔ پھر کتنی ہی مرتبہ محلّے کی لڑکیوں کو غیروں کے چنگل سے چھڑا چکا ہے۔ سکینہ کی مدد کرنے کے بجائے ادھر کھڑا اس کا مذاق اُڑا رہا ہے!"

"پر مرزا جی سکینہ کی شادی ہو گئی ہے، میں اس کو کیسے چھڑا سکتا ہوں!" شیرا بے وقوفوں کی طرح منہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

شادی ہو گئی ہے! ایسی شادی نہیں ہوتی! پتہ بھی ہے ایسی شادی عذاب بن کر پورے قصبے کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے! ماں باپ نے زبردستی بچی کے گلے پر چھری پھیری ہے۔ خدا کے ہاں تم سب کو اس کا جواب دینا ہوگا۔ تمہیں بھی اور ان سب کو بھی جو آج ایک معصوم کی ہنسی اُڑا رہے ہیں۔"

مرزا صاحب یہ کہہ کر اندر جانے لگے تو شیرا نے لپک کر ان کا راستہ روک لیا۔ "اجی مرزا صاحب چلے کہاں! کچھ ترکیب تو بتاؤ۔"

میں کیا ترکیب بتاؤں۔ تمہارا معاملہ ہے۔ خود سوچو۔ نہ سمجھ میں آئے تو پنچایت بٹھاؤ۔ پر اتنا میں ضرور کہتا ہوں کہ سکینہ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اس معصوم پر ظلم ہوا ہے اور مظلوم کی آہ عذاب بن کر لگتی ہے۔ تمہاری گائیوں کا دودھ سوکھ جائے گا! تمہاری فصلیں جل جائیں گی! تمہارے مویشی مر جائیں گے! اور تم سب ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرو گے!" مرزا صاحب نے قرب قیامت کی نشانیاں بتا کر اس ہنستے کھل کھلاتے مجمع میں سنسنی پھیلا دی۔

"پر مرزا صاحب ایک جان تو گئی۔ کمزور جوان اپنی جان سے گیا ہے! اور سکینہ کیا بھینٹ مانگتی ہے؟" ایک دوسرے نوجوان نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا، جو شاید نصراللہ کا رشتے دار یا شاید بھائی تھا۔

"تم کس کو کہہ رہے ہو؟" مرزا صاحب نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"نصراللہ کو۔"

"بھاڑ میں ڈالو نصراللہ کو، وہ بھی کوئی مرد تھا! اٹھا کر پھیا سی لڑکی کو قصائی کے حوالے کیا۔ —— اچھا ہوا مر گیا محلّے سے ایک نامرد کم ہوا۔ تم سب بھی مر جاؤ تو اچھا ہے۔" یہ کہہ کر مرزا صاحب نے کوئی آیت مع ترجمہ پڑھی جس کا مفہوم تھا: "ظالم کی نجات نہیں۔" پھر انھوں نے جاتے جاتے دیوار کی طرف دیکھا۔ شیرا کوئلے کا ٹکڑا ہاتھ میں پکڑے ہوئے نصراللہ کے نام کے سامنے گالیاں لکھ رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور مجمع "اللہ اکبر" کہتا ہوا چھٹ گیا۔

دوسرے دن صبح کو سکینہ کا باپ مرزا صاحب کو دودھ کا کٹورا دینے آیا تو وہ وظیفہ پڑھ رہے تھے۔ انگلیوں سے تسبیح کے دانوں کو گھماتے ہوئے انھوں نے منہ سے "ہوں۔ ہوں" کی اور ہاتھ سے نورا کو ٹھہرنے کا اشارہ کر کے دعا مانگنے کے بعد بولے "نورا، سکینہ کی بغیر مرضی شادی کر کے تو نے اچھا نہیں کیا!"

نورا کھڑے کھڑے ایسا چونکا جیسے کسی زہریلے جانور نے ڈنک مار دیا ہو۔ پھر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ "بغیر مرضی! بغیر مرضی کیسے؟ میری مرضی تھی۔ سکینہ کی ماں کی مرضی تھی۔ پھر لڑکے کے ماں باپ کی مرضی تھی۔ سال بھر تک چوکھٹ پر ناک رگڑوائی تھی۔ بڈھے بڑھیا کو تب کہیں جا کر حامی بھری تھی! بغیر مرضی کیسے ہو گئی؟" نورا نے اپنا چوڑا چکلا سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔

"تیری ہی تو مرضی تھی۔ پر لڑکی ——" یہ کہتے کہتے مرزا صاحب ذرا رکے تو نورا مذاق اُڑانے کے سے انداز میں بولا: "کیسی باتیں کرو ہو مرزا صاحب! بچوں کی بھی مرضی ہووے ہے۔ جہاں ماں باپ نے کر دیا ٹھیک ہے۔"

"یہی تو ٹھیک نہیں۔" مرزا صاحب نے کہا۔

"کیوں، ٹھیک کیوں نہیں؟ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔"

"غلط ہوتا آیا ہے۔" مرزا صاحب نے تسبیح گھماتے ہوئے کہا۔

"پھر ہم کیا کریں، اور دوائی قوانی قانون کی طرح اس پر بھی کوئی قانون لاگو ہو گیا ہوگا!" نورا نے لاپروائی سے کہا۔

"نیا قانون کیسا! یہ خدائی قانون ہے اور ہمیشہ سے ہے!" یہ کہہ کر مرزا صاحب نے کارنس پر رکھی ہوئی کتاب اٹھا کر شادی بیاہ اور نکاح کے شرعی قوانین کی تفصیلات پڑھ کر نورا کو سنائیں جن کو وہ بغیر سمجھے ہوئے سر ہلا ہلا کر سنتا رہا۔

پھر نورا گردن ملا کر بولا "پر اب تو جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔ کہو تو بوڑھی بھینس خیرات کر دوں!" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بوڑھی بھینس سے کیا ہوتا ہے! لڑکی کی خیر خیریت معلوم کر! اگر خوش ہے تو پھر خوش ہے، لیکن اگر اس کی آنکھ میں ایک بھی آنسو اور سینے میں ایک بھی آہ ہے تو پھر سمجھ لے تیرا دین بھی گیا اور دنیا بھی!" یہ کہہ کر مرزا صاحب نے کتاب بند کر کے کارنس پر رکھ دی اور پیٹھ موڑ کر باقی وظیفہ پڑھنے لگے۔ نورا جانے کے لئے مڑا تو انھوں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا، سپاٹ اور سیدھا سادا چہرہ جس کو نہ دین کی پروا تھی اور نہ دنیا کی۔ فکر تھی تو بوڑھی بھینس کی، جو نہ دودھ کی تھی اور نہ پیسے کی، کوڑی کوڑی کھاتی تھی یا ڈکراتی تھی۔ اس نے گھر جا کر کھونٹے سے بھینس کو الگ کیا اور اس کو گھسیٹتا ہوا بوچڑ خانے کی طرف جانے لگا۔ مرزا صاحب نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے دیکھا اور سرد آہ بھر کر رہ گئے۔

"جاہل، گنوار، جانور اور انسان کو ایک ہی طرح ہانکتے ہیں۔ سکینہ اور بوڑھی بھینس میں کیا فرق ہوا؟ قصائی قصائی سب برابر، چاہے ہاتھ میں چھری ہو، یا منہ پر سہرا، ایک ہی بات ہے۔" مرزا صاحب دیر تک کھڑے ہوئے سڑک پر گھسٹتی ہوئی بھینس اور نورا کو دیکھتے رہے۔ پھر یہ کہتے ہوئے بیٹھ گئے "میری گردن پر کوئی عذاب نہیں۔ محلے والوں کو بھی سمجھا دیا اور باپ کو بھی خدائی قانون بتا دیا۔ اب یہ جانیں اور ان کا دین ایمان۔ الٰہی تو ان کو عقل دے۔" یہ کہہ کر مرزا صاحب اخبار اٹھا کر پڑھنے لگے۔

مرزا صاحب پڑھے لکھے آدمی تھے۔ لوگوں کو صحیح بات بتانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ پھر کچھ خوفِ خدا بھی تھا لیکن اپنی بات منوانے کے لئے کسی کے پیچھے ڈنڈا لے کر وہ کبھی نہیں دوڑے۔ ان کو معلوم تھا کہ قصبے کی آبادی ہزاروں سال پہلے کے عرب وحشی قبائل سے کسی طرح بھی بہتر نہیں ہے۔ یہ جس کے پیچھے پڑ جائیں اس کی عزت تو رہی ایک طرف، جان بچانا بھی دوبھر ہو جاتا تھا۔ اور پھر دیوار ——— ! وہ تو ایسا رستا ہوا ناسور تھا جو کسی بھی وقت کسی کے بھی جسم میں پھوٹ سکتا تھا۔ اس میں کسی بڑے چھوٹے، امیر غریب کی تمیز نہیں تھی بس کسی کی کوئی نازیبا حرکت کوئی دیکھ لے یا کوئی اچھی بُری بات ہاتھ لگ جائے، پھر دیکھیے دوسرے دن دیوار پر اس کی تفصیل، شجرۂ نسب اور تصویروں کے ساتھ قصبے میں ایک سے ایک بڑا فنکار اور صاحبِ ذوق موجود تھا۔ شیرا اپنی موزوں بے تکان اور چوشیلی گالیوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ چھوٹے میاں جو قطعی چھوٹا نہیں تھا۔ اس کو سارے عشقیہ اور دل میں گدگدی اور حرارت پیدا کرنے والے شعر یاد تھے جن کو وہ املا کی تھوڑی سی غلطیوں کے ساتھ دیوار پر موقع و محل کے لحاظ سے فٹ کر دیا کرتا تھا۔ بعد میں جب بھی اسکول ماسٹر، نوشیرواں کو فرصت ہوتی اور وہ اُدھر سے گذرتا تھا تو املا کی غلطیاں درست کرتا ہوا نکل جاتا تھا۔ تصویر کشی کا فن چھدا کو اپنے باپ سے ورثے میں ملا تھا۔ اس کا باپ مجذوب سا بزرگ آدمی تھا جو منہ میں پانی بھر کر زمین پر پچکاریاں مار مار کر نقش بنایا کرتا تھا۔ چھدا منہ سے تو نہیں ہاں ہاتھ سے بالکل جیتی جاگتی تصویریں بنا دیا کرتا تھا۔ مستری چراغ دین کا کارٹون اور ماسٹر یوسف کی بیوہ کی تصویر اس کی مصوری کے نمونے تھے، جو دیوار کے انمٹ نقوش تھے۔ پھر ایک مرتبہ جس کا نام یا جس کی تصویر دیوار پر آ جائے وہ مٹائے نہیں مٹتی تھی۔ ابھی تھوڑے دن کی بات ہے۔ رجب علی بزرگ سا آدمی تھا۔ شرع و ورع کا پابند، پرچون کی دوکان تھی نیچی نظریں کئے دوکانداری کرتا تھا۔ جو تمام مرد سب اس کی دوکان سے سودا سلف خریدتے تھے۔ ایک دن کسی نے دیکھ لیا کہ وہ جب ماسٹر یوسف کی بیوہ کو دال کا لفافہ پکڑا رہا تھا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور حساب میں بھی گڑبڑ کر بیٹھا تھا۔ پھر کیا تھا۔ دوسرے دن ایک لمبی چوڑی باتصویر کہانی دیوار پر رقم

تھی ـــــ نقلی پیر ـــــ اب رجب علی بابا کھا رہا ہے. مسجد میں جا کر قرآن شریف اٹھانے کو تیار ہے. اپنی کھچڑی بوڑھی کا واسطہ دلا رہا ہے کہ اس کے کان میں اگر بھنک پڑ گئی تو بوڑھے رجب علی کا مردہ ہی اٹھوا دے گی. وہ جا کر ایک ایک کے آگے گڑگڑایا: "میرا جوان بیٹا ہے وہ سُنے گا تو اس کا خون جوش کھائے گا. کوئی ایسی ویسی حرکت کر بیٹھا تو میں بڈھا ٹھڈا آدمی کہاں پولیس چوکی کرتا پھروں گا. پھر تمہیں تو سب کو معلوم ہے کہ میرا حساب کمزور ہے. پیسے جوڑنے میں اکثر گڑبڑ کر بیٹھتا ہوں. بیسیوں مرتبہ تم میں سے ہی کئی ایک آ کر میرے پیسے واپس کر کے گئے ہو. ماسٹر کی بہو کے پاس دو آنے زیادتی چلے گئے تو ایسا کونسا غضب ہو گیا کہ تم نے نہ میری عمر کا خیال کیا اور نہ رتبے کا. میری شرافت اور ایمان داری سب پر پانی پھیر دیا"

پر اب کیا ہو سکتا تھا. دیوار پر لکھا جا چکا تھا جو مقدر کے لکھے کی طرح اب قبر تک ساتھ جائے گا. مرنے کے بعد دلوں سے بھلے ہی مٹ جائے. دیوار کا تو ہر نقش انمٹ تھا. اکثر لوگوں کا دل چاہتا تھا کہ کلھاڑی پھاوڑے اٹھائیں اور اس دیوار کو ڈھا دیں. دیوار تھی یا خدائی فوجدار ـــــ نہ آزادی کا جینا تھا اور نہ چین کا مرنا. پھر دیوار کی اوٹ میں ہوتے ہوتے کچے پکے عشق اور گھوسیوں کے مکان آڑے آتے. جمّا اور نورا دونوں محلے کے شیر تھے. جو پکی پختہ دیوار کے سائے سائے پروان چڑھ کر اور بھی مضبوط ہو گئے تھے. کیونکہ ان کو مرزا صاحب جیسے بزرگ کی پشت پناہی حاصل تھی. جمّا کو دیوار سے دوہرا فائدہ تھا. اول تو وہ بے دھڑک رشیدہ کو چار چوٹ کی مار لگا سکتا تھا. رشیدہ کے لئے جمّا کی مار اتنی ہی ضروری تھی جتنا جمّا کے لئے رشیدہ کا بھاری بھرکم جسم. اس کو مار پیٹ کر وہ بے کھٹکے اونچی اونچی سانسیں لے سکتا تھا. اس کی سانس میں اتنا جوش تھا کہ اگر ہوتی کوئی کچی مٹی کی دیوار تو دو دن میں ہی شاید ڈھیر ہو جاتی. پھر بھی سانس لیتے وقت اس کو اپنے گھر کی بقیہ تین دیواروں اور سب سے زیادہ کھپریل کی چھت سے خطرہ ہی رہتا تھا جو جمّا کی پھنکاروں سے کسی وقت بھی اڑ سکتی تھی. اس لئے وہ جلد اپنے کو قابو میں کر لیتا تھا. اور سنبھل سنبھل کر سوچا تا تھا. لیکن اس کی پھنکاروں سے مرزا صاحب کی نیند ایسی ٹوٹتی کہ صبح تک پلک ہی جھپکنے میں نہیں آتی تھی. اُدھر دوسری طرف نورا نے مویشیوں کا پورا ریوڑ اکٹھا کر لیا تھا جن کے گوبر اور چارے کی بدبو سونگھتے سونگھتے مرزا صاحب کو مستقل نزلہ رہنے لگا تھا. وہ اکثر سوچتے تھے کہ مکان کے پیچھے شاگرد پیشہ خالی پڑا ہے. جمّا اور نورا آرام سے اس میں رہ سکتے ہیں. مکان کے سامنے کی غلاظت بھی دور ہو جائے گی اور ان کو بھی سکون مل جائے گا. بیٹھے بٹھلائے ان کو اچھے مرض لگ گئے. انھیں نہ تو نزلے کی شکایت تھی اور نہ کم خوابی کی. ان کی صحت اور ان کا کسرتی جسم تو ان کے ہم عمروں کے لئے مثال تھا. پچاس سے اوپر کے پیٹے میں تھے لیکن نہ بال سفید ہوئے تھے. نہ دانت جھڑے تھے اور نہ بینائی میں فرق آیا تھا. وہ تو ایسے ٹھسکے ٹھکانے اور جچے جچائے تھے جیسے ابھی لوہار کی بھٹی سے نکل کر آئے ہوں. اب جو ان کی نیندیں غائب ہونا اور مستقل چھینکیں آنا شروع ہوئیں تو ان کو فکر ہوئی. انھوں نے نوکر بھیج کر جمّا اور نورا کو بلوایا. جمّا تو یہ سُن کر ایسا خوش ہوا جیسے جنت مل گئی ہو. پر نورا کا چہرہ لٹک گیا. یہ دیکھ کر مرزا صاحب نے پوچھا "کیوں؟ تجھے اُدھر اٹھ آنے پر کیا اعتراض ہے؟"

"اعتراض تو کوئی نہیں، بس ڈھور ڈنگر اور ایک کمرے کی بات ہے"

"ڈھور ڈنگر کون ایسے بڑے ہیں! تیرے چیونٹوں پوٹوں کے لئے ایک کمرہ بہت ہے. مویشیوں کے لئے جیسے اُدھر چھپر ڈالا ہے اِدھر بھی ڈال لیجو!"

"وہ تو سب ٹھیک ہے"

"پھر؟" مرزا صاحب چنگھاڑے.

"ابھی وہ لونڈیا بھی تو چھٹی کرائی ہے. تم جانو، جوان لونڈیا ہے چھٹی کر بیٹھی تو کیا ہوا. دل تو اس کا بھی ہے. ہم میاں بیوی کو دیکھے گی تو ـــــ" نورا اپنی جھونک میں بول رہا تھا کہ جمّا نے اسے آنکھ ماری اور وہ بوکھلا کر خاموش ہو گیا.

"کون لونڈیا؟" مرزا صاحب نے چونکتے ہوئے پوچھا.

"سکینہ بچی اور کون! اس کا مرد خود پیچھا کر گیا ہے کہ رکھو اس تھوبڑے کو. نہ منہ سے بولے اور نہ کوئی اور بات بتائے. بس منحوسوں کی طرح روئے

جا وے ہے۔ اس کا دل کرے تو آجائے نہیں تو ہماری طرف سے آزادی؛ میں تو اس کو دوبارہ جانے کے لئے راضی کر رہا تھا۔ پر تیسرے ہی دن اس کے آدمی کی چٹھی آگئی: "طلاق، طلاق، طلاق۔ بیچ بچوں کے درمیان تین طلاق، اب تم بتاؤ؟" نورا ہمیشہ جب بولتا تھا مفصل بات چیت کرتا تھا۔

مرزا صاحب نے اس کو بیچ میں ٹوک کر کہا: "اچھا مجھے یہ سب کچھ تو نہیں سننا۔ تم دونوں سوچ لو اور سامنے کا حصہ خالی کر دو تو میں صفائی کے لئے آدمیوں کو بلواؤں۔ مکان کے پیچھے تم بھلے ہی کچا مکان کھڑا کر سکتے ہو۔"

جمّا اور نورا شاگرد پیشے میں اٹھ آئے۔ لیکن مرزا صاحب کی کم خوابی اور نزلے کی شکایت بدستور رہی پہلے تو گھڑی دو گھڑی آنکھ بھی لگ جاتی تھی۔ اب تو راتیں جاگ جاگ کر اور توبہ استغفار کرتے ہی گذرنے لگیں۔ ایسے اوندھے سیدھے خیالات آتے کہ کبھی نوجوانی میں نہیں آئے ہوں گے۔ اور وہ لیٹے ہی لیٹے خوف سے کانپنے لگتے۔ یہ حالت ان کی اکیلے پن کی وجہ سے نہیں تھی۔ اکیلے مرزا صاحب کوئی آج سے تھوڑی رہ رہے تھے۔ بیوی کو مرے ہوئے بھی پندرہ سال سے کچھ اوپر ہی ہو چکے تھے اور سب سے چھوٹی بچی کی شادی کو بھی پانچواں برس لگ رہا تھا، انہیں تنہائی سے نہ کبھی وحشت ہوئی تھی اور نہ گھبراہٹ — ان کو اپنی تنہائیاں بڑی عزیز تھیں۔ ان تنہائیوں نے ان کو خدا اور مذہب سے قریب کیا تھا۔ پر پچھلے دن سے جو کتابیں ان کے مطالعے میں تھیں، ان سے اب وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ دنیا کو چھوڑ دے بغیر عقبیٰ کو سنوارنا بچوں والی بھول ہے اور جب سے ہی ان کو یہ تنہائیاں کاٹ کھانے کو دوڑنے لگی تھیں۔ پھر مکان کی دیوار پر اور مکان کے پچھواڑے ایک دنیا آباد تھی۔ ایسی رنگا رنگ دنیا کہ مرزا صاحب لاکھ آنکھیں چرائیں اور دامن بچائیں، وہ کانٹوں والی بیل کی طرح لپٹی ہی جاتی تھی۔ مرزا صاحب صبح سویرے چہل قدمی کے لئے نکلتے تو نہ دیکھنے کے باوجود بھی دیوار پر بنے ہوئے نقش ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے۔ دیوار پر ہر روز کسی تازہ عشق کی داستان، طربیہ اور عشقیہ اشعار ننگی اور عریاں گالیاں اور چھوٹے موٹے لطیفے رقم ہوتے تھے، جو مرزا صاحب جیسے صوفی منش کے دل میں بھی گدگدی پیدا کئے بغیر نہ رہتے تھے۔ ان کے سینے میں ہلکی ٹیس سی اٹھتی اور وہ صبح کی ٹھنڈی ہوا سے بچاؤ کے لئے اپنی شیروانی کے اوپر کے بٹن بھی بند کر لیتے۔ چھڑی کی نوک سے دیوار پر بنے ہوئے کسی نقش کے ہجے درست کرتے اور کبھی مسکراتے ہوئے اور کبھی جھنجھلاتے ہوئے آگے بڑھ جاتے — دیوار پر بنی ہوئی تصویریں، دیوار پہ لکھے ہوئے اشعار اور دیوار کے پیچھے ہوتے ہوئے چھوٹے چھوٹے عشق اور پھر آئے دن خودکشی اور گھر سے بھاگنے کی وارداتیں سن سن کر مرزا صاحب کو اپنے ایمان پر شبہ سا ہونے لگا تھا۔ پھر دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر رکھنے کے وہ قائل بھی نہیں تھے —— وہ مدت سے دنیا اور اس کے جھگڑوں سے الگ تھلگ صوفیوں کی سی زندگی گذار رہے تھے اب کچھ دن سے محسوس کرنے لگے تھے کہ رہبانیت جھوٹا سہارا ہے اور تب ہی تصوف پر سے ان کا ایمان ایکا ایکی ہٹ گیا اور انھوں نے اپنے گردو پیش میں دلچسپی لینے کا ارادہ کر لیا۔ پر گردو پیش میں کیا رکھا تھا گھسیوں، قصائیوں اور کسانوں کی آبادی —— اور اس کے درمیان میں کھڑی ہوئی ایک اینٹ کی دیوار جو سراسر غلاظت کی پوٹ تھی۔ اکثر مرزا صاحب کا دل چاہتا تھا کہ راج مزدوروں کو بلوا کر اس کا قصہ ہی ختم کروا دیں، پھر سوچتے تھے رات بھر کی کوفت منٹ بھر میں دور ہو جاتی ہے۔ جب وہ دیوار کے سامنے کھڑے ہو کر کوئی پھڑکتا ہوا شعر یا چٹکلا پڑھ لیتے۔ سارا دن بڑا ہلکا پھلکا گذرتا۔ جمّا کی بیوی کا تھل تھل کرتا ہوا جسم، نورا کی زرد زرد رنگت والی بیٹی سکینہ، اس کی اپلے تھاپتی ہوئی بھوسلے بالوں والی بیوی اور سب سے بڑھ کر جمّا کی اکلوتی گیابھن بھینس — ان کے سامنے ڈھیروں جیتے جاگتے رنگ سے بکھرے رہتے۔ اور بار بار تصد کرنے کے باوجود ان کی نمازیں قضا ہو جاتیں — فرضوں کی جگہ سنت اور وتر میں دعائے قنوت پڑھنے کے بجائے خالی لاحول پڑھ کر پلنگ پر لیٹ جاتے —— پر رات کا کیا کریں جو قیامت بن کر آتی —— جمّا رشیدہ کو پیٹ کوٹ کر سانپ کی طرح پھنکارنے لگتا اور سکینہ اور اس کی ماں ہاتھ چلا چلا کر چلانا شروع کر دیتیں۔ جب سے یہ لوگ کوارٹر میں اٹھ کر آئے تھے۔ ان کے درمیان ماں بیٹی والا رشتہ ختم ہو کر سوکنوں والا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ ادھر مرزا صاحب اور ان کے ساتھ ساتھ نورا کا رات کا سکون ہی جاتا رہا۔ نورا کی راتیں بیٹی کے پلنگ کو تک تک کر گذر رہی تھیں، جو نہ سوتی اور نہ پلک جھپکاتی، بس خالی خالی آنکھوں سے چھت کو ٹٹولتی رہتی —— صبح کو نورا اور اس کی بیوی سکینہ کے خراٹوں سے جاگتے اور اس کی بیوی پھر چیختا

شروع کر دیتی: "میری سوت، اپنا خصم چھوڑ کر میرے اوپر پھرا لگا کر بیٹھی ہے۔"

اور مرزا صاحب اس کی آواز کو صبح صادق کا پیغام سمجھ کر آسمان کو دیکھتے —— پھر نماز سے فارغ ہو کر باہر نکل جاتے، یہ دیکھنے کے لئے کہ دلوں کا بھید جاننے والی دیوار پر کہیں ان کا نام تو نہیں —— !

دیوار کا بھوت محلے میں سب پر سوار تھا۔ پر آج کل جو سب سے زیادہ پریشان تھا وہ تھا نورا جس کی بیوی اور بیٹی کی آوازیں مرزا صاحب کے پکے مکان میں گونجتی ہوئی کچی سڑک پر صاف سنی جاتی تھیں۔ وہ کئی مرتبہ مرزا صاحب سے کہہ چکا تھا "میں تو کہہ کہہ کر ہار گیا۔ مرزا صاحب، اب ذرا تم ان کو سمجھا کر دیکھو۔ تمہاری وجہ سے ڈھکی پڑا ہوا ہے ورنہ ان کی کمینی حرکتوں کی وجہ سے میرا نام کبھی کا دیوار پر آ گیا ہوتا۔"

مرزا صاحب عورتوں کے منہ لگنے کے قائل نہیں تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ بولتے وقت قوت گویائی کے علاوہ باقی تمام قوتیں کسی روحانی طاقت کے زور سے ان سے چھین لی جاتی ہیں۔ ہاں، نورا ان سے دعا کے لئے کہتا تو وہ ضرور ان کے حق میں دعا کرتے۔

"اے رب العزت اس مخلوق کی زبان اور اپنی رحمت کے درمیان کوئی ایسا رابطہ قائم کر جو موٹر کے بریک کی طرح جا کر زبان کے نیچے لگ جائے۔ تیرے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ یا مامور کر دے کسی فرشتے کو یا ابابیلوں کو جو بولتی عورتوں کے سر پر ڈھیلے برسائیں اور ان کو تنبیہ ہو اور خوف خدا اور انسانی ہمدردی دونوں جذبے ایک ساتھ بیدار ہوں۔"

پر سکینہ اور اس کی ماں کے سلسلہ میں دعا کا کوئی کلمہ بھی ان کی زبان سے نہیں نکلتا تھا۔ بلکہ اکثر رات کو تو عجیب و غریب خیالات ان کو آتے۔ اور ان کا دل چاہتا یہ دونوں عورتیں یوں ہی بولتی رہیں اور وہ یوں ہی لیٹے لیٹے ان آوازوں کو اپنے اندر جذب کرتے رہیں۔ انتہائی کرخت اور بے تکی آوازیں مرزا صاحب کی روح کی گہرائیوں میں اتر کر عجیب و غریب اثر کر رہی تھیں۔ حالانکہ مستقل جاگتے رہنے کی وجہ سے ان کی صحت پر بڑا برا اثر پڑ رہا تھا۔ ان کا گٹھا ہوا کسرتی جسم روز بروز لٹکتا جا رہا تھا، پورے جسم میں ہلکا ہلکا درد سا رہنے لگا تھا، عجیب بے کلی اور بے چینی سی رہتی۔ ادھر وہ نورا کو دیکھتے، ناکام راتوں اور روز کے جھگڑوں نے اس کو لیموں کی طرح نچوڑ کر رکھ دیا تھا اور تب ان کو لگتا کہ نورا کا دکھ ان کے دکھ سے مختلف نہیں۔ وہ دونوں چند روز میں عمر کے کئی سال پھاند کر اس سرحد پر پہنچ گئے تھے جہاں سے پلٹ کر کوئی نہیں آتا اور جہاں اجالا ہے نہ اندھیرا، نہ آوازیں ہیں اور نہ چیخیں، بس آنکھوں میں کھٹکنے والی دیوار کی سفیدی کے سوا کچھ نہیں —— تب ایک دن انھوں نے سفید جھاگ سے بھرے دودھ کے کٹورے کے ساتھ نورا کے پھیکے زرد چہرے کو دیکھا اور بولے "ارے! یہ تجھے کیا ہوا ہے؟"

"بس جی، دونوں ماں بیٹی مجھے کھا کر دم لیں گی۔"

"تو کوئی بھلا مانس دیکھ کر سکینہ کا نکاح کر دے۔" مرزا صاحب نے مشورہ دیا۔

"بھلا مانس!" نورا نے اپنی میلی آنکھوں کو خلا میں گھمایا اور پھر بولا۔ "ابھی اب اسے کون جھیلے گا؟ پہلے ہی ایک مرتبہ ہو گیا تو بہت ہے۔ نصر اللہ کی موت اور دیوار کی کہانی سے آگے ہی اس کی بڑی شہرت ہو چکی ہے۔ میں تو اپنی گھر والی کو سمجھاتا ہوں کہ نیک بخت تو صبر کر۔ یہ تو زندگی بھر کی مصیبت ہے۔ کل کلاں کو کسی کے کان میں بھنک پڑ گئی تو دیوار پر نام آ جائے گا۔ پر وہ بھی کیا کرے؟ جوان جی ہے۔ قابو میں آتے ہی آتے تو آئے گا۔ سکینہ سے کہتا ہوں بیٹا تو چھپر میں اٹھ جا، تو وہ ایک اڑیل ٹٹو ——"

"تو سکینہ سے پوچھ کہ وہ نکاح ثانی کے لئے تیار ہے؟"

"نکاح ثانی!" نورا نے بغیر سمجھے ہوئے لفظوں کو زبان سے ادا کیا۔

"ہاں، ہاں، دوسرا نکاح ـــــ میرا مطلب ہے دوسری شادی۔"

"پوچھ کر کیا کرنا ہے جی، یہ تو ہی بات ہوئی سوت نہ کپاس کولہو سے لٹھم لٹھا، مجھے معلوم ہے اس کو اب کوئی نہیں تھمے گا۔ غریب کی بیٹی ایک مرتبہ اٹھ جائے تو بہت ہے۔"

"تو پوچھ تو سہی لڑکے کا بھی انتظام ہو جائے گا۔"

نورا کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی، اس نے اپنی میلی آنکھوں کو آستین سے صاف کیا اور گھگھیاتے ہوئے بولا: "مرزا صاب جی، اگر تمہاری نظر میں کوئی لڑکا ہو تو پھر بتاؤ، سکینہ راضی ہو یا نہ ہو، پر میں اور اس کی ماں مار باندھ کر نکاح پڑھوا ہی دیں گے۔"

"لاحول ولا ـــــ پھر وہی جہالت۔ ایک مرتبہ زبردستی کا نتیجہ دیکھ چکا ہے، پر ابھی عقل نہیں آئی۔"

مرزا صاحب نے ایک مرتبہ پھر اپنا فرض ادا کرتے ہوئے نورا کو سیدھی راہ سجھانے کی کوشش کی۔ نورا کی موٹی عقل میں بات آنی تو مشکل تھی، پر وہ بھی دوڑ کی ہائے ہائے سے عاجز آ چکا تھا۔ پھر دیوار کے بھوت سے بھی اس کی جان جاتی تھی۔ ایک مرتبہ اگر بھول چوک سے بھی نام آ گیا تو پھر زندگی بھر کے لئے چھٹی ہو جائے گی۔ اس نے سکینہ کو ہموار کرنا شروع کیا۔ سکینہ نصر اللہ کے نام پر جان دینے کی قسم کھا چکی تھی۔ اب کچھ دن سے سوچتی تھی کہ اس ڈائن ماں کے چنگل سے کسی نہ کسی طرح نکل ہی جائے تو اچھا ہے۔ پھر مرزا صاحب ذمہ داری لے رہے تھے۔ اس لئے ہاں ہو گئی۔ نورا نے مرزا صاحب کو آکر بتایا تو انھوں نے کہا: "تو اطمینان رکھو، جمعہ کو عصر مغرب کے درمیان نکاح ہو جائے گا۔"

"لڑکا!" دماغ میں کیڑے کی طرح کلبلاتا ہوا اکلوتا لفظ نورا کی زبان سے لڑھک سا پڑا اور وہ کچھ شرمندہ سا ہو کر مرزا صاحب کو دیکھنے لگا۔

"میں سکینہ کو اپنے نکاح میں لے رہا ہوں۔" مرزا صاحب نے گہرے اطمینان سے کہا۔

"تم! مرزا صاب جی تم!" نورا کی منہ اور آنکھیں پوری کی پوری پھٹ گئیں۔ پھر ذرا سنبھل کر اس نے ہوشیار گاہکوں کی طرح مرزا صاحب کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا۔ اس کے بعد اس کی آنکھوں میں ٹھہراؤ آ گیا اور پھٹا ہوا منہ بند ہو گیا۔ بس گردن آہستہ آہستہ ہل رہی تھی کہ وہ ایک دم سے اچھلا اور دیوار سے ذرا سا ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ مرزا صاحب نے اس کی گھبراہٹ دیکھ کر پوچھا: "کیوں، تجھے کچھ اعتراض ہے؟"

"اعتراض!" نورا بے وقوفوں کی طرح پھر منہ کھول کر کھڑا ہو گیا، پھر ہڑبڑا کر بولا: "دیوار ـــــ!"

"دیوار کیا؟" مرزا صاحب نے ناگوار ناگواری سے پیر پٹختے ہوئے کہا۔

تب پھر نورا بولا: "دیوار پر نام آ جائے گا! اور تم جانو دیوار پر نام آنا ـــــ!" یہ کہتے کہتے نورا ذرا رکا تو مرزا صاحب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر نورا کے قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دیر تک اس کا اطمینان دلاتے رہے۔

دوسرے روز شام کو نورا اپنے مویشیوں کو ہانکتا ہوا اپنے گھر میں داخل ہو رہا تھا تو اس نے دیکھا، مرزا صاحب کے مکان کے سامنے والی دیوار ڈھائی جا چکی تھی اور مرزا صاحب بیچ میدان میں کھڑے ہوئے ملبہ اٹھوا کر میدان ہموار کروا رہے تھے۔

حسین شاہد

اعتراف

دنیائے خدا کی منصور بن جانا بھی آسان رہا اور قیس بننا بھی مشکل جو ٹھہرا تو ایک کام اور وہ ہے سکول ٹیچر بننا۔ اگر کوئی منصور بن جائے تو لوگ اسے سولی پر لٹکا دیں گے اور سولی سے بہتر دکھوں کا علاج اور کونسا ہوگا۔ اگر کسی کے مقدر میں قیس بننا لکھا ہے تو اس کے لئے بڑی سے بڑی آفت طفلانِ بے پروا کی سنگ زنی ہی ہو سکتی ہے لیکن قیس کو ایک تو پتھر کھانے کی چاٹ خود بھی ہوتی ہے دوسرے اگر وہ پتھر کھانے سے بچ جانا چاہتا ہو تو راہ فرار ہمیشہ کھلی پائے گا۔ لیکن سکول ٹیچر تو اپنے پاؤں چل کر لڑکوں کے پاس جاتے اور پتھر کھانے پر مجبور ہوتا ہے۔

آج میں وہ سب باتیں صفحۂ قرطاس پر لانے کے لئے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں جنھیں میں آج تک راز بنا کر سینے میں چھپائے چلا آ رہا تھا لیکن انھیں ہضم کرنا میرے لئے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

مجھے محکمۂ مال میں آئے ہوئے دس بارہ برس ہونے کو ہیں۔ آج جب میں بطور تحصیلدار دورے پر نکلتا ہوں تو پورے کا پورا علاقہ میری راہ میں آنکھیں بچھاتا ہے۔ میرے سامنے ایک روشن مستقبل ہے۔ جوں جوں میں اپنی ذات کے سنگ ہائے گراں اپنی راہ سے ہٹاتا جاؤں گا ترقی کے دروازے کھلتے جائیں گے اور جس دن میں نے ہمت کر کے اپنی ذات فنا کر دی معلوم نہیں میں کونسے منصب پر سرفراز ہو جاؤں لیکن ترقی کا کوئی بھی زینہ چڑھتے ہوئے مجھے ابتدائی زینہ شدت سے یاد آتا ہے جب میں سکول ماسٹر تھا۔ اور اس زینہ پر کھڑا ہوتے ہی مجھے اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آ جاتا ہے۔

میں اپنی زندگی کے دونوں زمانے کبھی نہ بھلا سکا، شاید آئندہ بھی کبھی نہ بھلا سکوں۔ ایک زمانہ پڑھنے کا اور دوسرا پڑھانے کا۔ پہلے دَور میں مَیں نے سنگ زنی کی لذت جی بھر کر حاصل کی اور دوسرے دَور میں لذتِ سنگ سے شناسائی! یا یوں سمجھ لیں کہ طالب علم ہوتے ہوئے ایک پودا لگایا اور ماسٹر بن کر اسے کاٹا۔

یہ میری آپ بیتی کے دو روپ ہیں جو آج بھی مجھے یاد آتے ہیں تو میرے دل سے دھواں سا اٹھتا ہے!!

میں سکول کے تصور سے جتنا بھاگتا ہوں سکول اتنا ہی تلخ حقیقت بن کر بار بار میرے سامنے آتا ہے۔ میں دورے پر ہوتا ہوں تو دیہات والے عام طور پر میری رہائش کا انتظام سکول کی عمارت میں ہی کرتے ہیں مجھے یوں لگتا ہے جیسے انھیں کسی زمانے میں میرا شغل تدریس معلوم ہو گیا ہے اور وہ ازراہِ شرارت مجھے اسکول میں ٹھہراتے ہیں۔ ابھی پچھلے ہفتہ کا ذکر ہے میں ایک قصبے میں دورے پر تھا اور حسبِ معمول سکول کی عمارت میں برسرِ عدالت تھا کہ میرے کانوں میں ایک آواز پڑی۔ کوئی آدمی چوکیدار سے پوچھ رہا تھا "صاحب بہادر کا نام کیا ہے؟"

"چوہدری برکت علی چیمہ" یہ چوکیدار کا جواب تھا جو ہونا ہی چاہئے تھا لیکن سکول کی عمارت میں بیٹھ کر میرا اپنا دکھ میرے اندر سے نکل کر میرے سامنے آ بیٹھتا ہے اس لئے میں نے یہی سمجھا کہ اس نے مجھے میری سکول میں پڑی ہوئی چڑ سے یاد کیا ہے۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر بعد میں نے

کوئی اور بہانہ بنا کر چوکیدار کو پیٹ ڈالا۔

میں آپ کو اپنی چڑ کے بارے میں ابھی سب کچھ بتاتا ہوں۔ میں نے وعدہ جو کیا ہے کہ آج کوئی بات چھپا کر نہیں رکھوں گا! ....

آج مجھے خیال آ رہا تھا کہ میں تو اتنے بلند منصب پر فائز ہوں کہ جسے بھی چاہے بہانہ بنا کر پیٹ ڈالوں لیکن مولوی نعمت اللہ اگر زندہ ہے تو بے چارا ابھی تک وہی دینیات کا بے بس مدرس ہوگا جب ایسی وارداتیں اس پر گزرتی ہوں گی تو وہ کیا کرتا ہوگا۔ میں تو اپنے عہدے کی برکت سے اپنی دلی بیماریوں کا کچھ نہ کچھ علاج کر ہی لیتا ہوں لیکن مولوی کے دکھ تو اس کے اندر گھٹ گھٹ کر اب تک آتش فشاں کا لاوا بن چکے ہوں گے۔ میرے خیال میں اگر اسے آج سیشن جج لگا دیا جائے تو اس کی عدالت سے کوئی نوجوان موت سے کم سزا نہ پائے چاہے ایک زمانہ نوجوان کی بے گناہی کا ثبوت دیتا رہے! ——— اب مولوی نعمت اللہ کا ذکر آ ہی گیا ہے تو پہلے اس کی کہانی سن لیجیے میری چڑ کی داستان مولوی کے حالات سے اس طرح منسلک ہے کہ اگر دونوں کو الگ الگ بیان کیا جائے تو دونوں باتیں بے لذت ہو کر رہ جائیں۔

میرے والد صاحب جب مجھے پہلے دن سکول چھوڑنے گئے تو داخلے کے لوازمات پورے ہو جانے کے بعد انھوں نے میری موجودگی میں مدرس سے کہا تھا "آج کے بعد اس آپ کا اور ہڈیاں ہماری۔ آپ ہدایت دینے کے لئے اس کی کھال بھی ادھیڑ دیں تو ہم آپ سے باز پرس نہیں کریں گے۔"

میں گاؤں کے سکول میں پرائمری تک زیرِ تعلیم رہا اور ماسٹر صاحب میرے والد صاحب کی اجازت کے مطابق میری کھال ادھیڑتے رہے۔ میرے لئے کائنات میں پہلی قابلِ ذکر ہستی خدا کی تھی اور دوسری ماسٹر کی۔ اگر کبھی سر غرور ماسٹر صاحب کے سامنے بلند ہونے کی سوچتا بھی تو والد صاحب کا فرمان یاد آ جاتا اور میں اندر ہی اندر دانت پیس کر رہ جاتا۔ لیکن پرائمری پاس کر کے جب میں شہر کے ہائی سکول میں پہنچا تو ماحول کو مختلف پایا۔ ایک تو والد صاحب اب اتنے قریب نہیں تھے۔ دوسرے میں نے دیکھا کہ گاؤں کے مقابلے میں یہاں کے لونڈے اپنے اساتذہ کا واجبی سا احترام ہی کرتے تھے۔ وہ بھی صرف ان کے سامنے۔ پیٹھ پیچھے تو ظالموں نے ہر ایک معلم کی کوئی نہ کوئی چڑ بنا رکھی تھی ......

ایک استاد کی چڑ ماسٹر پاپی تھی تو دوسرے کی چیتا! ایک کو ماسٹر گھسن کہتے ہیں تو دوسرے کو ماسٹر ریچھ!!

یہ صورتِ حال نہ جانے کیوں میرے لئے یک گونہ مسرت کا باعث ہوئی!

میرے لئے انتہائی لذت کا ہنگام وہی ہوتا تھا جب میں کسی ماسٹر کے پاس سے گزرتے ہوئے چپکے سے اسے چڑ کا پتھر مار دیتا تھا۔ ایک تو میں ڈیل ڈول کا مضبوط تھا، دوسرے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اس لئے میرے ساتھ امتیازی سلوک ناگزیر تھا جس کا میں نے جی بھر کے فائدہ اٹھایا۔ اگر کبھی کوئی ماسٹر سزا بھی دیتا تو میں کھلے بندوں اسے اس کی چڑ سے پکارنے لگتا۔ بات بڑھ جاتی تو کبھی کبھی اساتذہ سے معافی بھی مانگ لیتا لیکن پرنالہ وہیں کا وہیں رہتا۔ موقع ملنے پر میں کسی استاد کو اس کی چڑ کا پتھر مارنے سے باز نہ رہتا۔

مولوی نعمت اللہ دینیات کے مدرس تھے۔ اتفاق کی بات کہ کئی سال گزر گئے لیکن ان کی کوئی چڑ نہ بنی۔ میں تو ایسا کرنے کی ہمت اس لئے بھی نہیں کرتا تھا کہ یہ واحد استاد تھے جو میرے والد صاحب کے ذاتی طور پر شناسا تھے اور جانتے تھے کہ میرا علاج اپنے ہاتھوں سزا دینا نہیں، والد صاحب سے شکایت کر دینا کافی ہے لیکن دوسرے لڑکے معلوم نہیں کیوں مروت میں رہے۔ ہم پانچویں درجے سے دسویں میں پہنچ گئے لیکن مولوی صاحب نے ہمارے ہاتھوں چڑ کا کوئی پتھر نہ کھایا لیکن معلوم ہوتا ہے یہ ساری کسر ایک ہی دفعہ پوری ہونا لکھی تھی۔ بالآخر مولانا اپنی ہی ایک حرکت کی بنا پر چڑ کی دلدل میں پھنس گئے

ایک دیہاتی لڑکے کو مولانا سے کچھ زیادہ ہی عقیدت تھی۔ وہ انھیں ہمیشہ متنوع قسم کی سوغاتیں لا کر دیا کرتا۔ مولوی صاحب بھی بالعموم ضرورت کے وقت اسی سے فرمائش کیا کرتے۔ ایک دفعہ انھوں نے محمد دینے کو ——— یہ اس برخوردار کا نام تھا ——— تھوم لانے کے لئے کہا۔ دوسرے روز جماعت میں آئے تو

چھوٹتے ہی اُس سے سوال کیا "بوٹنے! تھوم لایا ہے؟"

"خدا کی قسم بالکل یاد نہیں آسکا" یہ بوٹے کا جواب تھا۔

دوسرے روز پھر یہی مکالمہ دہرایا گیا اور بوٹے کو بہت معذرت کرنا پڑی۔ سوئے اتفاق کہ بوٹا تیسرے روز بھی تھوم لانا بھول گیا۔ اس روز مولانا اس پر بہت برسے۔ یوں ساری جماعت کو حفظ ہوگیا کہ مولوی صاحب نے بوٹے سے تھوم لانے کی فرمائش کر رکھی ہے۔ اس دن مولوی صاحب کے جانے کے بعد لڑکے بوٹے سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے۔

چوتھے دن مجھے نہ جانے کیا سوجھی کہ مولوی صاحب کا پیریڈ شروع ہوا تو میں نے ان کی آمد سے پہلے تختۂ سیاہ پر لکھ دیا:

"بوٹا! تھوم لایا ہے؟"

"خبیث! تھوم لایا ہے؟"

نالائق! تھوم لایا ہے؟"

مولوی صاحب جماعت میں آئے تو یہ تحریر دیکھ کر بہت سٹپٹائے پہلے تو انھوں نے لکھنے والے کو خناس، رجیم، خبیث اور ملعون جیسے خطابات سے نوازا اور پھر دیر تک کوشاں رہے کہ لکھنے والے کا پتہ چل جائے لیکن لڑکے مجھ سے بدکتے تھے اس لئے کسی نے نہ بتایا۔

اُس سے اگلے دن میں نے مولوی صاحب کے خطابات کا قرضہ چکانے کی ایک اور تدبیر سوچی۔ دینیات کا پیریڈ شروع ہوا تو میں نے مولوی صاحب کے آنے سے پیشتر ان کی میز پر تھوم کا گٹھا لا کر رکھ دیا۔ مولوی صاحب گٹھا دیکھ کر آگ بگولہ ہوگئے۔ وہ غصے کے عالم میں پارے کی طرح تڑپ رہے تھے اور شیر کی مانند گرج رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جماعت میں ہٹلر گھس آیا ہے جس کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ مجرم کی نشان دہی ہر صورت ہونی چاہئے لیکن لڑکے جانتے تھے کہ مجرم کا نام لیتے ہی مولوی صاحب اس کی ہڈیاں توڑ دیں گے اور پھر جا با نام لینے والے کی اپنی بھی خیریت نہیں، اس لئے وہ چپ سادھے بیٹھے رہے۔

مولوی صاحب بے بس ہوگئے تو انھوں نے گٹھا رکھنے والے کو بڑی بے شرم گالی داغ دی!

اگر کوئی اور مدرس ہوتا تو میں کبھی کا میدان میں آگیا ہوتا کیونکہ ماسٹروں کے کھال ادھیڑنے کے باوجود میرے دل میں ان کا خوف کبھی نہیں بیٹھا تھا۔ میں نے زندگی میں خوف کھایا ہے تو صرف ایک انسان سے اور وہ ہیں قبلہ والد صاحب اس وقت بھی میرے سامنے مولوی نعمت اللہ نہیں تھے، والد صاحب تھے، اس لئے میں توہین برداشت کر گیا حالانکہ لڑکوں کی آنکھیں مجھ سے سوال کر رہی تھیں کہ آج اتنے بے غیرت کیوں بن گئے استاد؟!

اس کے بعد میں نے مولوی صاحب کے خلاف گوریلا جنگ چھیڑ دی اور آخر کار وہ آگ جو میں نے ہنسی ہنسی میں لگائی تھی پھیل کر سارے سکول پر محیط ہوگئی۔ یہ منظر اب روزمرہ کا معمول بن گیا کہ پانچ سات لونڈوں نے مولوی صاحب کو تنہا پا کر تھوم تھوم کا شور اٹھا رکھا ہے۔ مولوی صاحب جنگلی بلے کی طرح زخم کھا کر لڑکوں پر جھپٹتے اور لڑکے یہ جا وہ جا۔ شریر لڑکے تھوم کی رٹ اُس وقت لگاتے جب وہ تعداد میں زیادہ ہوتے تاکہ کسی ایک کی نشان دہی نہ ہو سکے۔ مولوی صاحب پاگلوں کی طرح ان کے پیچھے بھاگتے، انھیں گالیاں اور بددعائیں دیتے اور انجام کار روہانسے ہو کر سٹاف روم میں سے چلے جاتے۔ ان کے بس میں نہ تھا کہ ورنہ وہ تمام لڑکوں کو ایک جگہ ڈھیر کرتے اور تیل ڈال کر دیا سلائی دکھا دیتے۔

دوسرے مدرسین مولوی صاحب کو سمجھایا کرتے کہ وہ چڑنا چھوڑ دیں تو لڑکے خود ہی بات کو بھول جائیں گے، کبھی کبھار مولوی صاحب ضبط کا مظاہرہ بھی کرتے اور بات کو ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کیا کرتے لیکن بات کو ہنسی میں ٹالنے کا صحیح وقت نکل چکا تھا۔ اب تو پتھر کھانا ان کا مقدر بن چکا تھا۔

مولوی صاحب منصور بن جاتے تو کبھی کے پھانسی پا گئے ہوتے۔ قیس بن جاتے تو جس دن پتھر کھانے سے طبیعت سیر ہو جاتی سکول جانا چھوڑ دیتے لیکن وہ تو پیٹ کے ہتھے چڑھ کر روزانہ سویرے اُٹھ کر نماز پڑھتے، پیٹ کا دوزخ بھرتے اور پھر اُجلے کپڑے پہن کر سکول پہنچ جاتے — پتھر کھانے کے لئے زخموں پر نمک پاشی کرانے کے لئے!! جتنا جتنا مولوی صاحب چڑتے گئے لڑکے اُتنا ہی مشتعل ہوتے گئے۔ تھوم کا لفظ مولانا کے لئے دوزخ کا عذاب بن گیا۔ خدا معلوم وہ سکول کے باہر نجی زندگی میں کسی کنجڑے سے تھوم خریدنے کے قابل بھی رہے یا نہ رہے۔

مولوی صاحب کے سینے پر تھوم کی تریاں بندوق کی گولیوں کی طرح برستی رہیں کہ اسی اثنا میں ہم میٹرک پاس کر گئے۔ جو بات زیادہ لوگوں کی زبان پر جاری ہو جائے بالعموم اس کا مصنف تاریکی میں چلا جاتا ہے۔ مولوی صاحب کی چڑ باقی تمام اساتذہ کی نسبت زیادہ موضوعِ سخن رہی بایں ہمہ کم سے کم مولوی صاحب اس کے مصنف کے نام سے ناواقف ہی رہے...... میں سکول سے فارغ ہو کر کالج میں داخل ہو گیا اور آہستہ آہستہ سکول کے بارے میں سب کچھ بھول گیا۔

بی۔اے پاس کیا تو میرے اندر والا انسان صحیح سالم اور جوانی کے جوش سے بھرپور تھا۔ وہ میرے لئے ایک عرصے تک مصیبت بنا رہا اگر وہ زندہ رہتا تو یقیناً مجھے گمراہ کر دیتا کیونکہ وہ تو شبانہ روز انسانیت کی خدمت کے جذباتی نعرے لگاتا رہتا تھا۔ وہ تو میرے روکے رُکتا ہی نہیں تھا اسے اپنا مفاد ترک کر کے دوسروں کے کام آنے کا خبط تھا۔ اس نے میری کھال اتنی نرم کر دی تھی کہ معمولی سی بے انصافی کی میخ بھی میرے جسم سے پار ہو جایا کرتی تھی۔ اب تو میں نے اپنی ہمت سے اپنے سینے میں پتھر اور اپنے جسم کے گرد لوہا چن لیا ہے لیکن اس وقت میں موم کا پتلا ہی تھا ایک دن بیٹھے بٹھائے میری موم پگھل گئی اور میں نے سوچا کہ اس قوم کی سب سے بڑی ضرورت اور خدمت یہی ہے کہ اسے تعلیم دی جائے۔ میں نے اپنے اس فیصلے کے نشیب فراز پر غور کئے بغیر اگلے برس بی۔ٹی میں داخلہ لے لیا۔ یہ کورس پاس کرتے ہی میں اپنے پرانے سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ وہ میری صلاحیتوں سے واقف ہی تھے انھوں نے بلا چون وچرا مجھے ملازم رکھ لیا۔ مجھے سینیئر انگلش ٹیچر کا منصب ملا اور ہائی کلاس کے ایک فریق کا انچارج بنا دیا گیا۔ اس طرح میں قوم کی خدمت میں ہمہ تن محو ہو گیا۔

چند دن گزرے تو مجھے معلوم ہوا کہ پانچ چھ برس پیشتر میں مولوی صاحب کی جو چڑ بنا گیا تھا وہ تو بعد میں آنے والے طلبا کے ذریعے کھیپ در کھیپ منتقل ہوتی آ رہی ہے اور ابھی تک اسی جوش و خروش سے اس کا ورد جاری ہے۔ وہ پہلا دن تھا جب مجھے معلّمی کا پیشہ اختیار کرنے کا افسوس ہوا لیکن میں سنبھل گیا اور خدا کا شکر کیا کہ بروقت پتہ چل گیا ہے۔ آئندہ میں ایسی کوئی غیر معمولی حرکت نہیں کروں گا جو میری چڑ بن سکے۔ ویسے اس کے بعد مولوی صاحب مجھے دکھائی دیتے تو میرا جی چاہتا کہ یا تو مولوی صاحب انتقال کر جائیں یا سکول چھوڑ جائیں —— اس کی وجہ مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکی —— میں مولوی صاحب کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں انہیں FACE نہیں کر پاتا تھا۔ کبھی کبھی میرے کانوں میں تھوم کی آواز پڑتی تو میں گھبرا جاتا اور میرا جی چاہتا لڑکوں کو آگ لگا دوں۔ معتبر اور زوردار قسم کے لڑکے مجھے گولی کی طرح لگتے اور میں ہر وقت اس شعوری احتیاط کا شکار رہتا کہ کسی حرکت سے میری کوئی چڑ نہ پڑ جائے۔ مجھے یہ سوچنے کی توفیق نہ ہوئی کہ ماسٹر اور چڑ تو آپس میں جسم اور لباس کی طرح جڑے ہوتے ہیں۔ جب تک کوئی چڑ نہ پڑے ماسٹر کی ذات نامکمل رہتی ہے ماسٹر کو چڑ سے بھاگنا نہیں چاہیے ہاں یہ دعا ضرور کرتے رہنا چاہیے کہ چڑ پڑے تو گوارا قسم کی پڑے۔

ایک دن میں نے جماعت سے پچھلے دن کا پڑھایا ہوا سبق سننا چاہا تو اتفاق سے کوئی لڑکا بھی نہ سنا سکا۔ مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے کہا "آج تو میں چھوڑے دیتا ہوں لیکن کل بھی جسے سبق یاد نہ ہوا اس کا قیمہ کر دوں گا۔"

میں نے یہ بات نہایت غصے کے عالم میں کہی تھی۔ اس کے باوجود ایک لڑکا بے اختیار ہنسی سے پھٹ پڑا۔ بس یوں ہی لگا جیسے کسی نے کاغذ کے لفافے

میں ہوا بھر کر اوپر سے زور کا مکا چلا دیا ہو!

میں نے خونی نظروں سے لڑکے کو دیکھا اور پوچھا "اس میں ہنسنے کی کون سی بات تھی؟"

وہ لڑکا تو سہم کر چپ ہو گیا لیکن مجھے باقی تمام جماعت کی آنکھوں میں شرارت ناچتی ہوئی دکھائی دی۔ مجھ سے یہ آنکھیں برداشت نہیں ہو رہی تھیں لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آسکا کہ بات کیا ہے۔

کچھ دن اور گزر گئے تو مجھے وہ خبر سننا ہی پڑی جسے میں پہلے دن سے ٹالنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میری چڑ پڑ چکی تھی۔ لڑکوں کو میری کوئی غیر معمولی حرکت تو ہاتھ نہ آسکی لیکن وہ اپنے اُستاد کو زیادہ عرصے تک نامکمل کیسے دیکھ سکتے تھے۔ جب انھیں اور کچھ نہ ملا تو انھوں نے میرے نام کو اُلٹ پلٹ کر میری تکمیل کر دی میرے نام کا قافیہ تنگ تھا۔ انھوں نے چلتی سی گرہ لگائی اور شعر تیار ہو گیا۔

برکت علی چیمہ — بکری دا قیمہ!!

تب میں نے جانا کہ اُس روز میرے ایک شاگرد کا ہنسی والا غبارہ کیونکر پھٹ پڑا تھا۔

اپنی چڑ کا سُن کر میں پسینے میں شرابور ہو گیا۔ یہ دوسرا موقع تھا جب مجھے نیچر بننے کی بے وقعتی کا احساس ہوا۔ اب میں نے سوچا کہ چڑ تو پڑ ناتھی سو پڑ گئی میرا ردِ عمل صحت مند ہونا ضروری ہے۔ اس کی پہلی صورت یہ ہے کہ میں لڑکوں کو پتہ ہی نہ چلنے دوں کہ مجھے اپنی چڑ کا علم ہو گیا ہے۔ چنانچہ جب سکول میں چلتے پھرتے میرے کانوں میں قیمے کی گولی لگتی تو میں اپنی کھال کے اندر تڑپ کر رہ جاتا لیکن باہر سے مستحکم رہتا۔ جہاں لڑکوں کا ہجوم ہوتا وہاں سے کترا کر نکل جاتا۔ ایک کام اور بھی کیا۔ میں نے معتبر اور ذمہ دار لڑکو بیٹا کہنا ترک کر دیا!

آہستہ آہستہ لفظ قیمہ میرے حواس پر سوار ہونا شروع ہو گیا۔ میں نے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ اپنے نام کے ساتھ چیمہ لکھنا چھوڑ دوں لیکن پھر خیال آتا کہ اس طرح تو میں لوگوں کی توجہ زیادہ شدت سے اپنی طرف کھینچ لوں گا۔ مولوی صاحب کی چڑ بناتے وقت تو مجھ میں ڈھیروں حسِ لطیف تھی لیکن میری چڑ پڑی تو نہ جانے یہ حس کہاں چل دی۔ بہت دفعہ اپنے آپ کو سمجھایا کہ کون ماسٹر ہے جس کی چڑ نہیں پڑتی۔ آخر اس بات کو اتنی اہمیت دینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ لیکن جونہی میں اپنے گاؤں جاتا اور میرے گلی محلے جھک جھک کر سلام کہتے تو مجھے لڑکوں پر پھر طیش آجاتا!

میں اس وقت سیدھا اپنی عدالت برخاست کر کے آرہا ہوں۔ آج میری عدالت میں ایک آدمی پیش ہوا۔ فائل پر اس کا نام لکھا تھا۔ علی بخش المعروف چوچا ——— جن باتوں کا میں آج انکشاف کر رہا ہوں۔ ممکن ہے کل اس پر پچھتاؤں لیکن اس وقت میری موم پگھلی ہوئی ہے ——— میں آدمی کے نام پر حیران ہوا اور اس سے پوچھا کہ چُوچے کا کیا مطلب ہوا، اس نے جواب دیا۔

"مائی باپ! بچپن میں لوگوں نے چُوچا میری چڑ بنا رکھی تھی، مائی باپ! جوں جوں میں بڑا ہوا چڑ بھی میرے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ تب مائی باپ! میں نے سوچا کہ ایک عمر کا ساتھ ہے، اسے نبھانا ہی چاہیئے ......"

مجھے یوں لگا جیسے اس آدمی نے میرے منہ پر طمانچہ دے مارا ہے۔ میرے لئے عدالت کی کارروائی جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ میں نے عدالت برخاست کی اور خود عدالت سے ریٹائر کر گیا۔ تھوم! قیمہ! اور چوچا! آج میرے عام استعمال کے لفظ نہیں رہے۔ سکول ماسٹر، تحصیلدار اور ایک عام آدمی کی علامت بن گئے ہیں۔ تھوم کے آئینے میں مجھے اپنا مجرم چہرہ نظر آرہا ہے۔ قیمہ جرم کی سزا بن گیا ہے اور چُوچا ایک نارمل انسان! میں نے اپنی پریشانی دور کرنے کے لاکھ جتن کئے ہیں لیکن بات نہیں بنی اور اب میں نے قلم سنبھالا ہے، اپنے ہی کیس کا فیصلہ لکھنے کے لئے!

مولوی نعمت اللہ میری آنکھوں کے سامنے سے نہیں ہٹ رہا۔ میرا خیال ہے کہ اگر وہ زندہ ہے تو یقیناً پاگل خانے میں ہو گا۔ میرا اپنا علم نفسیات

جہاں سے آیا وہیں چلا گیا اور میری حسِ لطیف ایک کتابی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ بظاہر تو میں پہاڑ کی سی استقامت لئے رہا لیکن چوکیدار کو پیٹنے کی مضحکہ خیز حرکت اب بھی کر بیٹھتا ہوں۔ سکول میں پڑھاتے ہوئے میں کیسی عجیب عجیب احتیاطیں برتا کرتا تھا۔ اس قسم کی آخری احتیاط جو میں نے سکول میں برتی یہ تھی کہ ایک دن میں جماعت میں جا رہا تھا۔ ابھی میں برآمدے ہی میں تھا کہ میرے کانوں میں قوالی کی سی آواز پڑی۔ لڑکے میری چڑ کا گانا بنائے ہوئے تھے۔ آدھے کہتے تھے:

"برکت علی چیمہ ا"

دوسرے آدھے جواب دیتے تھے:

"بکری دا قیمہ ا!" اور ڈیسکوں کا طبلہ بجاتے تھے۔

میں جہاں تک پہنچ چکا تھا۔ وہاں تک لڑکوں کی نظروں سے اوجھل تھا میں نے سوچا، ممکن ہے میں جماعت میں پہنچوں تو نعرہ ابھی لڑکوں کے منہ میں ہو اس لئے میں اُلٹے پاؤں لوٹ گیا اور پھر سکول کے صحن میں اپنی جماعت کے سامنے اس انداز میں کھڑا ہو گیا کہ میری پشت لڑکوں کی طرف تھی اور دھیان دوسری طرف۔ لڑکوں نے مجھے دیکھ لیا اور خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد میں آہستہ آہستہ جماعت میں آ گیا جیسے مجھے کچھ پتہ ہی نہ چلا ہو۔

اُس دن میں دل ہی دل میں کڑھتا رہا مجھے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ اپنی چڑ کو لفٹ نہ دینے کے لئے کتنے جگرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بس دل میں یہی جذبہ سما رہا تھا کہ کسی نہ کسی بہانے لڑکوں کو سزا دوں جیسے پچھلے ہفتے چوکیدار کو دی تھی۔ میں نے نہایت بے دلی سے جماعت کو پڑھایا اور دل میں غبار لئے اسٹاف روم میں چلا گیا۔

میرے بعد مولوی نعمت اللہ کی گھنٹی تھی۔ میں باہر آیا تو وہ اندر گئے تھے۔ تھوم اور قیمے کا دروازے میں ملاپ ہوا تھا۔ تھوم جل چکا تھا اور قیمہ بھن رہا تھا، دونوں مل کر لڑکوں کی لذت کا سامان بنے ہوئے تھے۔

میرا یہ پیریڈ خالی تھا۔ میں اس کے دوران سٹاف روم میں کباب سیخ بنا رہا۔ اخبارات کے مطالعہ کی بہت کوشش کی لیکن اخبار آنکھوں کے سامنے لاتا تو یہی لگتا جیسے ہر صفحہ پر قیمہ! قیمہ! لکھا ہوا ہو۔

پیریڈ ختم ہوا تو مولوی صاحب میرے ساتھ والی کرسی پر آ بیٹھے۔ اُس دن وہ بڑے جذباتی ہو چلے تھے۔ آ کے بیٹھے ہی تھے کہ میرے کان میں تیل ڈال دیا۔ کہنے لگے "برکت! اگرچہ تم اس وقت میرے برابر بیٹھے ہو لیکن تم کتنے ہی اونچے چلے جاؤ میرے بہرحال شاگرد ہی رہو گے ......"

میں جھٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اور جواب دیا: "محترم! میں آپ کے برابر محض انتظامی ضرورت اور مجبوری کے تحت بیٹھ جاتا ہوں لیکن اگر آپ کو گراں گزرے تو میں سٹاف روم میں بھی آپ کی خدمت میں کھڑا ہی رہوں"

میرے اس جواب پر اُن کی آنکھیں بھیگ گئیں کہنے لگے: "تم تو میری اس قدر عزت کرو اور تمہاری جماعت میری اس قدر توہین کرے کیا یہ افسوس کا مقام نہیں؟ ...... کیا میرا تم پر کوئی حق نہیں؟"

مولوی صاحب کا لہجہ میرا سینہ چیر گیا۔ میں نے کھڑے کھڑے ان سے پوچھا "آپ یہ تو بتائیں ہوا کیا ہے؟"

مولوی صاحب کہنے لگے "جو کچھ ہوا وہ تم خود جا کر پوچھ لو مجھے تو اتنا معلوم ہے کہ تمہاری جماعت نے آج میری ریش میں خاک ڈال دی ہے"

اس کے بعد میرے کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی۔ بہت سی امکانی باتیں میرے ذہن میں آئیں۔ نہ آئی تو مولوی صاحب کی چڑ والی بات نہ آئی۔ اگر مجھے اس کا خیال آ جاتا تو ممکن ہے میرا ردِعمل کچھ اور ہوتا لیکن مجھے تو اس وقت اپنی چڑ زیادہ یاد آ رہی تھی۔ مولوی صاحب کی

گیا آگ۔ میں سٹاف روم سے نکلا اور اپنی جماعت کی طرف چل دیا۔

ایسے معلوم دیتا تھا جیسے اُس روز میں، میں نہیں تھا کوئی اور تھا۔ بس میں آگ کا گولا بن چکا تھا جسے اگر پانی میں بھی پھینکا جاتا تو پانی میں آگ لگ جاتی۔ میں انگارے کی طرح دہک رہا تھا اور شوکتے ہوئے ناگ کی طرح جماعت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میرے چہرے کا رنگ دیکھ کر تمام جماعت سناٹے میں آگئی۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہی شیر کی طرح گرج کر پوچھا: "آج مولوی نعمت کو کس نے تنگ کیا ہے؟"

میری کڑک سن کر جیتی جاگتی جماعت قبرستان کا نمونہ بن گئی۔ بڑی خوفناک چپ کا سایہ لڑکوں پر منڈلانے لگا۔ کتنی دیر تک مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے اور زیادہ زور سے کڑک کر کہا: "اگر بتا دو تو بہتر ورنہ ایک طرف سے شروع کروں گا اور دوسرے سرے تک تمام جماعت کی کھال اتار دوں گا۔"

قبرستان میں ایک تنکے کو بھی جنبش نہ ہوئی۔

میں نے اپنی دھمکی کو سچ کر دکھانے کے لئے اگلے بنچ پر بیٹھے ہوئے ایک لڑکے کو تڑاخ سے چھڑی دے ماری۔ لڑکے میں سے ایک آواز تو "ہائے" کی نکلی اور دوسری آواز یہ تھی: "جی! تنگ تو ساری جماعت ...... جی ساری جماعت نے کیا تھا ...... لیکن ...... لیکن پہل ...... جی پہل مقبول نے کی تھی ...... جی! ......"

گو اکتائے ہوئے افسر کی طرح میں نے یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی کہ مقبول نے پہل کیا کی تھی حالانکہ مقبول میرا بڑا چہیتا شاگرد تھا۔ میں نے اسے آج تک سزا نہیں دی تھی۔ میرے خیال میں اگر اس لڑکے نے جھوٹ بھی بولا تھا تو محض اس لئے کہ مقبول کو کون سی مار پڑے گی۔ مقبول لائق لڑکا ہونے کی وجہ سے تمام استادوں کو پسند تھا اور ٹیچر انچارج ہونے کے باعث مجھے اس سے بہت پیار تھا۔ لیکن آج وہ میری عدالت میں ہی مجرم تھا اور کوئی نہ تھا جو اسے مجھ سے چھڑا سکے!

مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں خونی نظریں لے کر مقبول کے پاس پہنچا تھا تو اس کا رنگ پھولی سرسوں کی طرح ہو چکا تھا۔ وہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور ایک سدھائے ہوئے جانور کی طرح اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میں نے اس ہاتھ کو ڈس لیا تو دوسرا آگے کر دیا، پھر پہلا، پھر دوسرا ...... وہ باری باری ہاتھ بڑھاتا رہا اور میں پتے کی آگ بجھاتا رہا۔ مقبول کی چیخیں نکلتی رہیں اور اس کے ہاتھ مشین کی طرح آگے پیچھے آتے جاتے رہے۔ میری اور مقبول کی ریس کتنی دیر جاری رہی اور بالآخر ہار میری ہی ہوئی، میں خود ہی ہانپ کر کرسی میں جا گرا۔

کرسی میں پھیل کر میں کتنی دیر ہانپتا رہا اور جب سانس نارمل ہوئی تو مجھے اصل بات پوچھنے کا خیال آیا۔ میں نے جماعت سے سوال کیا: "پہل کس طرح ہوئی تھی؟"

مردے آرام سے قبروں میں لیٹے رہے! کوئی جواب نہ آیا۔

میں نے اگلی لائن کے ایک لڑکے کو کھڑے ہونے کا حکم دیا اور اس سے پوچھا: "تم بتاؤ کیا بات ہوئی تھی؟"

"جی ...... جی مولوی صاحب جماعت میں ...... جماعت میں آئے ...... تو مقبول نے ...... جی مقبول کی طرف سے ...... جی تھوم کا گٹھا ...... مولوی صاحب کو ...... جی تھوم مولوی صاحب کی ......"

لڑکا اپنی طرف سے میری بات کا جواب دے رہا تھا لیکن مجھے یوں لگا جیسے اس نے سٹین گن بھری ہے اور اب اٹھ کر مجھ پر باڑھ مار رہا ہے۔ ابھی بات اس کے منہ میں تھی کہ میں نے گولی سے زخمی ہو جانے والے کی طرح چیخ کر کہا: "بکواس بند کر ...... اوئے! چپ ہو جا!" اس روز میرے یہ آخری لفظ

تھے جو میں نے ہوش میں ورلے۔

مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں بے جان مجسمہ ہوں اور کرسی میں فٹ ہوگیا ہوں ہلنے جلنے کی پوری کوشش کی لیکن مجسمے بھی کبھی ہل پائے ہیں؟ میں چاہتا تھا کہ لڑکوں سے روپوش ہوجاؤں لیکن چھپنے کے لئے میرے پاس ایک ہی پردہ تھا میری کھال کا پردہ! لیکن میری کھال اس وقت بڑی نرم تھی!! لڑکوں کی آنکھیں میری کھال کو چیر کر میرے اندر پہنچ رہی تھیں۔ کتنی دیر تک میرے اعضا میرا ساتھ دینے سے منکر رہے اور آخر کار جس عضو نے سب سے پہلے میری طرف ہمدردی کا ہاتھ بڑھایا وہ میرے پاؤں تھے۔ میں نے پاؤں کو جنبش دی اور باقی جسم کو پاؤں کے بل پر یوں باہر لے گیا جیسے میرا اوپر کا جسم لکڑی کا ہو اور نیچے پاؤں کے پہیے لگے ہوں!

پہیے اس وقت تک چلتے رہے جب تک میں بورڈنگ ہاؤس میں اپنے کمرے میں نہیں پہنچ گیا۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے آج تک بے ہوش نہیں ہوا سوائے اس رات کے جو مقبول کو مارنے کے بعد آئی۔ میرا روم میٹ ماسٹر عبدالغنی پتہ نہیں کب آیا، میں نے رات کس طرح گزاری، کمرے میں پہنچنے کے بعد جب میں نے ہوش سنبھالا تو یہ اگلے دن کی صبح کا ہنگام تھا۔ ماسٹر عبدالغنی منہ لٹکائے میری چارپائی پر بیٹھا تھا۔

میں نے آنکھیں کھولیں تو عبدالغنی کھِل گیا لیکن فوراً ہی اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وہ ہمیشہ متضاد حرکات ایک ہی سانس میں کرنے کا عادی تھا۔

تھوڑی سی دیر ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ میں نے دھیمے سے مسکرانا شروع کیا اور ہاتھ پاؤں کو جنبش دی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ہاتھ بوجھل ہیں۔ میں دونوں ہاتھوں کو آنکھوں کے سامنے لایا تو میری حیرانگی کی انتہا نہ رہی۔ میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھوں پر چمڑے کے دستانے پہنا کر انہیں زور سے باندھا ہوا ہے۔ کبھی میں ہاتھوں کو دیکھوں اور کبھی عبدالغنی کو۔ آخر میں نے آہستہ سے پوچھا "یہ کیا؟"

عبدالغنی کا گلا رندھ گیا اور وہ بولا "ظالم! میں نے تمام رات اُلّو کی طرح تمہارے سرہانے جاگ کر گزار دی ہے۔ تم تمام رات ایک ہی دہائی دیتے رہے، میرے ہاتھوں کو ٹکڑے کردو۔۔۔ میں مرگیا ہے! میرے ہاتھوں کو ٹکڑے کردو ورنہ میں مرا!!"

میں آہستہ آہستہ چارپائی سے اٹھا۔ دستانے اتارے استعفٰی لکھا اور عبدالغنی کے ہاتھ سکول بھجوا دیا۔

(پنجابی سے)

سعیدہ احسان

دائرے

"آپ کو وقت نکالنا ہی ہوگا۔ دیکھئے ابھی سب لوگ ڈائننگ ہال میں ہیں۔ آپ کی غیر موجودگی کا کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا پلیز پلیز" وہ اچانک چونکی۔ ہال میں ابھی تقریریں جاری تھیں اور تالیوں کے شور سے ہال گونج اٹھتا تھا۔ زمان صاحب غالباً ملن صاحب کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے ہر شخص ہر دوسرے شخص کا شکریہ ادا کر رہا تھا جب وہ کھانے کی میز سے اٹھ کر آئی تھی تو ڈیوڈ صاحب نے جو اس کورس کے اسپانسر تھے تقریر ختم کی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔

کیا خودی کی تکمیل یوں ہی ہوتی ہے، کیا انا اسی طرح پروان چڑھتی ہے! کیا زندگی کی محرومیوں اور مایوسیوں کے داغ ان خود ساختہ تعریفوں سے مٹ جاتے ہیں! کیا.......!

"آپ پھر کچھ سوچنے لگیں"

"جی؟" اس نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان کو دیکھا۔ شوق، التجا اور امید کے اسرار اس کی نگاہوں، اس کی آواز میں لرز رہے تھے۔ اسے اپنے ذہن میں ایک جھنجھنی سی محسوس ہوئی۔

پھر ماضی اور حال کے فاصلے سمٹ گئے۔ کسی اور کی آواز اس کے کانوں میں گونجی "جب تم میرے پاس ہوتی ہو۔ اتنی قریب ہوتی ہو کہ میں تمہیں چھو سکوں۔ اس وقت تمہارے تبسم کے دلارسے روح کے خلا بھر جاتے ہیں۔ تمہاری قربت مجھے ایسی آسودگی عطا کر دیتی ہے جو ہر خواہش، ہر آرزو، ہر تمنا کی تکمیل ہو۔ پھر بھی میں تمہیں چھوتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ تم کہیں تحلیل نہ ہو جاؤ، تحلیل نہ ہو جاؤ، بکھر نہ جاؤ تمہاری آنکھوں کی گہری اداسی مجھے محتاط کر دیتی ہے چھپے ہوئے اندیشے سر اٹھاتے ہیں اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ میں کبھی سمجھ بھی سکوں گا.... کیا...."

یکایک ایک سوال گونجا "آپ چپ کیوں ہیں؟ کیا سوچ رہی ہیں آپ؟ دیکھئے لوگ شاید ادھر آ رہے ہیں۔" وہ چونک کر سیدھی بیٹھ گئی۔ ہال تالیوں کے شور اور قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ غالباً آخری تقریر ختم ہو گئی تھی۔ یہ سب کامن روم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس کا ساتھی بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ "چلئے باہر کار میں بیٹھتے ہیں" اور جمال نے جلدی سے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ تازہ ہوا کے ایک جھونکے نے اسے پوری طرح بیدار کر دیا۔ اس کے ذہن نے ایک جھرجھری سی لی اور اب وہ پوری طرح اس موقع، اس لمحہ سے آمادۂ پیکار ہو گئی۔ آخر یہ چھوکرا جس سے اس کی ملاقات کی میعاد محض ایک شام تھی، جو عمر میں بھی یقیناً اس سے چھوٹا تھا، جوان، حسین اور دولتمند بھی، پڑھا لکھا بھی تھا۔ آخر چاہتا کیا تھا؟ محبت؟ ناممکن! خوش وقتی؟ مگر وقت گذارنے کے اس سے بہتر ذریعے بھی اسے ضرور معلوم ہوں گے...... پھر یہ کیا ہے؟

کار میں بیٹھ کر جمال نے اپنا سگریٹ کیس کھول کر آگے بڑھاتے ہوئے کہا "سگریٹ لیجیے"

"شکریہ میں سگریٹ نہیں پیتی۔"

"اس وقت لے لیجئے۔ میری خاطر پلیز۔"

اس نے ایک سگریٹ اٹھائی اور سگریٹ جلاتے ہوئے بوال کے ہاتھوں کی لرزش پر اسے تعجب ہوا۔ آخر یہ گھبراہٹ کیوں! "مجھے آپ سے بہت کچھ کہنا تھا، کہنا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو۔ اور اگر آپ کے پاس وقت ہو تو۔ اسی لئے باوجود اس کے کہ کل شام آپ نے بتا دیا تھا کہ آج آپ مصروف ہوں گی، پھر بھی میں نے یہاں آنے کی جرأت کی۔ اس امید میں کہ شاید میں ——— آپ کو کچھ دیر کے لئے اپنے ساتھ ڈرائیو پر جانے کے لئے ——— آمادہ کر سکوں......."

"دیکھئے میں مجبور ہوں اسی لئے میں نے کل بھی آپ کو بتا دیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اب بھی میری غیر موجودگی محسوس کی جا رہی ہو گی۔"

"لیکن کل تو آپ کالاؤن چلی جائیں گی۔"

اسے ہنسی آگئی "مگر پرسوں واپس بھی تو آجاؤں گی۔"

"اچھا تو پھر وعدہ کیجئے کہ واپس آنے پر ملیں گی۔ ورنہ میں یہیں ستیہ گرہ کر دوں گا۔"

"اچھا پھر آپ سلیچر کو ٹیلی فون کر لیں۔"

"جی نہیں، سلیچر کو میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔ اور اب صرف دس منٹ کے لئے ڈرائیو پر چلئے۔ دیکھئے نا آپ نے تو کھانے کے بعد کافی بھی نہیں پی تھی۔ بالکل قریب ایک ریستوراں ہے۔ دس منٹ میں واپس آجائیں گے۔"

"اچھا چلئے۔" اس نے بہت بے دلی سے کہا۔ اس لڑکے کا اتنا اصرار اسے اچھا نہ لگا مگر اس کے اس بے پناہ شوق اور بے تکان اصرار کو وہ رد نہ کر سکی۔ اور کسی انجانے ذہنی انتشار اور بے چینی نے اسے جھنجھوڑ کر اس نیم بے حسی کے عالم سے بیدار کر دیا۔ اس گھبراہٹ کو چھپانے کے لئے اس نے نظریں نیچی کر لیں۔ اب اس کی نگاہیں کافی کی پیالی میں گہرے بھورے مشروب میں ڈوب گئی تھیں۔ پھر جیسے اس کا دم الجھنے لگا۔ حال دھندلا ہوتا گیا اور یکایک ماضی کی ایک شام ابھری۔ ایک آواز اس کے کانوں میں بس رہی تھی۔ کافی کی پیالی میں ایک اور چہرہ ابھرا جس پر پیار کی بے اختیاری تھی، آرزوؤں کی تپش تھی، لگاوٹ کی چاہت تھی۔ اور محرومی کے اندیشے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا "جب تم میرے قریب ہوتی ہو......."

اور یکایک اسے احساس ہوا کہ اس کا ساتھی بات کرتے کرتے خاموش ہو گیا ہو۔ سگریٹ کا آخری جلتا ہوا سرا اس کی انگلیوں کو جھلس رہا تھا اور وہ ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اس بے آواز شکایت سے اسے بڑی ندامت ہوئی۔

"آپ خاموش کیوں ہو گئے۔"

"بیکار ہے۔ آپ نے سنا ہی نہیں کہ میں نے پچھلے دس منٹ میں کیا بکواس کی ہے۔ آپ کافی ختم کر لیں تو میں آپ کو واپس چھوڑ آؤں۔"

تھکن سے چور وہ کمرے میں پہنچی۔ اگر اس وقت گرم پانی غسل کو مل جائے تو شاید کچھ تھکن دور ہو، اس نے سوچا۔ کمرے میں عجب بے ترتیبی کا عالم تھا۔ جانے سے پہلے اس نے جلدی میں بیگ خالی کیا تو تمام کتابیں پلنگ پر ڈال دی تھیں۔ اب کون گرم پانی مانگنے جائے۔ ویسے بھی ہوسٹل کے نوکر سو چکے ہوں گے۔ وہ پلنگ کتابوں سے خالی کرنے کے لئے بڑھی۔ اتنی موٹی موٹی کتابیں اور

یہ لوگ چاہتے ہیں کہ پندرہ دن میں ساری کی ساری ختم بھی کر دی جائیں۔ ہونہہ!

اس نے بڑی بیزاری سے کتابیں سمیٹ لیں۔ داہنے ہاتھ سے بائیں بازو کے آغوش نما خم میں ایک کے بعد ایک کتاب رکھنی شروع کی۔ وہ کتابوں کو اس خم میں بھر رہی تھی کہ یکایک اس کا ہاتھ ایک سرد چکنی سطح پر رک گیا۔ اس نے نظر جما کر اس اجنبی چکنی سطح کو دیکھا۔ [illegible] سائنس سے مختلف ایک نیلی خوبصورت سی نوٹ بک نظروں کے دائرے میں آئی اس نے حافظے پر زور دے کر اس نوٹ بک کا پھر سے جائزہ لیا اور جھنجھلا اٹھی۔

یہ نوٹ بک یہاں کیسے ہے؟

مگر یہ ہے کس کی؟ میری تو نہیں! کسی نے دی تھی؟ مگر کس نے؟

جھنجھلاہٹ اور مجبوری اسی کیفیت میں بائیں بازو کے خم کی ساری کتابیں پھسل کر فرش پر آ رہیں۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور بے بس ہو کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

انگلیوں نے نوٹ بک کے ورق الٹنے شروع کیے۔ سادہ اور چکنے کاغذ --- مگر خالی اور نا آشنا۔ پھر بھی اجنبیت کے باوجود اس کی انگلیوں کا لمس، ان سادہ اوراق کی چکنی سطح کو سہلانا چاہتا تھا۔ ان سے الگ نہیں ہو پاتا تھا۔ پھر جھنجھلاہٹ کی ایک لہر دل و دماغ میں تیری۔ اور اسے محسوس ہوا کہ اس کی انگلیاں اس کے ارادے کی تابع نہیں رہیں کسی خارجی ارادے کی قوت جیسے ان کو اپنا مطیع فرمان کئے ہے۔

اس نے آہستہ آہستہ ایک ایک ورق پلٹنا شروع کیا۔

ذہن میں کسی انجانے طوفان کی پہلی لہر اٹھی۔ وہ ہلکے ہلکے ورق پلٹتی رہی اور سوچتی رہی کہ یہ نوٹ بک اتنی اجنبی ہوتے ہوئے بھی اسے اتنی عزیز کیوں ہے کہ اب وہ اسے الگ نہیں کر سکتی تھی۔ نوٹ بک کی نیم شناسا سا نیم اجنبی کشش اس کی انگلیوں سے چلتی ہوئی اس کے رگ و پے میں سرایت کر رہی تھی۔ وہ ایک بے بس کڑی جو اسے جذبے کی اندھی گرفت میں تھی۔ ایک اور ورق پلٹا گیا جو باقی اوراق کی طرح خالی تھا۔ اس کی یادداشت کا تانا بانا اور الجھ گیا۔

پوری توجہ سے سوچنے کے بعد بھی کوئی سرا ہاتھ نہ آیا۔ آخری صفحہ باقی تھا۔ اس کی انگلیوں میں ناامیدی رینگ رہی تھی۔ بوجھل انگلیوں سے اس نے آخری ورق الٹا۔ سامنے ورق پر دائرے ہی دائرے تھے۔ چھوٹے بڑے ہر پیمانے کے دائرے...... شاید تھکن سے اس کا ذہن واہموں کے دائرے بن رہا تھا۔ پھر اس نے بہت احتیاط کے ساتھ ہلکے سے آنکھیں کھولیں کہ حقیقت کو اس دھوکے سے بچایا جائے۔ لیکن دائرے اب حقیقی شکل اختیار کر چکے تھے اور اسے جواب طلب نظروں سے گھور رہے تھے۔

اور ایک دم بجلی کی تیزی سے جیسے ذہن سے ایک دبیز پردہ اٹھ گیا اور یہ دائرے اسے ایک کمرے میں لے گئے۔

رات ہو چکی تھی اور [illegible] جو ختم ہی نہ ہو رہے تھے۔ وہ بیزار ہو گئی۔ اگلی صبح اسے ایک مختصر کورس پر ایبٹ آباد جانا تھا۔ [illegible] بھی ختم کرنا تھا۔ ایک پیالی چائے پی جائے، پھر سے کام شروع کیا جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ اٹھی اور پانی کی کیتلی رکھ کر واپس کمرے میں آئی تو [illegible] اسے عجیب لگا۔ اعجاز نہایت کم گو آدمی تھے۔ وضعداری ان کی سرشت میں تھی اور یہ ان کے آنے کا وقت نہ تھا۔ [illegible] لٹکائے ہلکے جیسے وہ گھبرائے ہوئے [illegible] ادھر سے گزر رہا تھا تو سوچا کہ آپ سے خدا حافظ کہہ لوں۔ صبح جا رہی ہیں ناں آپ"

"جی ہاں صبح سات بجے جانا ہو گا۔ آپ [illegible] بیٹھے" اور پھر ایک ناگوار، بے چین سی خاموشی طاری ہو گئی۔

اعجاز کو وہ پچھلے ایک سال سے جانتی تھی۔ نہایت خاموش، روایتوں کے پابند مگر خوش مذاق اور بے حد ذہین۔ اسی ذہانت سے

وہ بے حد مرعوب تھی [illegible] یہی دونوں کے درمیان شناسائی کے رشتے کی بنیاد تھی کیونکہ اعجاز نے ہمیشہ ہمیشہ اس بات کا اعلان کیا تھا کہ "تمہاری نہایت براق اور صیقل شدہ ذہانت، تمہاری اس خداداد ذہانت کی بے حد معترف ہوں جس سے تم کوئی [illegible] زیادہ نہیں۔"

اور بار بار اعجاز کے منہ سے اپنی ذہانت کا یہ اعتراف سن کر اسے ہمیشہ ایک عجیب طرح کی فتح مندی کا احساس ہوتا رہا۔ اصل میں دونوں کے درمیان ذاتی قسم کی گفتگو اسی فقرے پر محدود تھی اور اس میں کوئی کمی بیشی نہ آئی تھی۔

اس میں کسی اونچ نیچ یا اتار چڑھاؤ کا یوں بھی امکان بہت [illegible] تھا۔ اعجاز زرہ بکتر پہن کر زندگی گذارنے کے ماہر تھے۔ جذبات کی لطافت اور گہرائی سے بہرہ ور ضرور تھے مگر عقل اور ہوش مندی اور سود [illegible] ان کو جذبات پر بہر [illegible] جذبات پر حاوی رکھنا ان کے نزدیک جیسے انسانیت کا سب سے اعلیٰ مقصد تھا۔

اعجاز سے اپنے ان تعلقات کو وہ ہمیشہ اپنی سہیلیوں کے سامنے "ذہنی یگانگت" کا کتابی نام دیتی تھی۔ اصل میں یہ ایک عجیب طرح کا اعتماد، ایک نرالے قسم کا بھروسا تھا جو اعجاز کو اپنے آپ پر تھا اور اسے بھی وہی بھروسا اعجاز پر تھا۔ اسی لئے اعجاز کو یہ اجازت تھی کہ جس وقت چاہیں اس کے گھر آ سکتے تھے۔

لیکن آج اعجاز کو یوں ناوقت دیکھ کر وہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔ ایک ہی نظر نے اسے بتا دیا کہ جو اعتماد اعجاز کو ہمیشہ اپنی ذات پر رہا ہے وہ ان کے چہرے پر اور ان کی آنکھوں میں موجود نہیں تھا۔

وہ خاموش طبع آدمی تھے مگر آج اس خاموشی کی تہہ میں کوئی طوفانی لہر ضرور تھی۔ اکثر جب انہیں کسی سے اپنے کام کے سلسلے میں اختلاف رائے ہوتا تھا تو وہ اس سے ذکر کرتے تھے اور وہ ان کا بوجھ ہلکا کرنے میں کامیاب ہو جاتی مگر آج تو وہ کچھ بول ہی نہ رہے تھے اور بے حد بے چین بھی نظر آ رہے تھے۔ اس نے بہت سوچا مگر کوئی ایسی بات ذہن میں نہ آئی جس سے ان کی اس خاموشی کو توڑا جا سکتا۔

"میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

اور جب وہ چائے بنا کر لائی اور ایک پیالی [illegible] کو دی تو اسے ان کے ہاتھ میں ہلکی سی بے معلوم سی کپکپاہٹ کا احساس ہوا۔ اونہہ! یونہی — اس نے یہ شبہ فوراً رد کر دیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ اعجاز کے ہاتھ میں ایک نیلی نوٹ بک تھی۔

"یہ میں آپ کے لئے لایا ہوں۔"

"بہت خوبصورت ہے۔"

اور پھر خاموشی۔ اب اسے جھنجھلاہٹ شروع ہوئی۔ کیا مصیبت ہے۔ مجھے اتنا بہت سا کام کرنا ہے اور یہ کچھ بولتے ہی نہیں۔

کچھ نہ کچھ کرنے کو انگلیاں کانپ اٹھیں تو اس نے نوٹ بک کے سادہ اوراق الٹنے شروع کئے۔ ایک، دو، تین ..... خیال آیا، کیوں نہ جو جو اشعار یا فقرے یاد ہیں یا کہیں سے پڑھوں گی وہ اس نوٹ بک میں لکھتی جاؤں۔ کم از کم روز کے [illegible] میں اندراج ہوں ..... مگر اتنا وقت کس کے پاس ہوگا — خیر —

یکایک اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ اعجاز کا ساکت و صامت چہرہ اب بھی اس کے سامنے تھا۔ اس کی شخصیت نے اپنے بچاؤ کے لئے جو نیم دائمی زرہ بکتر پہن رکھا تھا اس کی کڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ اس کے آہنی حلقے اور فولادی دبیز پترے خزاں کے پتوں کی طرح اپنے ہی بوجھ سے ریزہ ریزہ ہو رہے تھے۔ اس شخصیت کے گرد ایک کے بعد ایک دفاعی حصاروں کی جو فصیلیں تھیں، ان میں جگہ جگہ شگاف تھے۔ یہ اونچے

حصار مٹی میں مل رہے تھے۔ فصیلیں زمین بوس ہو رہی تھیں۔

وہ پھر چونکی۔ اُسے احساس ہوا کہ وہ مسکرا رہی تھی۔ اعجاز کی آنکھوں میں نمی اور چمک دلی کرب کی لہروں سے دست و گریبان تھے۔ ان میں چاہت اور حسرتوں کے شعلے لپک رہے تھے۔

وہ ڈر گئی۔ اعجاز کی آواز نے اُسے بیـ ڈس لیا، وہ کہہ رہے تھے "تم مانو گی کہ جب تم میرے پاس ہوتی ہو، اتنی قریب کہ میں تمہیں چھو سکوں تو تمہارے تبسم کے دلاسے میری ویران روح کے خلا بھر جاتے ہیں؛ تمہاری قربت مجھے ایسی آسودگی دیتی ہے جو ہر خواہش، ہر تمنا، ہر آرزو کی تکمیل ہو۔"
اعجاز نے ٹھنڈی سانس لی۔ اتنی گہری اور کرب ناک کہ جیسے دل سینے سے نکل پڑے گا۔

بہت آہستہ سے اُٹھ کر انھوں نے ایک سگریٹ سلگایا اور کھڑکی کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ ان کی آواز میں اب آنسو تیر رہے تھے۔ "پھر بھی میں تمہیں چھوتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کہیں تم پگھل نہ جاؤ، بکھر نہ جاؤ، تحلیل نہ ہو۔ تمہاری آنکھوں کی گہری اداسی مجھے محتاط کر دیتی ہے۔ میں سوچنے لگتا ہوں کہ میں تمہیں کبھی سمجھ بھی سکوں گا...... شاید...... شاید..... اچھا میں جاتا ہوں۔ خدا حافظ۔"

یہ سب کچھ اس قدر غیر متوقع اور اچانک تھا کہ اس کے اعصاب، اس کی عقل مفلوج تھے۔ کچھ نہ دیکھنے والی آنکھوں سے اس نے پہلے کرسی کی طرف دیکھا، پھر کھڑکی کو ٹٹولا — پھر اس نوٹ بک کو جس پر — اس کا کانپتا ہوا سرد، بے جان ہاتھ دائرے ہی دائرے بنا رہا تھا۔ بے ہنگم ٹیڑھے میڑھے، چھوٹے بڑے دائرے — دائرے ہی دائرے —

اب یہی دائرے ایک زندہ زنجیر بن کر اس کے رگ و پے میں پیچاں تھے اور وہ ان کی اسیر تھی

کمال مصطفیٰ

یہ خانہ بدوش لوگ

یہ لوگ جو ہمارے گھروں کے سامنے کھلے میدانوں میں یا سڑکوں کے کنارے، اجاڑ علاقوں میں آکر عارضی خیمے گاڑ لیتے ہیں، کھلی ہوا میں سانس لیتے ہیں، نیلے تاروں بھرے آسمان تلے ننگی زمین پر سوتے ہیں، ہنستے ہیں، مگن رہتے ہیں اور باہر زمین پر آگ جلا کر وہ اور اُن کی عورتیں مل جل کر کھانا پکاتے ہیں لیکن پھر بھی ہم سے الگ تھلگ اور دور دور رہتے ہیں اور یوں اکیلے اور تنہا نظر آتے ہیں، اور پھر کچھ دن ایک جگہ قیام کرکے اپنے خیمے اکھاڑ کر کسی دوسری طرف چل دیتے ہیں ——— تو یہ لوگ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟ انہیں زمین کا کوئی خطہ کوئی کونا پسند کیوں نہیں آجاتا؟

اور وہ بھی تھے جو ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنے نکلے، ان لوگوں کے ساتھ رہے، اُٹھے، بیٹھے لیکن پھر بھی نہ جان سکے ——— کچھ نہ جان سکے اتنا بھی نہیں جو ان سے آگے جانے والوں نے جان لیا تھا ——— کہ یہ لوگ دراصل اسی پرانی ڈگر پر چل رہے ہیں جو آج سے ہزاروں بلکہ لاکھوں برس پہلے ان کے بڑوں نے اختیار کی تھی۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ ان کے بڑے تو ایسے اس لئے تھے کہ وہ مویشی چراتے تھے اور انہی کا گوشت کھاتے، انہی کا دودھ پیتے اور انہی کی کھالوں کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناتے اور جب ان کے جانوروں کے لئے گھاس ختم ہو جاتی تو وہ اپنے جانوروں کو ہنکاتے اور یوں ہی منہ اُٹھائے کسی اور سمت چل دیتے ——— کنبوں میں، قبیلوں میں، قافلوں میں۔

پر یہ جو آج ہیں، یہ کیوں پریشان و بد حواس مارے مارے پھرتے ہیں؟ ان کو کون سا غم ستاتا ہے ——— یہ کوئی نہیں جانتا۔ البتہ چند تحقیق کرنے والے تاریخ جاننے والے وہ بھی ہیں جنہوں نے اپنے بڑوں کے خلاف بغاوت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کا جواب پا لیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ خانہ بدوش لوگ ایک پرانی داستان کو دہرا رہے ہیں۔ وہ داستان جو سب داستانوں سے پہلے شروع ہوئی تھی اور ابھی تک ختم نہیں ہوئی ——— لیکن یہ سب باتیں پرانوں کی سمجھ سے باہر ہیں۔

تو اس داستان کا آغاز یوں ہوا کہ ہزاروں بلکہ لاکھوں سال پہلے قدیم انسان کو ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ بلکہ یوں تھا کہ یہ حادثہ قدیم انسان کو نہیں، قدیم زمین کو پیش آیا تھا۔ آج سے ہزاروں بلکہ لاکھوں سال پہلے سورج مغرب سے طلوع ہوتا تھا اور یوں تھا کہ ان دنوں زمین مشرق سے مغرب کی سمت گھومتی تھی۔ پر یہ بات جو اب ہم کو اُلٹی نظر آتی ہے، اس زمانے کے لوگوں کے لئے بالکل صحیح اور قدرتی ہوگی کیونکہ جو ہوتا آیا ہے، ہوتا آیا ہے اور انسان روایت کا مارا ہوا، عادت سے مجبور، معمول پسند ہے۔ اس کے باوجود ان باتوں کا اب ہزاروں بلکہ لاکھوں برس بعد ہم صرف اندازہ ہی لگا سکتے ہیں کیونکہ ہمیں اس قدیم واقعہ کا کوئی شعوری علم نہیں ہے۔ ہمارے ذہن سے جو ویسے ان گنت صدیوں کا گہوارہ ہے یہ واقعہ بالکل ہی مٹ چکا ہے۔ پر ہم یہ جانتے ہیں کہ اگر یوں ہوا تھا تو وہ کوئی بہت ہی بڑے پیمانے کا حادثہ ہوگا جو اب ہماری یادوں، ہمارے شعور

ضمیر شعور سے بھی بالکل مٹ چکا ہے۔

اور کچھ وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ یہ حادثہ نہیں تھا بلکہ قدرت نے ہی ایسا چاہا تھا اور اس لئے یہ زندگی کا ایک عام سا واقعہ تھا جس طرح موت، تنزل، تبدیلی۔ اصل میں یہ واقعہ، یہ تبدیلی اس قدر آہستہ اور مسلسل تھی کہ انسان کو اس کا احساس تک نہ ہوا۔ انسان کی کتنی نسلیں اس کے دوران پیدا ہوئیں، آئیں اور چلی گئیں اور انھیں اس بات کا علم ہی نہ ہوا کہ وہ کسی حادثے سے دوچار ہیں۔ اور کون جانے کہ آج کا انسان بھی ان گزرے ہوؤں کی طرح صدیوں سے اسی قسم کے کسی حادثے کا شکار نہیں ہے اور شاید ہم سب صرف یہی جاننے کو بیتاب ہیں ـــــ لیکن یہ ایک اور کہانی ہے۔

پر یہ جاننا بھی مشکل ہے کہ وہ حادثہ جو ہزاروں بلکہ لاکھوں سال پہلے پیش آیا، اس کا اثر اس زمانے کے انسان پر کیا ہوا۔ کون جانے کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ صرف اندازے ہیں اور کچھ نہیں۔ اور کون جانے کہ ہم جاننا ہی نہیں چاہتے کیونکہ ہم ڈرتے ہیں کہ زیادہ جاننے کی کوشش میں جو کچھ ہم جانتے ہیں اسے بھی نہ کھو بیٹھیں۔ اور جانتے ہی کتنا ہیں! صرف اتنا کہ آہستہ آہستہ زمین کی گردش سست ہوتی گئی اور دن اور رات بڑھتے گئے، سینکڑوں برس بیت گئے اور انسان کی کچھ نسلوں کو تو اس بات کا علم ہی نہ ہوا لیکن پھر اچانک سب ہی کو ایک ساتھ یہ احساس ہوا کہ ان کی دنیا میں کوئی تبدیلی آ رہی ہے جو اجنبی اجنبی سی ہے۔ اب دن کو زیادہ گرمی پڑتی اور رات کو زیادہ سردی۔

یونہی دن بیتا کئے اور پھر ایک دن یوں لگا جیسے دھرتی گھومتے گھومتے تھک گئی ہے اور اب آرام چاہتی ہے اور ایک دن ڈرے سہمے لوگوں نے اپنے بچوں کو جو غیر ارادی طور پر سمٹے سمٹائے بیٹھے تھے عجب یہ بتایا کہ دھرتی دیوی تھک گئی ہے تو بچے بولے کہ اگر وہ تھک گئی ہے تو کچھ دیر کے لئے سو کیوں نہیں جاتی۔ اس پر ڈری سہمی مائیں اور زیادہ ڈر گئیں اور ان کے ماتھوں پر شکنیں پڑ گئیں (شاید انسان کے ماتھے پر یہ پہلی شکنیں تھیں) " نہ نہ ایسے سوال نہیں کیا کرتے۔ اس طرح نہیں سوچا کرتے نہیں تو دھرتی دیوی خفا ہو جائے گی۔"

پر دھرتی دیوی تو پہلے ہی سے خفا ہو چکی تھی اس ہر وقت کے گھومنے سے وہ بیزار ہو چکی تھی اور اب وہ آرام چاہتی تھی لیکن بیچارے انسان کیا کرتے۔ شروع میں تو انھوں نے زمین کے اندر گہرے غار کھود لئے تھے۔ دن کی تپش سے بچنے کے لئے وہ تمام دن اپنے جانوروں کے ساتھ ان میں گھسے رہتے اور جونہی دن ڈھلنے لگتا اور سائے لمبے ہونے لگتے، انسانوں اور حیوانوں، چرند اور پرند کے غول کے غول اپنی پناہ گاہوں سے شکار کی تلاش میں نکلتے جو جس کے ہاتھ آ جاتا اس کی خوراک بن جاتا اور جب سورج ڈوب جاتا اور افق کی سرخی سیاہی میں تبدیل ہو جاتی تو یہ دنگل یہ آنکھ مچولی ختم ہو جاتی اور انسان، مویشی اور درندے پھر زمین کے اندر، زمین کی پناہ میں چلے جاتے۔ اپنے اپنے ٹھکانوں میں چھپ جاتے، دوسری شام کا انتظار کرتے پر یہ سلسلہ کب تک چلتا۔ اب گرمی اس قدر شدید ہو گئی تھی کہ درخت اور گھاس اور پھول رفتہ رفتہ مرجھانے لگے تھے۔ شام کے قریب ان میں کچھ جان آتی تو رات ان کو اپنی خنکی تلے دبا لیتی۔

پھر ایک دن وہ بھی آیا کہ جب دن کی گرمی اور رات کی ٹھنڈک بیچارے انسانوں کی برداشت سے باہر ہو گئی، انھوں نے اپنی بستیاں چھوڑ دیں اور مویشیوں اور حیوانوں اور انسانوں کے قافلے غیر ارادی طور پر مشرق کی سمت چل دیئے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ یہ مسافت بے انتہا طویل ثابت ہوگی، اتنی طویل کہ ان کو طوالت کا احساس بھی نہ رہے گا کیونکہ ان کی آنے والی بے شمار نسلیں مشرق کی طرف منہ اٹھائے چلے جانے والے اس قافلے کا ساتھ دیں گی۔ بوڑھی ہو جائیں گی، تھک جائیں گی، ہار جائیں گی لیکن پھر دوبارہ نئی انسانی نسلیں پیدا ہوں گی جو ایک نئے عزم کے ساتھ پھر اسی قافلے میں شامل ہو جائیں گی یہاں تک کہ قافلوں میں چلنا ان کی فطرت بن جائے گی ـــــ اور وہ ازلی و ابدی قافلہ چلتا رہے گا۔ یونہی بے مقصد، بے معنی راستوں سے گزرتا ہوا۔ ان لوگوں کی قسمت میں اب آرام نہ تھا۔ آرام کی تلاش میں جس منزل کی طرف وہ روانہ ہوئے تھے وہ ان کو نظر نہ آتی تھی۔ اپنے نہ ختم ہونے والے سفر کے دوران ان کی کوشش یہ ہوتی کہ وہ ہمیشہ اس علاقے میں رہیں۔

جہاں رات کی تاریکی اور دن کی روشنی دونوں دھندلکے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ایک دو دن تھی جو جاری تھی لیکن دھندلکا ہمیشہ ہی رہتا۔ وہ برسوں اسی تگ و دو میں لگے رہے اور برسوں ہی اس میں ناکام۔ لیکن رفتہ رفتہ زمین کی گردش سست ہوتی گئی۔ دن اور رات زیادہ طویل ہوتے گئے، اور ایک دن یوں ہوا کہ دھندلکے کا علاقہ انسانی پہنچ میں آ گیا۔ یہ ان کے لئے ایک خوش آئند دن تھا کیونکہ اب یہ مویشیوں اور انسانوں پرندوں اور حیوانوں کا سیلاب ہر وقت دھندلکے میں رہتا اور دھندلکے ہی کے ساتھ سفر کرتا۔

اب دن اور رات اس قدر طویل ہو چکے تھے کہ گرمی کی شدت اور سردی کی تیزی اور دھندلکے کی تاریکی سے گھاس پھوس، درخت اور پھول مرجھا چکے تھے۔ زمین پر ایک مردنی سی چھا گئی تھی اور سمندری جانور ساکت، خاموش اور اندھیرے پانی کی عمیق تہوں میں جا چھپے تھے۔ پر انسان تو مجبور رہے۔ ان خانہ بدوشوں کو اپنے مویشیوں کے لئے ہریالی کی ضرورت تھی اس لئے ان میں سے کچھ لوگ گھاس پھوس کی تلاش میں مختلف راہوں پر نکل پڑے۔ اسی ظن کے مارے کچھ لوگ شمالی قطب کی طرف، اس کے نزدیک جا نکلے اور پہلی بار ہری بھری زمین کو دیکھ کر ان کی ترستی آنکھوں میں چین کی چمک نمودار ہوئی اور ان کے چہرے جو فکر اور پریشانی سے سیاہ اور نحیف پڑ گئے تھے، پہلی بار خوشی سے دمک اٹھے۔ انہوں نے تو اس ہلکی ہلکی دھوپ میں ہری بھری جنت پا لی تھی چنانچہ یوں ہوا کہ شمالی قطب کے ارد گرد آبادی کا بہت بڑا مرکز قائم ہو گیا ——— لیکن افسوس! کہ کچھ ہی دنوں بعد یہ بستی بھی اجاڑ ہو گئی۔ کیونکہ یہ آبادی سال میں صرف چھ مہینے تک قطب کے ارد گرد رہ سکتی تھی۔ شمالی قطب پر جب راتیں لمبی ہونے لگیں تو ان لوگوں نے اپنا ڈیرہ اٹھایا اور پھر ہریالی کی تلاش میں جنوب کی طرف چل پڑے، اور اس طرح یوں ہوتا کہ انسانی قافلے دو مختلف اور عمودی سمتوں میں چلا کرتے۔ ایک مستقل مغرب سے مشرق کی طرف اور دوسرا شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال کی طرف۔ اس مسلسل سفر کے دوران اکثر ایسا ہوتا کہ یہ دونوں قافلے آپس میں مل جاتے اور جب بھی ایسا ہوتا تو بہت سے لوگ اپنے پہلے قافلے کو چھوڑ کر دوسرے میں شامل ہو جاتے۔ کچھ اس وجہ سے کہ وہ ایک ہی رخ چلتے چلتے اکتا گئے تھے اور کچھ اس وجہ سے کہ وہ منچلے تھے اور مختلف علاقوں کو دیکھنے کا شوق ان کو زمین کے مختلف حصوں میں لے جاتا۔ اور قافلے چلتے رہے، انہی دو سمتوں میں چلتے رہے۔

اور پھر یوں ہوا کہ زمین کی گردش بالکل ہی رک گئی۔ زمین کب رکی اور کتنی دیر تک ساکت رہی ہے —— کون جانے —— یہ تو وہ بھی نہیں جانتے جو جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ کچھ کا تو کہنا یہ ہے کہ زمین سالہا سال تک ساکت رہی لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ کتنے سال تک تو وہ کوئی واضح جواب نہ دے سکے اور وہ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ صرف چند لمحوں کے لئے زمین کی گردش بند ہوئی اور اس کے بعد اس نے الٹی سمت میں گھومنا شروع کر دیا۔ ہاں البتہ ساکت ہونے سے پہلے اور اس کے بعد بعد عرصہ تک زمین کے گھومنے کی رفتار اس قدر سست تھی کہ اس زمانے کے لوگوں کو یہی محسوس ہوا جیسے زمین عرصے سے ساکت ہو۔ کیونکہ اب ان کا طویل سفر ختم ہو گیا تھا۔ شاید وہ منزل تک پہنچ گئے تھے —— اور اب ان کو دھندلکے کے پیچھے بھاگنا نہیں پڑتا تھا۔ زمین کو ساکت وہ اس لئے بھی سمجھتے رہے کہ وہ ایسے علاقے میں رہتے تھے جہاں اگرچہ روشنی اور تاریکی کی حدیں آپس میں ملتی تھیں لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ روشنی کی حد کہاں ختم ہوتی تھی اور تاریکی کہاں سے شروع ہوتی تھی، اس لئے وہ یہ محسوس نہ کر پائے کہ زمین کی حرکت کب بند ہوئی۔ ان کے یہ نہ جاننے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس دوران انسان کی کئی نسلیں آئیں اور چلی گئیں۔ انسان کی یہ نسلیں دھندلکے کی نسلیں تھیں۔ ان میں اکثر انسان تو رات کی تاریکی اور دن کی تمازت سے بالکل ہی ناواقف تھے۔ البتہ چند لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنے بزرگوں سے دھندلکے سے باہر کی دنیا کے بارے میں عجیب غریب قصے سن رکھے تھے جنہیں یہ کہہ کر ڈرا دیا گیا تھا کہ خبردار ان علاقوں میں نہ جانا، ایک طرف تو دھوپ کی تپش سے تم جھلس جاؤ گے اور دوسری طرف اندھیرے میں تم بھٹک جاؤ گے اور اپنا راستہ کھو بیٹھو گے۔ لیکن ایک آدھ بار یوں ہوا کہ چند سر پھرے ایسے بھی پیدا ہو گئے جو اپنے بزرگوں کے کہنے کی کوئی پروا نہیں کرتے تھے۔ وہ مشرق یا مغرب کی سمت کچھ دور تک نکل جاتے اور پھر واپس آ کر ان علاقوں کا جہاں تنہا وہ تھے، سوچ تھا یا تاریکی تھی اور لق و دق صحرا یا برف کی ایک چادر —— وہاں کے حالات وہ اس قدر بڑھا چڑھا کر بیان کرتے کہ وہ کہانیاں بن کر رہ جاتے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ جو نقشہ انہوں نے دانستہ میں بڑھا چڑھا کر کھینچا وہ حقیقت سے بہت کم تھا کیونکہ آخر کو وہ روشنی یا اندھیرے کی سرحد پر سے ہی تو لوٹ آئے تھے۔

اب جبکہ زمین رک چکی تھی۔ انسان دھندلکے کے خطے میں مستقل آباد ہوگیا تھا اور اس نے اپنے آرام و آسائش کے لئے وہ تمام چیزیں پیدا کرلی تھیں جو بے فکری اور اطمینان کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس نے اپنی بستیاں بنالی تھیں اور وہ گھر بنا کر رہنے لگا اور انسانی آبادی کا یہ خطہ، یہ پٹی زمین کے چاروں طرف ایک دائرے کی شکل میں پھیلی ہوئی تھی۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اگرچہ اس آبادی کا یہ خطہ قطبین کے سوا تسلسل کے ساتھ زمین کے گرد پھیلا ہوا تھا مگر آبادی کی ایک پٹی میں رہنے والوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ زمین کی دوسری طرف بھی دھندلکے کا خطہ موجود ہے اور جو انسانوں سے آباد ہے بلکہ ان میں سے اکثر لوگ تو اب یہ بھی بھول چکے تھے کہ وہ جس زمین پر رہ چکے تھے کہ وہ جس زمین پر رہتے ہیں وہ گول بھی واقع ہوئی ہے۔ اور پھر یوں ہوا جو ہوتا آیا ہے کہ ایک سر پھرے دماغ میں یہ بات سمائی کہ اگر شمال کی طرف چلا جائے اور قطب شمالی کے برفانی غیر آباد علاقے کو بھی پار کرلیا جائے تو دنیا کے دوسری طرف نئے انسانوں کی ایک اور بستی میں جا پہنچیں گے اور اس طرح کچھ لوگوں کی ایک جماعت انسانی توہمات اور مخالفت کے پردوں کو چیرتی ہوئی شمال کی طرف روانہ ہوئی۔ برفانی چوٹیوں کو سر کرتی ہوئی، راستوں کو روندتی ہوئی یہ باہمت مردوں کی جماعت شمال کے قطب کو پار کرنے میں کامیاب ہوگئی اور بالآخر زمین کی دوسری طرف بسنے والے انسانوں میں جا پہنچی اور یوں رفتہ رفتہ زمین کے اردگرد قطبین کے راستے سے انسانوں کی آمد و رفت شروع ہوئی۔

زمانہ گزرتا گیا اور زمین کی گردش معکوس، جو پہلے آہستہ تھی ـــــ اتنی آہستہ کہ اس کا سراغ بھی نہ ملتا تھا یہاں تک کہ یہ بھی پتہ نہ چلا تھا کہ وہ سکوت سے حرکت میں کب آئی تھی ـــــ اب تیز اور تیز تر ہوتی گئی۔ اور انسان جو اب تک غافل تھا چونک پڑا۔ اس کے لئے زمین کو حرکت میں تصور کرنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا عرصہ پہلے اس کے آباؤ اجداد کا زمین کو ساکت تصور کرنا ـــــ اور اس کے لئے یہ خبر بے حد حیران کن تھی۔ زمین کی حرکت کی خبر انسان کو کیسے ہوئی، یہ وثوق کے ساتھ نہیں معلوم۔ شاید پہلے ایک افواہ تھی جو مشرق کی سمت سے اٹھی اور دھندلکے کی پوری پٹی میں شمال سے لے کر جنوب تک پھیل گئی۔ افواہ پہلے تھی اور حقیقت بعد میں یا حقیقت پہلے تھی اور افواہ بعد میں۔ کوئی نہیں جانتا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خبر انسان کے لئے ضرور پریشان کن ہوگی ـــ بے حد ہی پریشان کن۔ قدرت کچھ یوں سفاک تھی کہ ان کی ننھی سی، عارضی خوشی کو بھی چھیننا چاہتی تھی اور اس بار قدرت کا یہ کرشمہ تو ان پر اس سے بھی زیادہ گراں گزرا جو ان کے آگے گئے ہوؤں پر گذرا تھا اگرچہ یہ تجربہ ـــــ زمین کا گھومنا ان کے لئے اتنا نیا نہیں تھا جتنا زمین کا ساکن ہونا ان کے بڑوں کے لئے تھا۔ اور یوں ہوا کہ دھندلکے کی پٹی کے مشرق میں رہنے والے پناہ لینے کے لئے دھندلکے کے مغربی حصوں میں وارد ہونے لگے۔ شاید یہ ایک دوسرے بڑے قافلے کی پہلی لہر تھی جو مشرق سے اٹھی تھی اور مغرب کی سمت سفر کر رہی تھی یا شاید یہ پہلا ہی قافلہ تھا جو کچھ دیر پڑاؤ کرنے کے بعد اب اسی سمت چلنا شروع ہوگیا تھا جس سمت سے آیا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ کس سمت سے آیا تھا اور کس سمت اسے جانا تھا۔ اور یوں ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں سمندری لہروں کی طرح لوگوں کی کھیپ کی کھیپ دھندلکے کے مشرقی کنارے سے اٹھتی اور مغرب کی طرف چل دیتی اور رفتہ رفتہ انسانی سمندر میں مدغم ہوجاتی جو ابھی ساکن تھا لیکن حرکت میں آنے کے لئے تلا بیٹھا تھا۔ اور جس طرح پانی کی روئیں سمندر میں چلتی ہیں اور اردگرد کے پانی کو بھی سمیٹ کر اپنے ساتھ لے جاتی ہیں، اسی طرح ایک روز جنگلی جانوروں کا طوفان مشرق سے ابھرا اور ہریالی کو روندتا ہوا۔ دھول کے بادل اڑاتا ہوا مغرب کی طرف بھاگ کھڑا ہوا اور یوں یہ حیوانی لشکر انسانی قافلے کا ہراول دستہ بنا۔ انسانوں کی عظیم آبادیاں پھر اجاڑ ہوگئیں انھوں نے اپنا گھر بار چھوڑا اور لمبے ختم نہ ہونے والے سفر پر دوبارہ روانہ ہوگئے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب وہ مخالف سمت چل رہے تھے اور جس طرف سے آئے تھے اسی طرف جا رہے تھے پر وہ نہ جانتے تھے، جس طرح وہ اول بابت کچھ نہ جانتے تھے۔ اور یوں انسان اور قدرت کے درمیان دوبارہ ایک طویل کشمکش شروع ہوگئی ـــــ وہ کشمکش جو اب بھی جاری ہے۔

پر یہ جو آج کل کے لوگ ہیں، جو ہمارے گھروں کے سامنے کھلے میدانوں میں یا سڑکوں کے کنارے اجاڑ علاقوں میں آ کر عارضی سے خیمے گاڑ لیتے ہیں، کھلی ہوا میں سانس لیتے ہیں، نیلے تاروں بھرے آسمان تلے کچی زمین پر سوتے ہیں، ہنستے ہیں، مگن رہتے ہیں اور باہر زمین پر آگ جلا کر وہ اور ان کی عورتیں مل جل کر کھانا پکاتے ہیں لیکن پھر بھی ہم سے الگ تھلگ اور دور دور رہتے ہیں اور یوں اکیلے اور تنہا نظر آتے ہیں اور پھر کچھ دن ایک جگہ قیام کر کے اپنے خیمے اکھاڑ کر دوسری طرف چل دیتے ہیں ـــ تو یہ لوگ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟ اور انھیں زمین کا کوئی خطہ کوئی گوشہ پسند کیوں نہیں آتا؟

نورالحسن ہاشمی

ڈاکٹر سعدی

وہ مجھے خدا حافظ کہنے کے لئے میرے ساتھ سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ اچانک میرا پاؤں رپٹا اور میں یکبارگی پانچ چھ سیڑھیاں لے کر گیا۔ بالکل اس طرح جیسے بچے پھلنے والے تختے پر سے پھسلتے چلے جاتے ہیں۔ سیڑھیاں سیمنٹ کی تھیں اور ڈاکٹر سعدی کے سماجی نے بھی مجھے گرتے دیکھا دم بخود ہو گیا اور مجھ سے اظہار ہمدردی کرنے لگا۔

ڈاکٹر سعدی کو میرے گرنے پر ہنسی کا جو دورہ پڑا وہ میرے لئے بیحد حیران کن تھا۔ اسے میں نے پہلی مرتبہ قہقہے لگاتے ہوئے دیکھا۔ ہنسی کا ایک طوفان تھا جو تھمتا ہی نہ تھا۔ یکایک اس نے کہا "آپ کو ضرور چوٹ لگی ہے" اور وہ پھر ہنسی کے پالنے میں جھولنے لگی اور میں غم و غصہ کے عالم میں مٹھیاں بھینچ رہا تھا "یہ کونسا موقع ہے ہنسنے کا؟" دوسرے لوگوں نے مجھ سے اظہار ہمدردی کیا مگر ڈاکٹر ہے کہ ہنسے چلے جا رہی ہے یہ ماجرا کیا ہے؟ میرے لئے یہ نفسیاتی تحقیق کا ایک مسئلہ بن گیا۔ وہ اس لئے کہ میں نے ڈاکٹر کو قہقہے تو در کنار کھل کر مسکراتے ہوئے بھی بہت کم دیکھا تھا۔ میں اسے اس معاملہ میں بیوروکریٹ کہا کرتا تھا۔ وہ ہنسنے اور مسکرانے میں بیحد بخل سے کام لیتی تھی۔ وہ حد درجہ متین، حد درجہ سنجیدہ اور کم سخن تھی۔ اور پھر اس کی عمر ہی کیا تھی۔ یہی ۲۲ ۲۳ برس۔ ہر بات پر "نا" اور "نہیں" کہنا اس کی عادت ثانیہ تھی۔

"ڈاکٹر میرے ساتھ چائے پیوگی؟" ۔۔۔ "نہیں۔"

"ڈاکٹر کل پھر ملنے آؤں؟" ۔۔۔ "نہیں۔"

"ڈاکٹر آج تم بہت اچھی لگ رہی ہو" ۔۔۔ "نہیں"

"ڈاکٹر میں تمہارے منفی انداز سے سخت تنگ ہوں۔ اب تم سے کبھی نہ ملوں گا" ۔۔۔ "نہ ملئے۔"

"ڈاکٹر تم کبھی مسکراؤ گی بھی؟" ۔۔۔ "نہیں"

غرضیکہ "نا" اور "نہیں" اس کی شخصیت کا حصہ بن چکے تھے۔

میں نے بہت سوچا کہ آخر ڈاکٹر میرے گرنے پر اتنی لطف اندوز کیوں ہوئی؟ سوچ سوچ کر اسی نتیجہ پر پہنچا کہ شاید اس کی زندگی میں طرب انگیز یا قہقہہ افزا لمحات بہت کم آئے ہیں۔ شاید وہ ہوش سنبھالتے ہی ایک ایسی چٹیل اور ہموار راہ پر چلنے لگی جس پر نہ کہیں اونچ نیچ تھی نہ آس پاس چرند پرند یا سبزہ یا درخت یا پھول یا ہنستے کھیلتے چہرے یا شریر لڑکے لڑکیاں۔ غرضیکہ اس کے ۲۲-۲۳ برس نہایت ہی متین و سنجیدہ بلکہ شدید نظم و ضبط کے ماحول میں گزرے ہوں گے حتیٰ کہ اس کے سکول اور کالج کے زمانے میں یا اس کے محلے یا گلی میں کوئی لڑکا یا لڑکی پھسل کر گری بھی نہ ہو گی جسے دیکھ کر ڈاکٹر ہنستی۔

اتنا مجھے معلوم ہے کہ ڈاکٹر کا گھریلو ماحول سخت مذہبی تھا۔ والدین صوم و صلوٰۃ کے سخت پابند۔ والدین کے علاوہ اس کی بڑی ہمشیرہ بھی حج

کے فریضے سے فارغ ہو چکی تھیں۔ وہ خود بھی پانچ وقت نماز پڑھتی تھی۔ خدا نے اُسے کتابی چہرے سے نوازا تھا۔ سانولی سلونی، تیکھے دلکش ناک نقشے والی: ڈاکٹر سعدی لباس نہایت سادہ پہنتی تھی۔ اسے میں نے کبھی ریشمی لباس میں نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ سوتی سفید شلوار اور ہلکے پرنٹ کی سوتی قمیض میں ملبوس رہتی۔ میک اپ کے قریب بھی نہ پھٹکتی تھی۔ بال اُس کے اکثر خشک ہی دیکھے۔ سیدھی سادی کنگھی اور جوڑا کر لینا۔ معمولی سینڈل پہنتی لیکن ساتھ جراب ضرور ہوتے۔

سیڑھیوں سے رپٹنے کے دو دن بعد ڈاکٹر نے فون پر مجھ سے پوچھا "اُس دن آپ کو چوٹ تو نہیں لگی تھی؟" یہ پوچھتے ہی اُس پر پھر ہنسی کا دورہ پڑا۔ میں نے غصّے میں فون بند کر دیا۔ اُس نے پھر فون کیا اور پھر یہی پوچھا۔ میں نے غصّے میں جواب دیا۔ "نہیں۔"

مجھے ایسا لگا جیسے وہ ہنسی پر ضبط کر رہی ہے۔ اُس نے کہا "آپ کو ضرور چوٹ لگی ہے، آپ چھپا رہے ہیں۔" میں نے پھر کہا "نہیں۔" اُس پر اُس نے جھلا کر پوچھا "یہ نہیں نہیں کیا لگا رکھی ہے؟" میں نے جواب دیا "یہ تم ہی سے سیکھا ہے۔ تم بھی تو ہر بات پر نہیں اور ناہی کہتی ہو۔" اب کے اُس نے فون بند کر دیا۔

دوسرے یا تیسرے دن وہ میرے دفتر آ گئی اور کہنے لگی: "میرے ساتھ میرے گھر چائے پئیں۔ ابا بھی ہوں گے۔" میں نے فوراً کہا "نہیں۔" اُس کا متین اور سنجیدہ چہرہ سُرخ ہو گیا۔ کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہنے لگی: "اچھا تو نہیں آئیں گے آپ؟"

میں نے شرارت کے انداز میں پھر کہا "نہیں۔"

وہ فوراً اُٹھی اور جانے لگی۔ میں نے لپک کر اُس کا بازو پکڑا۔ اُس نے فوراً میرا بازو جھٹک دیا اور کہا "مجھے ہاتھ نہ لگائیے۔ آپ بہت بڑھتے جا رہے ہیں۔" مجھے گویا پسینہ سا آ گیا۔ میں نے پہلی مرتبہ اس طرح اُسے ہاتھ لگایا تھا۔

میں نے ملتجیانہ نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے بیٹھنے کو کہا۔ وہ غضبناک چہرہ لئے ہوئے بیٹھ گئی۔

میں نے پوچھا "چائے پینے کس وقت آؤں؟"

چہرے پر کوئی تغیر لائے بغیر اُس نے کہا "کل صبح ساڑھے دس بجے۔" اُس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

ایک منٹ بعد وہ اُٹھی اور میرے منہ پر "السلام علیکم" مار کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

دوسرے دن میں ٹھیک صبح کے ۱۰۔۳۰ بجے سعدی کے گھر پہنچا۔ اُس کے ابا بھی موجود تھے۔ چائے نہایت پُرتکلف تھی۔ پھل، مٹھائیاں، کیک، پیسٹری سبھی کچھ موجود تھا۔ مگر چار دانیاں دو تھیں۔ ایک بڑی، ایک ننھی سی۔ بڑی میں چائے اور چھوٹی میں دودھ تھا۔ مجھے کچھ اچنبھا سا ہوا۔ یہ لوگ اچھے خاصے خوشحال ہیں۔ مکان، زمین، بینک بیلنس سبھی کچھ ہے۔ پھر کراکری کے معاملے میں کنجوسی کیوں۔ معمولی دودھ دان دو ڈھائی روپے میں مل جاتا ہے۔ چار دانی سے دودھ برتنا اور وہ بھی ایک پُرتکلف چائے پر مجھے عجیب سا لگا۔

اس سے پیشتر بھی مجھے دو ایک بار سعدی کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اُس نے دونوں مرتبہ دودھ اور چینی سے بھر پور چائے کی پیالی مجھے پیش کی۔ اُس وقت تو میں زہر مار کر گیا۔ مگر بعد میں میں نے اُس سے احتجاج کیا۔ شاید اُسے یہ احتجاج یاد تھا اسی لئے اگلی مرتبہ اس نے چائے دودھ اور شکر الگ الگ پیش کی مگر دودھ چار دانی سے برتا گیا۔ دو چار دن کے بعد میں نے اُس سے پھر احتجاج کیا۔ اُس نے بہتیری تاویلیں پیش کیں مگر میں نے ایک نہ سُنی۔ وہ جھلا اُٹھی اور کہا "آئندہ آپ میرے گھر نہیں آئیں گے۔"

اس پُرتکلف چائے پر اِدھر اُدھر کی بیکار سی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے ابا کی موجودگی میں یہی کچھ ہونا تھا۔ چائے کے بعد میں چلنے لگا تو

ڈاکٹر نے کہا "مجھے کالج ڈراپ کر دیں" اس فقرے میں بھی حکم کا عنصر موجود تھا۔ اُس کے آبا ہمیں سڑک تک چھوڑنے آئے۔ وہ میرے برابر بیٹھ گئی۔ کار اسٹارٹ کرتے ہی میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ خاموش رہی اور سامنے ٹریفک کا جائزہ لیتی رہی۔

میں نے دوبارہ شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: "ڈاکٹر تم بھلی چنگی لڑکی ہو ہر لحاظ سے نارمل ہو۔ مگر تمہارے مزاج میں تکبر، درشتی، بے نیازی، پارسائی یا تو قدرتی طور پر موجود ہے یا تم ضرورت سے زیادہ بنتی ہو۔"

بس وہ تو تلملا گئی — چمک کر بولی: "تکبر سے مجھے سخت نفرت ہے۔ درشتی میرے مزاج کا حصہ ہرگز نہیں۔ بے نیازی سے نہ جانے آپ کا کیا مطلب ہے؛ نماز مجھے ورثہ میں ملی ہے — یاد رکھیے میں حاجی باپ کی بیٹی ہوں۔"

اتنا طویل فقرہ اس نے فرفر بولا۔ بغیر میری طرف دیکھتے ہوئے میں نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔ باقی مختصر راستہ خاموشی میں کٹا — ہسپتال کے قریب پہنچے تو اُس نے نہایت روکھے پن سے کہا "بس مجھے گیٹ ہی پر اتار دیجیے۔" میں نے فوراً بریک لگائی وہ بگولے کی طرح اٹھی اور باہر نکل کر اس نے کار کا دروازہ اتنے زور سے بند کیا کہ تمام گاڑی ہل گئی۔ چہرہ کالج ہی طرف رکھتے ہوئے اُس نے ایک مرتبہ پھر السلام علیکم میرے منہ پہ دے مارا اور سامنے والی سیڑھیوں میں غائب ہو گئی۔

"کس لڑکی سے پالا پڑا ہے"؛ میں بڑبڑایا اور کار لوٹا کر گھر کا رُخ کیا۔

میرے لئے ڈاکٹر ایک معما تھی — مجھے اُس کی بے نیازی سے اتنا ڈر نہیں لگتا تھا جتنا اُس کی پارسائی سے۔ وہ مجھے بےحد مقدس دکھائی دیتی تھی۔ اس سے گفتگو کرتے ہوئے مجھے اکثر یہ محسوس ہوا جیسے میں کسی نن سے باتیں کر رہا ہوں۔ وہ طویل فقرے بہت کم بولتی تھی۔ اُس کی مختصر گوئی میں بھی نا اور نہیں کی بھرمار ہوتی تھی۔ میں اُس کے پاس دو دو گھنٹے بھی بیٹھا مگر باتیں مجھی کو کرنا پڑیں۔ ان تمام حوصلہ شکن باتوں کے باوجود ڈاکٹر سے مجھے بےپناہ محبت ہو چکی تھی۔ میری زندگی نہایت پُرسکون ڈگر پر چل رہی تھی۔ فرائض کی ادائیگی میں میرا بےشمار لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ ان میں خواتین اور نوجوان لڑکیاں بھی ہوتی تھیں۔ خواتین اور لڑکیوں میں بعض اوقات نہایت دلکش اور شوخ و شنگ ہستیوں کا بھی سامنا ہوتا تھا لیکن حاشا وکلا میں کبھی پھسلا نہیں۔ ایک آدھ مرتبہ لغزش ہوئی مگر فوراً سنبھل گیا۔ مگر ڈاکٹر کا معاملہ ہی کچھ اور تھا — وہ چپکے سے بلکہ پنجوں کے بل میری زندگی میں داخل ہوئی اور پھر بلا تکلف میرے سکونِ قلب پر چھاپہ مار کر بیٹھ رہی، اور مجھے سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا۔ بڑی دیدہ دلیر نکلی۔

وہ دن مجھے خوب یاد ہے جب وہ پہلی مرتبہ میرے کمرے میں آئی تھی اور بڑے موثر انداز میں اپنی ایک سہیلی کے کیس کی وضاحت کی تھی۔ اُس کے سر اور بازوؤں کی جنبش نے اُس کی زبان کا ساتھ دیا اور وہ بزعمِ خود میدان مار کر چلی گئی۔ چند دن بعد وہ پھر نمودار ہو گئی۔ اور پوچھا "آپ نے اُس کیس کا کیا کیا؟"

یہ معاملہ خاصا پیچیدہ ہو چکا تھا اور اُسے حل کرنا کوئی آسان نہ تھا۔ میں نے کہا "ابھی کچھ دن لگیں گے"— چندے توقف کے بعد وہ چلی گئی اور ہفتہ عشرہ کے بعد پھر آن دھمکی۔

اسی دوران میں میں معاملہ کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ ماتحت عملہ نے کیس خاصا خراب کر رکھا تھا اور درحقیقت ڈاکٹر کی سہیلی سے بےانصافی ہوئی تھی۔ میں نے معاملہ ٹھیک ٹھاک کر دیا اور اُسے اب محض اطلاع ہی دینا تھی کہ فیصلہ اُس کی سہیلی کے حق میں ہو چکا ہے — دوسری طرف یہ خدشہ تھا کہ اگر فیصلہ سنا دیا تو ڈاکٹر کے ساتھ آج کی نشست آخری ہو گی۔ میں چاہتا کہ اُس کا آنا جانا بند نہ ہو۔ ڈاکٹر نے بیٹھتے ہی پوچھا "کچھ فیصلہ ہوا؟"

میں نے عرض کی " انشاء اللہ جلد ہی کام بن جائے گا اور میں آپ کو اطلاع بھجوادوں گا "

"نہیں - آپ آج ہی مجھے دو ٹوک جواب دیجئے "

"دو ٹوک جواب میرے لئے ناممکن ہے کیس کو ابھی کئی مراحل طے کرنا ہیں ۔ مگر انشاء اللہ کام بن جائے گا "

"کیس کس سٹیج میں ہے اور ابھی کتنے دن لگیں گے ؟"

"آپ تفصیلات نہ پوچھیں "

"میں ضرور پوچھوں گی "

میں جواب نہیں دوں گا "

"نہ دیں ۔ میں ہفتہ بعد پھر آؤں گی "

"ضرور تشریف لائیں "

وہ جانے لگی تو میں نے ایک منٹ بیٹھنے کو کہا —— وہ بیٹھ گئی ۔ میں نے پوچھا "ایک سوال کروں آپ ناراض تو نہیں ہوں گی "؟

"ناراض ہونے والی بات ہوئی تو ضرور ہوں گی "

"یہ بتلایئے کہ آپ کی سہیلی خود اپنے کیس کے لئے کیوں نہیں آئی "؟

"وہ پردہ کرتی ہے "

"آپ کیوں نہیں کرتیں "

"آپ کون ہوتے ہیں یہ بات پوچھنے والے ؟"

"بتلایئے نا !"

"میرے والدین نے اجازت دے رکھی ہے "

"کیوں ؟ آپ تو حاجی باپ کی بیٹی ہیں "

"میرا جو پیشہ ہے اس میں پردہ رکاوٹ پیدا کرتا ہے "

"ویسے آپ پردے کی حامی ہیں ؟"

"جی "

"گویا دولت کمانے کی خاطر آپ نے پردہ چھوڑنا مناسب سمجھا "

"نہیں ، خدمت خلق کے لئے "

خدمت خلق تو بہانہ ہے ۔ آپ کے بعض ہم پیشہ لوگ تو لوگوں کی کھال کھینچ لیتے ہیں "

بات پردہ کی ہو رہی تھی ، آپ پیشے پر آگئے ۔ میں نے اپنے والدین کی اجازت سے پردہ چھوڑا ہے ۔ اُن کی مرضی کے خلاف نہ میں نے آج تک کوئی اقدام کیا ہے نہ آئندہ کبھی کروں گی "

"آپ بڑی نیک بخت اور سعادت مند ہیں "

"نہیں۔ اچھا میرا وقت ضائع نہ کریں"

اُس نے میرے منہ پر سلام علیکم کا گولہ دے مارا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

الٹی میٹم کے مطابق وہ ہفتہ عشرہ بعد پھر آئی اور جواب طلب کیا۔ میں نے اُس کی نشست کو طول دینے کے لئے اُسے ایک تار دکھلایا جو اُس کی آمد سے چند منٹ پہلے مجھے ملا تھا۔ میں نے اُس سے مشورہ طلب کیا۔ تار پڑھ کر اُس نے پوچھا "یہ کون لڑکی ہے؟"

"میری عزیزہ ہے"

"کیوں بلا رہی ہے؟"

"اُس کی شادی کا مسئلہ ٹرک پر پہنچا ہوا ہے۔ جہاں وہ شادی کرنا چاہتی ہے والدین اُس رشتے سے خوش نہیں ہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ میں جا کر اُس کے والدین کو ہموار کروں"

"آپ کے نزدیک لڑکی کیسی ہے؟"

"بہت اچھی"

"میں صورت نہیں پوچھ رہی ہوں۔ ویسے کیسی ہے؟"

"میں بھی صورت کا ذکر نہیں کر رہا۔ سیرت اُس کی بہت اعلیٰ ہے"

"غلط، سب غلط۔ جو لڑکی والدین کی مرضی کے خلاف رشتہ کرے۔ وہ ہرگز اچھی سیرت کی مالک نہیں ہو سکتی۔ آپ ہرگز نہ جائیں ورنہ آپ بھی برابر کے مجرم ہوں گے"

نہ جانے کیوں میں نے اُس کی موجودگی میں تار بھیجدیا کہ "میں نہیں آ سکتا" تار بھجوانے کے بعد میں اصل موضوع پر آیا اور بتایا کہ اُس کی سہیلی کا کیس سلجھا دیا گیا ہے اور اب وہ اگلا قدم اٹھا سکتی ہے۔ اُس نے نہایت متانت سے شکریے کا فقط ایک لفظ ادا کیا اور اپنی سہیلی کا کیس بھلا کر پوچھا "آپ نے تار بھجوانے میں بہت عجلت سے کام لیا۔

"آپ کا یہی مشورہ تھا نا"

اُس نے "آپ نے اچھا کیا" کہا اور اپنی کتاب اور سٹیتھوسکوپ سمیٹ، سلام علیکم کہہ یہ جا وہ جا۔ اور میں دیکھتا ہی رہ گیا۔

نہ جانے اب وہ آئے گی یا نہیں۔ جس کام کے لئے وہ آتی تھی وہ ختم ہو گیا۔ اب وہ کیوں آئے گی۔۔۔ میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ چند منٹ سکتے کے عالم میں رہ کر میں دوبارہ اپنے کام میں غرق ہو گیا۔

دن اور ہفتے گزرتے رہے۔ مگر نہ اُس کا فون آیا نہ وہ خود آئی۔ میں نے بھی دل کو تسلی دی کہ ایک دور تھا جو ختم ہوا۔ دنیا کا کاروبار خواہ کیسا ہی ہو اسی نہج پر چلتا ہے۔ مگر ڈاکٹرنی یادداشت شعور میں گھر کر چکی تھی۔

محبت کے تیر مجھ پر کم ہی کارگر ہوئے تھے۔ میں خود کو اس معاملے میں سراپا ڈھال سمجھتا تھا مگر ڈاکٹرنی اور ہی چیز تھی۔ اُس کے اکھڑ پن میں بھی ایک ایسی جاذبیت تھی کہ میری ڈھال خود بخود اُس کے قدموں میں جا گرتی تھی۔

مہینوں بعد وہ دوسری بار جب مجھے ملنے آئی تھی تو ملاقات مختصر تھی مگر فتنہ انگیز۔ ہوا یوں کہ اُس کی سہیلی کا کیس سنتے ہوئے نہ جانے میرے منہ سے کیا فقرہ نکلا کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بے اختیار مسکرا دی۔

بس یہی مسکراہٹ مجھ پر قیامت بن کر ٹوٹی۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم یہی کوئی پانچ سیکنڈ رہا ہوگا مگر اس نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میں زندگی بھر میں سینکڑوں نہیں ہزاروں لوگوں سے ملا ہوں گا۔ ان میں لڑکیوں اور خواتین کا تناسب بھی خاصا تھا مگر ایسی قیامت شکن مسکراہٹ!! معاذاللہ!

میں اس کے خلوص اور دلکشی کا روزِ اول ہی سے قائل تھا۔ اپنی سہیلی کی وکالت اس نے جس خلوص سے کی تھی، وہ بجائے خود میرے لئے ایک عظیم الشان تجربہ تھا لیکن اس کی مسکراہٹ نے تو میری زندگی کا دھارا ہی موڑ دیا۔ اس مختصر تبسم میں وہ میرے سامنے کائنات کی حسین ترین شے بن کر جلوہ گر ہوئی اور میں بقائمی ہوش حواس اس کے قدموں میں تھا۔

جب پانچ چھ ملاقاتیں ہو گئیں تو ایک دن جی کڑا کر کے میں نے کہا، "ڈاکٹر ذرا مسکرا دو۔"

"اس کی بھویں تن گئیں۔ پوچھا "کیا مطلب؟"

"مطلب یہی کہ تم کبھی مسکراؤ گی بھی یا نہیں؟"

"نہیں، ہرگز نہیں۔"

"سنو سعدی۔ تمہاری مسکراہٹ نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ میں نے ایسی مسکراہٹ زندگی بھر نہیں دیکھی۔ چلو بناوٹی تبسم ہی لبوں پر لے آؤ۔"

ڈاکٹر کا چہرہ غصہ سے تمتما گیا "دیکھئے جناب میرے سامنے ایسی بیہودہ باتیں نہ کیجئے۔ میں اس قسم کی خرافات کی عادی نہیں ہوں۔ میں آپ کو کہہ چکی ہوں کہ میں حاجی باپ کی بیٹی ہوں۔"

خرافات کا لفظ میرے منہ پر طمانچہ تھا۔ میں نے فوراً معافی مانگ لی اور وہ خاموش رہی۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ جب بھی اس سے ملاقات ہوگی تو صرف دو اور دو چار قسم کی باتیں کروں گا۔ یعنی اتنی ہی جتنی کہ اشد ضروری ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ پھر آئی تو اس کے مختصر سوالوں کا جواب میں نے مختصر ترالفاظ میں دیا اور اس کی طرف دیکھے بغیر۔ گفتگو میں بار بار وقفہ آیا، نہایت تکلیف دہ سکتہ۔ مگر میں اپنی روش پر جما رہا۔

آخر اس نے کہا "اچھا میں چلتی ہوں۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ "دو منٹ بیٹھئے۔ ٹھنڈ ہو رہی ہے۔ چائے کی پیالی پی لیں۔"

وہ بیٹھ گئی۔ چائے آئی۔ اردلی چائے بنانے لگا تو اس نے کہا "تم جاؤ میں خود بناؤں گی۔"

اس نے میرے آگے چائے کی پیالی رکھ دی اور حسبِ معمول خاموش بیٹھی رہی۔ میں نے طنزاً کہا "آپ نے بہت زحمت کی۔ شکریہ!"

"نہیں۔"

"شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے۔"

"نہیں کوئی ضرورت نہیں۔"

یہ سوچ کر کہ شاید چائے کی پیالی پینا گوارا کر کے اس نے اپنے بہتر موڈ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میں نے اِدھر اُدھر کی ہانکنا شروع کی "سعدی تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"میں اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر جاؤں گی۔"

"کب؟"

"اگلے سال"

"پھر"

"پھر یہیں آکر پریکٹس کروں گی۔"

"خوب دولت کماؤ گی!"

"خدمتِ خلق کروں گی ــــــ"

"پریکٹس شہر کے کس حصہ میں کرو گی؟"

"یہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔"

"پریکٹس وہیں کرنا جہاں تمہارے والد نے تمہارے لئے چار کنال زمین لے رکھی ہے۔ تمہارے تب تک وہاں ایک بہت اعلیٰ کالونی آباد ہو چکی ہو گی۔"

میرے اس فقرے پر ڈاکٹر تیوراسی گئی۔ "کہاں ہے وہ چار کنال زمین؟ آپ کو کیسے علم ہوا اس بات کا؟"

"چھوڑو اس بات کو۔ یہ بتلائیے کہ اپنی زمین میں سے مجھے ایک کنال زمین دو گی؟"

ڈاکٹر کے چہرے پر پہلی بار میں نے اتار چڑھاؤ دیکھا۔ وہ کسمساسی گئی اس کے لب ہلے مگر وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ اس نے ایک دم جانے کا فیصلہ کیا اور چند لمحوں میں وہ میرے کمرے سے باہر تھی۔

اُس کی سہیلی کا معاملہ اُلجھ جانے کے دو تین ماہ تک اُس سے کوئی ملاقات نہ ہوئی اور نہ اُس کا فون آیا۔ میں اُس سے قریب قریب مایوس ہو چکا تھا۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور ایک صبح ہسپتال جا نکلا۔ وہ راؤنڈ پر تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکی۔ نرس کو کہا "تم چلو میں آتی ہوں۔" نرس آگے نکل گئی۔

"السلام علیکم"

"وعلیکم السلام۔ کیسے آنا ہوا؟"

"یونہی"

"کیوں وقت ضائع کیا آپ نے؟"

"بس آپ سے دو منٹ بات کرنا تھی۔"

"مجھے فرصت نہیں ہے۔"

"کیا اور کسی وقت آسکتا ہوں؟"

"کل"

"کس وقت؟"

"ساڑھے پانچ بجے شام"

"کہاں ؟"

"میرے کمرے میں"

"آپ کا کمرہ کہاں ہے ؟"

ڈاکٹر نے سمجھا دیا۔

"مجھے دستک دینا ہوگی ؟"

"دروازہ کھلا ہوگا۔ ہلکی سی دستک دے کر اندر آ جائیے گا۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے اپنے کمرے کی نشاندہی کی تھی ـــــ اُس سے خلوت میں ملنے کی امید نے میرا سکونِ قلب لوٹ لیا۔ دوسرے دن ساڑھے پانچ بجے سہ پہر تک میں بہت ہیجان میں رہا۔

دوسری سہ پہر میں اُس کے کمرے میں داخل ہوا تو اسے آرام کرسی پر سوتے ہوئے پایا۔ شاید تھکن کے مارے اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ میں چند منٹ اُسے دیکھا کیا۔ اُس کے بالوں کی ایک لٹ رخسار پر کنڈلی مارے ہوئے تھی مجھ سے نہ رہا گیا اور میں وفورِ جذبات سے مجبور ہو کر جھکا اور اُس کے داہیں رخسار کو ہلکے سے چوم لیا۔

ایک طوفان اُمنڈ پڑا۔ وہ ترنت بھڑک اُٹھی۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ دروازہ اندر سے بھیڑا اور مجھ پر برس پڑی۔

اُس نے دوسری مرتبہ مجھ سے اتنی طویل بات کی جو نہایت ہی تلخ تھی۔

"آپ کو جرأت کیسے ہوئی ؟ آپ نہایت ذلیل ہیں۔ میری غفلت سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آئی ؟ آپ نے کمینگی کی ہے آپ کی بیٹی کے ساتھ ایسی ہی حرکت ہوتی تو آپ کا ردِ عمل کیا ہوگا ؟ میرے والدین نے مجھ پر اعتماد کر کے یہاں بھیجا ہے۔ اگر میں اُن کا اعتماد کھو بیٹھوں تو مجھ پر ہزار لعنت۔ کاش آپ کی اس حرکت سے پہلے مجھے موت آ گئی ہوتی !! میں آپ کی صورت سے بیزار ہوں۔ نکل جائیے میرے کمرے سے اور خبردار جو کبھی اِدھر کا رُخ کیا ـــــ"

ایک ہی سانس میں وہ نہ جانے کیا کیا کہہ گئی اور اگر میں اُس کے کمرے سے نکل نہ جاتا تو نہ جانے وہ اور کیا کچھ کہتی۔

ایک اُبھرتی ہوئی حسین عمارت دھڑام سے گر پڑی۔ ایک دلکش غزل بڑے المناک اور تلخ مقطع پر ختم ہوئی۔

اس المیے کو دو ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ مجھے اچانک تبادلے کا حکم ملا ـــــ انہی دنوں میرا ایک دوست گردے کے درد میں مبتلا ہو کر اسی ہسپتال میں داخل ہوا۔ میں لپک جھپک اس کی عیادت کر جاتا اور اسی طرح ہسپتال سے باہر نکل آتا کہ کہیں ڈاکٹر دیکھ نہ پائے اور سب کے سامنے مجھ پر برس نہ پڑے۔

ایک صبح کیا دیکھتا ہوں کہ بڑا ڈاکٹر اُسے لئے میرے بیمار دوست کے کمرے میں داخل ہوا۔ سخت سردی کے باوجود میری پیشانی پر پسینہ آ گیا۔

ڈاکٹر سعدی نے مجھے دیکھا اور فوراً اپنے سینیئر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ سینیئر ڈاکٹر نے میرے دوست کا معائنہ کیا، چارٹ دیکھا اور سعدی کو کچھ ہدایات دیں۔ میں اس دوران ٹہل کر کمرے کے ایک کونے کی طرف سرک گیا تھا۔

بڑے ڈاکٹر نے میرے دوست کو تسلی دی اور چلے گئے۔ سعدی اُن کے پیچھے تھی۔ اضطراب کی سی کیفیت میں میں بھی کمرے سے باہر نکلا اور سعدی کے پیچھے چلنے لگا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا اور ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ ڈر کے مارے میرا کلیجہ منہ کو آ گیا اور میں ٹھہرنے کی بجائے اُس سے آگے نکل گیا۔

اُس نے مجھے آواز دی ـــــ میں گویا کانپ گیا۔

میرے نزدیک آ کر وہ بولی "یہ آپ کے کون ہیں؟"

"میرے دوست ہیں۔"

"حالت کافی خراب تھی۔ اب اللہ کے فضل سے بہت بہتر ہے۔"

میری جان میں جان آئی ہمت کر کے کہا "ڈاکٹر صاحب میرا تبادلہ ہو گیا ہے۔"

"جھوٹ"

میں نے اپنے تبادلے کا حکم نکال کر دکھایا اور اس نے اُسے پڑھنا بھی گوارا کر لیا۔ کانپتے ہوئے اس نے کہا "یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ نہیں جائیں گے۔"

میں سناٹے میں آ گیا۔

"میں تو شاید پرسوں روانہ بھی ہو جاؤں۔"

"اچھا"

"جی ہاں ــــ اور آپ ناراض بھی تو ہیں۔"

"فضول باتیں نہ کیجئے۔" پھر ایک لمحہ رک کر بولی "تو گویا آپ جا رہے ہیں؟"

"گویا نہیں، یقینی طور پر۔"

"تو پھر خدا حافظ!"

اور وہ اسلام علیکم کہہ کے تیزی سے آگے نکل گئی۔ میں اس کے پیچھے دوڑا اور اسے ٹھہرایا۔ "کیا میں آپ کو خط لکھ سکتا ہوں؟"

"ہرگز نہیں۔"

"تو پھر؟"

"تو پھر کیا؟"

اور مجھ سے سوائے "کچھ نہیں، کچھ نہیں" کے کچھ بھی تو نہ کہا گیا اور وہ پھر اسلام علیکم کا طمانچہ مار کر آگے چل دی۔

"یا خدا! یہ کیسی لڑکی ہے؟" یہ سوچتا ہوا میں منہ لٹکائے اپنے دوست کے کمرے میں آ بیٹھا۔ مگر جی نہ لگا اور گھر چل دیا۔

تقریباً چار برس بعد ڈاکٹری سعدی کے شہر میں پھر میرا تبادلہ ہو گیا۔ ٹرانسفر سے چھ ماہ پیشتر میری بیوی مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئی تھی اور میں ایک ایسے مکان کی تلاش میں تھا جس کے پڑوس میں ہمدرد اور غمگسار لوگ بستے ہوں کہ میں جب گھر سے باہر ہوں یا دورہ پر ہوں تو وہ میرے تین بچوں کی دیکھ بھال کر سکیں۔ اس شہر میں میرے کوئی رشتہ دار نہ تھے جو اس سلسلے میں میری مدد کر سکتے۔

ڈاکٹر سعدی کے شہر میں آ کر دبی ہوئی چنگاریوں کو ہوا ملی اور وہ پھر سے دہکنے لگیں۔ ان چار برس میں میرا اس سے مکمل قطع تعلق رہا۔ وہ نہ جانے کہاں ہو گی! شاید انگلستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہو۔ ممکن ہے اُس کی شادی ہو گئی۔ اسی قسم کے خیالات ذہن میں اٹھتے رہے۔

میں ہر روز شام کو مکان کی تلاش میں نکلتا اور ناکام لوٹتا۔ ایک پراپرٹی ایجنٹ کی زبانی معلوم ہوا کہ "گلنار کالونی" میں ایک صوفیانہ کوٹھی نما مکان خالی ہے اور مالک مکان نہایت نیک انسان ہیں۔ چنانچہ میں اتہ پتہ پوچھ کر اس طرف روانہ ہوا۔

'گلنار کالونی' میرے لئے کوئی نیا نام نہ تھا۔ اسی کالونی میں ڈاکٹر سعدی کا چار کنال کا پلاٹ تھا جو اس کے والد نے اس کے لئے برسوں پہلے خرید لیا تھا۔ ڈاکٹر سعدی کا اسی کالونی میں اپنا کلینک کھولنے کا پروگرام تھا۔ یعنی نئے مکان کے ساتھ ہی کلینک بھی۔

دفورِ اشتیاق سے کار خود بخود تیز چلنے لگی۔ کالونی میں داخل ہوتے ہی مجھے سڑک کے ایک کنارے ایک ضعیفہ ایک نوجوان عورت کے ساتھ بیٹھی نظر آئی دونوں نہایت غریب لگتے تھے۔ میری کار آگے نکل چکی تھی۔ چنانچہ میں پیچھے آیا اور انھیں "لفٹ" لینے کو کہا تو وہ دونوں حیران ہو گئیں۔ ضعیفہ بولی "بیٹا! یہاں سے کئی موٹریں نکل گئیں کسی کو ہم پر ترس نہ آیا۔ یہ میری بیٹی ہے۔ بڑی بیمار ہے۔ چلا تک نہیں جاتا"

وہ دونوں کار میں بیٹھ گئیں تو میں نے اُن سے اُن کی منزل پوچھی، بڑھیا نے کہا "ہمیں ڈاکٹر سعدی کے ہسپتال جانا ہے"

خوشی سے میرا چہرہ تمتما اٹھا۔

"مگر مجھے معلوم نہیں کہ اُن کا ہسپتال کہاں ہے"

"میں بتلاتی ہوں۔ آپ سیدھے چلیں اور پھر دائیں کو مڑ جائیں۔ پہلی ہی کوٹھی میں اُن کا ہسپتال ہے"

اور میں چند منٹوں میں منزل پر پہنچ گیا۔

راستے میں ضعیفہ سے میں نے ڈاکٹر سعدی کے بارے میں پوچھا تو وہ بولی "نہایت رحمدل ڈاکٹر ہے۔ غریبوں سے فیس نہیں لیتی بلکہ اپنی جیب سے ادا کرتی ہے۔ اُس کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے۔ امیر غریب سب سے ہنس کر بات کرتی ہے۔ اُس کی مسکراہٹ سے ہی آدھا مرض دور ہو جاتا ہے"

اور مجھے اُس کی مسکراہٹ یاد آگئی جس نے مجھے اُس کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔

ابھی ضعیفہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ مجھے ایک سادہ سی کوٹھی کے سامنے ایک بڑا سا بورڈ نظر آیا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

"ڈاکٹر سعدی کا کلینک"

میں نے کوٹھی میں کار ٹھہرائی اور دونوں خواتین اتر گئیں۔ بڑھیا نے مجھے دعائیں دیں اور اپنی بیٹی کو کمرے تھامے برآمدے کی طرف جانے لگی۔

برآمدہ مریض عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ عورتیں سامنے والے لان میں بیٹھی تھیں میں نے دو منٹ کوٹھی کا جائزہ لیا اور پھر وہاں سے نکل آیا۔

پراپرٹی ایجنٹ کا بتلایا ہوا مکان ڈھونڈھوں حسنِ اتفاق سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر مجھے وہ مکان مل گیا۔ برابر والی کوٹھی مالک مکان کی تھی۔ اُن سے ملا اور ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر مکان حاصل کر لیا۔ دوسرے دن میں اُس مکان میں منتقل ہو گیا۔

ڈاکٹر سعدی میرے مکان سے لگ بھگ ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ پڑوس واقعی اچھا تھا اور مالک مکان نہایت مشفق اور ہمدرد۔ میرے بچوں کا اُن کے ہاں آنا جانا ہو گیا اور وہ نئے ماحول میں گھل مل گئے۔

مگر میرا اطمینانِ قلب چھن چکا تھا۔ کئی دن اسی الجھن میں رہا کہ ڈاکٹر کے ہاں حاضری دوں یا نہیں۔ نہ جانے وہ کیسے ملے؟ چار سال بعد تو وہ بالکل اجنبی ہو گئی ہوگی۔

آخر ایک سہ پہر جی کڑا کر کے میں اُس کی طرف چل دیا اس خیال سے کہ شام کو مریضوں کی یورش کم ہوگی اور شاید ملاقات کا موقع مل جائے خنک سہ پہر تھی۔ یہی پانچ ساڑھے پانچ کا وقت ہوگا

وہاں عورتوں کی وہی بھیڑ بھاڑ پائی۔ ایک نرس باہر آئی تو اسے میں نے اپنا کارڈ تھما دیا۔ پوچھنے لگی "کیا کوئی مریض ساتھ لائے ہیں" "مرض کی — نہیں"

"تو پھر کیا کام ہے ؟"

"یونہی ملنا ہے۔"

"پہلے سے وقت لے رکھا ہے ؟"

"جی نہیں۔"

"تو پھر وہ نہیں مل سکتیں۔ بےحد مصروف ہیں۔"

"آپ انہیں میرا کارڈ تو دے دیجئے۔"

"مجھے سخت ہدایت ہے کہ بغیر کسی خاص کام کے کسی ملاقاتی کو اُن سے نہ ملاؤں۔"

"آپ میرا کارڈ اُن کے سامنے تو رکھ دیجئے۔"

"مجھے ڈانٹ پڑے گی۔"

"میرا ذمہ ڈانٹ نہیں پڑے گی۔"

"کیا آپ ان کے عزیز ہیں ؟"

"وہ مجھے بے حد عزیز ہیں۔"

ابھی نرس غالباً کچھ اور کہتی کہ برابر کے جالی دار دروازوں والے کمرے سے آواز آئی ـــ "جمیلہ!" اور نرس اندر چلی گئی۔ مجھے یہ آواز جانی پہچانی سی لگی مگر میں کچھ فیصلہ نہیں کر سکا۔ نرس فوراً باہر آئی اور مجھے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں اس کے پیچھے برآمدے برآمدے چل پڑا اور اُس نے مجھے الگ چھوٹے سے کمرے میں بٹھا دیا جو جالی دار دروازوں والے کمرے کے عین مقابل تھا۔ نرس مجھے بٹھا کر چلی گئی۔ اور میں نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ چار کرسیوں کے درمیان ایک تپائی جس پر صاف ستھرا سفید میز پوش بچھا ہوا تھا۔ کوئی خاص سجاوٹ نہیں تھی۔ کرسیوں کے نیچے ایک معمولی مگر صاف دری تھی اور پردے گہرے نیلے تھے۔ تپائی پر چند رسالے پڑے تھے جو سب کے سب ڈاکٹری کے موضوع سے متعلق تھے۔ میں نے وقت کاٹنے کے لئے ایک رسالہ اٹھایا۔ مگر مضامین میری سمجھ سے باہر تھے۔

کوئی بیس منٹ بعد گہرا نیلا پردہ ہلا اور سعدی کمناک سے اندر آ گئی۔ سفید لمبا کوٹ، اس پر سیٹھو سکوپ، چہرے پر وہی سنجیدگی، کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے مجھے سلام کیا اور دیر سے آنے کی معافی چاہی۔ میں نے اُٹھ کر اس کا خیر مقدم کیا اور پھر ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔
چند لمحے سکوت رہا۔ پھر اُس نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے۔ میں نے بھی مشینی انسان کی طرح ہاتھ اُٹھا لئے۔ اُس کے لب ہلتے رہے اور میں اُسے دیکھا کیا۔

پھر وہ بولی "آپ کی اہلیہ کے انتقال کا سن کر مجھے بہت دکھ ہوا تھا۔"

میں سناٹے میں آ گیا۔ "تو آپ نے میری بیوی کے لئے دعائے مغفرت کی ہے ؟"

وہ خاموش رہی اور میں حیران کہ اُسے میری بیوی کے انتقال کے بارے میں علم کیسے ہوا۔ نہ میری اس سے خط و کتابت رہی، نہ وہ میرے کسی رشتہ دار کو جانتی ہے، نہ کسی دوست کو۔ بہر حال میں نے اس موضوع پر اُس سے کوئی سوال نہ کیا۔

"بچوں کی دیکھ بھال کون کر رہا ہے ؟"

"کوئی نہیں ـــــ اللہ پر بھروسہ ہے"

"آپ ایک مہینے سے یہاں ہیں۔ ملنے کیوں نہیں آئے؟"

"اول تو میری ہمت ہی نہیں ہوئی، دوسرے مکان کی پریشانی رہی۔"

"اب تو مکان مل گیا ہے نا!"

"جی ہاں"

"اور یہاں قریب ہی نا؟"

"جی ہاں"

"بچوں کو میرے ہاں بھیج دیا کریں"

"جی؟"

"جی ہاں۔ بچوں کو میرے ہاں بھیج دیا کریں۔"

"میری پڑوسی عمانین بہت نیک ہیں، وہ بہت اچھی طرح دیکھ بھال کر رہی ہیں۔"

"آپ کی مرضی۔ مگر میں بھی تو آپ کے پڑوس میں ہوں۔"

"میرا جواب سنے بغیر وہ اُٹھی اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں پیچھے ہولیا اور وہ مجھے اپنی کوٹھی کے عقب میں لے جا کر کھڑی ہو گئی۔"

شام گہری ہو چکی تھی۔ سرد ہوا جسم کے آر پار ہو رہی تھی۔ قریب ہی ایک مسجد سے موذن نے مغرب کی اذان دی۔

وہ اذان ختم ہونے تک خاموش کھڑی رہی۔ دُھندلکے میں اُس نے انگشت شہادت سے اپنی کوٹھی سے ملحقہ خالی قطعہ زمین کی طرف اشارہ کیا اور میری طرف دیکھے بغیر دھیمی آواز میں کہا۔ "یہ رہی آپ کی ایک کنال زمین ـــــ"

میں جیسے منجمد ہو کر رہ گیا اور وہ بڑھتی ہوئی تاریکی میں تحلیل ہو گئی۔

میں فقط ایک سایہ کوٹھی کے برآمدے میں سماتا ہوا دیکھ سکا۔

اس مرتبہ اس نے جاتے ہوئے سلام بھی نہ کیا۔

نگہت مرزا

دریافت

پہلا زینہ!

اُس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے اور پان کی پیک دہنے ہاتھ کی دیوار پر پھینکی جو پرانے سرخ دھبوں کے ساتھ اس میلے زرد کپڑے کے پارسل کی مانند تھی جس پر کسی زمانے میں لاکھ کی مہریں لگی ہوں۔ پہلا زینہ اور یہ پیک! ـــــ تم گویا یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ تمہیں اس گھر سے نفرت ہے۔ تم اس کے چپے چپے کو حقارت سے دیکھتے ہو تم یہ پرانی بوسیدہ سیڑھیاں توڑ دینا چاہتے ہو اور اس ماحول سے بھاگ جانا چاہتے ہو۔

دوسرا زینہ!

خسرو پرویز میں ہوں۔ آنکھیں بند کر کے غصہ بھر کو وہ پھوڑوں کو ہتھیلیوں سے سہلاتا۔ تم سب کچھ پیچھے چھوڑ آئے بھائی میرے۔ اب تمہارے اور اس جگمگاتی دنیا کے درمیان پردہ حائل ہو چکا ہے۔ (ثبات کا پردہ جسے ہٹا کر وہ پہلے زینے پر قدم دھرتا ہے) اب تمہیں رات بھر اس جہنم میں جلنا ہوگا حتیٰ کہ صبح ہوگی اور تم ان زینوں کو روندتے خوش خوش نیچے اترو گے اور جانو گے کہ ایک اور دن تمہیں زندہ رہنے کے لئے مل گیا۔

تیسرا زینہ!

زینوں کے اوپر سے اس کے بھاری قدموں کی چاپ پر نصف درجن کے لگ بھگ کالے بھجنگ بچوں کی قطار سلے اوپر جھانکتی ـــــ یا وحشت! وہ نفرت سے ہونٹ سکوڑتا ـــــ اور پھر سر جھکائے اوپر چڑھتا جاتا ـــــ سمجھتا۔ تیسرا زینہ ایک سمجھوتا تھا۔ تین زینے ـــــ وہ صرف تین زینوں سے آشنا تھا ـــــ اس کے بعد کیا تھا ـــــ صرف سمجھوتا ـــــ ایک اور رات کے لئے ـــــ کون جانے رات کا عذاب کب ختم ہو

اور وہ حسبِ معمول باورچی خانے میں ہنڈیا کی جلتی باس سے بے پروا پڑوسن سے محوِ گفتگو ـــــ اوہ! جی کیسا میلا ہو گیا۔ پیچھے چھوٹ گیا خسرو پرویز۔ سب کچھ پیچھے چھوٹ گیا۔ اس نے لاپروائی سے کندھے اُچکائے اور اپنی تازہ ترین غزل کا مطلع اونچے سروں میں گنگنانے لگا۔ باورچی خانے میں بیٹھی وہ عورت اسے ہر شام پہلے قدم پر کیسی اجنبی سی لگتی۔ اس کا جی چاہتا چپکے سے اس کے قریب جا کر پوچھے ـــــ تم کون ہو؟ یہاں کس لئے آئی ہو؟ کیسا ایکدم سے سب کچھ دھندلا جاتا۔ اور وہ ڈیسک پر جھکی ہر لمحہ اپنے بالوں کو ہاتھ کی جنبش سے پیچھے ڈالتی اور گاہے گاہے معصومیت سے آنکھیں اُٹھا کر اس کی طرف دیکھتی ـــــ نہیں ـــــ وہ سر جھٹکتا ـــــ نہیں ـــــ اور اندر اپنے کمرے میں چلا آتا ـــــ بچے اس کے پیار بھرے لمس کو اس دن سے ترس رہے تھے جب سے ان کے شعور نے باپ کے وجود کا ادراک کیا تھا ـــــ بچے! بسا اوقات اس کا جی چاہتا سب کو باری باری اپنے پاس بلائے اور سب کا گلا گھونٹ دے۔

"ایک آگ ـــــ ایک شدید آگ بھری ہوئی ہے میرے اندر ـــــ میں نہیں جانتا اس آگ کا کیا ہوگا مریم ـــــ" ایک سہ پہر جانے کس بات پر وہ انتہائی جذباتی ہو گیا اور اس چھپیلی رنگت کی لڑکی نے جھک کر سرگوشی کی اور وہ تعجب سے چہرہ اُٹھائے اسے دیکھا کی تھی: "مریم! قسم خدا کی تم کس قدر بھولی

ہو، کیسی معصوم ——— اور پھر یکایک وہ اپنے لمحہ پیشتر کے جذباتی پن پر قہقہہ لگا کر ہنستا تھا اور مریم نے خود سے کہا تھا

اور اب رات ہے اور داہنے ہاتھ کے بستر پر وہ عورت عجیب بے ڈھنگے طریقے پر لیٹی خراٹے لے رہی ہے یہ تمہاری عورت ہے۔ جی چاہتا ہے اُسے کھڑکی سے اُٹھا کر نیچے پھینک دوں یا خود کہیں بھاگ جاؤں کہیں دور جہاں اس کا بے ہنگم وجود نہ ہو جہاں اس کے تیز گونجتے خراٹے نہ ہوں ہیں کس دوزخ میں جل رہا ہوں ——— یہ کیسی آگ ہے جس کو سوا میرے کوئی نہیں جانتا ——— پھر جونہی دن سیاہی مائل ہوتا تو اس کے قدم مختلف سڑکوں اور گلیوں کا چکر لگا کر پھوانہ بازار کی طرف مڑتے۔ وہاں کیفے ایران میں وہ انتہائی کونے کی میز پر بیٹھا لاپروائی سے سگرٹ پیئے جاتا اور سر اٹھا کر سر پر لٹکتے ہوئے قمقموں کو دیکھتا۔ ایسے میں اس کی آنکھوں میں ایک انجانا سا دکھ اُبھر آتا ——— خسرو پرویز تم کون ہو؟ کس لئے تمہیں وجود کے جہنم میں جھونکا گیا ہے؟ تمہیں کونسا اہم مقصد ادا کرنا ہے؟

"مریم ——— اپنے وجود کا دکھ ——— کیا تمہیں کبھی ایسے دکھ نے آگھیرا ہے جب تمہیں اپنے وجود سے وحشت ہوتی ہے؟ تم اپنے خول کو توڑ دینا چاہتی ہو؟ ———

——— مگر نہیں مریم! تم تو بہت بھولی ہو تمہیں ایسی باتوں کا کیا علم ———" اور مریم بسا اوقات اس کی لایعنی باتوں پر خوفزدہ ہو جاتی۔ پھر وہ جھینپے انداز میں ہنس پڑتا۔

——— اور مریم کوئی اور راہ نہ پاکر اس کی ہنسی میں شریک ہو جاتی۔ اور رات مریم اپنی روم میٹ سے کہتی "اللہ رابی تجھے کیا بتاؤں وہ شخص کیسی باتیں کرتا ہے۔ ایسی باتیں کہ جن کا نہ پہلا سرا میرے سامنے آتا ہے نہ آخری۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اس کی باتوں کے دوران ہی سے آملی ہوں اور وہ پہلے بھی باتیں کر رہا تھا اور میرے جانے کے بعد بھی کرتا رہے گا۔"

رات ——— اس عورت کے خراٹوں سے جہنم بنی ہوئی۔ کمرہ اس عورت کے ٹھوس وجود سے گھٹا ہوا۔ اس عورت کے کپڑوں کی باند ——— سوتے میں اکثر اس کی نیند کھل جاتی۔ وہ بستر سے اٹھ کر سرہانے کی طرف کھڑکی میں جا کر کھڑا ہوتا۔ چوڑی سڑک خموشی سے رات کا بوجھ اٹھائے۔ سڑکوں کے سامنے دکانیں سختی سے بھینچے ہوئے ہونٹوں کی مانند بند۔ ان کے اوپر مکان تاریکی کے بل ماسے ——— وہ چمپئی رنگت اس اندھیرے میں کیسی رنگت اختیار کرتی ہوگی۔ اس کے سنہرے بال تکیئے پر بکھرے کیسے لگتے ہوں گے۔ وہ گلابی ادھ کھلے ہونٹ ——— خسرو پرویز ——— اس کے اندر عجیب سا جذبہ اُبھر آتا، میں کچھ کرنا چاہتا ہوں ملے کھلے آسمان کے خدا! میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔

اور کبھی جو یوں ہو کہ چپ چاپ بیٹھے تم اپنے آپ سے الگ ہو جاؤ اور ایک اور وجود کا روپ دھار لو اور پھر سامنے بیٹھ کر قطعی اجنبیت اور بیگانگی سے اس میلے وجود کو دیکھو اور جانو کہ تم کون ہو ——— مگر میں وہ تو ہرگز نہیں جسے میں روزانہ صبح شیو بنانے یا کالج جانے سے قبل دیکھتا ہوں ——— کیا واقعی یہ وہی میں ہوں! آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے وہ اکثر لاشعوری طور پر اپنی انگلی سے اس عکس کو چھونے کی کوشش کرتا ——— کہیں وہی میں تو نہیں! یہ سارا چکر کیا ہے؟ اس کا جی چاہتا سب کچھ ختم ہو جائے اور وہ آنکھیں بند کرے اور جانے کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ مگر یہ صرف برس بھر ہی کی تو بات تھی۔ وہ لمحہ ——— وہ دریافت کا لمحہ "شبلی! ——— قسم جناب امیر کی۔ میں اس لمحے میں زندہ ہوا ——— اس نے بند آنکھوں، برس پہلے ارم میں بیٹھ کر شبلی اپنے واحد دوست سے سرگوشی کی تھی۔ اور بات ساری یہ تھی کہ اس دوپہر جب وہ کلاس لیتے بیٹھا تھا اور حسب عادت فائل کھول کر نوٹس لکھوانے شروع کئے تھے تو وہاں سب سے پیچھے ا‍ُسے دو چمکتی سیاہ آنکھوں نے جکڑ لیا۔ وہ چمکتی سیاہ آنکھیں اس کی آنکھوں میں تیرتی رہیں ——— شبلی ——— میں اگر کچھ لمحے اور اسے دیکھتا رہتا تو یقیناً ——— یقیناً شبلی میں ——— ہو جاتا ——— اور یہی بات تھی کہ اس سیاہ آنکھوں اور چمپئی رنگت والی بھولی بھالی لڑکی نے اسے عجیب ذہنی پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔

رات کی سیاہی نیلگوں دھوئیں کے ساتھ مل کر انتہائی پراسرار رنگت اختیار کرتی ایسے میں کیفے ایران میں بیٹھے سبھی لوگ اپنے اپنے معاشقوں، جو جہد رفتہ

کی یادگار بھی تھے اور وقت کا مسئلہ بھی۔ کے پرخچے چاک کیا کرتے۔ خسرو پرویز سگریٹ منہ میں دبائے چھت کے قمقموں کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا۔ پہلا زینہ۔ دوپل سرلود میں اس گھر کو آگ لگا دوں گا۔ میں اس گھر کا وجود ختم کر دوں گا ـــــ مریم! میں بھی چاہتا ہوں تمہاری باتیں کروں۔ اپنے داہنے ہاتھ بیٹھے ان خوش باش لوگوں سے سرگوشی کروں ـــــ سنو تم مریم سے واقف ہوگے ـــــ مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا۔ نصف درجن بچوں کا گن میرے ماتھے پر لکھا جا چکا ہے۔ اس عورت کے بخت کی تاریکی نے میرا وجود دھندلا دیا ہے ـــــ میں مر چکا ہوں ـــــ ایسے میں وہ ادھر ادھر کے لوگوں سے کاغذ قلم مانگنے لگا کہ اس کا اثاثہ ایک سلیپے سے رومال ایک عدد سستے قسم کے سگریٹ کی ڈبیا اور دو چار قمیا کو بھرے پان کے سوا کچھ نہ ہوتا اور کاغذ قلم تھیا ہوتے ہی وہ میز پر جھک کر آڑے ترچھے حروف میں نظم لکھتا ـــــ میہ لمحہ ـــــ تم بھلا اسے کیا سمجھو گے شبلی! ـ یہ لمحے کی کرامات ہوتی ہے۔ تم چپ چاپ بیٹھے ہو اور تمہارا ذہن آپ ہی آپ دیکھنے سننے میں مشغول ہے۔ دفعتاً تم محسوس کرتے ہو تم نے ذہن کی ہنڈکلیا کو نکاس کا راستہ نہ دکھایا تو تمہارے ذہن کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ تم اسکے ہی لمحے فنا ہو سکتے ہو۔ مگر یہ لمحے کی کرامات ہے شبلی! تم بھلا اسے کیا سمجھو گے!

رات ـــــ جناح کالونی کی اس دوکانوں والی سڑک کی رات لڑکیوں کے ہوسٹل پر چھائی رات سے مختلف ہوتی ہے۔ مریم کام ختم کرکے روشنی بجھاتی کو اپنی روم میٹ سے کچھ نہ کچھ کہتی اور پھر لحاف میں ناک ڈبو کر بچوں کی سی معصومیت سے سو جاتی ـــــ پھر ایک رات وہ روشنی بجھا کر اپنی کے بستر پر جا بیٹھی ـــــ راجی ـــــ یہ شخص اتنا پست کیوں ہوتا جا رہا ہے ـــــ اور راجو نے لحاف اٹھا کر اس کی طرف غور سے دیکھا اور کالج اور مریم اور وجاہت اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو گئے۔ وجاہت وہ خوش باش اور خوش مزاج لڑکا جو چند مہینے گذرے شو فیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں آیا تھا۔ راجی نے اسے غور سے دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں کو جھٹکا دیا ـــــ پگلی کیوں فکر کرتی ہے۔ دوستی کو تم نے اس سے اور بیش کر ـــــ پر اسے کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہ آئی کہ وجاہت پہلے ہی سے بادلا ہوا اس کے گرد چکر لگا رہا تھا۔

پہلا زینہ!

دیوار پر کے بے شمار دھبوں میں ایک اضافہ۔ نفرت ہے، مجھے اس گھر کے چپے چپے سے نفرت ہے۔ میں اس گھر کو آگ لگا دوں گا۔

دوسرا زینہ!

خسرو پرویز ـــــ مریم کئی دن سے نہیں آ رہی۔ وہ کیوں نہیں آ رہی ـــــ اگر وہ کل بھی نہیں آئی تو میں اس کے ہوسٹل میں چلا جاؤں گا ـــــ

ـــــ مگر ـــــ مگر میں کچھ کرنا چاہتا ہوں

تیسرا زینہ!

ننگ دھڑنگ بچوں کی قطار ـــــ تم سب مر کیوں نہیں جاتے! میں اس گھر کو آگ لگا دوں گا۔

رات ـــــ جناح کالونی کی بیزار سی رات ـــــ نغمہ برلب تاکہ اس کی جان کا سناٹا ہو دور۔ مگر یہاں تو کوئی نغمہ نہیں۔ میرے لب تو نغموں سے ناآشنا ہیں۔ میں اس عورت کے جہنم سے کب نکلوں گا ـــــ مریم ـــــ مگر مریم کیوں نہیں آ رہی ـــــ نغمہ برلب ـــــ مریم ـــــ

تم اتنے روز کالج کیوں نہ آئیں ـــــ وہ وہاں کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اس کے بلانے پر وہ کیسی بھاگی بھاگی آئی تھی ـــــ کیوں نہ جاؤں بھائی اپنا پروفیسر ہے ـــــ وہ لڑکیوں کے ہنستے ہوئے چہروں پر جملہ پھینک کر چلنے کو تھی ـــــ وہ اس روز اس سے کتنی نزدیک کھڑی تھی، ایک قدم کے فاصلے پر ـــــ میں چاہوں تو اسے چھو سکتا ہوں۔ اس کی چمپئی رنگت پر ہاتھ پھیر کر اس کی ملائمت محسوس کر سکتا ہوں میں ان ہونٹوں کو چومنا چاہتا ہوں (خسرو پرویز)، پھر اس نے ہاتھ بڑھایا اور اسے چھو لیا۔ اس کا نرم ملائم ہاتھ۔ اس چھوٹے سے گلابی ہاتھ کو اس نے

اپنے لبوں سے انتہائی درشت، خالص مردانہ انداز میں رگڑتا ـــــ مریم! اس کے اندر کی معصوم لڑکی نے چلا کر مریم کو متوجہ کیا۔ یہ تو کیا کر رہی ہے مریم! ـــــ کل کی شام اور وجاہت اور سڑک پر تیرتی کاریں گاہے دبے دبے لہجوں میں گفتگو ـــ گاہے خموشی کا طلسم ـــ اور ارد گرد دگرگی رات کے سناٹے میں وجاہت کی پیار بھری باتیں ـــــ مریم! تو کس قدر کمین عورت ہے۔ پر اس نے اندر کی لڑکی کی بات نہ سنی اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رہنے دیا جو انتہائی جذباتی طریق پر اُسے اپنے چہرے پر پھیرے جا رہا تھا ـــــ اور رات گئے مریم سوچتی ـــــ مریم! ـــ یہ تو کیا کر رہی ہے؟ تو دو وجودوں کے درمیان پس کر رہ گئی ہے۔ تیرا سانس گھٹا جا رہا ہے ـــــ فیصلہ کر لے مریم! ابھی سے فیصلہ کر لے ـــــ پر وہ فیصلہ نہ کر پاتی۔ دن بھر وہ وجاہت کی آرزو کرتی اور اسے دیکھ کر خوش ہوتی پر اس سے ملتے ہی اُس میں ایک جھنجھلاہٹ سی پیدا ہو جاتی اور وہ خسرو پرویز کی تلاش کرتی اور خسرو پرویز کو پاتے ہی اس کی جھنجھلاہٹ ختم ہو جاتی اور وہ بڑے رسان سے گھنٹوں اس کے پاس بیٹھ سکتی تھی ـــــ پر خسرو پرویز کی معیت میں اس کے اندر کی لڑکی اس سے جھگڑنے آ موجود ہوتی۔ اور وہ اس کے جھگڑے اور اس کی ملامت کی تاب نہ لا کر وہاں سے بھی اُٹھ آتی ـــــ اور رات گئے تک سوچتی رہتی ـــــ مجھے کس کی ضرورت ہے ـــــ کسے میری ضرورت ہے ـــــ اور دن بھر اِدھر سے اُدھر بھٹکتی پھرتی۔ اور رات سوچ میں گزرتی ـــــ پھر خسرو پرویز نے کہ انتہائی جذباتی موڈ میں تھا ایک سہ پہر اس کا ہاتھ اپنے رخسار پر رگڑتے ہوئے بے حد دکھ سے کہا ـــــ "مریم! ـــ میں تجھے کچھ نہیں دے سکتا، کچھ نہیں دے سکتا ـــــ پر تو مجھے بہت کچھ دے سکتی ہے مریم ـــــ" مریم کا ہاتھ اس سخت رخسار پر کانپا ـــــ مریم! میں تجھے اپنی زندگی میں جس حیثیت سے شامل کرنا چاہتا تھا ـــــ وہ حیثیت ـــــ مریم تب میں فرسٹ ایئر میں تھا جب میرے باپ نے میرے پاؤں میں زنجیریں ڈال دیں ـــــ" اس نے مریم کا ہاتھ چھوڑ دیا اور آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا ـــــ "اس لڑکی کا تصور مجھے اب بھی مارے ڈالتا ہے ـــــ" وہ معصوم لڑکا پروانے پہلے ہی جس کے پر کاٹ دیئے گئے ـــــ پھر ایک دم سے وہ آنکھیں کھول کر آگے کی طرف جھک آیا ـــــ "کیا تم یقین کرو گی مریم! کہ میں عورت کی محبت سے محروم رہا ہوں، میں نہیں جانتا عورت کی محبت کیا ہوتی ہے"۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مریم کے بالوں کو چھوا اور وہ سیاہ چمکتی ہوئی آنکھوں میں ڈوب کر اس نے کہا ـــــ "شادی کا گناہ میرے ماتھے پر لکھا جا چکا ہے مریم! میں اس گناہ کو ماتھے پر سجائے جس جگہ گیا سب نے میری طرف سے اپنے چہرے موڑ لئے ـــــ" پھر ایک دم سے اس نے مریم کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ایک بلند قہقہہ لگانے کی کوشش کی ـــــ "اپنے جذباتی پن کا تمسخر ـــــ میں بھی کیا باتیں لے بیٹھا مریم ـــــ آؤ کچھ اور باتیں کریں"۔

اس رات اس نے سوچا وہ اپنا سارا پیار، ساری توجہ خسرو پرویز کو دے گی اور دن کا بیشتر حصہ اسی کے ساتھ گذارے گی ـــــ خسرو پرویز کو محبت کی کتنی ضرورت تھی۔ اُسے مریم کی کیسی ضرورت تھی ـــــ اور مریم نے آنے والے بہت سے دن خسرو پرویز کو جی بھر کے توجہ دیتے گذارے۔ وہ اس کے پاس بیٹھی اس سے بچوں ایسی باتیں بھی کرتی اور اس کی غزلوں پر تنقیدی بحث بھی ـــــ اس سے جھگڑتی بھی اور اس سے پیار بھی کرتی لیکن ایک ہی ہفتے میں اُسے معلوم ہو گیا کہ وہ اس کھیل کو زیادہ دیر نہیں نبھا سکتی۔ وہ خسرو پرویز کے پیار کے علاوہ بھی بہت کچھ چاہتی ہے ـــــ وہ ایک گھر بھی چاہتی تھی، ایک مستقل سہارا جس کے بارے میں اُسے کوئی شک و شبہ نہ ہو، جس کے بارے میں وہ کبھی یہ نہ سوچ سکے کہ اب وہ اپنی عورت کے پاس خوش و خرم بیٹھا ہو گا۔ وہ اپنا اور صرف اپنا آدمی چاہتی تھی جس میں کسی غیر کی شرکت نہ ہو ـــ اور اسی خواہش نے اسے وجاہت کی طرف پلٹنے پر مجبور کیا ـــــ یہی وہ دن تھے جب وجاہت نے اسے اپنے مستقبل کے ساتھ کے لئے چن لیا۔

اور رات گئے خسرو پرویز کا چہرہ اس کے لحاف میں گھس آتا۔ تب وہ لحاف اُلٹ کر بیٹھ جاتی۔ مریم کیوں پاگل ہوئی ہے۔ خسرو پرویز ناکام سہی، دکھی سہی لیکن وہ اپنی منزل پا چکا ہے اور تجھے بھی ایک منزل کی ضرورت ہے۔

کبھی جو ایسا ہو کہ میں خود کو پا جاؤں کیفے ایران میں بیٹھے ہوئے اس نے بلند آواز میں سوچا اور گنگنانے لگا:

اس جہاں کا وقت جیسے سو گیا پتھرا گیا　　　　جیسے کوئی ساری آوازوں کو یکسر کھا گیا

دور بیٹھے ہوئے ایک تنو طی پروفیسر نے کہ جس کی ٹانگ کسی حادثے میں خراب ہو گئی تھی، اور جو واضح طور پر لنگڑا کر چلتا تھا اور شہر کا زبردست سیکنڈل مونگر تھا کہ اس طرح اپنے احساس کمتری کو دور رکھتا تھا، دور سے ہانک لگائی ——— "میں نے کہا پروفیسر صاحب کہیں آنکھ تو نہیں لڑ گئی ——— "سگریٹ خسرو پرویز کے ہونٹوں کی ایک ذرا سی لرزش سے کانپا اور فرش پر آ رہا" لاحول ولا برادرم، جب بھی منہ کھولو گے واہی تباہی بکا کرو گے ——— کسی مولوی نما پروفیسر نے کہا "کیا تم جانتے نہیں اس کے گھر میں پانچ بچے ہیں ——" پانچ بچے ——— تیسرا زینہ ——— تنگ و تاریک بچے ——— باورچی خانے میں جلتی ہوئی ہنڈیا کی باس ——— میں اس کو آگ لگا دوں گا، مریم ——— مریم ——— تم کہاں ہو مریم ——— آؤ اس گھر کو آگ لگا دیں ——— مریم کیا مجھے یہ حق نہیں ——— مریم! میں کچھ کرنا چاہتا ہوں!

آخر کار اس نے اسے بلا بھیجا اور اس نے انکار نہ کیا۔ چپکے سے پرانے دنوں کی مانند چلی آئی۔ وہ اندر اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھا تھا ——— اس چہرے کی لکیروں میں اضافہ ہو چکا تھا اور کتنے دنوں سے اس کی کلاس میں بھی تو نہ آئی تھی ——— اسے یوں لگتا تھا؛ وہ اسے دیکھے گی تو اس شام وجاہت سے کئے ہوئے عہد کو بھول جائے گی

لیکن اب ——— اس نے بلایا تھا اور وہ اپنے قدموں کو روک نہ سکی تھی ——— خسرو پرویز نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا ——— یہ وہ نہ تھی ——— یہ اس کی مریم نہ تھی ——— چہرے پر وہ بھولپن نہ تھا ——— سیاہ آنکھوں میں وہ چمک نہ تھی ——— "مریم کہاں ہے؟" اس کا جی چاہا چلا کر کہے ——— مریم کو بلاؤ ——— مجھے مریم کی ضرورت ہے، تمہاری نہیں ——— "پھر اس کی نظروں کی حدت سے وہ مصنوعی چہرہ پگھل کر ہوا میں تحلیل ہو گیا اور اس کی مریم، وہ بھولے معصوم چہرے اور سیاہ چمکتی آنکھوں والی مریم وہاں آ موجود ہوئی ——— "مریم ——— اس نے بہت کچھ کہنا چاہا اور کچھ نہ کہہ سکا اور چپکا اسے دیکھتا اور دیکھتا رہا۔ تب مریم نے بازو موڑ کر وقت دیکھا اور اسے ایک دم سے وقت گذرنے کا احساس ہوا ——— "مریم ——— تم نے مجھے چھوڑ کیوں دیا ہے؟ ——— میں تم سے کچھ نہیں چاہتا ——— صرف دوستی، کیا تم مجھ سے تمام عمر دوستی رکھ سکو گی؟ ——— تم نہیں جانتیں مریم، تم میرے لئے کس قدر اہم ——— مریم ——— خدا کے لئے ہاں کہہ دو ——— صرف دوستی مریم ——— میں اور کچھ نہیں چاہوں گا ——— "مریم کا جی چاہا اٹھ کر اس کے پاس جائے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہے ——— مگر اس نے سر جھکا لیا اور ہاتھوں سے کھیلنے لگی کہ یہ اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ تب وہ اٹھ کر اس کے پاس آیا اور جھک کر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا ——— "مریم" مریم کے اندر کی لڑکی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا ——— اور وہ اٹھ کر دروازے کے قریب جا کھڑی ہوئی ——— "مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کیجئے سر" اس نے درشت لہجے میں کہا اور دروازہ کھول کر باہر چلی گئی ——— وہ اپنے من کی نفی کرتی ہوئی چلی گئی اور خسرو پرویز سے دور ہوتی گئی۔

کیفے کی میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے بوڑھے اور جوان دانشور اعلیٰ پائے کے سیکنڈل مونگر تھے۔ ہر لڑکی کے بارے میں اوٹ پٹانگ قسم کی خبریں یہیں جنم لیتی اور یہیں پرورش پاکر باہر کی گلیوں میں آوارہ ہوتی ——— اس رات خسرو پرویز مریم کے بھرپور وار سے شکستہ اور نڈھال سست قدموں سے اندر داخل ہوا اور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ کر میز پر سر اوندھا لیا ——— "ہائیں خسرو پرویز! یار کیا ہوا؟" قریب کی میز سے ہمدردی کی آواز ابھری مگر وہ ویسے ہی پڑا رہا ——— ہلنے جلنے کی تمام صلاحیتیں گویا سلب ہو چکی تھیں ——— "چچ چچ خسرو"۔ دور کہیں آواز گونجی ——— "کیا ہوا ہے ——— یہ لڑکیاں دولت کے پیچھے مری جاتی ہیں ———" "مگر بات کیا ہے ہے" "یار وہی مریم ——— (خسرو کا کلیجہ پھٹنے لگا)" سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ میں ایک لونڈا سا آیا ہے۔ سالے کے پاس کار ہے۔ دن بھر اسے اڑائے پھرتا ہے ——— خسرو پرویز کو دفعتاً اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کا جی چاہا ایک جست لگا کر باہر بھاگ نکلے۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر جلدی جلدی چہرہ پونچھا اور اپنی طبیعت کی خرابی کا عذر کر کے باہر نکل آیا۔ رات آسمان سے قطرہ قطرہ گر رہی تھی ——— گر رہی تھی اور گہری ہوتی جا رہی تھی ——— ٹریفک کا ہجوم ——— کاروں اور سکوٹروں کا شور ——— اسے یکلخت اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا۔ وجاہت، وہ جو سفید کار اڑاتا ہے اور لاکھوں اور کروڑوں کی

باتیں کرتا ہے۔۔۔ وجاہت اور مریم۔۔۔ مریم اور وجاہت۔۔۔ مگر خسرو بھائی سنو تو، تم کس امید پر اٹھے تھے؟ تمہارے پاس کیا تھا؟ بھائی میرے، اس نازک کومل سی لڑکی کو تم دکھوں میں پالنا چاہتے تھے کیا؟۔۔۔ مریم۔۔۔ نغمہ برلب تاکہ اس کی جان کو سنانا ہو وہ۔۔۔ مریم۔۔۔ اندر کیا ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ وہ بلند آواز میں باتیں کرنا چاہتا تھا تاکہ اپنے اندر کے جہنم سے نجات پائے۔ نغمہ برلب۔۔۔ نغمہ برلب۔۔۔ پر کوئی نغمہ نہیں سوجھتا۔۔۔ مریم۔۔۔ مریم۔۔۔

وہ سڑک سڑک پھرا۔۔۔ یہ گھنٹہ گھر ہے۔۔۔ وہ گھوم پھر کر وہیں آجاتا۔۔۔ یہ گھنٹہ گھر ہے۔۔۔ وہ سر اٹھا کر گھڑی کو دیکھتا۔۔۔ ساڑھے گیارہ۔۔۔ اور پھر کسی بھوانہ بازار کسی کچہری بازار یا کسی جھنگ بازار کی طرف اس کے قدم اٹھ جاتے۔۔۔ وہ گھوم رہا تھا بے مقصد بے ارادہ، جیسے اسے خود اپنے وجود کا احساس نہ ہو۔۔۔ جیسے وہ خود اپنے لئے بھی مر چکا ہو۔۔۔

میں کون خسرو؟۔۔۔ میں کون؟۔۔۔ ایک بجھنے کو ہے خسرو۔۔۔ جیسے کسی بات کا کوئی مفہوم نہیں۔۔۔ ہر شے دھوکا ہے خسرو، ہر بات جھوٹ ہے۔۔۔ جئے جاؤ خسرو اور ہر جھوٹ کو نباہتے جاؤ۔۔۔ اور جب اس کا سر خود اپنے ہی خیالات کے بوجھ سے پھٹنے کو ہو گیا تو اس کے قدم کسی پالتو وفادار جانور کی مانند اسے کشاں کشاں جناح کالونی کی جانب کھینچ لائے۔

پہلا زینہ!

اس کے ہونٹ خشک تھے اور بے رنگ تھے اور اس نے تقریباً چار گھنٹوں سے پان نہ کھایا تھا۔۔۔ جھکا ہوا سر، دکھتا ہوا بدن، ہوا اور مٹی سے بے ترتیب الجھے ہوئے بال!۔۔۔

دوسرا زینہ!

وہ سب سراب تھا خسرو پرویز۔۔۔ تم بھلا کاہے کی امید لگائے بیٹھے تھے۔۔۔ بے وقوف۔۔۔ تمہاری پہلی اور آخری پناہ گاہ یہی ہے۔۔۔

تیسرا زینہ!

کہاں ہیں وہ۔۔۔ میرے بچے۔۔۔ زینے اداس ہیں خاموش ہیں۔ کوئی ان کے سرے پر کھڑا چلاتا نہیں رہا۔۔۔ ابا آگئے۔۔۔ ابا آگئے۔۔۔

چوتھا زینہ!

پانچواں زینہ!

چھٹا زینہ!

ساتواں زینہ!

آٹھواں زینہ!

نواں زینہ!

دسواں زینہ!

باورچی خانے کا دروازہ بند تھا۔ بچے سو چکے تھے۔ وہ دبے پاؤں اپنے کمرے میں آیا۔ وہ بستر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اداس اور پریشان۔۔۔ دفعتاً اس کی نظر بائیں جانب اٹھی۔ وہاں وہ کھڑا تھا۔ گرد میں اٹے ہوئے بال۔ خشک بے رنگ ہونٹ۔ سپاٹ آنکھیں۔۔۔ یہ میں ہوں۔۔۔ اس نے پہلی بار طمانیت سے سوچا جیسے اسے یہیں ہی ہونا چاہیئے تھا اور کچھ نہیں۔۔۔ اور وہاں۔ بستر پر وہ پریشان بیٹھی ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔۔۔ بے توجہی کا دکھ اس کے چہرے پر لکھا جا چکا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور اس بیٹھی ہوئی عورت کو اپنے بازوؤں میں جکڑ کر اٹھا لیا۔

قیوم راہی

پتھر

"چچا میاں ـــــ چچا میاں" ننھے احسن نے کمرے میں گھستے ہی رٹ لگائی۔

یہ اتوار کی صبح تھی اور دوپہر تھی اور وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر ایک جاسوسی ناول میں کھویا ہوا تھا۔ احسن کی دخل اندازی نے یہ سارا فسوں آنِ واحد میں توڑ دیا۔ اس پر ایک خفیف سی جھنجھلاہٹ مسلط ہو گئی۔ کتاب کو ایک ہاتھ میں تھامے اس نے تیکھی نظروں سے احسن کو گھورا جس کے چہرے پر شرارت کے آثار جھلک رہے تھے ـــــ دیکھنے میں بیشک احسن کا جسم دبلا پتلا تھا اور وہ کمزور سا لگتا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ اپنے ارادوں میں کس قدر مضبوط اور اٹل تھا۔

احسن چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر شاید اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی تو اس نے وہی الفاظ دہرائے "چچا میاں ـــــ!"

"کیا ہے ـــــ؟" اس نے دانت پیسنے کے انداز میں پوچھا۔

احسن نے چند قدم آگے بڑھائے اور مدھم لہجے میں بولا "آپ ـــــ آپ کیا کر رہے ہیں چچا میاں؟"

"بین بجا رہا ہوں" اس کی آواز قدرے کرخت ہو گئی "جاؤ باہر کھیلو۔"

احسن لمحہ بھر کو جیسے کچھ سوچتا رہا۔ پھر کمرے میں سے نکل گیا۔

"دیکھئے چچا میاں، عائشہ میرے لئے کتنی اچھی گڑیا لائی ہے۔" احسن نے ایک دن اسے نائیلون کی گڑیا دکھاتے ہوئے یہ خوش خبری سنائی تھی۔

سانولے رنگ اور بھدے نقوش والی اس کی ہم عمر سہیلی عائشہ بھی اس سے چپٹی کھڑی تھی۔ عائشہ سامنے والے مکان میں رہتی تھی اور بیشتر اوقات سائے کی طرح احسن کے ساتھ لگی رہتی تھی۔

اس کا سر ہلکی ہلکی ٹیسوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا ـــــ راستے بھر جیسے وہ انگاروں پر چل کر آیا تھا۔ مختار کو کتنی مدت کے بعد اس نے دیکھا تھا مگر کیسی بے اعتنائی سے وہ اسے نظر انداز کر کے اجنبیوں کی طرح اسکوٹر پر فرار ہو گیا تھا۔ یہ وہی مختار تھا جو مہینے میں کئی کئی بار چکر لگایا کرتا تھا لیکن جب سے وہ ایکسائز انسپکٹر بنا تھا اور اسکوٹر پر سوار ہوا تھا۔ اس نے جیسے پیدل چلنے والوں کو لفٹ دینی چھوڑ دی تھی ـــــ سچ کہیں کا ـــــ اس نے آتے ہی اُس دن کا خریدا ہوا رسالہ میز پر رکھ دیا تھا اور اس کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھا تھا۔ رسالے کے سرورق پر چھپے ہوئے نقش و نگار بڑے الوکھے تھے اور ان میں غیر معمولی کشش پائی جاتی تھی ـــــ

احسن نے گڑیا کا پیٹ دبایا تو سیٹی کی آواز نے سناٹے کا جگر چیر دیا "چچا میاں ـــــ گڑیا بول رہی ہے" احسن کے ساتھ عائشہ بھی ہنس پڑی

تھی اس بار بھی اس نے چپ رہ کر ہی احسن کو ٹالنے کی کوشش کی تھی مگر احسن تو جیسے اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

"چچا میاں"

"ہوں"

"آپ نے یہ....." احسن نے رسالے کا سرورق پکڑ لیا تھا۔

"کیا ہے بھئی" اس نے رسالہ کھینچا۔

پلک جھپکتے ہی سرورق رسالے سے جدا ہو چکا تھا۔ احسن کے ایک ہاتھ میں گڑیا تھی' اور دوسرے ہاتھ میں سرورق۔ وہ بھاگنے ہی والا تھا کہ اس نے اٹھ کر سرورق چھین لیا تھا اور گڑیا کو باہر صحن میں پھینک دیا تھا۔ جاؤ ـــــ اب ایسی حرکت کی تو ہاتھ توڑ دوں گا ـــــ"

احسن اس اچانک حملے سے ہونقا رہ گیا تھا۔ عائشہ ڈر کر بھاگی تھی تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑتا ہوا صحن میں چلا گیا تھا ـــــ اور پھر اس کے سر جیسے چھوٹے چھوٹے ان گنت پتھروں کا ڈھیر اکٹھا ہونے لگا تھا ـــــ میز پوش پر روشنائی کے دھبے ـــــ کمرے کی دیواروں پر کوئلے سے بنائی ہوئی ٹیڑھی میڑھی لکیریں ـــــ سفید چادر پر ننھے پاؤں کے مٹیالے نشان ـــــ کاغذوں کے پرزے بکھرے ہوئے ـــــ ضدیں کر کے مچلنا اور رونا ـــــ عائشہ کے ساتھ مل کر اونچی اونچی آوازوں میں گانا اور سیٹیاں بجانا ـــــ پہلو بدل کر اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں ـــــ مارے درد کے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔

اور یہ واقعہ ـــــ یہ حادثہ اس وقت ہوا تھا جب وہ صبح کمرے کے فرش پر بیٹھا شیو بنا رہا تھا۔ ربڑ کی گیند گولی کی طرح سنسناتی ہوئی دیوار پر لٹکے ہوئے کیلنڈر پر لگی تھی۔ ساتھ ہی احسن ہوا کے جھونکے کی مانند اندر آیا تھا اور اس کے داہنے بازو سے ٹکرا گیا تھا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ سیفٹی ریزر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا تھا ورنہ ـــــ بے قابو ہو کر اس نے احسن کے ایک بھرپور طمانچہ رسید کر دیا تھا۔ "بالکل اندھا ہو گیا ہے ـــــ شرارتوں میں کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے ـــــ" صحن میں عائشہ مٹی کی مورتی بن کر رہ گئی تھی۔ اس کے ہونٹ کھلے تھے اور آنکھوں میں ایک بڑا سا سوال تھا۔ احسن بلکتا ہوا بھاگا تھا تو یہ مورتی بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلی گئی تھی۔

شام کو اس کی بھابی نے انتہائی برہمی کے ساتھ اپنے خاوند سے شکایت کی تھی "دیکھئے آپ شہزادہ کو سمجھاتے کیوں نہیں ـــــ آخر کسی بات کی حد بھی تو ہونی چاہیئے۔"

"ہوا کیا ہے آخر؟" بڑے بھائی نے حسب عادت مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ شہزادہ کی یہ بے راہ روی اور لاابالی پن محض اسی وقت تک ہے جب تک وہ شادی کی زنجیر میں نہیں جکڑا جاتا۔

"ہوتا کیا" بھابی کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا "وہی پرانا رونا ہے۔ بات بات پر بچوں کو جھڑکتا ہے۔ جب میرے کسی بچے کو کبھی گود میں نہیں لیا تو یوں ہر وقت ڈانٹنے پھٹکارنے کا کیا حق پہنچتا ہے اس کو؟"

"میں پوچھتا ہوں معاملہ کیا ہے؟"

"معاملہ کیا ہوتا ـــــ صبح احسن کو اس بے دردی سے پیٹا ہے کہ بیچارے کا کئی منٹ تک سانس ہی قابو میں نہیں رہا۔ بچے سب ہی شریر ہوتے ہیں۔ چیزیں بھی خراب کرتے ہیں۔ شور بھی مچاتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان سے ظالمانہ سلوک کیا جائے۔ پیار سے سمجھایا بھی تو جا سکتا ہے"

بڑے بھائی کے چہرے پر مسکراہٹ کا دیپ بجھ گیا تھا اور اس سے جیسے ہلکا ہلکا دھواں اٹھنے لگا تھا۔ اس نے چھوٹے بھائی کو عجیب

نظروں سے دیکھا تھا۔ ان نظروں میں نہ غصہ تھا نہ شکایت تھی۔ وہ تو بس کوئی سوال کر رہی تھیں ــــ سوال جو بڑا اہم تھا ــــ سوال جس کی خاموش صدا سارے کمرے میں گونج رہی تھی۔ اور جس کا جواب شہزاد کو زبان کی جنبشوں سے دینا تھا۔

"سنگدلی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔" بھابی نے دونوں بھائیوں کی خاموشی سے فائدہ اٹھایا تھا "ان بچوں نے بھلا کیا بگاڑا ہے ــــ ہر وقت منہ سوجا رہتا ہے ــــ ہر وقت مزاج کا پارہ چڑھا ہوا ہی ملتا ہے۔"

وہ گم سم بیٹھا تھا گویا اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو جیسے وہ یہاں موجود ہی نہ ہو ــــ پھر ایکا ایکی وہ اٹھا تھا اور باہر نکل گیا تھا۔

چند ہی منٹ بعد اس نے تصورات کی بجھی ہوئی قندیلیں پھر سے روشن کر لیں۔ بھڑی ہوئی سطری تو کمرے کے بند کواڑوں پر اٹک گئے کا زور دار دھماکا ہوا۔ اس کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ نظریں گھمائیں تو سامنے دیوار پر سیاہ لکیریں کیڑے مکوڑوں کی طرح کلبلانے لگیں۔ کتاب کو تکیے کے نیچے رکھ کر اس نے داہنے ہاتھ کی کلائی سے پیشانی کو ڈھانپ لیا ــــ کواڑوں پر ایک اور دھماکا ہوا ــــ اس کے احساسات پر ایک اور چوٹ لگی۔ پھر صحن میں کھٹ کھٹ کی آواز کے ساتھ احسن اور عائشہ کے ملے جلے قہقہے بھی شامل ہو گئے۔

کافی دیر تک وہ اسی گرداب میں پھنسا رہا۔ زندگی کے گلشن میں جب بھی اس نے خوش رنگ پھولوں کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا نکیلے کانٹوں نے اس کے ہاتھ کو زخمی کر دیا تھا پھولوں تک تو اس کا ہاتھ کبھی پہنچ ہی نہ سکا تھا۔ کبھی کبھی تو اس پر ایک عجیب سی سراسیمگی اور بیزاری کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور وہ تمام جھمیلوں سے ایک انجانے سکون کی تلاش میں باغوں اور کھیتوں کی طرف نکل جاتا تھا۔

شور تھما تو وہ اس تہہ خانہ میں پہنچ گیا جو ایک خطرناک گروہ کا پوشیدہ مسکن تھا اور جہاں اس وقت ایک بہت ضروری میٹنگ ہونے والی تھی ــــ مگر وہ صرف چند سطور ہی پڑھ سکا کشتی نے تھوڑا فاصلہ ہی طے کیا ہو گا کہ تلاطم برپا ہو گیا اور منہ زور تھپیڑوں نے اسے پیچھے دھکیل دیا ــــ احسن کے چھوٹے بھائی کی روں روں کا ریکارڈ بجنے لگا اس کی بھابی چلائی "ٹھہر جا احسن کے بچے ــــ ہزار بار کہا ہے کہ اس کا کھلونا مت چھینا کر۔ اسے مت رلایا کر ــــ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" لیکن احسن بھلا کہاں ماننے والا تھا چھوٹے بھائی کا کھلونا چھین کر یہ جا وہ جا ــــ سیدھا عائشہ کے گھر پہنچ کر دم لیا۔

بچے کے بلکنے کی آواز پکے راگ کی طرح طویل ہوتی چلی گئی ــــ برداشت کی دیوار دھڑام سے نیچے آگری۔ اس نے بددل ہو کر کتاب الماری میں پھینک دی اور کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے لگا ــــ چاروں طرف تپتی ہوئی جھلسا دینے والی دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور ساری بستی پر سکوت طاری تھا۔ پتا پتا ساکت تھا، ذرہ ذرہ خاموش تھا۔ لیکن اندر ــــ اندر پکا راگ اپنے عروج پر پہنچ گیا تھا۔ وہ رہ رہ کر احسن کی دھاندلی پر کڑھ رہا تھا۔ کھڑکی بند کر کے وہ ٹانگیں لٹکا کر پلنگ پر بیٹھ گیا مگر اس کے ذہن کی وہ کھڑکی بدستور کھلی رہی جس پر احسن اچھل کود رہا تھا۔ اس کھڑکی کو بند کرنے پر شاید وہ قادر نہیں تھا۔ یہ امر شاید اس کی دسترس سے باہر تھا ــــ ایکا ایکی اس نے کپڑے تبدیل کئے اور گھر سے باہر نکل گیا۔

دوسری ہی شام احسن اور عائشہ کی سنگتوں کی مالا ٹوٹ گئی۔ اس دن بھابی کے کسی عزیز کی شادی تھی اور وہ صبح سویرے ہی بچوں کو لے کر وہاں چلی گئی تھی۔ یوں عائشہ سیالکوٹ جاتے ہوئے احسن سے مل بھی نہ سکی تھی۔ اس کے والد کا تبادلہ اچانک ہو گیا تھا۔

خالی خالی گھر میں اسے بڑا اطمینان ملا۔ اس نے کئی ناول اور رسالے پڑھ ڈالے۔ کئی بار احسن کے خیال نے بھی گدگدی کی جیسے وہ آنے ہی والا ہو لیکن پھر جیسے کسی نے سرگوشی کی ہو ــــ احسن آئے گا تو اب شاید ہنسی کے پٹاخے نہیں چھوٹیں گے۔ دھما چوکڑی نہیں مچے گی ــــ پھر نشیب و فراز کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ــــ کچھ دنوں تک شاید ایسا ہو سکے۔ احسن کوئی نئی راہ ڈھونڈ نکالے گا۔ وہ گلی کی کوئی اور عائشہ لے آئے گا ــــ لیکن یہ چین عارضی ہی سہی، بہر حال غنیمت ہے ــــ کچھ دنوں تک تو اس گھر کے آنگن میں آندھیاں نہیں چلیں گی۔

احسن دو دن بعد گھر واپس آیا تھا۔ وہ اپنی دھن میں مگن تھا۔ باری باری اس نے اپنے تمام کھلونے دیکھ ڈالے تھے۔ اسے کافی دیر تک علم ہی نہ ہو سکا کہ عائشہ اب کبھی اس کے ساتھ کھیلنے نہیں آئے گی ——— عائشہ کو آنے میں زیادہ دیر ہو جاتی تھی تو وہ یا تو خود اس کے گھر چلا جاتا تھا یا باجا بجا کر اس کو بلایا کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے باجا اٹھا لیا تھا اور تین پہیوں والی سرخ رنگ کی سائیکل پر بیٹھ کر اپنے پھیپھڑوں کا زور باجے پر آزمانے لگا تھا۔

احسن کی ماں ان تمام حرکتوں کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ اسے سب باتوں کا اندازہ تھا۔ وہ احسن کی رگ رگ سے واقف تھی۔ اسے یوں لگا جیسے باجے میں سے "عائشہ آؤ ——— عائشہ آؤ" کی صدائیں نکل رہی ہوں وہ رنجیدہ سی ہو گئی۔

احسن سائیکل چلاتے چلاتے اور باجا بجاتے بجاتے ہانپنے لگا تھا۔ اس نے سائیکل پر بیٹھے ہی بیٹھے اپنی سانسوں کو درست کیا، باجے کو نیکر کی جیب میں چھپایا اور سائیکل سے اتر کر صدر دروازے کی طرف چلا گیا۔ اس کی ماں نے فوراً ہی اسے پکڑ لیا "کہاں جا رہے ہو بیٹے؟"

"عائشہ کے پاس"

"وہ" ماں احسن کے نزدیک ہی بیٹھ گئی "وہ تو چلی گئی"

"کہاں امی؟"

"سیالکوٹ ——— یہاں سے بہت دور" اس نے بیٹھے بیٹھے احسن کو گود میں اٹھا لیا۔

"کیوں چلی گئی امی؟"

"اس کے ابو جو چلے گئے"

"کب آئے گی وہ؟"

"اب وہ کبھی نہیں آئے گی بیٹے"

"نہیں امی" احسن مچلنے لگا "میں عائشہ کو بلاؤں گا"

احسن کی ماں نے کواڑ کھول کر سامنے اشارہ کیا "وہ دیکھو ——— دروازہ بند ہے اور کتنا بڑا تالا لگا ہوا ہے اس میں"

احسن نے ایک دم چپ سادھ لی۔ اسے شاید اپنی ماں کی بات پر یقین آگیا تھا۔ اس کی ماں اسے لے کر کمرے میں آگئی۔ پھر اس نے احسن کو خوب پیار کیا اور طرح طرح کی باتوں سے اس کا دھیان بٹانے لگی۔

بڑا ہی بے رنگ سا دن تھا۔ صبح ہی سے لو کے جھونکے سرسرا رہے تھے۔ سہ پہر ہونے کو آئی تھی لیکن گرم ہواؤں کا زور کم نہیں ہوا تھا۔

وہ جب گھر میں داخل ہوا تو پسینے میں شرابور تھا۔ چپل اور پاؤں خاک آلود تھے، کپڑوں پر بے شمار شکنیں تھیں اور سر کے بال پریشان تھے ——— نیچی نظریں کئے وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا ——— اب تو نہا کر ہی طبیعت کچھ بحال ہوگی ——— اس نے خود کو پلنگ پر گرا دیا ——— اس کی سوچوں نے اسے پھر دفتر میں پہنچا دیا اور ہیڈ کلرک کی تلخ کلامی کا خیال اس کے خون کو گرمانے لگا۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ کھانے کی چھٹی کے بعد دیر سے دفتر پہنچا تھا۔ اس پر تو بات تو تو میں میں تک پہنچ گئی تھی ——— کام مشین کی طرح کرو، سخت پابندیاں ہیں، جھگڑے رہو، اور معاوضہ ——— اونہہ ——— نئی ملازمت کے لئے کتنے ہاتھ پیر مارے تھے اس نے ——— لیکن مقدر کا کیا کیا جائے ———

"عائشہ چلی گئی چچا میاں"

اسے علم ہی نہ ہو سکا کہ کب احسن داخل ہوا اور کب اس کے پلنگ کی پٹی سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

"تو میں کیا کروں" وہ اٹھا اور کھونٹی پر سے پاجامہ لے کر غسل خانے میں چلا گیا۔ اس نے احسن کو ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

احسن جو اپنے چچا کی ہمدردیاں حاصل کرنے آیا تھا خالی ہاتھ لوٹ آیا تھا۔

جب وہ نہا رہا تھا تو اس نے اپنی بھابی کی آواز سنی تھی "بیٹے تو کیوں گیا تھا وہاں ــــ وہ انسان تھوڑی ہے ــــ وہ تو پتھر ہے ــــ پتھر" ــــ اس کے جبڑوں میں تناؤ پیدا ہو گیا تھا اور گردن اکڑ سی گئی تھی ــــ بھابی کی آواز کا شیشہ پتھر سے ٹکرا کر کرچی کرچی ہو گیا تھا۔

احسن کی تمام چالاکیاں سرد پڑ گئی تھیں۔ وہ سست سست سا رہنے لگا تھا۔ کبھی وہ صحن اور کمروں میں بے مقصد گھومنے لگتا تو کبھی اپنے کھلونے بکھر کر یونہی انھیں اُلٹ پلٹ کرنے لگتا ــــ گھر کا ماحول یکسر بدل گیا تھا۔ اب نہ نت نئی شرارتوں کی یورش تھی اور نہ احسن کی اوٹ پٹانگ باتوں کا کھٹکا تھا۔ فضا میں ایک ٹھہراؤ سا پیدا ہو گیا تھا اور یہ ٹھہراؤ اس کے لئے تسکین کا پیغام بن کر آیا تھا۔ وہ گھر میں بڑا سکون محسوس کرنے لگا تھا۔

عائشہ کو گئے یہ پانچواں دن تھا۔

اس دن اس زور کی آندھی چلی کہ سارا شہر گرد و غبار میں اَٹ گیا ــــ فرم کے مالک نے اسے اپنے ایئر کنڈیشنڈ آفس میں بلا کر چند نوٹ اس کی طرف بڑھائے تھے، ساتھ ہی یہ جانکاہ خبر بھی سنائی تھی کہ آج سے فرم کو اس کی ضرورت نہیں رہی۔

جب وہ دفتر سے باہر نکلا تھا تو چیختی چلاتی ہوائیں پاگل ہو رہی تھیں۔ درخت بھگوڑے لگا رہے تھے، سڑک ویران تھی اور بازار کی گہما گہمی ماند پڑ چکی تھی ــــ بار بار ریتیلی مٹی اس کی آنکھوں میں گھس کر اس کو رُلا رہی تھی ــــ بار بار بالوں کی لٹیں اس کے ماتھے پر گر رہی تھیں ــــ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے وہ یوں چلا جا رہا تھا گویا وہ خود نہیں چل رہا تھا، بلکہ ہوائیں اُسے دھکیل رہی تھیں ــــ اچانک اسے یوں لگا جیسے یہ سارا شہر غیر آباد ہو گیا ہو ــــ ساری کائنات اُجڑ گئی ہو ــــ

کافی دیر بعد جب ہواؤں کے ریلوں کی یلغار تھمی اور وہ اپنی گلی کے نکڑ پر پہنچا تو ٹھٹھک سا گیا۔ احسن خالی مکان کے دروازے کے ساتھ لگا کھڑا تھا ــــ یہ اس وقت اکیلا یہاں کیا کر رہا ہے ــــ کیا پھر کوئلوں سے مصوری کا شوق چرایا ہے اسے ــــ؟ پھر وہ خواب میں چلتا ہوا احسن کے نزدیک پہنچ گیا۔

مکانوں کے عقب میں آسمان پر آگ لگی ہوئی تھی ــــ اس نے دیکھا احسن کے ہاتھ میں کوئلے کی بجائے نائیلون کی گڑیا تھی ــــ اور وہ کبھی گڑیا کو اور کبھی خالی گھر کے در و دیوار کو تک رہا تھا ــــ اس کے جسم میں ایک ندی سی دوڑ گئی اور سانسوں کا زیر و بم تیز ہو گیا ــــ وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ احسن بھی یوں سنجیدہ ہو سکتا ہے۔ احسن تو اس کے لئے محض ضدوں اور شرارتوں کی علامت بن کر رہ گیا تھا۔ پتہ نہیں آج وہ نٹ کھٹ شریر احسن کہاں روپوش ہو گیا تھا ــــ عائشہ کی یاد اسے اس دروازے تک کھینچ لائی تھی ــــ عائشہ جو ہمیشہ کے لئے اس سے بچھڑ گئی تھی ــــ اور یہ غم کی ایک مکمل تصویر تھی ــــ دکھ کا ایک المناک منظر تھا اسے یوں لگا جیسے آج احسن اس بیکراں دھرتی پر تنہا رہ گیا ہو ــــ آج وہ خود بھی تو بے سہارا ہو گیا تھا ــــ آج وہ خود بھی تو ایک بھاری بوجھ اُٹھائے اکیلا گھومتا پھر رہا تھا ــــ گڑیا پر نظر پڑی تو دفعتاً ایک خیال اس کے جگر میں نشتر بن کر پیوست ہو گیا ــــ میں نے تو اسے کبھی کوئی کھلونا لا کر نہیں دیا ــــ کبھی کوئی چیز نہیں دی سوائے جھڑکیوں کے، سوائے غصیلی نظروں کے ــــ اس کے سینے میں کوئی شے تڑپ کر رہ گئی ــــ اور پھر دبے دبے اضطراب و رستے رستے غم نے سارے حصار توڑ ڈالے۔

احسن نے ایک بار کواڑ کی جھری میں سے اندر جھانکا۔ شاید وہ بیتے دنوں کی ایک ایک بات تازہ کر رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے ننھے ہاتھ سے لٹکے ہوئے تالے کو یوں پکڑ لیا جیسے سارا قصور اس تالے کا ہی ہو ــــ وہ مڑا تو اس نے اپنے چچا کو دیکھا۔ گھبراہٹ میں گڑیا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گیلی زمین پر گر گئی۔

اس نے بڑھ کر احسن کی گڑیا اُٹھا لی اور پتلون کی جیب سے رومال نکال کر اسے صاف کرنے لگا ــــ پھر گڑیا کے ساتھ ساتھ جیسے اس کے دل کا میل بھی صاف ہو گیا ہو ــــ احسن نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکا۔ وہ چند لمحوں تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر ڈرتے ڈرتے لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"چچا میاں ــــ وہ عائشہ تھی نا عائشہ ــــ وہ ــــ وہ ــــ"

اس نے بے اختیار احسن کو گود میں اُٹھا لیا۔ احسن کا بدن بخار میں جل رہا تھا۔ وہ اسے سینے سے چمٹا کر گھر کی طرف بڑھنے لگا۔

عشرت نقوی

شمشاد والا

اور جب شمشاد والے نے تیسری شرط بھی جیت لی تو شکورا لقا کبوتر کی گردن بلا ملا کر پنجوں کے بل جھومنے لگا۔ لطیف نے ہارتے ہوئے بھی گیندے کے زرد زرد پھولوں کا ہار اس کی گردن میں ڈال دیا جس میں ایک ایک کے نئے نئے دس نوٹ پھولوں کی طرح پروئے گئے تھے۔ رمضو قصائی نے اپنی طرف سے ایک چھوٹا سا کپ دیا تھا جو کبھی اس نے جیتا تھا۔ اللہ دین سرخ سرخ گلاب کے پھولوں کا بنا ہار لایا تھا مگر وہ اس نے اسی وقت توڑ دیا پھولوں کی پتی پتی ادھیڑ کر رکھ دی اور منہ سے صابن کے سے جھاگ نکالتا ہوا، لطیف کو بے بھاؤ کی سناتا ہوا، اپنے ساتھیوں کو لے کر چلا گیا۔ وہ رمضو سے صرف پچاس ہی ہارا تھا لیکن لطیف نے تو پورے سو کی کھائی تھی۔ پھر بھی شکورے سے ایسے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا جیسے اس کا مغل اعظم ہارا نہ ہو بلکہ جیتا ہو مگر شریف سب سے علیحدہ خاموش کھڑا تھا۔ اس نے شکورے کو جھوٹے منہ بھی مبارکباد ی نہ دی تھی۔ سب اس کے دل کی بات جانتے تھے۔ وہ شکورے سے ہارے ہوئے اونٹ کی مانند خار کھاتا تھا۔ اس نے پچھلے جمعے کو ڈیڑھ سو ہارے تھے۔ سو نقد تھے اور پچاس کے بدلے میں بیوی کے چاندی کے پازیب اور جھمکے دیئے تھے۔

یکایک باسی کڑھی میں اُبال آیا۔ شریف لطیف سے مخاطب ہوا "بھائی لطیف! شکورے سے کہہ دے اگلے جمعہ دو سو کی ہوگی۔ اب کے شاہین کو تیار کیا ہے۔ امریکہ کے جہاز کی طرح آواز سے تیز اُڑے ہے۔ شاہین ہے شاہین۔ وہ ماسٹر کھوسے ہے نا۔ تباں کا شاہین بھی اُڑے تھا۔ میرے شاہین سے مقابلہ کرے تو دو وقت کا دانہ پانی بھول جائے۔ کل رات آٹھ بجے اترا تھا۔ محلے کی پانچ لالٹینیں اکٹھی کرنا پڑی تھیں۔"

اور شکورے نے کہا "لطیف تو بھی اس سے کہہ دے، دو کی کیا چار کی لگالے پر میں بھی اور بیوی کے زیور نہیں لوں گا۔ پچھلے جمعے میں کا نقصان ہوا تھا جھمکے بالکل بیکا تھے۔ ساروں میں کھوٹ ملا ہوا تھا۔ میاں اشرط لگانی ہے تو نقد نرائن ہوگی نقد نرائن۔ کاغذ کے کڑکڑاتے نوٹ۔ اگر منظور ہے تو میں تیار ہوں۔ اپنا شمشاد والا زندہ باد! پاکستان پائندہ باد!!"

شریف تھوڑی دیر تو چپ رہا گویا کوئی فیصلہ کر رہا ہو۔ اور پھر کہنے لگا "نہیں دو سو کی ہوگی۔ نقد سودا ہوگا۔ پٹھے صبح چھ بجے چھٹیں گے۔ آخری ٹیم پانچ بجے جگہ رشید لطیف رکھے گا دونوں کے۔" اور رمضو قصائی نے بھی حسب معمول گھوڑوں کی ریس کی طرح لطیف سے شاہین پر پچاس کی بدلی۔

شکورا اپنے محلے کے مشہور کبوتر بازوں میں سے تھا جس کی عمر کا اکثر حصہ چھت پر آسمان کو گھورتے، گوڈی کے چکر لگاتے اور گلیوں میں گھومتے گھومتے گذرا تھا۔ یوں تو محلے کا سب سے مشہور کبوتر باز منگو شاہ تھا مگر جب بھی اس سے شرط لگانے کی کہتے تو وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ جاتا اور صحن میں اپنے بھی بڑے بوڑھے کبوتروں کو گھورنے لگ جاتا۔ اس کے پاس اعلیٰ سے اعلیٰ نسل کے کوئی ڈھائی سو کبوتر تھے۔ وہ شام تک اُڑتے نظر آتے۔ شکورے نے ایک دن تو للچائی ہوئی نظروں سے اس کے کبوتروں کو دیکھتے ہوئے کہہ ہی دیا "چاچا! تیرے پاس یہ بڑھیا بڑھیا کبوتر ہیں۔ اُٹھتے ہی آسمان سے باتیں کریں ہیں۔ دن کے

تارے بن جاویں ہیں۔ چاچا! تُو تو مہینے میں ہزاروں کماتے، یہ تیرا چھیا اگر میرے پاس ہو تو قسم مولا کی! اپن کے وارے نیارے ہو جائیں۔ رمضو کی ماں کے ہاتھ سونے سے بھر دوں، باپ کو مہینہ بھر میں بیماری سے کھڑا کر دوں۔ اور چاچا! تیرا یہ ہرا تو اب ختم ہو گیا وہ نہ تو میں لے اے راستے میں اُڑتے دیکھا ہے۔ اتنا بھت چھوڑ دیا ہے اس نے۔ وہ خلاصہ ہے نا سالا۔ پھر بچے بھی سفید ہیں اور چاچا! اپنے شمشاد والے کی بھی کیا بات ہے پرسوں ہی ڈیڑھ سو جیتا ہے۔ سو میں نے جیتے اور پچاس رمضو جیت گیا۔ اللہ دین نے اس سے پچھلے جمعہ عبدالغنی سے جیتے تھے دو سو۔ اب پھر بد گئی ہے شریف سے دو سو کی۔ خدا مہربان رہا تو یہ بھی جیت جاؤں گا۔

"شکورے! یہ شریف سے شرط نہ لگایا کر، حرام زادے نے سارا گھر اس دھندے میں لٹا دیا۔ باپ نے بہن کے لئے کچھ زیور بنائے تھے۔ "کتے" کی اولاد نے سارے ختم کر دیئے۔ بیوی الگ قسمت کو روئے ہے۔ بہن بھی بائیس کے پیٹے میں ہو گی۔ ابھی تک گھر بٹھا رکھا ہے اسے۔ بھلا کبوتر بازی سے شادی ہوئے ہے خدائی میں کہیں؟

"پھر چاچا! میں چاہوں تھوڑی تھا۔ وہ تو اس نے خود لگائی ہے۔ اُسے اپنے شاہین پر گھمنڈ ہے تو اپنا شمشاد والا کم نہیں کسی سے۔ اور چاچا! میں نے بھی اس سے کہہ دیا ہے کہ نقد نقد سودا ہو گا۔ بیوڑ شیوڑ نہیں لوں گا۔ اور چاچا ایک بات اور بھی ہے۔ باپ کا اپریشن ہونا ہے۔ ڈاکٹر کہے ہے چھ سو روپے لگیں گے ایک سو تو میرے پاس ہیں۔ دو سو نیلی چھتری والا چاہے گا تو یہ بھی ہو جائیں گے۔ باپ کا علاج ہو جائے گا۔ چاچا! وہ بہت مخالفت کرے ہے میرے شوق کی۔ پر میں بھی بتا دوں گا کہ میرے کبوتروں نے ہی تجھے ٹھیک کیا ہے۔" شکورے نے پانی پیتے ہوئے چیمنے کو گھورتے ہوئے کہا۔

یوں تو شکورے کے پاس پورے پچاس جوڑے تھے مگر اس کے جگرے کبوتر تھوڑے ہی سے تھے۔ شریف والا اور مل والا اس کے پکڑے ہوئے پنچھے تھے شریف والا تو پار سال شریف کا پکڑا تھا۔ اب تو اس کے دو بچے ہیں۔ مل والا اس نے بھانا رام مل سے پکڑا تھا۔ چاند اس کے اپنے گھر کا تھا لیکن سب سے زیادہ اس کو شمشاد والا اور چمپا پسند تھے۔ چمپا کو وہ اس لئے زیادہ پسند کرتا تھا کیونکہ بڑی مشکل سے کئی کبوتریوں کے سر گنجے کرکے، آنکھیں خراب کرکے، شمشاد والے نے صرف اس کو ہی اپنے خانے میں جانے کی اجازت دی تھی اور چمپا بھی اس کی ایسی عاشق صادق نکلی کہ پہلی ملاقات میں اپنا دل ہار بیٹھی۔ وہ سہمی سہمی سی اس کے خانے میں بیٹھی رہی۔ اور جب شکورے نے اس کو شمشاد والے کے ساتھ اکیلا چھوڑ کر اس کے خانے میں دو دانٹیں رکھ دیں تو اس نے ایک لمحے کے لئے اپنی گلابی گلابی گردن کو اٹھایا، شبنمی آنکھوں سے اُسے دیکھا اور پھر گردن جھکا کر اپنی چھوٹی سی چونچ اس کے سرخ سرخ پیروں پر رکھ دی۔ شمشاد والے کو شاید اس کی یہی ادا بھا گئی۔ اس کی موتیا آنکھوں سے جھلکتا ہوا غصہ آہستہ آہستہ کافور ہو گیا۔ اس کی جگہ پیار پھیلتا چلا گیا۔ اس نے اپنے پر پھڑپھڑائے اور اپنے سیاہ پنجوں کے بل اس کے گرد ناچنا شروع کر دیا۔ اس کے منہ سے عجیب عجیب نغمے پھوٹنے لگے۔

جب شمشاد والے نے مسلسل تین شرطیں جیتی تھیں وہ پورے محلے میں چتنا فقیر کی طرح مشہور ہو گیا۔ جس کو بچوں سے لے کر بڑی بوڑھیاں تک جانتی تھیں۔ لوگ کہنے لگے۔ یہ شمشاد والا تو چتنا فقیر کے روپوں سے بھرے ہوئے مٹکے سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ وہ خاص طور پر اس کو دیکھنے آئے تھے۔ جیسے شمشاد والا کبوتر نہ ہو، بھولو پہلوان ہو۔ وہ نسل کا چینا تھا مگر شکورے کی ماں اسے گلاب شاہ کہتی تھی۔ اس کی بیوی نے اس کا نام موتی رکھا تھا۔ موتی اس کا بڑا مناسب نام تھا۔ اس کی آنکھیں بالکل موتیے کی طرح صاف شفاف رہتی تھیں۔ کبھی کبھار ان میں گلابی گلابی رنگ جھلکنے لگتا تھا۔ بعض دفعہ تو ایسے لگتا جیسے ابھی کئی موتی آنکھوں سے نکل کر گر پڑیں گے اس کے چھریرے جسم پر بھی سیاہ، سفید ہزاروں موتی بکھرے ہوئے تھے۔ چھوٹی سی چونچ، گہرے سیاہ بادلوں کا سا سر جس کی سیاہی پھیلتے پھیلتے اس کی گردن تک آ گئی جس میں قوس قزح کے تمام رنگ بہت سجے تھے۔ اسے دیکھ کر اس کی ماں کہا کرتی تھی: "ارے شکورے یہ تو اپنے سکتر صاحب کے باغ میں لگے ہوئے کالے گلاب سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ میں تو اسے گلاب شاہ ہی کہوں گی۔"

شمشاد والا دراصل اس کا باپ تھا جو اب بھی شمشاد بائی کے پاس ہے۔ شمشاد بائی ملتان کی مانی ہوئی کبوتر باز تھی۔ شکورے کا چاچا کہا کرتا تھا: "بھئی! کبوتر تو اپنی شمشاد بائی کے پاس ہیں۔ پر نہیں، جو کبوتر اس کی ماں نے (اللہ اسے جنت نصیب ہو) رکھے تھے وہ تو اس کے پاس بھی نہیں۔ وہی تو اسی سے لگا کرے تھی ہزار سے کم تو بات ہوتی ہی نہیں تھی۔ اپنے جوڑ کی تو وہی تھی۔ وہ بھی نقا کبوتری تھی۔ بہترین پھوری تھی، پر کبوتر بازی کے علاوہ بات ہی نہ کرے تھی۔ میرے کبوتر دیکھنے آوے تھی۔ میں بھی اس کے کبوتر دیکھنے جاؤں تھا۔ بس! اگمسرا، السرا، سرخا، چینا، کوئی کاغذی ہرا ہرا کرے تھا۔ ران پہ تو ہاتھ دھرنے دیتی ہی نہیں تھی کنجری کہیں سے ہزاروں بار۔ مگر پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ کہتی تھی کبوتر بازی کرنی ہے تو شوق سے اس وقت آؤ۔ رنڈی بازی صرف رات کو سجتی ہے۔ ہماری صبح جب ہوتی ہے جب شریفوں کی رات ہوتی ہے۔ اس وقت ہم شرفا میں شامل ہوتے ہیں۔ اب تو صرف کبوتروں کی بات کرو۔"

اور چاچا ایک سرد آہ بھر کر کہتا: "سالی ہر وقت نشے میں دُھت رہتی تھی۔ کبوتروں کو بھی گھی میں تیرتے ہوئے ملیدہ کے ساتھ ساتھ سو روپے کی روز افیم کھلا دیتی تھی۔ زعفران بھی دیا کرتی تھی لیکن اکثر کبوتر اس کی طرح افیم ہی زیادہ پسند کرتے تھے۔ لوگ کہتے تھے وہ ان کو شراب پلاتی تھی پانی کی جگہ، لیکن یہ غلط ہے۔" چاچا جو سب محلے کا چاچا تھا، سینے پہ ہاتھ مار کے کہتا "یہ صرف چاچا منگو ہی جانتا ہے کہ شراب اس کے تین کبوتر ہی پیتے تھے۔ کبوتری کوئی پیتی نہیں تھی۔ حرامزادی میرے ہی سامنے شراب سے مست کبوتروں کو اپنے ادھ کھلے سینے پر بٹھا لیتی اور اس زور سے پیار کرتی کہ میری طبیعت بھی خراب ہو جاتی تھی۔ جی چاہتا کہ ان کبوتروں کی گردن مروڑ کر رکھ دوں اور...... اور بس وہ شراب کی بوتل بن جاتی برانڈی کی طرح گرم۔ جی چاہتا ایک ہی گھونٹ میں پی جاؤں۔ میں اس سے کہتا "کیا میں ان سے بھی بُرا ہوں" تو ہنستے ہوئے کہتی "تم تو میرے بادشاہ کی طرح نرے لڑکے ہو۔ اس کی طرح کبوتروں کے پیچھے بھاگتے ہو، اور بھاگتے بھاگتے تھک جاتے ہو۔ دوسرے کبوتروں کو گرد منڈلاتے دیکھ کر رہ جاتے ہو۔ منگو شاہ تم جانتے ہو یہ کبوتر رات کو اندھے ہو جاتے ہیں اور میری آنکھوں پر بھی رات کو پٹی بندھی ہوتی ہے۔ کبوتر باز ہو کر بھی نہیں سمجھ سکتے۔ میرے بادشاہ کی طرح تمہاری عقل بھی موٹی ہو گئی ہے۔ بوڑھے ہو گئے۔ کاغذی بال تمہارے جسم پر آ گئے پر رہے بوڑم کے بوڑم ہی۔"

سال اوپر ہو گیا۔ شام کے کوئی چار بجے تھے۔ شکورا کبوتر کھولے حسب معمول آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس وقت چینا اکیلا ہی نیچے اُڑ رہا تھا۔ شکورا اس کے اُڑنے کے انداز اور اس کے رنگ سے فوراً پہچان گیا کہ یہ دوسری جگہ کا ہے یا کسی نے نیا تیار کیا ہے۔ اس نے فوراً تمام کبوتروں کو کابکوں سے نکال دیا۔ چند کبوتر چھتری پہ بٹھا دیئے۔ دو دو غٹے اور موٹے موٹے کبوتروں کو فضا میں اچھال دیا۔ پانی سے بھرے مٹکے سے تھوڑا تھوڑا پانی تسلے میں ڈالنے لگا تھوڑی ہی دیر میں شمشاد والا دونوں کبوتروں کے ساتھ اتر آیا۔ اس وقت اس کی زبان چونچ سے باہر نکل رہی تھی۔ وہ لڑتے ہوئے مرغے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کی پیلی پیلی آنکھوں میں زردی چھائی ہوئی تھی جس نے آنکھوں کے ٹکڑے سے سیاہ دانے کو بھی پھیکا کر دیا تھا۔ اس کے لمبے لمبے سیاہ و سفید پر پھیل کر زمین سے لگ رہے تھے۔ وہ زمین کی طرف پڑے ہوئے دانوں کی طرف گیا، لیکن بغیر ایک دانہ کھائے پانی کی طرف چلا گیا۔ اس نے پانی بھی نہ پیا اور گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ شکورا سمجھ گیا کہ بس! اب یہ اُڑنے والا ہے۔ اس نے فوراً ہی چھپکا مار کر اس کو دبوچ لیا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں شمشاد بائی نے اس کے دروازے کا کنڈا کھٹکھٹا دیا اور اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا، "میرا شیرا یہاں اُترا ہے۔ اس کا نشہ ٹوٹ رہا ہوگا۔ آج غصے میں میں نے اُسے ایک گولی بھی نہیں دی۔ وہ مجھ سے ناراض ہو گیا ہے۔ میرا شیرا مجھے واپس کر دو۔ میں اُسے مناؤں گی۔ میں دو کی جگہ چار گولیاں دوں گی اُسے۔ میرا کبوتر واپس کر دو۔ آج وہ تمام دن غائب رہا ہے۔ وہ بھوکا ہوگا۔ جب تک وہ گولی نہ کھائے گا، دو قطرے نہ پی لے گا، ایک دانہ بھی نہ کھا سکے گا۔"

"لیکن جناب! یہ کون سے قانون میں لکھا ہے کہ پکڑا کا مال واپس کر دو۔ پورے دو گھنٹے دھوپ میں سکتا رہا ہوں۔ میرا ایک پٹھا ابھی تک نہیں آیا۔ میں کیسے واپس کر دوں جناب کا شیرا۔" شکورے نے مرعوب نہ ہوتے ہوئے کہا۔ وہ دل میں سوچنے لگا۔ حرامزادی کبوتر لینے آئی ہے۔ نہ جانے

کتنے لوگوں کے پر قینچ کر رکھے ہیں۔ اپنا ایک کبوتر ہاتھ سے جانے لگا تو آ گئی، رونے پر لونڈیا زور دار ہے۔ ﷲ جواب پٹھوری ہے۔ اگر میرے ڈبے کی کبوتری بن جائے تو ... کیا غضب کی چال پائی ہے ظالم نے۔ لقا کبوتر کی طرح چلتی ہے بالکل۔

وہ آگے نہ سوچ سکا۔ شمشاد بائی نے پھر کہا: "سو روپے لو اور کبوتر واپس کر دو۔ اس کا بچہ بڑا پریشان ہے۔ صبح سے چیں چیں کر رہا ہے۔ میرا بھی بڑی پریشان ہے۔ ابھی تک چھتری پر بیٹھی ہے۔"

"بس! سو روپے۔ یہ تو بہت تھوڑے ہیں۔" شکورے نے کبوتر کی اہمیت اور سرخ رنگ کی کار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا دو سو لے لو۔"

ان پر تو ٹھوکر مارتی ہے یہ تو ہیرا ہے ہیرا۔"

"ڈھائی سو بھی لے لو۔" اس نے غصے سے لال بھبوکا ہو کر کہا۔

"یہ تو تیری مسکراہٹ کی قیمت بھی نہیں۔"

"اچھا تین سو لے لو۔" اس نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایک گیت پر ہزاروں کمائے۔ ماتو رات لوگوں کو دیوانہ کرتے اور اس انمول موتی کی قیمت صرف تین سو! پر خیر تو بھی کیا یاد کرے گی کوئی ملا تھا دل والا پر ایک شرط ہے۔ ایک بچہ بھی لوں گا ساتھ ـــــ" اور شکورے نے اپنی بات منوا کر چھوڑی۔ تین کی جگہ چار سو مارے، بچہ بھی لے لیا اور ایک بات اس کا گانا بھی سن آیا ـــــ ہائے کیا غضب کی گاتی ہے۔ میں تو عذرا بائی کو ہی سمجھا تھا پر کیا بات ہے اپنی شمشاد بائی کی۔ تڑپا دیا ظالم نے۔ چھری تھی چھری۔ کاٹ کے رکھ دیا۔ دل تو کرے تھا ان چار سو میں دس پانچ اپنے بھی ملا کر اس کے قدموں میں رکھ دوں۔ پھر سوچا کبوتر دینے کا فائدہ ہی کیا ہے دینا ہے تو اپنی عذرا بائی کو کیوں نہ دوں وہ تو اور بھی مہربانی کرے ہے۔

لیکن شمشاد والا کبوتر کا جنا ہی ثابت ہوا۔ افیم کے بغیر جو مزا وہ دو پر بھی نہیں مار سکتا۔ روپے روز کی افیم کھا جاتا ہے۔ ابھی پورے پر بھی نہیں آئے تھے کہ کبوتریوں کے گرد چکر لگانے شروع کر دیئے۔ ڈربوں کی کوئی کبوتری بھی نہیں چھوڑی۔ کئی دفعہ مار کھائی، سر گنجا کیا۔ آنکھ بھی زخمی کر لی مگر عادت نہیں چھوڑی۔ جس خانے میں کسی کو اکیلا دیکھا پھٹاک سے پر مار کر اس میں گھس جاتا۔ مجال ہے کہ کوئی کبوتری اکیلی ہو اور یہ اس کے گرد گھومتا نظر نہ آئے۔ تمام کبوتریاں اس سے بلی کی طرح بھاگتی تھیں۔

شکورے کی بیوی کو اس کی یہ ادا بہت بری لگتی۔ پھر بھی دیر تک اس کی حرکتوں کو دیکھتی رہتی۔ وہ سوچتی۔ یہ شکورا میرے لئے آمنا دیوانہ کیوں نہیں ہوتا۔ میں نے کب اس کی خوشی کو اپنی خوشی نہ سمجھا۔ کون سی اس کی خدمت میں کسر رکھی ہے جو شمشاد والے کی طرح ہر کبوتری کی طرف بھاگنے لگتا ہے۔

شکورے کی ماں بھی اس سے بہت خوش تھی کیونکہ وہ شمشاد بائی کی طرح بڑا لکھیرا ثابت ہوا تھا۔ مہینے میں چار سو کمائے تھے۔ اتنے تو شکورا بھی نہیں کماتا۔

شکورے کے باپ کا علاج تو در اصل یہی کر رہا تھا۔ وہ جب تک اڑایا نہ جاتا خود نہ اڑتا تھا۔ اکثر دیوار یا چھتری پر بیٹھ کر اپنی سرخی مائل سفید آنکھوں سے دھوپ میں لیٹے ہوئے شکورے کے باپ کو گردن جھکا جھکا کر بڑی پیاری نگاہوں سے دیکھتا جیسے اسے اس کی بیماری کی بہت فکر ہو۔ بہت دکھ ہو۔ جیسے وہ شرطیں اس کے علاج ہی کے لئے جیتا ہو۔ بعض دفعہ تو ایسے لگتا جیسے ابھی رو دے گا۔ اس کی آنکھوں میں پانی سا تیرنے لگتا۔

شکورے کے باپ میں بھی اچانک کئی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ وہ شکورے کے اس شوق سے سخت تنگ تھا لیکن اب خود اپنے سامنے اس کے لئے خاص گھی کا ملیدہ بنواتا حالانکہ خود انہیں اصلی گھی کھائے ہوئے برسوں گزر چکے تھے۔ وہ افیم کے استعمال کو حرام سمجھتا تھا۔ اس نے کئی دفعہ شکورے کو ڈانٹا تھا۔ کئی دفعہ مارا تھا مگر اب

ڈھیٹ بن کر اس کی گولیاں بند نہ کی تھیں لیکن اب خود وہ شکورے کو یاد دلا دیتا۔ پلنگ پر لیٹے لیٹے اس کے کبوتروں کا خیال کرتا۔ ابھی ایک مہینہ ہوا جب شکورے کے سات کبوتروں کو بلی مار گئی تو وہ بہت خوش ہوا تھا۔ اس نے کئی دفعہ ڈبلیں گٹوا گٹوا کر کبوتروں کو کھلائی تھیں۔ کئی دفعہ رات کی بچی ہوئی روٹیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے ان کے سامنے ڈالے تھے۔ وہ اپنی بیوی سے کہتا، "یہ گلاب شاہ تیرے شکورے سے بھی اچھا نکلا۔ وہ تمام دن رکشا چلائے ہے مگر مہینے میں دو ڈھائی سو سے زیادہ نہیں کماتا اور جو کماتا ہے پتہ نہیں کہاں کرتا ہے۔ میرا علاج تو یہ گلاب شاہ ہی کر رہا ہے۔ سارے دن چھتری پر بیٹھا مجھے تکا کرے ہے۔ ایسا لگے جیسے میرا دوسرا بیٹا ہو۔ مجھے تسلیاں دے رہا ہو۔۔۔ باپو! تو گھبرا نہیں، تیرا علاج میں کراؤں گا۔ تیری بیماری میں دور کراؤں گا۔ یہ دو سو بھی جیت لوں گا۔ پھر تیرا آپریشن ہو جائے گا باپو! تو بالکل اچھا ہو جائے گا میں تمام دن اڑتا رہوں گا۔ میں شرط جیت جاؤں گا۔۔۔ جب چھتری پر بیٹھا بابا چھپا کے پیچھے غٹرغوں کرتا پھرے ہے تو ایسا لگے جیسے کہہ رہا ہو۔ چھپا! میں شرط جیتوں گا۔ میں شرط جیتوں گا۔"

اور جمعہ کے روز دونوں کبوتر چھوڑ دیئے گئے۔ شکورے نے لطیف کی جگہ پیسے چاچا منگو کے پاس رکھوا دیئے تھے۔ شریف نے اپنی رقم لطیف کو ہی دی تھی۔ لطیف اور رمضو قصائی نے اپنی رقم اپنے اپنے پاس رکھی تھی۔ شکورے نے آج شمشادوالے کو ایک کی جگہ دو گولیاں دی تھیں۔ آج وہ بہت پریشان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شریف کا یہ پٹھا رات گئے اترتا ہے۔ پھر اسے باپ کی طرف سے بھی فکر تھا۔ ڈاکٹر نے رات کو کہہ دیا تھا کہ حالت خراب ہے فوراً آپریشن کی ضرورت ہے۔

اور آپریشن کے لئے چھ سو روپے۔ تین بیبیاں چاہئیں تھیں۔ اور شکورے کے ساتھ سب ہی سوچنے لگے۔ چھ سو شام تک ہی ہو سکتے ہیں۔

"اللہ کرے شمشادوالا جیت جائے۔ موتی جیت جائے۔" شکورے کی بیوی نے ظہر کی نماز پڑھتے ہوئے دعا مانگی

"اللہ کرے گلاب شاہ جیت جائے۔ گلاب شاہ جیت جائے۔" شکورے کی ماں نے خاوند کی خاک شفا کی سی رنگت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"خدا کرے شکورا جیت جائے شکورا جیت جائے۔" باپ نے پہلی دفعہ فضا میں گھورتے ہوئے دعا مانگی۔

اور شریف سوچ رہا تھا کہ اب کے خدا نے چاہا تو چار زیور ضرور ہی بن جائیں گے بہن کے۔ سب سونے کے بنواؤں گا۔ پچھلی کے بدلے میں شکورے سے پازیب اور جھمکے واپس لے لوں گا۔ اب کے تو ضرور ہاتھ پیلے ہو جائیں گے شبو کے۔ مولا نے چاہا تو ایک ایک سے بدلہ لوں گا ہارنے کا۔۔۔ اور رمضو قصائی سوچ رہا تھا کل انشاءاللہ تین بکرے کاٹوں گا۔ پچھلا نقصان بھی پورا ہو جائے گا۔ دس روپوں کا ایک ہار شریف کو پہناؤں گا۔۔۔ اور لطیف سوچ رہا تھا اب کے تو پیٹ بھر کے ملے گی۔ ذرا اچھے لاؤں گا۔ ہیرا بائی کا مجرا سنوں گا۔ دس کی بازی ہو جائے گی۔ شاید قسمت ساتھ دے دے۔۔۔ شمشادوالے نے تو ہارنا سیکھا ہی نہیں۔ بھلا کنجر کا نطفہ بھی کبھی ہارا ہے۔

تین بجے تمام لوگ اپنے اپنے ساتھیوں کو لئے چاچا منگو کے چوبارے پر اکٹھے ہو گئے۔ ابھی تک دونوں کبوتروں کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ بادلوں کی ہلکی ہلکی تہوں نے ان کو جانے کہاں چھپایا ہوا تھا۔ تین بج کر پچیس منٹ پر سب سے پہلے لطیف کو ایک باریک سیاہ دھبہ نظر آیا جو بڑا ہوتا چلا گیا۔ اس نے زور سے نعرہ مارا۔۔۔ یا علی۔۔۔ اور شکورے سے لپٹ گیا۔ جیسے جیسے یہ سیاہ دھبہ واضح ہوتا گیا، شریف کا چہرہ اس کے کبوتر کی طرح سیاہ ہوتا گیا۔ آنکھیں بے جان ممی کی طرح ویران ہوتی گئیں، اس کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ سوچنے لگا، یہ ابھی سے کیوں اترنے لگا۔ اس کو تو ابھی نظر بھی نہیں آنا چاہیئے تھا۔ یہ تو رات کو اترتا ہے۔ یہ تو شاہین ہے شاہین۔ کیا تھک گیا ہو۔ نہیں یہ تھک نہیں سکتا۔ یہ ہار سکتا ہی نہیں۔ یہ ضرور جیتے گا۔ یہ شمشادوالے کو مارے ہی مارے۔ اس نے بے اطمینانی سے رمضو قصائی کی طرف دیکھا مگر وہ بھی اس بکرے کی طرح نظر آ رہا تھا جو چھتری تلے پڑا ہو۔

اور شکورا دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ اب میں باپ کا آپریشن ضرور کراؤں گا۔ میرا موتی ہار سکتا ہی نہیں۔ وہ کوئی ہارنے کے لئے تھوڑی پیدا ہوا ہے اس نے طوائف کے گھر آنکھ کھولی ہے۔ وہ کنجر کا جنا ہے۔ وہ بھلا کس سے ہار سکتا ہے۔ پھر وہ شریف کو دیکھنے لگا جو اسے اپنے باپ کی طرح زرد زرد نظر آیا

اس کو دیکھ کر اس کو اپنی جیت کا اور بھی یقین ہوگیا۔ چھ ـــ پھر سو ـــ تین ریسیاں ـــ وہ اپنے باپ کو ہسپتال کے صاف ستھرے کمرے میں دیکھنے لگا۔ کمرے میں چلتا پھرتا دیکھنے لگا۔ چاچا منگو شاہ کے ساتھ بازار میں گھومتا ہوا دیکھنے لگا۔ اسے اپنی پیشانی چومتے ہوئے پایا۔ شمشاد والے کو افیم کی گولیاں کھلاتے ہوئے دیکھا۔ مل میں کام پر جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کا چہرہ قندھاری انار کی طرح سرخ ہوگیا۔ اس نے زور سے نعرہ لگایا۔ اپنا شمشاد والا زندہ باد۔ چاچا منگو زندہ باد۔ اور لطیف نے نعرہ مارا۔ شکورا زندہ باد۔ شمشاد والا زندہ باد۔

چار بجے شریف کا شاہین کانی نیچے اتر آیا تھا مگر شمشاد والا ابھی بہت اونچائی پر اڑتا ہوا ابابیل کے بچے کی مانند نظر آرہا تھا۔ سب کو شکورے کی جیت کا یقین ہوگیا۔ یکایک سب کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ شمشاد والا بڑی تیزی سے تباہ شدہ جہاز کی طرح نیچے آرہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک بیری لگی ہوئی تھی۔ اس نے کئی دفعہ اس کو پر مارا مگر بیکار۔ پھر شکورا گرتے گرتے بچا۔ اس کو لطیف نے سنبھال لیا۔ اس کے منہ سے کئی چیخیں نکل گئیں۔ بیری نے اپنا کام کر لیا تھا۔ دور اونچائی پر شمشاد والا کے پر اڑتے ہوئے نظر آئے۔ وہ جہاز سے پھینکے گئے اشتہار کی طرح جوہڑ کے پاس جا گرا۔ شکورا تیزی سے پاگلوں کی طرح اس کی طرف بھاگا۔

اور جب وہ اس کو اٹھائے روتا ہوا گھر میں داخل ہوا تو اس کو سکتہ سا ہوگیا۔ اس کے آنسو تھم گئے۔ پیروں نے چلنے سے انکار کر دیا۔ وہ ایک بت کی طرح ٹکٹکی باندھے صحن میں پڑی ہوئی چارپائی کو دیکھنے لگا۔ جہاں اس کا باپ مرا پڑا تھا۔ ایک دم اس کے جسم میں حرکت ہوئی اور اس نے زور سے جھرجھری لی اور خون میں لتھڑے ہوئے شمشاد والے کو دیکھنے لگا۔

وہ سوچنے لگا کس کا غم مناؤں ـــ شمشاد والے کا یا اپنے باپ کا؟ ـــ گلاب شاہ کا یا ماں کے اجڑے ہوئے سہاگ کا؟ ـــ موتی کا یا اپنی یتیمی کا؟

اس کی آنکھوں سے کئی آنسو ایک دم نکلے اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے شمشاد والے پر گرنے لگے۔ اس نے زور سے دونوں ہاتھوں میں اس کو بھینچ لیا۔ اس کو سینے سے لگایا اور مسلسل چومنے لگا پھر وہ تیزی سے مڑا اور اس کو دفنانے چلا گیا۔

لیلیٰ عطاء اللہ

ضد

یوں تو قصبے بھر کی لڑکیوں کا پورا گروہ ڈاکٹر صاحب پر دم دیتا تھا۔ مگر عطیہ کی حالت کچھ زیادہ ہی نازک تھی۔ اسی لئے وہ جو بھی دیوانہ پنے کی حرکت کرتی تو کوئی محسوس نہ کرتا۔ اس رعایت خصوصی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ڈاکٹر صاحب اُس کی دریافت تھے۔

انھیں اس دور دراز قصبے کے چھوٹے سے ہسپتال میں آئے چھ سات ماہ ہو چکے تھے مگر لڑکیوں میں سب سے پہلے اُن سے علاج کرانے کا اتفاق عطیہ ہی کو ہوا۔ اُسی نے سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب کا غائبانہ تعارف اور پھر مختلف حیلوں سے ملاقات کرائی۔

اس علاقے کے سخت مزاج جاگیرداروں کی انتہائی سخت باپردہ بیٹیوں کی مجال نہیں تھی کہ وہ مرد ڈاکٹروں سے علاج کرانے کا تصور بھی کرتیں — وہ تو باپوں سے اپنی چھوٹی موٹی بیماریاں بھی اُن کے جلال کے مارے چھپاتی تھیں۔ پردے کی اس قدر پابندی تھی کہ غیر مرد تو کیا چچا تائے کے بیٹوں تک سے چھپنا پڑتا مگر عطیہ غریب کی بیماری ہی کچھ ایسی عشق مشک قسم کی تھی کہ چھپائے نہ چھپی — پہلے تو اماں جانی نے بہت کچھ کوشش کی اور کافی عرصے تک اس کوشش میں کامیاب بھی رہیں مگر کب تک — بے عطیہ بے چاری کو جب بھی دورہ پڑتا تو اس کی یہ حسِ امتیاز ہی ختم ہو جاتی کہ وہ کہاں ہے اور کون کون دیکھ سن رہا ہے —— اکثر ایسا ہونے لگا کہ بابا کو کھانا کھلا رہی ہوتی یا چائے پانی دے رہی ہوتی کہ اچانک دھم سے زمین پر گر جاتی، ہاتھ پاؤں اکڑ جاتے، بتیسی بند ہو جاتی بالکل مردوں کا سا حلیہ ہو جاتا۔ پھر اُسی بے ہوشی میں اس قدر شدت کی اور بے ساختہ چیخیں نکلتیں کہ سارا شہر سنتا۔ بابا جان بے چارے مع اپنے سارے جاہ و جلال اور مزاج کی پابندی کے گھبرا گئے۔ پہلونٹھی کی چہیتی بیٹی تھی اور پھر تو نذر چڑھی ہوئی۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ سارا جاتا دیکھئے تو آدھا دیجے بانٹ —— تو غیر خدانخواستہ بانٹنے کا تو سوال ہی نہ تھا مگر میرا مطلب یہ ہے کہ باقاعدگی سے علاج پر خود بخود راضی ہو گئے۔ لیڈی ڈاکٹر وہاں دور دور نہ تھی۔ ایک ڈاکٹر صاحب تھے جن کی مسیحا صفتی اور ہاتھ کی شفا کا چرچا تھا۔ انھیں کا دم غنیمت نظر آیا اور ایک دن خود ہی ساتھ لے آئے۔ یہ مرض اُن کے لئے کچھ ایسا عجیب اور خوفناک تھا کہ مسہری کے پردوں میں سے کلائی نکال کر صرف نبض دکھانے سے بات نہیں بنتی تھی سو پردہ اتر گیا۔

ڈاکٹر صاحب مریضہ کی بیماری تو خیر فرلانگ بھر کے فاصلے سے بھانپ گئے مگر اپنے طور پر نفسیات کا خاصا مطالعہ کر رکھا تھا۔ بیٹی کے علاج سے زیادہ گھبرائے ہوئے باپ کی تسلی کے لئے نبض دیکھی۔ سٹیتھسکوپ لگا کر اچھی طرح معائنہ کیا۔ ایک آدھ بے مزہ سا انجکشن بھی لگایا اور نسخہ لکھنے کے لئے کاغذ قلم طلب کیا۔ اس دوران مریضہ ہوش میں آکر اپنے طور پر خاصی تسلی سے ڈاکٹر صاحب کا معائنہ فرما چکی تھیں۔ بوکھلائے ہوئے والد صاحب کو خود ہی قلم کاغذ لے کر لپکے ہوئے آتے دیکھا تو بڑے اطمینان سے آنکھیں بند کر لیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نسخے پر تین چار سکون آور ٹانک اور ٹھنڈی دوائیں گھسیٹ کر کاغذ اُن کے ہاتھ میں تھمایا کہ کیمسٹ سے منگوا لیں اور خود چلتے بنے۔

دوسرے مریضوں کے لئے بلاشبہ ڈاکٹر صاحب کا علاج آگ پر پانی کا اثر رکھتا ہو مگر عطیہ کے لئے تو آگ پر تیل ثابت ہوا۔ بجائے کم ہونے کے دوروں کی شدت

بڑھ گئی۔ وقفہ بھی کم پڑنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب کی نفسیات۔ دائمی اُن کے لئے بلا ہو گئی ——— ایک ڈاکٹر تھا اور تھیں بھر کے مریض ——— مرض کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت، نیک مزاجی اور لیاقت کا شہرہ سن کر ڈاکٹر صاحب کے پاس اس سے بھی زیادہ دور دراز سے مریض آنے لگے تھے اور یوں جب وہ مریضوں کے اژدہام میں بگر سے نسخے لکھنے اور ان کمزور لاچار انسانوں کے دکھ سن کر ان کا علاج ڈھونڈھنے میں مشغول ہوتے تو اچانک عطیہ کی خاص ملازمہ ایک مرد لڑکے کے نمودار ہوتی اور سب کچھ چھوڑ کر اپنے ساتھ چلنے کی فرمائش کرتی۔ تب انھیں یہ سب کچھ بیحد شاق گذرتا۔ انھیں ان سب حاجت مندوں کو چھوڑ کر ایک بڑے گھر کی چہیتی اور اپنی آسائش اور بیکاری کے ذہنی مرض میں مبتلا لڑکی کی خدمت میں گھنٹہ بھر کی غیر ضروری حاضری سخت کھلتی مگر مجبوری تھی کیا کیا جاتا!

انھی بے شمار دوروں کے درمیان عطیہ اپنی ڈیڑھ درجن کے لگ بھگ سہیلیوں اور رشتے کی بہنوں کو بھی ڈاکٹر صاحب کا دیدار کرا چکی تھی اور مختلف موقعوں پر کم و بیش ساری لڑکیاں تیمار داروں اور بے حال مریضہ کو سنبھالنے والیوں کی صورت میں خود بھی ڈاکٹر صاحب کے سامنے آ چکی تھیں۔ سبھی نے اس پر صاد کیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب ویسے تو خیر مردوں ایسے مرد ہیں مگر ان کی مسکراہٹ میں کچھ ہے اور آنکھیں بھی لاجواب ہیں۔ خصوصاً جب اچانک پلکیں اُٹھا کر دیکھتے ہیں تو ——— یا کسی بات پر اچانک جھینپ کر نظریں نیچی کر لیتے ہیں تو ——— وغیرہ وغیرہ

پہلے پہل تو ڈاکٹر صاحب کو بھی شک نہ گزرا تھا یہی سوچا کہ وہی ماں باپ کی لاڈلی بیٹی سے سابقہ ہے مگر آہستہ آہستہ وہ بھی چونکنے لگے۔

اس کے ساتھ ہی سبھی لڑکیوں کو طرح طرح کے مرض لاحق ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب آئے دن کسی نہ کسی حویلی میں بلوائے جاتے اور اچھی بھلی صحت مند سرخ و سفید مریضاؤں کو دیکھ دیکھ کر بوکھلایا کرتے۔ یہ بھی نہ کہہ سکتے تھے کہ تمھیں کوئی مرض نہیں ہے، اچھی بھلی ہو۔ ایک دفعہ کہہ بیٹھے تھے غلطی سے تو لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ اس بار مریضہ نے بڑی پیاری ادا سے منہ بنا کر کہا تھا "ہونہہ! دیکھ لی آپ کی ڈاکٹری، مرض سمجھ میں نہ آیا تو کہہ دیا کہ کوئی بیماری ہی نہیں ہے۔"

"آپ جیسی ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے" سامنے کھڑی ٹکٹکی باندھ کر مسیحا کو تکتی ہوئی عطیہ نے اس قدر ٹھنڈی سانس بھر کر کہا تھا کہ ایک دفعہ تو ڈاکٹر صاحب بھی کپکپا گئے، اور پھر ساری لڑکیوں کا بیک آواز کورس کہ "ہم مرے جاتے ہیں تم کہتے ہو حال اچھا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے گھبرا کر پائنتی بیٹھی بزرگ خاتون کو دیکھا جو ان کی مریضہ کی غالباً والدہ تھیں اور انھوں نے جلدی سے ڈاکٹر صاحب کی نظروں اور اپنے چہرے کے درمیان جھالر دار پنکھا حائل کر لیا ——— یہ لڑکیاں تو بلا ہیں بلا، اس جوان مسٹنڈے ڈاکٹر سے ذرا نہیں گھبراتیں ——— پر مجھے تو بھائی لحاظ آتا ہے۔ کیسے ایک ایک کو پلٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہے۔ انھوں نے پنکھے کی جالی میں سے ڈاکٹر صاحب کو کل کے لٹو کی طرح مختلف آوازوں پر ادھر سے ادھر مڑتے دیکھ کر سوچا۔

ڈاکٹر صاحب کی مسکراہٹ اور خوبصورت آنکھیں قصبے بھر کی خواتین میں مشہور ہو چکی تھیں۔ بچیوں سے لے کر بڑی بوڑھیوں تک انھیں خاص طور پر دیکھ چکی تھیں اور جو ایک آدھ اس کار ثواب سے محروم رہ گئی تھی اسے یہ محرومی ختم کرنے کی حسرت تھی۔ پتہ تو چلے یہ ساری لڑکیاں آخر کیوں باؤلی ہوئی پھرتی ہیں ویسے تو یہ عمر ہی پاگل پنے کی ہوتی ہے مگر پھر بھی۔

انھی محروم خواتین میں سے خالہ حمیدہ بھی تھیں۔ جن کی بدقسمتی سے کوئی اتنی بڑی اور شریر لڑکی نہ تھی جو اپنی باری پر سر یا پیٹ کے شدید درد میں مبتلا ہو کر ڈاکٹر صاحب کو تکلیف دیتی ——— مگر روز کے نئے نئے قصے سن کر ان کا جی مچلتا۔ کبھی آخر دیکھیں تو سہی وہ کون ہے ایسا یوسف ثانی جس کے پیچھے سبھی لڑکیاں اور خصوصاً عطیہ ——— اقبال آپا کی اتنی لاڈلی اور نک چڑھی عطیہ بالکل جوگ سا لئے پھرتی ہے۔

انھیں یہ چھوکریوں کا سا ڈھونگ رچاتے خود بھی بڑی خفت سی محسوس ہوئی مگر تجسس ہر جذبے پر بازی لے گیا۔ ڈاکٹر صاحب نرمی سوٹ پہنے، کار لئے کار دروازے تک آئے تو کمپونڈر سے بیگ انھوں نے خود سنبھال لیا (کمپونڈر مقامی تھا اور اس سے پردہ نہیں لازم تھا)

حمیدہ خالہ کو زیادہ ڈھونڈنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ عمر کے تقاضے سے کئی بیماریاں بفضلہ ریڈی میڈ موجود تھیں۔ دل کی دھڑکن کی شکایت، بلڈ پریشر کی کمی بیشی یا جوڑوں کا درد تو کہیں گیا ہی نہ تھا۔

جتنا عرصہ ڈاکٹر صاحب اُن کے بازو پر پٹی لپیٹے غور سے بلڈ پریشر ناپنے والے آلے کی طرف دیکھتے رہے وہ بغیر کسی جھجک کے بڑے اطمینان سے ڈاکٹر صاحب کو تکا کیں

سے ناچتی کودتی رہیں اور سوچتی رہیں کہ لڑکیاں تو سچ مچ پاگل ہیں۔ اب کوئی پوچھے بھلا اس سالے سے لڑکے میں آخر رکھا ہی کیا ہے، اچھا ہے مگر خیر ایسا بھی کیا کہ انسان ہوش ہی گنوا بیٹھے۔ اپنے خاندان کے شہزادوں ایسے گورے چٹے، کالی بھنورا آنکھوں والے لڑکوں کے سامنے اس کی حیثیت ہی کیا ہے؟ مگر ساتھ ہی انھیں یہ خیال بھی آیا کہ کنواری لڑکیوں کو بھلا خاندان کے لڑکوں کے نزدیک بھی کون پھٹکنے دیتا ہے۔ خیر پھر بھی اِدھر اُدھر سے تاک جھانک کر دیکھ تو رکھے ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر نظریں جمائے وہ یہ سب سوچ رہی تھیں کہ اچانک ڈاکٹر نے آلے کو ڈھیلا چھوڑ کر ان کی طرف دیکھا، پلکیں کچھ عجیب انداز میں گرگرائیں اور مسکرا کر بولے "بلڈ پریشر تو آپ کا بالکل ٹھیک ہے۔ البتہ جوڑوں کے درد کے لئے نسخہ لکھے دیتا ہوں۔"

ممکن ہے اس کی وجہ اپنے دل کا چور ہو مگر خالہ حمیدہ کو ڈاکٹر کی مسکراہٹ میں شرارت کی جھلک نظر آئی اور اس خیال سے کہ کہیں ڈاکٹر ان کی بیماری بھانپ نہ گیا ہو، وہ لڑکیوں کی طرح شرما گئیں مگر ساتھ ہی وہ کچھ کچھ قائل بھی ہو گئیں۔ ڈاکٹر کی مسکراہٹ اور نگاہ میں واقعی کچھ ہے تو سہی۔ اب حمیدہ خالہ کو کون سمجھاتا کہ خالہ جان ہے تو بہت کچھ۔ پر آپ محسوس کرنے کی سرحد ہی سے نکل چکی ہوں تو کیا کیا جائے۔

معاملہ برداشت سے باہر ہونے لگا اور بدنامی کا اندیشہ بڑھا تو ڈاکٹر صاحب پریشان ہو گئے۔ اس سارے تماشے کا اول تو مطلب ہی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ لاکھ لڑکیاں سنجیدہ ہوں وہ یہی محسوس کرتے کہ انھیں بنا رہی ہیں۔۔۔ اتنی بہت سی حسین لڑکیاں۔۔۔ آخر انھوں نے ان میں دیکھ ہی کیا لیا تھا؟ وہ اکثر سوچتے۔ عام مردوں کے برعکس وہ زیادہ خوش فہم نہ تھے۔ پھر ایک آدھ لڑکی ہوتی تو جب بھی بات تھی وہ سنبھال لیتے مگر یہ اتنا بڑا غول بیابانی۔ داناؤں کا قول ہے کہ دو ملاؤں میں مرغی حرام ہوتی ہے اور یہاں تو خیر سے پورا لشکر تھا، مرغی بے چاری پر کیسے جان چھپاتی پھرتی۔۔۔ آسان ترین طریقہ یہی نظر آیا کہ۔۔۔ اب تک ڈاکٹر صاحب کی نظر سے جتنی محترمائیں گزری تھیں ان سب سے زیادہ قابل رشک ان لڑکیوں کی صحت تھی سو اس طرف سے تو ضمیر پر بوجھ پڑے گا نہیں۔ لہٰذا گھر میں جا کر مریضاؤں کو دیکھنا قطعی بند۔ اور یہ صرف ارادہ ہی نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے پوری طرح نبھایا اور تقریباً ہفتہ بھر تک اپنڈے سائٹس، اختلاج قلب اور آنکھوں اور سر کے سخت درد میں مبتلا جاں بلب مریضاؤں کے گھر جانے سے بالکل انکار کر دیا۔ سب مایوس ملازماؤں کو یہی جواب ملا کہ جو علاج کرانا چاہتے ہیں ہسپتال تشریف لے آئیں۔ میں کسی کے گھر جانے کا پابند نہیں۔ کام میں حرج ہوتا ہے۔

یہ ایک ہفتہ ڈاکٹر صاحب نے بے حد اطمینان اور سکون سے گزارا۔ ڈیوٹی کا وقت ہسپتال میں مصروف رہتے، شام بے فکری سے اپنے کمرے میں مطالعہ کرنے اور ریکارڈ سننے میں گزارتے۔ سارے ہنگامے اور گتھیاں اپنے آپ ان کے دماغ سے دور ہونے لگیں۔۔۔ صبح بڑے تازہ دم اور خوشگوار موڈ میں ہوتے جس سے مریضوں اور عملے میں مزید مقبول ہو گئے۔

ایسے ہی ایک دن ہسپتال کسی وجہ سے ذرا دیر سے پہنچے۔ برآمدہ اور ویٹنگ روم مریضوں سے پٹا پڑا تھا وہ کرسی پر بیٹھ بھی نہ پائے تھے کہ بدحواس کمپوڈر جلدی سے سامنے آ گیا: "جناب! پہلے ذرا خواتین کے کمرے کو دیکھ لیجیے۔"

جائز بات تھی بیٹھنے کے لئے کھینچی ہوئی کرسی یونہی چھوڑ کر ڈاکٹر صاحب خواتین کے کمرے کی طرف بڑھے اور دروازے میں جم کر رہ گئے۔ کمرے میں دیواروں کے ساتھ دو طرفہ لکڑی کے سخت بنچوں پر دیوالی کے دیئے سے جل رہے تھے۔

"آپ سب کس لئے آئی ہیں؟" ڈاکٹر صاحب نے ہکلا کر پوچھا۔

"کمال کرتے ہیں آپ۔ ہسپتال میں لوگ کس لئے آتے ہیں۔۔۔؟" جواب ملا

ڈاکٹر صاحب کچھ سنبھل کر اندر آ گئے۔ "مگر آپ سب تو اچھی بھلی نظر آتی ہیں۔ کیا تکلیف ہے آپ کو؟"

"یہی تو ہمیں معلوم نہیں۔ آپ ڈاکٹر ہیں تشخیص کیجیے نا؟" اور ساتھ ہی دبی دبی ہنسی، ایک بار تو ڈاکٹر صاحب بھی ساری احتیاط بھول کر ہنس پڑے۔

"کمپونڈر صاحب کارمینیٹو مکسچر کی ایک ایک خوراک سب کے لئے بھیج دیجیے۔" انھوں نے وہیں کھڑے کھڑے کہا، پھر اچانک سنجیدہ ہو کر کمرے سے نکل گئے۔

یہ سلسلہ پہلے سے بھی زیادہ پیچیدہ اور خطرناک تھا۔ ہر صبح ڈاکٹر صاحب لرزتے کانپتے اپنے کوارٹر سے برآمد ہوتے۔ ہسپتال کے برآمدے تک پہنچتے پہنچتے حالت اور بھی غیر ہو جاتی۔ یہی دھڑکا لگا رہتا کہ وہ سب پھر موجود نہ ہوں۔ اب تو غالباً کمپونڈر بھی کچھ کچھ سمجھ گیا تھا۔ جس دن ہسپتال پہ پریوں کی یلغار ہوتی، ڈاکٹر صاحب کی سراسیمگی دیکھ

دیکھ کر اُسے مسکراہٹ چھپانا مشکل ہو جاتا۔ بلا ضرورت اگر دکی انچ انچ بھر موٹی تہہ چڑھے پرانے رجسٹروں سے پٹی ہوئی الماریوں میں منھ دے کر بیکار کی کھٹ پٹ کرتا پھرتا ڈاکٹر صاحب کی اور بھی جان ہوا ہوتی کیونکہ وہ رستانی تھا اور سب کو جاننے پہچاننے والا۔ اُس کے ذریعے کسی وقت بھی اُن کی ناکردہ گناہی کا جرم برسرِ عام کھل سکتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی نگاہ بے نیازی بے پناہ سنجیدگی اور سارا زہد و اتقا بجائے لڑکیوں کو مایوس کرنے کے شاید اُن کے سمندِ ناز پہ تازیانہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بھی بچے نہ تھے جتقد ور بھر خاصی دنیا دیکھ چکے تھے۔ انھیں معاملے کی نوعیت کی سنگینی کا برابر احساس تھا اور وہ پہلے دن ہی سے جانتے تھے کہ یوں تو سبھی لڑکیاں دلچسپی لیتی ہیں اور موقع پاکر اظہارِ شوق بھی بڑی فراخ دلی سے کر دیتی ہیں مگر وہ سب اتنی سنجیدہ نہیں جتنی عطیہ — اُس کی حرکتیں بعض دفعہ تو مجنونوں کی سی لگتیں۔ شروع شروع میں وہ ایسے موقعوں پر بیٹی سٹوری ہوتی مگر پھر ایسی وارفتگی طاری ہوتی کہ تنہا رہنگ سے بجو ایسے حالات میں لڑکیوں کے لئے اور بھی لازمی ہو جاتا ہے لاپروا ہو گئی کپڑے قیمتی ہوتے مگر گنجلے ہوئے۔ صاف پتہ چلتا کہ رات اُنھی میں سوئی ہے اور اسی طرح آ گئی ہے۔ چہرہ قطعی سادہ — لمبے لمبے بھورے بال اُلجھے اور بکھرے ہوتے اور کاجل بھی بکھری ہوئی لکیاں ٹوٹی ٹوٹی نہ چاہتے ہوئے بھی ڈاکٹر صاحب کا ذہن بھٹکنے لگتا اور وہ گھبرا کر کمرے سے نکل آتے۔

اِس میں شک نہیں کہ وہ تقریباً سبھی حسین تھیں مگر ڈاکٹر صاحب کی بوکھلاہٹ کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے زندگی بھر ایسی لڑکیاں نہ دیکھی تھیں۔ یہ سب خوبصورت سہی مگر باقی دنیا میں صرف بدصورت تو نہیں بستے۔ وہ ہوش سنبھالنے کے بعد سے ہی حسن سے شناسا ہو چکے تھے۔ پہلے کانونٹ میں پڑھتے رہے۔ ایف۔ ایس سی کے بعد میڈیکل کالج کے پانچ سال اور پھر کامیاب ہونے کے بعد سال بھر کو ملک کے سب سے بڑے ہسپتال میں ہاؤس جاب۔ لاکھوں ہی تو لڑکیاں — ساتھی طالبات، کولیگز، نرسوں اور مریضاؤں کی صورت میں نظر سے گزر گئیں۔ جھجک یا دمیدگی کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا — نہ ہی وہ ایسے زاہدِ خشک تھے کہ بیہودگی نہ سہی ان لڑکیوں سے مناسب دوستانہ رویہ بھی نہ رکھتے — یہ تو اللہ کی دین ہے کہ آگ لینے کو جائیں پیغمبری مل جائے۔ (انھوں نے جب اس پوسٹ کے لئے درخواست دی تھی تو اپنے کو بالکل شہادت کے درجے پر پایا تھا۔ حالانکہ شروع ہی سے جب میٹرک میں سائنس رکھی تو ارادہ خدمتِ خلق کا ہی تھا مگر تعلیم کی تکمیل کے بعد اس دور دراز اور پسماندہ علاقے میں آنے کے لئے نفسِ امارہ سے زبردست جنگ کرنی پڑی تھی — بہرکیف یہاں آنے کے بعد یہاں کے سادہ اور خاموش ماحول میں غریب اور بے آسرا لوگوں کی اس سچ مچ کی بے لوث خدمت میں انھیں حقیقتاً روحانی سکون ملا تھا) مگر انھیں نہ پائے تھے کہ اس عجیب و غریب سے بے تکے جال میں اُلجھ کر رہ گئے۔ سارا سکون اور یکسوئی غارت ہو گئی — اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ یوں کنواری لڑکیوں کی طرح شرمانے اور دامن بچانے کی بجائے زبانی کلامی سب لڑکیوں کو بہلا کر جان چھڑا لیں۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ ان سرو قد، شفاف رنگ اور سیاہ چشم لڑکیوں کو دیکھتے ہی اُن کے تصور میں اُن کے دیسی حلیے کے گرانڈ سے کہیں زیادہ تند اور اکھڑ مزاج اور تنومند باپ بھائی آ جاتے کیریکٹر کیرکیٹر انھیں اپنی جان تک خطرے میں نظر آتی۔

پھر کچھ امن سا ہو گیا۔ ہفتہ بھر سے زیادہ گزر گیا، لڑکیوں کا ہسپتال کی طرف پھیرا نہ پڑا۔ ڈاکٹر صاحب کو کچھ خلش سی تو محسوس ہوئی جیسے گھر کا ریڈیو خراب ہو جائے یا سوتے وقت پڑھنے کو جی چاہے اور پسندیدہ کتاب میز پر سے غائب ہو مگر پھر بھی انھوں نے اسی میں عافیت جانی۔ خدا کا شکر کیا اور پوری دلجمعی سے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

اکتوبر کی ایک بڑی ہی کافر رات تھی۔ ایسی رات جس میں خواہ مخواہ کوئی پاگل پنے کی انوکھی سی بات کرنے کو جی چاہے۔ کھڑکی کے نیچے رات کی رانی کا پرانا گرد آلود پھول والا جھاڑ تھا جس پر دن کے وقت خواہ نظر ڈالنے کو جی نہ چاہے مگر اس وقت اُس نے قیامت مچا رکھی تھی۔ ڈاکٹر صاحب سمیت سارا کمرہ خوشبو کے سمندر میں تیر رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کوئی انوکھی انجانی حرکت تو اس گرد بھرے قصبے میں خیر کیا کرتے سو ساڑھے دس بجے تک وہ ہوتے رہے، جو اب قرآن دور معلوم ہوتا تھا کوئی بور سا جشنِ موسیقی سنتے رہے پھر کچھ دیر ایک بیہودہ سی ردی پھیکی کتاب دیکھی پھر بیڈ لیمپ بجھا کر سونے کی کوشش کرنے لگے۔

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ کھٹکا۔ بیزار نہ ہوئے، باوجود غنودگی کے، دل میں یہ سوچ کر کہ کوئی ضرورت مند ہوگا، انھیں کچھ اطمینان کی سی کیفیت محسوس ہوئی۔ یوں زبردستی سونے سے تو اچھا ہے کہ کسی کے کام آئیں — انھوں نے اونگھتے اونگھتے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔

دروازہ کھلتے ہی وہ ایک دم دھکا سا کھا کر پیچھے ہٹے۔ نیندیں غائب ہو گئیں جیسے کبھی آئی ہی نہیں تھی۔ باہر چاندنی میں پیلے پیلے کپڑے پہنے کونجوں کی ڈار

اتری ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر صاحب کچھ کہتے وہ سب اندر آگئیں۔ دروازے کے پاس لگا بجلی کا بٹن دبا کر وہ ٹھٹھکے تو اس دوران میں وہ سب بڑے اطمینان سے کرسیوں پر، پلنگ، میز پر اور کھڑکی کی سل پر بیٹھ چکی تھیں۔ عطیہ اُن سب میں نمایاں تھی۔ اُس کے ململ کے لاپروائی سے رنگے دوپٹے پر گوٹا لگا ہوا تھا، ہاتھ مہندی میں رچے ہوئے تھے اور آنکھیں سرخ تھیں جیسے مہندی کا رنگ آنکھوں میں پہنچ گیا ہو۔ وہ خلافِ معمول چپ بیٹھی، سر جھکائے دوپٹے کے کونے کو انگلی پر کھول لپیٹ رہی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کو باقی لڑکیوں سے معلوم ہوا کہ عطیہ تین چار دنوں تک دلہن بننے والی ہے۔ وہ شادی پر رضامند نہ ہوتی تھی مگر اماں نے اپنا دوپٹہ اس کے پاؤں پر ڈال کر بمشکل منایا ہے۔ آج اُسے مہندی لگی تھی۔ یہاں آنے کے لئے اُس نے وقت سے پہلے ہی چھٹا دیا ہے۔ اور یہ کہ عطیہ ڈیڑھ ہفتے سے مایوں بیٹھی ہوئی ہے۔ آج بڑی مشکل سے وہ کھلی ہوا میں ٹہلنے اور دریا تک جانے کے بہانے باہر نکلی اور یہاں تک آئی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب کو خاصی سردی کے باوجود ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔ ساتھ ہی ان قید و بند کی عادی نازک اندام لڑکیوں کی جرأت پر حیرت ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ آخر اس وقت ان کی وجہ نزول کیا ہو سکتی ہے۔ یہ مشکل بھی عطیہ کی سہیلیوں نے حل کر دی۔ شادی چونکہ اپنے عزیزوں میں ہو رہی تھی لہٰذا عطیہ شادی کے بعد بھی یہیں رہے گی مگر سسرال سے چوری آنا ناممکن ہوگا اس لئے وہ ڈاکٹر صاحب کی کوئی اچھی سی تصویر لینا چاہتی تھی تاکہ آئندہ زندگی کے اُجاڑ اور بے رونق دنوں میں اس سے جی بہلا سکے۔

ڈاکٹر صاحب کو یہ مطالبہ کسی صورت منظور نہ تھا کیا پتہ کب اُن کی تصویر عطیہ کے سسرال والوں کے ہاتھ لگ جائے۔ اپنے ماں باپ اور بھائی بہن تو برداشت بھی کر جاتے ہیں مگر سسرال والوں اور شوہر کا ایسی حرکت پر ردِ عمل ظاہر ہے جو ہو سکتا ہے۔ عطیہ کا جو حال ہوگا سو ہوگا۔ یہ کون مانے گا کہ ڈاکٹر صاحب اس سارے معاملے میں قطعی بے گناہ ہیں کسی قسم کی صفائی کا موقعہ ملے گا نہیں۔ ایسے سلسلوں میں کسی کو کب اتنی تاب ہوتی ہے۔

گرگرکے رنگے گوٹے زرد کپڑوں کھلے بالوں اور مہندی رچے ہاتھوں کے ساتھ سوگوار سوگوار سی عطیہ انہیں آج بہت اچھی لگ رہی تھی۔ پہلی بار انہیں یہ نشہ خیز احساس ہوا کہ اتنی پیاری لڑکی اُن کے پیچھے جان دیئے دے رہی تھی۔ اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اپنے سے۔ ال اور آئندہ زندگی کا ذکر سن کر عطیہ کی آنکھیں بے ساختہ برسنے لگی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے الماری سے سیاہ جلد کا بیش قیمت البم نکال کر سارے کا سارا اُن کے سامنے رکھ دیا۔

شادی کے بعد عطیہ۔ کھڑکیوں پر اور آگے پیچھے شیشوں پر موٹے آسمانی رنگ کے پردے لگی کار میں شوہر کے ساتھ مہینہ بھر کے لئے سوات چلی گئی۔ اسی دوران میں اچانک پردہ غیب سے ڈاکٹر کے تبادلے کے احکام آگئے۔ باوجود خدمتِ خلق کے حقیقی اور بے پناہ جذبے کے وہ بے حد خوش ہوئے اور بڑے اطمینان سے مختصر سا سامان باندھ کر چپکے سے چمکتے مہکتے شہروں سے پرے بستے ہوئے اس خاموش سے قصبے سے روانہ ہو گئے۔ جس کی کوئی یادگار اُن کے پاس موجود نہیں تھی سوائے ایک اُجڑے ہوئے البم کے۔

ایک شادی کی تقریب میں بے انتہا بنی سنوری، زیوروں سے لدی، زری میں لپٹی تین چار آیاؤں اور ملازماؤں کے باوجود اپنی پیاری سی بچی کو گود میں اُٹھائے مسرور اور شادماں عطیہ کو دیکھ کر خدا جانے کیوں خالہ حمیدہ کو وہ ڈاکٹر یاد آگیا، کبھی جس کی موہنی مسکراہٹ اور اچھی آنکھوں کا شہر بھر میں چرچا تھا اور جس کے پیچھے عطیہ بال بکھرائے بے ڈھنگے کپڑے پہنے جوگ سا لئے پھرتی تھی۔

ساری احتیاط اور نشیب و فراز کو بھول کر وہ عطیہ سے مخاطب ہوئیں "عطیہ! وہ ڈاکٹر یاد ہے؟"

"کون سا؟"

"وہ ۔۔۔!"

"ہاں وہ ۔۔۔ یاد تو ہے" عطیہ لاپروائی سے ہنس دی۔

"لوگ کہتے تھے کہ تم ۔۔۔"

"ہاں خالہ" عطیہ نے جلدی سے اُن کی بات کاٹ دی "ٹھیک کہتے تھے لوگ کہ میں اُس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ میرا علاج کرتے ہوئے پتہ نہیں کیسے کیا تکلیف ہوتی تھی حالانکہ ابا جان فیس بھی ڈبل دیتے تھے ۔۔۔ ضد ہو گئی تھی مجھے اُس ڈاکٹر کے بچے سے"

یعقوب ناسک

کروٹ

عابدہ سکول سے واپس آئی تو اس نے گلی کے موڑ پر بڑی کو جھولے جھولے قدم اٹھاتے ہوئے دیکھا۔ سیاہ پتلون اور سفید قمیض پہنے وہ بڑا بھلا لگ رہا تھا سیاہ پتلون اور سفید قمیض اس کے کھلتے ہوئے رنگ پر بہت بھلی لگتی تھی۔ جب وہ چھوٹا سا تھا تو اس کے گال بڑے بڑے اور پھولے پھولے سے ہوتے تھے، اور جب بھی وہ اسے لے کر گلی میں آتی تھی کوئی واقف نا واقف ضرور اس کے گالوں پر چٹکی بھرتا۔ عابدہ کی عمر اس وقت آٹھ سال تھی جب بڑی پیدا ہوا۔ اس دن ہلکے ہلکے بادل گھرے ہوئے تھے۔ وہ صبح سو کر اٹھی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس کی چارپائی کسی اور ہی کمرے میں تھی اور ابا جی کے پاس بیٹھے شیو بنا رہے تھے۔ "ارے جلو تو اٹھ گئی ہے"

وہ آنکھیں ملتی ہوئی چارپائی سے اتر آئی اور پوچھنے لگی "امی کہاں ہیں؟"

"اندر دوسرے کمرے میں"

وہ اٹھ کر جانے لگی۔

"ارے ارے!" سیفٹی ریزر رکھ کر ابا نے اسے پکڑ کر گود میں اٹھا لیا "وہاں نہ جانا بھئی، وہاں بہت سی عورتیں بیٹھی ہیں۔"

"تو پھر میں کیا کروں؟ میں ضرور جاؤں گی" وہ مچلنے لگی۔

ابا اسے گدگدی کرنے لگے "نہیں بابا وہاں نہ جاؤ۔ چلو چونی لے لو"

"نہیں پانچ آنے لوں گی" اس نے پانچوں انگلیاں پھیلا کر دکھا دیں۔

"اچھا بھئی پانچ آنے ہی لے لو" ابا نے پانچ آنے گن کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ "تم اب منہ ہاتھ دھو لو اور ناشتہ کر کے سکول چلی جاؤ"

وہ اٹھ کر غسل خانے کی طرف جانے لگی

"ارے عابدہ ذرا سننا تو" ابا نے اسے پکارا

اس نے مڑ کر دیکھا ابا بانہیں پھیلائے کھڑے تھے۔ وہ بھاگ کر لپٹ گئی۔

"عابدہ تمہیں ایک بھائی لا دیں؟"

"ہاں لا دیں" وہ مسکرانے لگی

"اچھا لا دیں گے۔ اب سکول جاؤ"

اور وہ گود سے اتر کر غسل خانے میں چلی گئی۔ جب وہ سکول سے واپس آئی تو گھر میں اسے چہل پہل نظر آئی۔ صغراں بوا اسے اٹھا کر اندر لے گئی "عابدہ تمہارا ہاں ایک ننھا بھائی آ گیا ہے"

امی رضائی اوڑھے لیٹی تھیں اور ساتھ سرخ سرخ سا چھوٹا سا بچہ دکھا تھا۔ اور وہ اُسے مسرت بھری نظروں سے تکنے لگی۔ ماں نے رضائی سے ہاتھ نکال کر اس کا سر سہلایا "عابدہ تیرا بھائی"

وہ اس پر جھک گئی اور اس کے ہونٹوں کو چھیڑنے لگی "ابا لائے ہیں نا؟" اس نے کہا۔

کمرے میں موجود سب عورتیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اور ماں نے گھبرا کر دوپٹے سے منہ ڈھانپ لیا۔

اس کا نام ظہیر رکھا گیا لیکن سب اسے بڈی ہی کہتے تھے اور جب وہ ذرا بڑا ہوا اور اس کی طرف باہیں پھیلا کر دیکھتا تو وہ اسے جھپٹ کر اٹھا لیتی۔

"چھیل ہے نری کیا؟ بوچ لیتی ہے" ماں کہتی۔

عابدہ مسکرانے لگی اور اس نے تیز تیز قدم اٹھانے شروع کر دیئے۔ بڈی اسی طرح بے ہنگم سی چال چلتا ہوا گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے بوٹوں کے تسمے کھلے ہوئے تھے اور قمیص پتلون کی پچھلی جانب سے باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ میں اس نے دوات تھام رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ میں تختی تھی جس کو وہ بڑے زور زور سے ہلا رہا تھا اور چلتے چلتے پاؤں سے کنکریوں کو ٹھوکریں بھی لگا رہا تھا۔ عابدہ نے قدم اور تیز کر دیئے۔ وہ اسے گھر پہنچنے سے پیشتر جا لینا چاہتی تھی۔ اس نے تیز تیز قدم اٹھائے اور اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر زور سے آواز نکالی۔ وہ ڈر کر اچھل پڑا اور پھر اسے دیکھ کر ہنسنے لگا۔

"ارے احمق تو نے پھر سیاہی سے منہ ہاتھ رنگا ہوا ہے ذرا چل کے آئینے میں اپنی شکل تو دیکھ۔ پورا اچھا رنگ رہا ہے"

وہ شرما گیا۔ پھر معنی خیز نظروں سے اسے تکنے لگا۔

"لائی ہو؟" وہ مسکرانے لگی۔ "لائی ہوں بابا فکر نہ کرو"

"تو پھر دو نا" اس نے ہاتھ پھیلا دیا۔

"ایسے نہیں۔ پہلے منہ ہاتھ دھوؤ۔ پھر ملے گی"

"نہیں ابھی لوں گا" وہ مچل گیا "نہیں تو امی کو بتا دوں گا کہ روز املی کھاتی ہے"

"ہائے نہ بتانا" وہ گھبرا گئی "اندر چل کے دیتی ہوں"

دونوں نے کمرے میں کتابیں رکھیں۔ امی دوسرے کمرے میں تھیں عابدہ نے کاغذ میں لپٹی ہوئی املی جیب سے نکالی اور اس کے برابر برابر دو حصے کئے۔ وہ اپنے حصے کی جلدی ہی چٹ کر گیا۔ عابدہ اپنے حصے میں سے تھوڑی تھوڑی کھا کے چوستی رہی۔ وہ اسے للچائی ہوئی نظروں سے تکتا رہا۔

"ارے ساری کی ساری ہضم بھی کر گیا۔ تو تو بڑا لڑکی ہے۔ کیا کھٹی چیزیں کھا جاتا ہے"

اور اس نے اپنا حصہ بھی اس کے حوالے کر دیا۔ وہ ہمیشہ ہی اسے اپنے حصے کی چیز دے دیا کرتی تھی

عابدہ کو روز دو آنے جیب خرچ ملتا تھا۔ مگر جب سے وہ آٹھویں جماعت میں گئی تھی اس کے دو آنے اور بڑھ گئے تھے۔ البتہ بڈی کو دو آنے ہی ملتے تھے۔ دونوں کی اپنی اپنی گلکیں تھیں جن میں وہ پیسے جمع کرتے تھے۔ بڈی بہت سارے پیسے جمع کر کے اُن سے سائیکل خریدنا چاہتا تھا علاوہ کے جن پر نظر کچھ چھوٹی چھوٹی چیزیں تھیں لیکن ہوتا اکثر یوں تھا کہ جب بڈی کی گلک میں ایک آدھ روپیہ جمع ہو جاتا وہ نکال کر اڑا دیتا تھا اور پھر نئے سرے سے جمع کرنے لگ جاتا۔ اُن دنوں جب اُس کے پاس کوئی پیسہ نہ ہوتا وہ چوری چھپے عابدہ کی گلک میں سے پیسے نکال کے خرچ کر دیتا۔ اس کا راز یوں کھلا کہ ایک دن عابدہ نے اسے موقع پر ہی پکڑ لیا۔ اسکول سے واپس آ کر اس نے بستہ دیکھتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھ کر گلک اٹھالی۔ عابدہ اُسے چھپ کر دیکھتی رہی پہلے تو وہ گلک کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا، پھر پاس پڑی ہوئی سلائی اُٹھا کے گلک کو اُلٹا اور پیسے نکالنے لگا۔

"بے ایمان، چور کہیں کا!" عابدہ نے آگے بڑھ کر اُسے پکڑ لیا۔

اس کو دیکھ کر بڈی کا رنگ اُڑ گیا تب عابدہ کو اُسے اس حالت میں دیکھ کر بڑا ترس آیا۔ بے اختیار اُس کی ہنسی چھوٹ گئی، اُسے ہنستا دیکھ کر بڈی کو بھی حوصلہ ہو گیا، اور وہ بھی کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا: "باجی اچھی گڑیاں خریدنی تھیں۔" اس نے جھجکتے جھجکتے کہا۔

"اپنے سارے پیسے تو اڑا دیتے ہو اور پھر میرے پیسے چرانے شروع کر دیتے ہو۔ سچ سچ بتا دو، کتنی بار پہلے چوری کی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"صرف ایک بار"

"اوں ہوں، ابھی سچی بتا دو۔ پھر پیسے دوں گی۔" اس نے لالچ دیا۔

"تین بار" اس نے بتا دیا۔

"جھوٹ" اسے پھر بھی اعتبار نہ آیا۔

"اللہ کرے اسے کوڑھ پڑے، اور اس کی کیڑی جتنی تیز نکلے جو جھوٹ بولے۔ بس تین بار ہی نکالے تھے۔ دو بار چونی اور ایک بار دو آنے۔"

"اچھا زیادہ قسمیں نہیں کھاتے۔" اس نے بڈی کے ہاتھ پر دوانی رکھتے ہوئے کہا: "جاؤ گولیاں خرید لو لیکن منہ میں نہ ڈالنا، گلے میں پھنس جاتی ہیں۔"

رات کو وہ عابدہ کے پاس ہی سوتا تھا۔ سونے سے پہلے کہانی ضرور سنتا تھا۔ یوں تو عابدہ کے پاس کہانیوں کی بہت سی کتابیں تھیں اور وہ کتاب سے پڑھی ہوئی ہر کہانی اُسے ضرور سناتی تھی لیکن بڈی کو اس شہزادی والی کہانی بڑی پسند تھی جس کا وزن پانچ پھولوں جتنا تھا۔ اگرچہ یہ کہانی بڈی کو بھی یاد ہو چکی تھی لیکن وہ اکثر یہی کہانی سننے پر اصرار کرتا۔

امتحان میں چند دن رہ گئے تو ان لڑکیوں کو جنھیں میٹرک فائنل کا امتحان دینا تھا سکول سے آٹھ دن کی چھٹی مل گئی تاکہ گھر میں تیاری ہو سکے۔ عابدہ کی تیاری قریباً مکمل تھی لیکن بڑی مس صاحبہ نے کچھ ضروری نشانات لگوا دیئے تھے اور انھیں یاد کرنا باقی تھا۔ سکول میں مشہور تھا کہ مس کا گیس کبھی غلط نہیں ہوتا۔

کُل نو سمریاں ہی تو ہیں۔ تین دن میں انھیں ختم کر لوں گی۔ باقی کے پانچ دن دوہرائی میں لگ جائیں گے۔ اس نے سارا حساب تیار کر لیا۔

مارچ کا مہینہ تھا لیکن سردی اب بھی باقی تھی۔ وہ کتابیں لے کر چھت پر چڑھ گئی اور سمریاں یاد کرنے لگی۔ آدھ گھنٹے میں اس نے ایک سمری یاد کر لی اور پھر اسے دوہرانے کے لئے اس نے خلاصہ بند کر لیا۔ سامنے والی چھت پر اسے نیلی نیلی آنکھوں اور بھورے بھورے بالوں والا ایک لڑکا کھڑا نظر آیا جو اُسے بڑی طرح گھور رہا تھا۔

"کمبخت کیا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہا ہے۔" اس نے غصے سے اس کی طرف دیکھا تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد تنگ کے پھر وہیں کھڑا ہو گیا۔ اس نے اس کی زیادہ پروا نہ کی اور پھر سے پڑھائی میں جٹ گئی۔

"یہ اس طرح کھڑا مجھے کیوں گھور رہا تھا؟" اچانک پڑھتے پڑھتے اس نے سوچا۔ "اور یہ ہے کون؟ اس گھر میں تو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ خیر ہوگا کوئی مجھے کیا۔" اس نے سمری کو رٹنا شروع کر دیا اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ سمری یاد ہو گئی ہے تو اس نے خلاصہ بند کر دیا۔ مس نے یاد کرنے کا ایک طریقہ بتایا تھا کہ پہلے یاد کرو پھر آنکھیں بند کر کے ذہن میں دوہراؤ اور پھر لکھو تو یاد کی ہوئی چیز کبھی نہ بھولے گی۔ وہ مس کے بتائے ہوئے فارمولے کے مطابق اسے یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ آنکھیں بند کرنے سے پہلے اس نے دیکھا، وہ ابھی تک وہیں کھڑا تھا لیکن کسی اور طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سمری دوہرانے لگی۔ اچانک ہنسنے کی آواز سن کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ منڈیر پر جھکا ہنس رہا تھا۔ اسے بہت غصہ آیا۔ "بھلا اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے؟ بیوقوف کہیں کا۔ چیزیں اسی طرح تو یاد کی جاتی ہیں۔" اس نے سوچا اور پھر سے آنکھیں بند کر لیں لیکن جلدی اس نے کتابیں سمیٹ لیں اور نیچے چلی آئی۔ "یہ مجھے پڑھنے نہیں دے گا۔" اب نیچے جا کر ہی پڑھوں گی۔"

سیڑھیوں سے اترتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ابھی تک وہیں کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

نیچے آکر اس نے دو مرتبہ سرسری آنکھیں بند کر کے دوہرائی اور پھر کاپی کھول کر لکھنے بیٹھ گئی۔

"آخر یہ تھا کون؟" لکھتے لکھتے وہ رک گئی "خیر ہوگا کوئی مجھے کیا غرض" اس نے پھر لکھنا شروع کر دیا لیکن دو لائنیں لکھنے کے بعد وہ بھول گئی۔ اس نے پھر سے آنکھیں بند کر کے یاد کرنے کی کوشش کی لیکن حروف اس کے ذہن سے پھسلتے ہی چلے گئے۔

ہائے اللہ! میں بھی کیا کوڑھ مغز ہو گئی ہوں" اس نے اپنے سر کو کنپٹیاں مارتے ہوئے کہا: "کیا ہو گیا ہے میرے دماغ کو۔ یاد ہی نہیں ہوتا" اس نے خود کو کوسا۔

ناکام ہو کر اس نے پھر خلاصہ کھول لیا۔ ایک نظر ڈالی تو بھولی ہوئی سب چیزیں یاد آ گئیں مطمئن ہو کر اس نے خلاصہ بند کر دیا اور لکھنے بیٹھ گئی۔ جلد ہی اُسے پھر احساس ہوا کہ اس کے ذہن سے الفاظ پھسلتے جا رہے ہیں اور اس کا ذہن سلیٹ کی طرح صاف ہو گیا ہے۔ اسے خود پر بہت غصہ آیا۔ اللہ کی مار ہفتہ امتحان میں رہ گیا ہے اور یہاں کچھ یاد ہی نہیں ہو رہا"

اس نے پھر سے خلاصہ کھول لیا۔ ایک دم سب کچھ اُسے یاد آ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے ذہن میں قمقمے سے جل اٹھے ہوں۔ اس نے کتاب بند کر کے لکھنا شروع کر دیا۔ اب کی بار وہ آخری سطروں پر آ کر رک گئی اور جب وہ حصہ یاد کرنے میں ناکام رہی تو اس نے جھنجھلا کر کاپی پٹخ دی "جانے کیا گوبر بھرا ہوا ہے میرے ذہن میں"

"کیا کروں" وہ سوچنے لگی "شہزادہ کے ہاں چلی جاؤں؟ لیکن وہ بھی تو پڑھ رہی ہوں گی" اس نے سوچا۔ اٹھ کر اس نے الماری کھولی، سامنے کہانیوں والی کتابیں پڑی تھیں۔ یہ کتابیں چند روز ہوئے وہ شہزادہ سے مانگ کر لائی تھی۔ اس نے ایک کتاب اٹھائی۔ اوپر جن کی تصویر بنی ہوئی تھی جس نے شہزادی کو اٹھا رکھا تھا۔ اس نے جھنجھلا کر کتاب پھینک دی "ہو گی وہی بکواس۔ ایک جن شہزادی کو اٹھا لے جاتا ہوگا اور ایک شہزادہ اسے بچانے کو نکل پڑتا ہوگا۔ یہ کمبخت شہزادے ہر جگہ کیوں آ موجود ہوتے ہیں" وہ بستر پر لیٹ گئی اور لیٹے لیٹے انگلیاں چٹخانے لگی۔

"آخر میں نیچے اُتر ہی کیوں آئی؟ مجھے کیا تھوڑا ہی تھا، وہاں بیٹھ کے کیوں نہ پڑھتی رہی؟" اس نے بہت سوچا لیکن اس سوال کا جواب اُسے نہ مل سکا۔

اُسے اپنے اوپر سخت غصہ آ رہا تھا۔ اس نے خلاصہ اور کاپی اٹھائے اور پھر چھت پر چلی گئی۔ سامنے والا کوٹھا خالی تھا۔ شاید وہ جا چکا تھا۔ اس نے بیٹھ کے پڑھنا شروع کر دیا لیکن جلد ہی اکتا کے اس نے کتاب بند کر دی اور چھت پر بے مقصد ٹہلنے لگی۔ اکتا گئی تو باہر گلی میں جھانکنے لگی کتنی دیر تک وہ اس طرح باہر دیکھتی رہی۔ پھر وہ پلٹی تو سامنے والا کوٹھا اسی طرح خالی تھا۔ اس نے خلاصہ بغل میں مارا اور نیچے اُتر آئی۔

"آدھی چھٹی ساری

میں نے تختی ماری"

بلو تختی سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آ رہا تھا۔ وہ تختی بجا رہا تھا اور زور زور سے چلا بھی رہا تھا۔ اس کے کپڑے مٹی میں لت پت تھے اور منہ پر اور کپڑوں پر جگہ جگہ سیاہی کے داغ لگے ہوئے تھے۔

"کیا تڑ تڑ لگا رکھی ہے؟ آ گیا ہے کان کھانے کو۔ منہ تو دیکھو آئینے میں اپنا۔ چوہڑا چمار۔ جی چاہتا ہے ماروں ایک تھپڑ تیرے منہ پر" وہ آگے بڑھی تو بلو سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ کچھ دیر تک تو وہ سہمی سہمی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا اور پھر بستہ پٹخ کر زور زور سے رونے لگا۔

شمع پرویز

فن شناس

آرٹسٹ: (پکار کر) کلو!—

کلو: جی سرکار— میں تو یہیں کھڑا ہوں آپ کے پاس۔

آرٹسٹ: کیا بج گیا؟

کلو: سرکار، گھڑی تو آپ کی کلائی پر بندھی ہے۔

آرٹسٹ: اوہ! ساڑھے گیارہ بج گئے اور وہ لوگ ابھی تک نہیں آئے

کلو: کون لوگ حضور؟

آرٹسٹ: ارے ایک سیٹھ صاحب ہماری تصویریں خریدنے آ رہے ہیں۔ سنا ہے فن کے بڑے دلدادہ ہیں

کلو: (خوش ہو کر) کیا سچ سرکار؟

آرٹسٹ: ہاں۔ یہ تینوں تصویریں آج شرطیہ بک جائیں گی۔ سیٹھ صاحب نے نیا بنگلہ بنوایا ہے۔ اس کی آرائش کے لئے انھیں فن کے اعلیٰ نمونوں کی تلاش ہے— مگر میں تجھ سے کیوں کہہ رہا ہوں؟ بھلا تو کیا جانے فن کیا ہوتا ہے؟

کلو: واہ سرکار! بھلا کیوں نہیں جانتا؟ آپ سمجھتے ہیں مجھے ان تصویروں سے سروکار ہی نہیں؟

آرٹسٹ: (ہنس کر) اچھا تو بتا ذرا ان تینوں میں سے کون سی تصویر سب سے اچھی ہے؟

کلو: یہ والی سرکار جس میں ایک دوسیزہ (دوشیزہ) کالے کالے بال کھولے اداس بیٹھی ہے۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہیں۔ میں اس تصویر کو روزانہ (روزانہ) گھنٹوں دیکھا کرتا ہوں۔ مجھے یہ بہت اچھی لگتی ہے۔ سرکار ... یہ اکیلی تصویر ایک ہزار کی ہے۔

آرٹسٹ: (آہ بھر کر) اس میں تو میرا دل رو رہا ہے۔ میرے جگر کے لہو سے بنی ہے یہ تصویر—

کلو: (حیرت سے) کیا کہا سرکار؟ کس کے کھون (خون) سے بنی ہے یہ تصویر؟

آرٹسٹ: تم نہیں سمجھو گے کلو— یہ آرٹسٹ کی زبان ہے —اس کے دل کی آواز ہے۔ تم نہیں سمجھو گے۔

کلو: بہت اچھا سرکار— میرے لئے اب کیا حکم ہے؟

آرٹسٹ: تم باہر جا کر بیٹھو۔ جیسے ہی وہ لوگ آئیں مجھے اطلاع کر دینا۔

کلو: بہتر سرکار— (باہر گھنٹی بجتی ہے) اے لیجئے سرکار، وہ لوگ آ گئے۔ میں انھیں اندر لئے آتا ہوں۔

آرٹسٹ: آیئے سیٹھ صاحب تشریف لایئے — تسلیم عرض کرتا ہوں

سیٹھ: (ہنس کر) معاف کرنا بھائی ہم کو دیری ہوگئی۔ آپ کو ٹم کا ٹیم (ٹائم) دیا تھا۔ ہم بھول گئے۔ منیم جی کو بھی یاد نہ رہا۔ ٹھیک گیارہ بجے یاد آیا تو اسی ٹیم کچھ بجنس (بزنس) والے لوگ آگئے تو اور دیر ہوگئی۔ آؤ منیم جی تم بھی اندر آجاؤ

آرٹسٹ: (دبی ہوئی آواز میں) کوئی بات نہیں۔ میرے لئے یہی کیا کم ہے کہ آپ تشریف لائے۔

سیٹھ: اچھا آرٹسٹ صاب — ہم کو وہ تصویریں دکھا دو — پھر ہم کو گودام چیک کرنے جانا ہے۔

آرٹسٹ: تصویریں یہ آپ کے سامنے لگی ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے —

سیٹھ: آؤ منیم جی — تم بھی دیکھو آرٹسٹ صاب کی تصویریں —

آرٹسٹ: سیٹھ صاحب یہ پہلی تصویر بچپن کی — بھولپن — سادگی اور معصومیت کی —

سیٹھ: بچپن کی؟ کس کے بچپن کی؟

آرٹسٹ: انسان کے بچپن کی —

سیٹھ: پن اس انسان کا کوئی نام تو ہوگا؟ کیوں منیم جی؟

آرٹسٹ: (جل کر) حضور یہ میرے بچپن کی تصویر ہے۔

سیٹھ: ہی ہی ہی ..... آؤ منیم جی تم بھی دیکھو آرٹسٹ صاب کے بچپن کا فوٹو۔

منیم: ہی ہی ..... بچپن میں تو بہت موٹا تھا آرٹسٹ صاب — اب کیا ہوگیا؟ ایک دم سوکھ گیا۔

سیٹھ: آرٹسٹ صاب — تصویر تو بہت اچھی ہے، ہم کو پسند آئی۔ پن ایک مشکل ہے — یہ فوٹو اگر ہم اپنے بنگلے میں لگائیں گا تو وہ جو ہمارا پوتا ہے نا؟ وہ ناراج ہو جائیں گا۔

آرٹسٹ: (حیرت سے) پوتا ناراض ہو جائے گا؟ کیوں؟

سیٹھ: وہ بولیں گا کہ اس کی جگہ میری تصویر لگا۔ بچے لوگ تم جانو بہت جدی (ضدی) ہوتے ہیں —

آرٹسٹ: (مایوسی سے) اچھا اسے چھوڑیئے — یہ تصویر ملاحظہ فرمایئے — یہ حسن سوگوار کی تصویر ہے۔

سیٹھ: حسن سوگوار؟ یہ کیا نام ہوا؟ کون ہے یہ؟ آؤ منیم جی تم بھی دیکھو چھوری کی تصویر۔

آرٹسٹ: یہ ایک غمگین دوشیزہ کا عکس جمیل ہے

سیٹھ: غمگین دوشیزہ؟ کیوں کیا گم (غم) ہے اس کو؟

آرٹسٹ: زندگی کے بہتیرے غم ہوتے ہیں سیٹھ صاحب — آپ کیا جانیں —

منیم: ویسا نہ کہیئے آرٹسٹ صاب — ہمارے سیٹھ صاب بڑی سوجھ بوجھ کے آدمی ہیں پورے بازار میں ان کی ٹکر کا دوسرا بیوپاری نہیں —

سیٹھ: فوٹو تو چھوری کی بہت کھوبصورت ہے۔

منیم: اس میں کیا شک ہے — چھوری کی صورت اچھی بنائی ہے آرٹسٹ صاب نے۔

سیٹھ: یہی تو بات ہے — ہماری سیٹھانی اس کو ہرگز کوٹھی میں نہیں لگانے دے گی۔ عورت جات تم جانو دوسری عورت کی فوٹو سے بھی کھار (خار)

کھاتی ہے۔ ہی... ہی... ہی...

نیم جی: کمار کھانے کی بات بھی ہے سیٹھ جی۔

آرٹسٹ: اچھا تو اسے ملاحظہ فرمایئے ـــــ بڑھاپے کی تصویر ہے

سیٹھ: آؤ نیم جی ـــ تم بھی دیکھو بڈھے کی تصویر ـــ ادھے نیم جی ـــ یہ تو اپنا مستری رمجان خان سگے ہے ـــــ ہی... ہی... ہی۔

نیم: اس میں تو کوئی کھاس بات نہیں۔ بس ایک بڈھا بیٹھا ہے۔

آرٹسٹ: بڑھاپا زندگی کا نچوڑ ہوتا ہے سیٹھ صاحب۔ اس تصویر میں ہر انسان اپنے مستقبل کا عکس دیکھ سکتا ہے۔ دیکھئے ـــ یہ انسان زندگی کا طویل سفر طے کرکے ـــ تھک ہار کر اس ریگزار پر بیٹھ گیا ہے۔

سیٹھ: بھئی بڑھاپے میں اتنا پیدل نہیں چلنا چاہیئے تھکن ہو جاتی ہے۔

نیم: اس بڈھے کے پاس موٹر وٹر کچھ نہیں ہے؟

آرٹسٹ: (غصے سے) جی ہاں ـــ اس غریب کے پاس موٹر ہے نہ تانگہ، نہ سائیکل نہ گدھا گاڑی کچھ بھی نہیں ـــ بس یہی دو ٹانگیں ہیں۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے؟ بولیئے آپ کو کوئی اعتراض ہے؟

نیم: باپ رے باپ۔ آرٹسٹ صاحب تو ناراض ہو گیا ـــ ہم تو خالی یہ پوچھا کہ یہ بڈھا غریب ہے تو سیٹھ صاحب اس کو نوکری دلائیں گا۔

آرٹسٹ: آپ تشریف لے جایئے ـــ میں کہتا ہوں ـــ آپ اسی وقت یہاں سے تشریف لے جایئے۔

سیٹھ: آؤ نیم جی ـــ آرٹسٹ صاحب تو بہت ناراض ہو گیا ـــ ہم تو کچھ بولا بھی نہیں ـــ آؤ... نیم جی ہم کو گودام چیک کرنے جانا ہے ادھر بہت دیری ہو گئی... (جاتے ہیں)

آرٹسٹ: (پکار کر) کلو ـــ ارے او کلو ـــــ

کلو: جی سرکار ـــــ

آرٹسٹ: یہ تینوں تصویریں اتار کر یہاں رکھ دو ـــ میرے قریب ـــ یہ... میرے دل کے ٹکڑے ہیں۔ انہیں یہاں لے آؤ میرے پاس ـــ (آواز جذبات کی شدت سے بھرا جاتی ہے) میرے... پاس... لے آؤ انہیں ـــــ

(بشکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

ڈرامہ

اصغر بٹ

ویرانہ

وقت: شام کے پانچ بجے ہیں۔ منظر۔ ایک چھوٹا سا دفتر کا کمرہ۔ پیچھے اور بائیں جانب دروازے ہیں۔ دائیں جانب دفتری میز اور کرسی اور ملنے والوں کے لئے دو کرسیاں سامنے رکھی ہیں۔ میز کے برابر سامنے کو ایک چھوٹی تپائی پر ٹیلیفون رکھا ہے۔ دروازے پچھلی دیوار کے قریب چھوٹی تپائی پر بجلی کی کیتلی لگی ہے۔ میز پر بجلی کا لیمپ روشن ہے۔ ایک طرف رنگ برنگ کی فائلیں ترتیب سے رکھی ہیں۔ کرسی پر تقریباً پچیس برس کی سنجیدہ لڑکی چشمہ لگائے ایک مسودہ کا مطالعہ کر رہی ہے۔ قلم سے کاٹ کاٹ کر اس پر کچھ لکھتی جا رہی ہے۔ لڑکی نہ تو بہت اچھی شکل کی ہے اور نہ ہی بُری شکل کی۔ پچھلے دروازے سے پردہ ہٹا کر ایک قریباً پچاس برس کا سفید ریش آدمی داخل ہوتا ہے۔ اُس نے کرتا پاجامہ پہن رکھا ہے۔ ایک ہاتھ میں زرد رنگ کا کاغذ ہے اور دوسرے ہاتھ میں قلم۔ ذرا خمیدہ کمر سے چلتا ہے۔

لڑکی: (مسودے سے نگاہ اُٹھا کر) کیوں کیا ہے شکور؟

شکور: وہ جی پریس سے آدمی آیا ہے۔ کہتا ہے ساری کاپیاں لگا دی ہیں۔ اداریے کے لئے کام رکا ہوا ہے۔ وہ جلدی سے بھجوا دیجئے

لڑکی: تو مجھ سے کیا کہتے ہو؟ ناظر صاحب سے کہو۔ اداریہ انھیں لکھنا۔

شکور: ہر دفعہ یہی ہوتا ہے کہ انھیں لکھنا ہوتا ہے اور آخر لکھنا آپ کو پڑتا ہے۔

لڑکی: ٹھیک ہے لیکن مدیر وہ ہیں۔ میں تو محض معاون ہوں۔ وہ کہیں گے تو میں لکھ دوں گی لیکن اپنے طور پر کیسے لکھ دوں۔

شکور: وہ سارا دن اشتہاروں کے چکر میں رہتے ہیں انھیں لکھنے کی فرصت کہاں ہو گی۔

لڑکی: اب تو اچھا خاصہ چلنے لگا ہے پرچہ۔ ماہانہ سے ہفتہ وار پر آ گئے ہیں اور اشتہار کے لئے لوگ خود بھی آنے لگے ہیں۔ اب تو لکھنے پڑھنے کا وقت نکل سکتا ہے۔

شکور: (چلتے ہوئے) دیکھ لیجئے وہ آپ ہی سے کہیں گے۔

لڑکی: کہانی کی کتابت ہو گئی ہے کیا؟

شکور: جی کر ہی رہا ہوں۔

[پچھلے دروازے سے پردہ اٹھا کر قریباً تیس برس کا آدمی داخل ہوتا ہے۔ ذرا لمبا قد اور جسم دبلے پن کی طرف مائل۔ ایک ہاتھ میں کوٹ اُٹھائے ہوئے۔ نائی ڈھیلی حالت میں لٹک رہی ہے۔ پتلون زیادہ ماڈرن نہ پرانی وضع کی بلکہ معقول چشمہ لگائے ہوئے ہیں]

نمودار ہوتی ہے۔ رفیعہ اس پریس کے آدمی کو روانہ کر کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) ابھی اداریہ نہیں لکھا تم نے؟

رفیعہ: بہت خوب! مدیر کون ہے، میں یا آپ ناظر صاحب؟

ناظر: بھئی میرے پاس اور ضروری کام تھوڑے ہیں! آخر معاون رکھا کس لئے جاتا ہے؟

رفیعہ: بیگار کے لئے

ناظر: (شکور سے) شکور اب وقت بالکل نہیں ہے۔ کل پرچہ نکل آنا چاہئے۔ پچھلی دفعہ بھی ایجنٹ نے شکایت کی تھی۔

شکور: جی۔

ناظر: (شکور واپس پچھلے دروازے کی طرف بڑھتا ہے) مسطر پر ہی لکھوا دیں گی اب کے جیسا پچھلے مہینے لکھوایا تھا۔ بیٹھ جاؤ سامنے۔ وقت بالکل نہیں ہے۔

(پچھلے دروازے سے نکل جاتا ہے)

شکور: دیکھا میں نے کیا کہا تھا؟

رفیعہ: (بے بسی سے سانس لے کر کلائی پر گھڑی دیکھتی ہے) پانچ بجے ہیں اور صبح دس بجے سے کولہو کے بیل کی طرح کام کر رہی ہوں۔ اب تو مجھ سے بالکل کچھ نہیں ہوگا۔ چائے پی کر پھر کام کروں گی۔ چھ بجے آئیے گا شکور صاحب:

(اٹھتی ہے۔ میز میں سے چائے کے برتن نکالتی ہے اور بجلی کی کیتلی کا بٹن دبا دیتی ہے)

شکور: چائے بن جائے تو مجھے بھی آواز دے دیجئے (پلٹ کر پچھلے دروازے سے نکل جاتا ہے)

رفیعہ: ہاں ہاں کیوں نہیں۔

(بائیں جانب بیرونی دروازے سے ایک نوجوان لڑکی جھانکتی ہے)

لڑکی: میں آسکتی ہوں رفیعہ بہن؟

رفیعہ: (مسکرا کر) آؤ آؤ نگہت:

(نگہت تقریباً بیس برس کی ہنس مکھ اور خوبصورت لڑکی ہے۔ باس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی غریب گھر سے ہے۔ ہاتھ میں معمولی سا پرس ہے۔)

نگہت: خوب چائے کے وقت پر آئی (آ کر سامنے کی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور میز پر پڑے مسودے کو جھک کر دیکھتی ہے) او اب کے تو بہت ہی برا لکھا ہے میں نے۔

رفیعہ: (چائے کے برتن درست کر کے دودھ کا ڈبہ ڈھونڈ رہی ہے) نہیں تو اچھا خاصہ ہے۔

نگہت: خاک اچھا خاصہ ہے۔ سارا آپ کا لکھا ہوا لگ رہا ہے۔ میرا تو بس یونہی نام ہو جائے گا۔

رفیعہ: (بدستور چائے کے سلسلے میں مصروف) بڑے تعریفی خطوط آ رہے ہیں تمہارے مزاحیہ خاکوں کے۔ تصویر لائی ہو؟ بے حد فرمائشیں ہو رہی ہیں تمہاری تصویر کے لئے۔

نگہت: (پرس میں سے ایک تصویر نکال کر دیتی ہے) تصویر تو لے آئی ہوں لیکن اچھی نہیں آئی۔

رفیعہ: (مسودے پر ہی رکھ دو۔ اگر تمہاری صورت کا دسواں حصہ بھی آگیا ہے اس میں تو دلوں میں کہرام مچانے کو بہت ہے (قریب آ کر تصویر اٹھا کر دیکھتی ہے

تو اب تمہارے قلمکاروں کی خیر نہیں! ایسی ایسی بڑی دو چار تصویریں اور مل جائیں تو فلمی کاروبار کر سکتے ہیں ہم لوگ

نگہت : آپ میری حوصلہ افزائی کرتی رہتی ہیں۔

رفیعہ : پگلی! خدا تو ناظر صاحب بھی پڑھ کر پھڑک گئے (تصویر وہیں سامنے رکھ دیتی ہے) کہنے لگے کہ خوب لکھتی ہے تمہاری سہیلی۔

نگہت : خیر پچھلے خاکے میں تو سوائے عنوان اور دستخطوں کے اور کوئی چیز تھی ہی نہیں میری۔ آپ نے ناظر صاحب کو بتا دیا ہوتا

رفیعہ : میں اس قسم کی چیزیں ناظر صاحب کو نہیں بتایا کرتی۔

نگہت : کیوں ؟

رفیعہ : وہ مجھے بیحد خشک، سنجیدہ، اور ترش سمجھتے ہیں اور مرعوب رہتے ہیں۔ اگر انھیں میری غیر سنجیدہ کاوشوں کا پتہ چل گیا تو ایک تو رعب ختم ہو جائے گا اور پھر دوسرے ہی دن نکال باہر کریں گے

نگہت : تو آپ کو نوکری کی ایسی کیا ضرورت ہے ؟

رفیعہ : یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔

نگہت : پیسے کی ضرورت ہوتی، وہ بھی نہیں۔ آپ تو شہرت کی خاطر بھی کچھ نہیں کرتیں۔ اداریے ناظر صاحب کے نام سے لکھتی ہیں، مزاحیہ خاکے میرے نام سے اور کہانیاں نہ جانے کس کس کے نام سے۔ آپ کا اپنا نام تو کہیں ہوتا نہیں میری تو بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ یہ نوکری کس لئے کرتی ہیں (رفیعہ واپس اپنی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

رفیعہ : ہاں خود میری سمجھ میں بھی نہیں آتا چنانچہ میں نے سوچا ہے کہ یہ کام چھوڑ ہی دوں (میز کے دراز میں سے ایک کاغذ نکال کر نگہت کے سامنے رکھتی ہے) اس کاوش کے بارے میں کیا خیال ہے ؟

نگہت : (جلدی سے دیکھ کر) یہ تو استعفےٰ لکھا ہوا ہے آپ کی طرف سے (ذرا پریشانی سے) کیا مطلب ؟ یعنی آپ واقعی چھوڑ کر جانا چاہ رہی ہیں ؟

رفیعہ : سوچ رہی ہوں

نگہت : کیا کوئی اور کام مل گیا ہے ؟

رفیعہ : نہیں۔ میں نے ڈھونڈا ہی نہیں۔

نگہت : تو ۔ ؟

رفیعہ : میں جو اپنا خون پسینہ ایک کر رہی ہوں تو کاہے کے لئے رسالے کے لئے ؟ سو وہ اب چلنے لگا ہے اور میرے بغیر بھی چلتا رہے گا۔ معاشرے کے لئے ؟ تو ہمارے لکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ذاتی مروت کے لئے ؟ تو آخر کب تک ؟

نگہت : میرا خیال ہے کہ ناظر صاحب آپ کو جانے نہیں دیں گے

رفیعہ : کیوں ؟

نگہت : اتنے دنوں ساتھ رہے اور ۔ یوں بھی تو آپ کے عزیز ہیں نا ۔ آپ ہی تو کہہ رہی تھیں کہ آپ کے خالہ زاد یا پھوپھی زاد بھائی ہیں۔

رفیعہ : ہاں (کچھ سوچ کر سر جھکا لیتی ہے) ناظر صاحب کو معاون مدیر چاہیئے۔ وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے (سر اٹھا کر) وہ تم بھی ہو سکتی ہو۔

نگہت : (امید و نا امیدی کے درمیان) نہیں بہن مجھے کون پوچھتا ہے۔

رفیعہ: (اُٹھ کر چائے بناتی ہے اور آواز دیتی ہے) شکور صاحب (نگہت سے) تم شکر کتنی پیتی ہو؟
نگہت: ایک چمچہ
رفیعہ: (بنا کر) لو
نگہت: (پیالی لیتے ہوئے) شکریہ۔ لیکن جہاں تک معاون مدیر کا تعلق ہے (شکور داخل ہوتا ہے)
شکور: جی؟
رفیعہ: (چائے کی پیالی اسے دیتے ہوئے) یہ لیجئے آپ کی پیالی بن گئی۔
شکور: (چائے کی پیالی لیتے ہوئے) شکریہ! وہ جی ماہتاب میک اپ کا منیجر آیا ہوا ہے۔
رفیعہ: (حیرت سے) ماہتاب میک اپ! کون ماہتاب میک اپ؟
شکور: وہی جی جن کا خط آیا تھا ٹائیٹل پر اشتہار کے لئے۔
رفیعہ: تو مجھے کس لئے بتا رہے ہو۔ ناظر صاحب سے ملوا دو
شکور: وہ جی چلتے چلتے مجھ سے کہہ گئے تھے کہ شاید وہ آجائے اور ہو سکتا ہے نہ ہی آئے۔ بات پکی نہیں تھی اس لئے انھوں نے انتظار نہیں کیا۔
رفیعہ: یہ تو اور سنو نئی بات۔ اب اشتہارات کا کاروبار بھی میرے حوالے ہو گیا۔ صاحب یہ میرے بس کا روگ نہیں۔ اسے کہہ دو کہ ناظر صاحب سے ہی ملے۔ اور جاؤ ناظر صاحب کو ٹیلی فون کرو۔ کافی ہاؤس میں بیٹھے ہوں گے۔
شکور: جی چونکہ ناظر صاحب کہہ گئے تھے کہ آپ سے ملوا دوں اس لئے میں نے اُسے کہا کہ بیٹھے آپ ابھی بلواتی ہیں۔ اب اگر کہہ کہ آپ نہیں ملنا چاہتیں تو وہ ناراض ہو جائے گا۔ کاروبار کا معاملہ ہے۔
رفیعہ: (ذرا جھنجھلا کر) اچھا تو بھیج دو۔ غریب خانہ یہ حاضر ہے ہر بلا کے لئے۔
شکور: جی اچھا آپ بات کیجئے۔ میں ناظر صاحب کو بھی تلاش کرواتا ہوں۔

(چائے پیتا ہوا پچھلے دروازے سے نکل جاتا ہے)

نگہت: تو میں چلتی ہوں
رفیعہ: نہیں بیٹھو چائے ختم کر کے جانا۔ اور یہ رخ بھی دیکھ لو۔ شاید کبھی اس سے واسطہ پڑے۔ کہاں ہے وہ میرا استعفےٰ (میز سے اٹھا کر پڑھتی ہے) اسے ایک نظر دیکھ لیتی ہوں تو طبیعت میں ایک گونہ سکون سا محسوس ہوتا ہے۔

(بائیں جانب دروازے سے مرد کی آواز)

آواز: میں حاضر ہو سکتا ہوں؟
رفیعہ: جی ہاں تشریف لائیے۔

[چھوٹے قد اور موٹے جسم کا ایک آدمی مغربی لباس میں داخل ہوتا ہے۔ شکل نہایت معمولی ہے چینی آنکھیں اور ہونٹوں پر ایک بناوٹی سی مسکراہٹ ہے۔]

نووارد: میرا نام معین بزمی ہے۔

رفیعہ: تشریف رکھیے۔ یہ میری دوست نگہت ہیں۔
معین: آداب عرض۔ (نگہت کی برابر والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)
نگہت: آداب عرض۔
رفیعہ: آپ چائے پیجیے گا؟
معین: جی پی لیں گے شکریہ! (رفیعہ اٹھ کر چائے بناتی ہے)۔ (نگہت سے) آپ بھی پرچے کے کسی شعبے سے متعلق ہیں؟
نگہت: جی نہیں مضامین لکھتی ہوں کبھی کبھی۔
معین: (اچانک گویا پہچان کر گرم جوشی سے) تو نگہت ذہنی کے نام سے جو دلچسپ خاکے آپ کے یہاں چھپتے ہیں آپ ہی لکھتی ہیں۔
نگہت: جی ہاں، شکریہ!
معین: اسے صاحب ہیں تو آپ کا بیحد دلدادہ ہوں۔
نگہت: (چونک کر) کیا!
معین: (ذرا بوکھلا کر) جی میرا مطلب ہے آپ کے مضامین کا دلدادہ ہوں۔ واہ واہ کیا مزاح پیدا کرتی ہیں آپ، کیسے پیدا کرتی ہیں اتنا اچھا مزاح،
نگہت: آپ ہی لوگوں سے مل کر کچھ حاصل ہو جاتا ہے

(رفیعہ ہنستی ہے)

معین: شکریہ، شکریہ۔ یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ ابھی تک ہم اس سعادت سے محروم تھے لیکن اب انشاء اللہ ملاقات ہوتی رہے گی۔
نگہت: جی کیا۔؟
معین: (ذرا بوکھلا کر) جی میرا مطلب ہے یہیں دفتر میں، یعنی رفیعہ صاحبہ سے ملنے آپ تو آتی ہی ہوں گی۔ مجھے بھی اشتہارات کے سلسلے میں آنا ہی ہوگا۔
رفیعہ: (معین کو چائے پیش کرتی ہے) یہ لیجیے چائے۔
معین: (جلدی سے اٹھ کر) جی آداب عرض۔ شکریہ!

(جلدی سے چائے پیتا ہے اور چائے چونکہ گرم ہے اسے نگلتے ہی زبان باہر نکل آتی ہے۔)

رفیعہ: میں بتانا بھول گئی کہ چائے ذرا گرم ہے
معین: جی نہیں کوئی بات نہیں۔ ہم ہر گرم و سرد زمانہ کے عادی ہیں۔
نگہت: بہت خوب!
معین: جی آداب عرض کرتا ہوں۔
رفیعہ: آپ نے بڑی ادب دوست طبیعت پائی ہے
معین: (نگہت کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے) اجی کون پوچھتا ہے ادب دوستی کو اس زمانے میں۔
رفیعہ: (مضمون بدل کر) آپ اشتہارات کے سلسلے میں کچھ فرمانے والے تھے۔

معین: جی ہاں حاضر تو اشتہارات کے سلسلے میں ہی ہوا تھا لیکن بات ذرا دلچسپ چل نکلی۔

رفیعہ: بے شک بے شک، آپ بھی ان تمام دلچسپ باتوں کو مضمون کی شکل میں لکھ ڈالئے۔ اور پارہ بن جائیں گی۔ زبانی باتوں میں یہ جوہر قابل نہ گنوائیے۔

معین: (اب خود اعتمادی واپس آجاتی ہے) ارے صاحب یہ کاروبار کا دھندا نہ ہوتا تو ہم بھی کچھ لکھتے۔ بہت شوق تھا لکھنے پڑھنے کا کسی زمانے میں۔

رفیعہ: (اسے واپس پٹڑی پر لانے کی کوشش میں) ماہتاب میک اپ کا کارخانہ آپ ہی کا ہے نا؟

معین: (انکساری سے) جی میں کس لائق ہوں۔ آپ ہی کا ہے

رفیعہ: تو اشتہار اسی میک اپ کے سامان کے بارے میں غالباً ہوگا۔

معین: جی ہاں۔ دراصل آپ کا پرچہ خواتین میں خاص طور پر مقبول ہے (نگہت کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے) نگہت نور صاحبہ کے مضامین بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

نگہت: خواتین کے علاوہ آپ بھی تو پڑھتے ہیں۔

معین: بے شک۔ بے شک۔ میرا مطلب یہ تھا کہ عورتوں اور مردوں میں یکساں طور پر مقبول ہے۔ چنانچہ اس میں میک اپ کا اشتہار نہایت موزوں رہے گا۔

نگہت: تو مردوں کے لئے بھی میک اپ کا سامان تیار ہوتا ہے آپ کے ہاں؟

معین: جی مردوں کے لئے؟ میرے خیال میں مردوں کو تو میک اپ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ تو ویسے ہی اچھے خاصے ہوتے ہیں لیکن عورتوں کے لئے میک اپ نہایت ضروری ہے۔

نگہت: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں یعنی عورتیں میک اپ کے بغیر اچھی خاصی نہیں ہوتیں؟

رفیعہ: (ڈک کر) نہیں نگہت ان کا مطلب یہ ہے کہ میک اپ عورت کے حسن کو اور نکھار دیتا ہے اور مرد میں تو حسن ہوتا ہی نہیں جسے نکھارنے کی ضرورت ہو۔

معین: بے شک۔ بے شک (پھر چونک کر) جی نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ خیر اس بحث میں کیا پڑیں۔ ہمیں تو میک اپ بیچنا ہے۔ اسے عورتیں استعمال کریں یا مرد۔ جو حسین ہے، میک اپ سے حسین تر ہو جائے گا اور جو مکروہ ہے وہ مکروہ تر ہو جائے گا۔ میرا مطلب ہے وہ بھی بہتر ہو جائے۔ (چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے) ماشاء اللہ بہت اچھی چائے تھی۔

رفیعہ: تو کون سے صفحے کے لئے ہوگا یہ اشتہار اور کے مرتبہ کے لئے؟

معین: خیال تو ٹائیٹل کے لئے تھا۔

رفیعہ: ٹائیٹل پر تو ہمارے ہاں آپ نے دیکھا ہوگا اشتہار ہوتا ہی نہیں۔ ٹائیٹل کی دوسری جانب البتہ ہو سکتا ہے۔

معین: میرے ذہن میں یہ تھا کہ اگر کسی مشہور خاتون کے بارے میں پرچے میں کچھ چھپ رہا ہو تو ٹائیٹل پر اس کی تصویر چھاپ دی جائے اور نیچے لکھ دیا جائے کہ یہ ماہتاب میک اپ استعمال کرتی ہیں۔

رفیعہ: (سوچتے ہوئے) اب کے بیگم خروشوت پر ایک نوٹ چھپ رہا ہے۔ ٹائیٹل پر اس کی تصویر دینے کا ارادہ تو نہیں تھا لیکن اگر آپ

ٹائیٹل خرید رہے ہوں تو ـــــ

معین : (جلدی سے رُک کر) نہیں نہیں، آپ سمجھیں نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ کسی بھی خاتون کے بارے میں کچھ چھپ رہا ہو تو آپ ہمارا اشتہار لگا دیں۔

رفیعہ : تو ؟

معین : میرا مطلب یہ تھا کہ ان کو تو شاید زیادہ لوگ جانتے بھی نہ ہوں گے۔ کوئی ایسی خاتون ہوں جنھیں ہر شخص جانتا ہو جن کے بارے میں ذہن پر زور نہ ڈالنا پڑے۔

نگہت : مثلاً اماں حوّا ؟

معین : (چونک کر) جی نہیں ـــ جی ہاں مشہور تو وہ بے شک ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ان کی تصویر کہاں سے آئے گی۔

رفیعہ : اور اگر ہو بھی تو غالباً ان کے ساتھ کوئی اشتہار موزوں نہ رہے گا۔

معین : قطعی قطعی ـــ جی نہیں ـــ ظاہر ہے کہ ایسی گستاخی کی کون جرأت کر سکتا ہے۔

رفیعہ : فلم ایکٹریسوں کی تصویریں تو بہت موزوں رہیں گی لیکن وہ ہم ٹائیٹل پر چھاپتے نہیں

معین : (میز پر سے نگہت کی تصویر اٹھا کر کھڑا ہو جاتا ہے) اگر نگہت نور صاحبہ کو اعتراض نہ ہو تو ہمارے میک اپ کو ان کے ساتھ منسوب ہونے پر بے حد فخر محسوس ہوگا۔

نگہت : (ذرا جھینپ کر) جی نہیں۔ میں معذرت چاہتی ہوں

معین : (نا امیدی سے) اس سے بہتر جوڑ سوجھ نہیں سکتا (تصویر رکھ کر بیٹھ جاتا ہے رفیعہ تصویر اٹھا کر میز کے دراز میں رکھ دیتی ہے)

رفیعہ : اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ ٹائیٹل پر اشتہار آ نہیں سکتا۔ اب آخری صفحے کے لئے کچھ سوچئے۔

نگہت : اگر آخری ہی صفحے پر چھپنا ہے تو نرمی صاحب کی اپنی تصویر کیوں نہ چھپ جائے۔

رفیعہ : اس عنوان کے ساتھ کہ یہ ماہتاب میک اپ استعمال کرتے ہیں ؟

نگہت : نہیں بلکہ یہ کہ ماہتاب میک اپ بناتے ہیں۔ صنعت اور صنعکار دونوں کی شہرت ہو جائے گی۔

معین : (سوچتے ہوئے) خیال تو بُرا نہیں ہے

نگہت : بلکہ اگر میک اپ کو فروغ دینے کے لئے آپ اپنا رسالہ بھی شروع کر دیں تو شہرت کئی گنا بڑھائی جا سکتی ہے۔

رفیعہ : اور رسالے کا نام ہو "میک اپ" یا اور نام رکھنا ہو تو "سنگار"۔ اپنا رسالہ بہرحال اپنا رسالہ ہوگا۔

معین : (پھڑک کر) واللہ ـــ واقعی اس بارے میں مزید سوچنے کی ضرورت ہے (اُٹھ کھڑا ہوتا ہے)

رفیعہ : تو آپ چل دیئے ؟

معین : جی ہاں۔ فی الحال آخری صفحے کے لئے میں اپنی تصویر بھجواتا ہوں (بائیں جانب بڑھتا ہے)

رفیعہ : بہت خوب

نگہت : اگر تصویر جوانی کی ہو تو زیادہ موزوں رہے گی۔

معین : (رک کر) تو کیا آپ کے خیال میں اب میں بوڑھا لگ رہا ہوں ؟

رفیعہ: نہیں نگہت کا مطلب یہ تھا کہ تصویر اگر دو ایک برس پہلے کی بھی ہو تو کچھ مضائقہ نہیں ہوگا۔

معین: ہاں ظاہر ہے کیا مضائقہ ہو سکتا ہے اور سچ پوچھیے تو ہم نے میٹرک کے بعد کبھی تصویر اُتروائی ہی نہیں۔ کون ان فوٹوگرافروں کے چکر میں پڑے۔ تصویر اتروانے جائیے تو بالکل کاٹھ کے اُلّو کی طرح بٹھا دیتے ہیں، اور پھر طرح طرح کی فرمائشیں کہ یہ پہلو دبا کر بیٹھیے اور اب وہ پہلو دبا کر بیٹھیے۔ پورا پیٹ کوئی دبا دے تو سانس کیسے لے۔

رفیعہ: (ہمدردی کے لہجہ میں) ظاہر ہے ظاہر ہے۔

نگہت: اور اوپر سے کہتے ہوں گے "ہنسئے" بھی۔

معین: جی ہاں۔ آپ بتائیے کہ اگر ہم سانس روکے بیٹھے ہیں تو ہنسیں کیسے!

رفیعہ: وہ میٹرک والی تصویر ٹھیک رہے گی۔ آپ بے تکلف بھیجیے۔ اکثر مشہور لوگوں کی تصویریں میٹرک ہی کے زمانے کی ہوتی ہیں۔

نگہت: اصل میں پرانے زمانے کے فوٹوگرافر بھی اچھے ہوتے تھے اب تو اگر کسی سے تصویر بنوایئے گا تو وہ انتہائی غیر ذمہ داری سے بنائے گا۔ کمر کا ناپ کچھ بھی آئے اس کی بلا سے۔

معین: (ذرا سا سانس اندر کھینچ کر) یہ تو درزی نے کوٹ ذرا کھلا بنا دیا ہے اس لئے کمر کے پھیلاؤ کا شبہ ہوتا ہے۔ کوٹ نہ ہو تو دیکھئے۔ فوٹوگرافر چاہے بھی تو بگاڑ نہیں سکتا۔ اچھا خدا حافظ!

(یونہی سانس روکے اکڑے اکڑے بائیں جانب سے نکل جاتا ہے)

رفیعہ: ہائے بیچارہ۔

نگہت: بیچارہ کیوں؟

رفیعہ: آج سے کھانا پینا ختم کر دے گا۔ دیکھ لینا۔

نگہت: کمر کا ناپ ٹھیک کرنے کے لئے؟

رفیعہ: اور اس کے بعد تمہاری شامت آئے گی۔

نگہت: واہ کیوں؟

رفیعہ: جب کوئی مرد فاقے کاٹے گا کسی لڑکی کے لئے تو ظاہر ہے اُس کا پیچھا بھی کرے گا۔

نگہت: (ہنس کر) رفیعہ بہن آپ کو سیدھی سادی باتوں میں بھی رومان نظر آنے لگتا ہے۔

رفیعہ: اگر ایسا ہوتا تو زندگی بڑی اچھی گذرتی۔ مشکل یہی ہے کہ مجھے سیدھی سادی باتوں میں رومان نظر نہیں آتا جہاں ہوتا ہے وہیں نظر آتا ہے اور جہاں نہیں ہوتا وہاں مجھے ویرانہ بھی صاف نظر آنے لگتا ہے۔

(تھوڑی دیر خاموشی چھا جاتی ہے)

نگہت: اچھا تو میں اب چلتی ہوں۔ چائے کا شکریہ۔ (اٹھتی ہے)

رفیعہ: مجھے بھی تو چلنا ہے۔ اکٹھے چلتے ہیں (اٹھتی ہے)

نگہت: آپ کو تو ابھی اداریہ لکھوانا ہے۔

رفیعہ: (ریسیور کی طرف) او ۔۔ ہاں ۔۔ اچھا تو جاؤ تم ۔ (آواز دیتی ہے) شکور! ذرا مسطر لیتے آئیے ۔

نگہت: تو یوں کیوں نہ کریں کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں آجاؤں اور پھر اکٹھے چلیں ۔

رفیعہ: تم میری وجہ سے خواہ مخواہ کیوں رُکو ۔

نگہت: نہیں مجھے دراصل اپنی بھانجی کے لئے فراک کا کپڑا لینا ہے ۔ آپ کے برابر میں جو دوکان ہے وہاں سے لیتی ہوں ۔ واپسی پر جھانک لوں گی ۔ اگر آپ کا کام ختم ہو چکا ہو تو اکٹھے چلے چلیں گے ۔ ٹھیک ہے نا ۔ (پھر ذرا رُک کر) اور ہاں رفیعہ بہن وہ جو میں سکول میں کام کر رہی تھی چھوڑ دیا میں نے

رفیعہ: ارے اچھا! تو اب کیا بیکار رہو گی ؟

نگہت: بیکار رہنے سے گھر کا سلسلہ کیسے چلے گا ۔ کوئی چھوٹی موٹی ملازمت تو کرنی ہی پڑے گی ۔

رفیعہ: کوئی ہے نظر میں ؟

نگہت: اُستانی کی (اکری) تو مل ہی جائے گی ۔ اگرچہ تنگ آگئی ہوں بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے ۔

رفیعہ: اچھا تم آؤ تو اور باتیں ہوں گی اس پر ۔

نگہت: تو میں ابھی آئی رفیعہ بہن (بائیں جانب سے نکل جاتی ہے)

(شکور پچھلے دروازے سے مسطر، قلم اور دوات لے داخل ہوتا ہے اور نگہت والی کرسی پر بیٹھ کر مسطر پھیلاتا ہے)

رفیعہ: (میز سے ہٹ کر سوچتے ہوئے ٹہلتی ہے اور آہستہ آہستہ لکھواتی ہے) ہم لوگ ہر ہفتے یہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے پڑھنے والوں کی دلچسپی کے لئے زیادہ سے زیادہ ادب پارے، خاکے اور قصے اس پرچے میں پیش کریں اور ان کے ذریعے آپ کے لئے سامانِ مسرت مہیا کریں ۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی زندگی اگر پُر بہار ہے تو اور پُر بہار ہو جائے اور اگر خدانخواستہ تنہا یا اداس ہے تو اُس کی تنہائی اور اداسی دور ہو جائے ۔ لیکن کبھی آپ نے سوچا کہ ہم لوگ جو اس کاوش میں لگے رہتے ہیں خود کہاں سے مسرت حاصل کرتے ہیں ۔

(پچھلے دروازے سے ناظر داخل ہوتا ہے)

ناظر: یا! میں ابھی تک لکھوا رہی ہیں ؟

رفیعہ: ابھی شروع ہی کیا ہے ۔

ناظر: شکور نے ٹیلی فون کیا تھا کہ بزمی صاحب آئے ہوئے ہیں ۔۔ تو چلے گئے وہ ؟

رفیعہ: جی ہاں ابھی ایک دو منٹ ہوئے

ناظر: کیا بات ہوئی اُن سے ؟

رفیعہ: آخری صفحے کا اشتہار غالباً دیں گے

ناظر: ایک دفعہ کے لئے یا زیادہ ؟

رفیعہ: یہ تو ابھی بات نہیں ہوئی

ناظر: اور کیا کیا باتیں ہوئیں ؟

رفیعہ: (ذرا چڑکر) آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت اداریہ لکھوا رہی ہوں۔ تفصیلات کل پوچھ لیجیے گا۔

ناظر: اداریئے کی کوئی بات نہیں۔ وہ میں لکھوا دوں گا۔ آپ.....

رفیعہ: (ایک دم غصے سے) اداریہ جائے بھاڑ میں اور یہ پرچہ بھی جائے بھاڑ میں۔ اگر خود ہی لکھوانا تھا تو مجھے کیوں کہا۔ میں جا رہی ہوں اس جہنم خانے سے۔

ناظر: (ذرا پریشان ہو کر) ابھی آپ غصے کیوں ہو رہی ہیں؟ میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی

رفیعہ: (بدستور غصے میں) نہیں، آپ نے مجھے زر خرید لونڈی سمجھ رکھا ہے۔ پرچہ بھی لکھو، اداریئے بھی لکھو، اشتہار بھی ڈھونڈو۔ اور مجھے کیا ملتا ہے اس میں؟ (میز پر سے استعفے اٹھا کر اس کے سامنے پٹخ دیتی ہے) یہ رہا میرا استعفےٰ۔

ناظر: (ذرا برہم ہو کر) تو آپ نے پہلے سے لکھ کر رکھا ہوا تھا استعفےٰ؟

رفیعہ: ہاں۔

ناظر: تو میرے اوپر کیوں بات رکھ رہی ہیں (استعفے کو سرسری انداز میں دیکھتا ہے) اگر آپ کو میری بات بُری لگی ہے تو میں معافی مانگ لیتا ہوں۔

رفیعہ: (دوسری کرسی پر میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ جاتی ہے) نہیں میں اب تنگ آ گئی ہوں مجھے یہاں گھٹن محسوس ہوتی ہے مجھ سے یہاں کام نہیں ہوتا۔ بس۔

ناظر: (شکور سے) شکور تم جاؤ ابھی۔ تھوڑی دیر میں دیں گے اداریہ۔

(شکور اپنا سامان سمیٹ کر چلا جاتا ہے)

ناظر: آخر ہوا کیا ہے؟

رفیعہ: کچھ نہیں۔ (استعفے کی طرف اشارہ کر کے) پڑھ لیجیے۔

ناظر: (استعفے کو زیر لب پڑھتا ہے اور پھر نظریں اٹھا کر) بہت خوب تو گویا ہمارا دفتر آپ کو ویرانہ لگتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ کو اس کام میں دلچسپی ہو گی۔

رفیعہ: جی نہیں مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔

ناظر: رفیعہ تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے بغیر یہ پرچہ نہیں چلا سکتا

رفیعہ: آپ کا مطلب ہے کہ مدیر معاون کے بغیر۔

ناظر: یونہی سہی۔

رفیعہ: تو مدیر معاون دوسرا رکھا جا سکتا ہے۔

ناظر: ابھی پرچے میں اتنی سکت کہاں ہے کہ کسی پڑھے لکھے آدمی کو صحیح تنخواہ پر رکھ سکیں۔

رفیعہ: جتنی تنخواہ مجھے دیتے ہیں اتنے میں کوئی اور مل جائے گا۔

ناظر: مجھے معلوم ہے نہیں مل سکے گا۔

رفیعہ: اگر کوئی ضرورت مند ہو۔

ناظر: تو کون ہے ایسا ضرورت مند؟

رفیعہ: میرا خیال ہے کہ نگہت تو مان جائے گی۔

ناظر: (ذرا حیرت سے) نگہت نور؟
رفیعہ: وہ ابھی آرہی ہے۔ اس سے پوچھ لیتے ہیں
ناظر: لیکن تم کیوں نہیں رکتیں؟
رفیعہ: میں نے بتا دیا
ناظر: یہ آخری فیصلہ ہے؟
رفیعہ: قطعی۔
ناظر: تو فیصلہ آج نہیں کرتے کل کریں گے۔
رفیعہ: کل نگہت نور شاید یہاں نہ آئے۔
ناظر: مجھے نگہت نور میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔
رفیعہ: جب آپ اسے دیکھیں گے تو دلچسپی ہو جائے گی۔

(بائیں جانب دروازے سے نگہت داخل ہوتی ہے)

نگہت: کیوں ہوگیا کام رفیعہ بہن (ناظر کو دیکھ کر) اوہ معاف فرمائیے۔
رفیعہ: یہ ناظر صاحب ہیں
ناظر: آداب۔
نگہت: آداب (رفیعہ سے) پھر چلئے گا۔
رفیعہ: ہاں۔ لیکن میں اکیلی چلی جاؤں گی
نگہت: (جلدی سے) تو میں چلتی ہوں
رفیعہ: نہیں ابھی تھوڑی دیر رک جاؤ۔ ناظر صاحب تم سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔
نگہت: (ذرا پریشان ہو کر) اس خاکے کے بارے میں؟
رفیعہ: نہیں، دراصل ناظر صاحب بڑی مدت سے سوچ رہے تھے کہ یہ پرچہ کچھ ٹھس سا ہوتا جا رہا ہے۔ اس میں انشائے لطیف کی اور گنجائش ہے اور ان کا خیال تھا کہ اگر آپ تعاون کریں تو اس پرچے کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔
نگہت: (ویسے ہی پریشان) لیکن میں تو تعاون کر رہی ہوں۔
رفیعہ: لیکن آپ ادارتی فرائض میں بھی تعاون کریں۔
نگہت: (ذرا خوش ہو کر) ہاں ہاں میرے لائق کوئی کام بتائیں۔ میں ضرور کروں گی۔
رفیعہ: ناظر صاحب نے میرا استعفیٰ قبول کر لیا ہے۔
ناظر: لیکن میں نے ....
رفیعہ: (بات کاٹ کر) اور وہ چاہتے ہیں کہ آپ میری جگہ کام کریں۔

نگہت: (پھر پریشان ہو کر) لیکن میں یہ کیسے کر سکتی ہوں۔

رضیہ: (دراز کھول کر کاغذ نکالتی ہے۔ اور اپنے پرس میں ڈال لیتی ہے) اس میں پریشان ہونے کی بات نہیں۔ شروع میں مجھے بھی کچھ نہیں آتا تھا۔ مجھے انھوں نے سکھا دیا تھا۔

نگہت: لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں آپ کی جگہ لے لوں۔

رضیہ: تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں خود ہی چھوڑنا چاہ رہی ہوں (بائیں جانب بڑھتی ہے) اچھا خدا حافظ

[بائیں جانب سے نکل جاتی ہے۔ ناظر اور نگہت خاموش کھڑے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ پچھلے دروازے سے شکور داخل ہوتا ہے ہاتھ میں مسطر اور قلم دوات ہے۔]

شکور: جی وہ چھاپے خانے سے آدمی آیا ہے

ناظر: (چونک کر) اچھا۔ ہاں ابھی تو اداریہ لکھوانا ہے (نگہت سے) تو ذرا چند منٹ تشریف رکھیے (نگہت بیٹھ جاتی ہے) لکھو شکور۔

شکور: (بیٹھ کر مسطر پر لکھتے ہوئے) انھوں نے لکھوایا تھا۔۔۔

ناظر: نیا مسطر لگاؤ

شکور: (نیا مسطر لگا کر) جی

ناظر: قارئین کرام کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اردو کی مقبول ادیبہ نگہت رضا صاحبہ ہمارے ادارے میں مستقل طور پر تشریف لے آئی ہیں۔۔۔

شکور: جی؟

نگہت: لیکن میں نے تو ابھی۔۔۔۔۔

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا ایکٹ

[وقت صبح کے گیارہ بجے ہیں۔ منظر وہی دفتر کا کمرہ۔ پردہ اٹھتا ہے تو میز پر کاغذات کے انبار لگے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پچھلی دیوار کے قریب ناظر بے چینی اور قدرے غصے سے ٹہل رہا ہے]

ناظر: (آواز دیتا ہے) شکور۔ شکور

(پچھلے دروازے میں سے شکور جھانکتا ہے)

شکور: جی۔

ناظر: شکور کب تک چلے گا آخر؟

شکور: کیا حضور! پرچہ؟

ناظر: ارے پرچہ تو معلوم نہیں چلے گا یا نہیں۔ یہ کب تک چلے گا کہ اب گیارہ بج رہے ہیں اور نگہت ابھی تک دفتر نہیں آئیں۔

شکور: جی عورتوں کو دیر ہو ہی جاتی ہے۔

ناظر: تو رفیعہ کیسے ۸ بجے دفتر پہنچتی تھیں۔
شکور: ان کو میک اپ کا شوق نہیں تھا۔
ناظر: یہ سب بزمی نے ستیاناس کر رکھا ہے۔ ہر ہفتے نیا میک کا سیٹ لا کر دے جاتا ہے۔ بزمی کا آنا بند کرنا پڑے گا۔
شکور: اب تو اس نے دو صفحے کا اشتہار خرید لیا ہے۔
ناظر: ہاں یہ تو ہے۔
شکور: اور پچھلے ہفتے پانچسو کاپی واپس آ گئی تھیں۔ یہ نقصان آخر اشتہاروں ہی سے پورا ہوگا یا نہیں۔
ناظر: اشتہار تو دو ایک زیادہ ہو گئے ہیں لیکن پرچے کا ستیاناس ہو رہا ہے۔ ہر ہفتے بکری کم سے اور کم ہو رہی ہے۔
شکور: تو نگہت صاحبہ کو کام پر لگائیے نا
ناظر: کیا کام پر لگاؤں، خاک کام ہوگا جب محترمہ دو گھنٹے سے زیادہ دفتر میں بیٹھیں گی نہیں اور وہ بھی بزمی چلے آ رہے ہیں یا کوئی اور۔ آج تک ایک اداریہ لکھ کر نہیں دیا۔
شکور: خاک تو لکھ رہی ہیں ہر ہفتے۔
ناظر: لاحول ولا۔ وہ بھی کوئی چھاپنے کی چیز ہوتی ہے۔ یہ پہلے کیسے لکھ لیتی تھیں! انھیں تو کچھ ہو گیا ہے۔ دو جملوں میں ربط تو قائم نہیں کر سکتیں۔ کیا کسی سے لکھوا کر لاتی تھیں،
شکور: جی ہاں۔
ناظر: چونک کر) کیا؛
شکور: وہ رفیعہ کے لکھے ہوتے تھے۔
ناظر: ارے بتاؤ وہ کسی سے بھی لکھواتی ہوں لیکن رفیعہ سے نہیں۔ رفیعہ کی تحریر کو میں نہیں پہچانتا کیا؛

(میز کے پیچھے جا کر رفیعہ والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

شکور: کاتب سے کوئی کیا بات چھپا سکتا ہے۔ نگہت صاحبہ کے مسودے کی کتابت تو یہی خادم کرتا رہا ہے۔ شروع سے آخر تک سرخ روشنائی سے رفیعہ صاحبہ کے جملے کے جملے بلکہ پیرے کے پیرے ہوتے تھے۔
ناظر: کیا مطلب وہ طنز و مزاح بھی لکھتی تھیں؛ ناممکن!
شکور: تو پچھلی فائل نکال کر دیکھئے۔
ناظر: (سوچتے ہوئے) تو مجھے پہلے کسی نے کیوں نہیں بتایا —— خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔ (کاغذوں کے انبار کو اپنی طرف گھسیٹ کر اور یہ کاغذوں کا ڈھیر کیوں یہاں پر رکھا ہے (کاغذ الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے) یہ خط تو دو مہینے پہلے آیا تھا۔

(بائیں جانب سے نگہت داخل ہوتی ہے۔ اس کا لباس پہلے سے کہیں بہتر ہے۔ فیشن کی طرف پوری توجہ کی گئی ہے)

نگہت: آداب عرض ناظر صاحب!
ناظر: (اٹھ کر) آداب عرض

نگہت: ڈاک آپ دیکھنے گا آج؟

ناظر: (کرسی چھوڑ کر سامنے آجاتا ہے) جی نہیں آپ ہی دیکھیے۔ میں بیٹھ کر آپ کی مدد کروں گا

نگہت: (اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے) میں بھی سوچ رہی تھی کہ آپ سے کہوں کسی روز زحمت کریں اور ان خطوں کو دیکھیں۔

ناظر: (خطوں میں ایک اٹھا کر پڑھتا ہے) بخدمت جناب نگہت نور صاحبہ۔ میں ہمیشہ سے آپ کی مداح ہوں اور آپ کا خاکہ بڑے شوق سے پڑھتی ہوں لیکن پچھلے چند ہفتوں سے آپ پوری توجہ سے نہیں لکھ رہی ہیں ....

نگہت: پڑھنے والوں کا ذوق عجیب بے ڈھنگا ہے کس کی سنیں اور کس کی مانیں (پرس کھول کر ایک خط نکالتی ہے اور پڑھتی ہے) میں ایک ادیب ہوں اور ادیب کی حیثیت سے عرض کر رہا ہوں کہ جب سے آپ نے رسالے کی ادارت سنبھالی ہے پرچہ نکھر آیا ہے اور آپ کے خاکے تو ماشا اللہ کیا کہنے۔ فقط منیر نگینوی "

ناظر: خوب (ایک اور خط اٹھا کر پڑھتا ہے) پچھلے دو مہینے میں تین خط لکھ چکی ہوں آپ نے ابھی تک جواب نہیں دیا۔ ہمیں پرچہ باقاعدگی سے نہیں مل رہا ہے۔

نگہت: اس طرح کے انتظامی امور کی طرف آپ توجہ فرمایئے نا۔

ناظر: (ایک اور خط اٹھا کر پڑھتا ہے) معلوم ہوتا ہے کہ پرچہ ڈوب رہا ہے۔ ناظر صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ مضامین کا معیار بہتر کرنے کی طرف کیوں توجہ نہیں دے رہے ہیں۔

نگہت: (اپنے پرس سے ایک اور خط نکال کر) اتفاق سے اس مضمون پر ایک اور خط ملاحظہ فرمایئے (پڑھتی ہے) میرے خیال میں پرچے پر مدیر کی چھاپ کا ہونا ضروری ہے اور مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ آپ کے پرچے پر آپ کی چھاپ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ جب سے ناظر صاحب نے انتظامی معاملات پر زیادہ توجہ اور ادبی معاملات پر کم توجہ دینا شروع کی ہے مضامین کا معیار پہلے سے بہتر ہو گیا ہے

ناظر: خوب اور اس کے لکھنے والے کون ہیں؟

نگہت: منیر نگینوی

ناظر: آپ کے پرس میں اور بھی کوئی خط ہیں؟

نگہت: جی ہاں بہت (پرس میں ہاتھ ڈال کر ایک پلندہ نکالتی ہے)

ناظر: ان کو فائل میں لگایئے گا۔ یہ کس کس کی طرف سے ہیں؟

نگہت: سب منیر نگینوی صاحب کی طرف سے ہیں۔

ناظر: خوب! یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ہم منیر نگینوی صاحب کا کلام کبھی نہیں چھاپتے۔

نگہت: جی نہیں مجھے نہیں معلوم۔ کیوں نہیں چھاپتے؟

ناظر: کیونکہ غیر معیاری ہوتا ہے۔

نگہت: مجھے تو منیر نگینوی صاحب بڑے معیاری ادیب لگے چنانچہ اس پرچے کے لیے میں نے ان کی تین نظمیں شامل کر لی ہیں۔

ناظر: (چونک کر) تین نظمیں! خدا کے لیے، وہ تو دو مصرعے بھی موزوں نہیں لکھ سکتے۔ آپ نے اکٹھی تین نظمیں کیسے چھپنے کو دے دیں!

نگہت: (ناپسندیدگی سے) میرا خیال ہے کہ مجھے ادب پاروں کے انتخاب کا حق تو پہنچتا ہے۔

ناظر: بے شک۔ بے شک۔ لیکن نظم چونکہ آپ کا میدان نہیں ہے اس لئے اس میں غلطی ہو سکتی ہے۔ آپ مجھے دکھا لیجئے۔ وہ نظمیں کہاں ہیں؟

نگہت: ان کی کتابت ہو گئی ہے۔ میں نے پریس بھجوا دی ہیں۔

ناظر: اس میں غلطی میری ہے۔ مجھے چاہیئے تھا آپ کو بتا دیتا کہ چند لوگ ایسے ہیں جو اکثر اپنی تخلیقات ہمارے پاس بھیجتے رہتے ہیں اور ہم انہیں لوٹاتے رہتے ہیں۔ دراصل وہ ادیب بنتے ہی عورت کا نام پڑھ کر ہیں۔

نگہت: کیا مطلب؟

ناظر: پہلے رفیعہ کا نام چھپتا تھا تو اس کی مدح میں خطوط آتے رہتے تھے۔ اب آپ کا نام یا آپ کی تصویر دیکھ کر آنے لگے ہیں۔ ہم لوگ عموماً ایسے خطوط کو نظر انداز کر دیا کرتے ہیں۔

نگہت: لیکن یہ تو انتہائی بے مروتی کی بات ہے۔

ناظر: کہیں آپ نے ان خطوط کے جواب تو نہیں بھیجے؟

نگہت: آپ ہی نے تو کہا تھا کہ پڑھنے والوں کے خطوط کی طرف خاص توجہ دی جائے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔

ناظر: میرا مطلب یہ تھا۔۔۔۔ خیر ہٹایئے

نگہت: معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آج صبح آپ کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔

ناظر: جی ہاں

نگہت: تو آپ ذرا دیر باہر ٹہل آیئے اور مجھے کام کرنے دیجئے (میز پر سے کاغذوں کو سمیٹتی ہے)

ناظر: نگہت میرا یہ خیال تھا کہ ہم دونوں مل کر اس پرچے کو بہتر بنا سکیں گے۔

نگہت: (ڈاک اٹھا کر دیکھتی ہے) اگر آپ تنقید کم کریں اور تعمیر زیادہ تو پرچہ بہتر ہو سکتا ہے۔

ناظر: میں نے تو آج تک تنقید نہیں کی۔

نگہت: اور آج جو اگلی پچھلی کسر نکال رہے ہیں؟

ناظر: میں معافی چاہتا ہوں۔

نگہت: (مسکرا کر) خیر کوئی بات نہیں۔ ہر انسان سے غلطی ہو سکتی ہے۔ آپ فرمایئے کہ پرچے میں کیا خرابی ہے۔

ناظر: ہر پرچے میں بہتری کی گنجائش رہتی ہے لیکن یہ بہتری اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ ہم دونوں میں ذاتی سطح پر تعاون ہو۔

نگہت: درست۔ ضرور ہونا چاہیئے تعاون۔

ناظر: میں اپنے ساتھیوں کے قریب نہیں جا سکتا۔ مجھ میں ضرور کوئی خرابی ہوگی۔

نگہت: (بظاہر اور کوئی خرابی تو نظر نہیں آتی لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ خواتین سے آپ کا سابقہ بہت کم رہا ہے۔

ناظر: کوئی ایسی لاتعلقی بھی نہیں رہی۔ پچھلے کئی برس سے رفیعہ میرے پرچے میں کام کرتی رہی اور اب کچھ عرصے سے آپ ہیں۔

نگہت: نہیں تو خیر آپ دفتر کا فرنیچر سمجھتے ہوں گے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کی زندگی میں کسی خاتون کا دخل نہیں رہا۔

ناظر: یہ بھی درست نہیں۔ میں اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ اور ماں کا اکلوتے بیٹے کی زندگی پر بہت اثر ہوتا ہے۔

نگہت: ہو سکتا ہے کہ ماں کی غیر ضروری حد تک توجہ نے آپ کو خود پرست بنا دیا ہو۔

ناظر: ہو سکتا ہے لیکن میں نے کبھی اپنی خود پرستی کا مظاہرہ نہیں کیا۔

نگہت: لیکن دوسروں کی طرف توجہ بھی نہیں دی۔

ناظر: دیکھئے میں آپ کی طرف توجہ دینا چاہ رہا ہوں۔

نگہت: (ہنس کر) بہت دیر سے۔ بہت دیر سے۔ اتنے میں مجھے احساس ہو چکا ہے کہ آپ کی مجھ میں دلچسپی محض سطحی ہے۔

ناظر: تو آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ دلچسپی اور گہری ہونی چاہیئے؟

نگہت: (یکایک بوکھلا کر) مجھے معلوم نہیں۔ (ڈاک کی طرف پھر متوجہ ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا جاتی ہے)

ناظر: آپ بہت مصروف ہیں۔

نگہت: (بغیر نظریں اٹھائے) جی ہاں۔

ناظر: تو میں چلتا ہوں۔ (اٹھ کر پچھلے دروازے سے نکل جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد نگہت کاتب کو آواز دیتی ہے)

نگہت: شکور۔

(شکور پچھلے دروازے سے جھانکتا ہے)

شکور: جی؟

نگہت: ناظر صاحب نے اداریہ لکھوا دیا ہے؟

شکور: جی نہیں۔ انھوں نے ابھی ابھی باہر جاتے ہوئے کہا کہ آپ لکھوائیں گی۔

نگہت: لیکن وہ تو کل چلا جانا چاہیئے تھا۔ اور ہمیشہ وہی لکھتے ہیں۔

شکور: جی میں نے کل کہہ دیا تھا لیکن انھوں نے جب بھی کہا کہ آپ سے لکھوایا جائے۔

نگہت: (ذرا تامل سے) تو تعلّی ہے یہ؟

شکور: جی؟

نگہت: کچھ نہیں۔

شکور: مسطر لاؤں؟ اسی پر لکھوا دیجئے۔ وقت اب کم ہے

نگہت: (میز سے کاغذ پنسل بڑھاتے ہوئے) نہیں یہ سادہ کاغذ اور پنسل لے لیجئے مجھے مسطر پر لکھوانے کا تجربہ نہیں ہے۔

(شکور کاغذ پنسل لے کر بیٹھ جاتا ہے)

شکور: جی۔

نگہت: (سوچتے ہوئے) اوپر لکھیے اداریہ۔

شکور: جی وہ تو میں نے پہلے ہی لکھ لیا۔

نگہت: اچھا تو آگے لکھیے (سوچتے ہوئے) کیا لکھا جائے ۔۔۔؟ ٹیڈی لباس کے بارے میں تو پچھلے ہفتے ناظر صاحب نے لکھوا دیا تھا۔ اس سے پچھلے ہفتے کیا تھا؟

شکور: عورتوں کا ادب میں حصہ۔

نگہت: اور اس سے پچھلے ہفتے؟

شکور: ادب میں مزاح

نگہت: ہاں یہ تو سب ہو چکے۔ اب میرے لئے مضمون کوئی چھوڑا ہی نہیں لکھواؤں کیا خاک۔ اچھا تعلّی ہے تو تعلّی ہی سہی، خیر لکھئے۔

شکور: جی۔

نگہت: (سوچتے ہوئے انڈر لائن ہے) لکھیے "اس ہفتے ہم اپنے قارئین کی توجہ ایک نہایت اہم مسئلے کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

شکور: جی لکھ لیا۔

نگہت: (رک کر) لیکن وہ اہم مسئلہ کیا ہے؟

شکور: یہ بھی لکھوں جی؟

نگہت: ارے نہیں میں سوچ رہی ہوں۔ اچھا تم بتاؤ وہ مسئلہ کیا ہو سکتا ہے؟

شکور: جی مجھے کیا معلوم۔

نگہت: اب اتنا میں نے لکھوا دیا ہے تو آپ لوگ بھی کچھ سوچیں۔ کیوں دنیا میں اس وقت کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے؟

شکور: مشرق بعید میں جنگ کا مسئلہ ہے۔

نگہت: ہم سیاسی مسائل پر نہیں لکھ رہے۔ کوئی ادبی یا سماجی مسئلہ بتاؤ۔ اچھا خیر میں خود ہی سوچتی ہوں ۔۔۔ "شہروں میں صفائی کا مسئلہ" یہ کیسا رہے گا؟

شکور: لیکن اس پر تو رضیہ صاحبہ ایک مرتبہ لکھوا چکی ہیں۔

نگہت: تو دوبارہ نہیں لکھا جا سکتا کیا؟

شکور: لکھوا دیجیے لیکن کوئی نئی بات تو نہ ہو گی۔

نگہت: تو یوں لکھو کہ اس ہفتے ہم اپنے قارئین کی توجہ ایک ایسے مسئلے کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جس پر پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔

شکور: جی لکھ لیا۔

نگہت: لیکن رضیہ پڑھیں گی تو ہنسیں گی۔ کیا لکھا؟

شکور: اس ہفتے ہم اپنے قارئین کی توجہ ایسے مسئلے کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جس پر پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔

نگہت: "جس پر پہلے بھی لکھا جا چکا ہے" کاٹ دیجیے

شکور: کاٹ دیا۔

نگہت: اب پھر پڑھئے۔

شکور: اس ہفتے ہم اپنے قارئین کی توجہ ایسے مسئلے کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

نگہت: یہ تو فقرہ بے معنی ہوگیا۔ ایسے مسئلے کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ کاٹ دیجئے۔

شکور: کاٹ دیا

نگہت: اب کیا رہ گیا؟

شکور: اس ہفتے ہم اپنے قارئین کی توجہ۔

نگہت: یہ بھی کاٹ دیجئے

شکور: کاٹ دیا۔

نگہت: اب پڑھیئے

شکور: اداریہ

نگہت: (واپس آکر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے) اداریہ ــــ اداریہ (جھنجلا کر) یہ ناظر صاحب کی سراسر زیادتی ہے (بائیں جانب دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے) کون ہے؟

(باہر سے آواز)

آواز: منیر نگینوی۔

نگہت: تشریف لائیے۔

شکور: تو میں جاؤں جی؟

نگہت: نہیں آپ بھی بیٹھئے۔

[منیر نگینوی بائیں دروازے سے داخل ہوتے ہیں گندمی رنگ شکل نہایت معمولی درمیانہ قد دبلا پتلا جسم کرتا پاجامہ پہنے ہوئے ہیں۔ پان چبا رہے ہیں ہاتھ میں ایک چھوٹا سا رجسٹر ہے]

منیر: آداب عرض ہے

شکور: (اُٹھ کر) آداب عرض

نگہت: یہ شکور صاحب ہیں۔

منیر: دوبارہ آداب بجا لاکر) تشریف رکھئے شکور صاحب

شکور: آپ بھی تشریف رکھئے

منیر: نوازش

(شکور اور منیر دونوں کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں)

(نگہت سے) بہت دنوں سے آپ سے ملنے کی تمنا تھی۔ آج ہمت کرکے آن ہی پہونچا۔

نگہت : اس میں ہمت کی کیا بات ہے۔ یہ ایک ادبی ادارہ ہے اور آپ ادیب ہیں۔ لازم و ملزوم۔

منیر: اور شکریہ ادا کرنا تھا اس بات کا کہ آپ نے میری چند نظمیں انتخاب فرمائیں۔

نگہت : ہم پرچے میں نئے لوگوں کو بھی لانا چاہتے تھے۔ پرچے میں فرسودگی سی آنے لگی تھی

منیر: یہ تو آپ کی عنایت ہے ویسے ہم کچھ ایسے نئے بھی نہیں ہیں آپ کی دعا سے بچپن سے شعر کہہ رہے ہیں۔

نگہت : (ذرا حیرت سے) بچپن سے ؟

منیر: جی ہاں قدرتی طور پر طبیعت موزوں ہے۔ میں دو سال کا تھا جب بے ساختہ پہلا شعر میرے منہ سے نکل گیا۔

نگہت : (ذرا حیرت سے) دو سال کا ؟

منیر: جی ہاں اباّ مجھے گود میں لئے ہوئے بہلا رہے تھے۔ شعر سنا تو حیران رہ گئے۔

نگہت : خوب : کیا شعر تھا وہ ؟

منیر: بچپن کی باتیں کسے یاد رہتی ہیں۔ یقیناً کوئی اچھا شعر ہوگا جبھی ابا مرحوم اس کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے تو عرض یہ ہے کہ صرف پچھلے ایک برس میں میں نے جو کچھ کہا ہے وہ اس بیاض میں ہے۔

(رجسٹر اٹھا کر میز پر رکھتا ہے)

نگہت : تو آپ بیاض کو ساتھ کیوں رکھتے ہیں ؟

منیر: یہاں قصہ یہ ہے کہ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے شعر نازل ہوتے رہتے ہیں۔ اگر بیاض ساتھ نہ ہو تو ایک ادبی خزانہ ہاتھ سے جاتا رہے۔

نگہت : بے شک

منیر: خیر ہٹایئے اس قصے کو ہمیں اپنے بارے میں تو کچھ کہنا نہیں تھا ہمیں تو آپ سے ملنا تھا اور واقعی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ جیسا سوچا تھا اُس سے بڑھ کر پایا۔

نگہت : شکریہ (موضوع بدلتے ہوئے) پرچے کا معیار بہتر کرنے کے لئے اگر آپ کے ذہن میں کچھ مشورے ہوں تو ہمیں بتایئے۔

منیر: جب سے آپ تشریف لائی ہیں پرچے کا معیار روز بروز بہتر ہو رہا ہے۔ کسی مزید مشورے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ آپ کی ذات ہی بابرکات ہے دیکھیے شعر ہو گیا۔

نگہت : جی کون سا شعر ؟

منیر: آپ کی ذات ہے بابرکات

نگہت : (ہنس کر) یہ وہی شعر تو نہیں جو دو برس کی عمر میں کہا تھا۔

منیر: (ذرا بگڑ کر) ان کی ہمارے یہاں آمد ہے آورد نہیں اور آمد بھی ایسی کہ سہل ممتنع سمجھ لیجیے۔ یہ وہ چیز ہے جو شاید آپ کو آسان لگے لیکن بڑے بڑے استادوں کے قلم لرز جاتے ہیں اس کے آگے

شکور: بے شک۔ بے شک

منیر: (شکور کی طرف متوجہ ہو کر) آداب عرض۔ آداب عرض۔

شکور: ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں۔

منیر: واہ — واہ — واہ تو جناب بھی شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ واہ واہ واہ واہ۔ مکرر ارشاد فرمایئے گا

شکور: (ذرا پشیمان ہو کر) ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں۔

منیر: (پھر پھڑک کر) واہ کیا زمین نکالی ہے، گیارواں مصرعہ ہے! بہت خوب کہا ہے آپ نے!

شکور: (ذرا حیرت سے) جی؟

نگہت: (ہنس کر) یہ تو مرزا غالب کا مصرعہ ہے۔ شکور صاحب تو شعر نہیں کہتے۔

منیر: مرزا غالب! آپ کیا فرما رہی ہیں؟ مصرع یوں ہے کہ غالب کے طرفدار نہیں۔ اب فرمایئے کہ کون شاعر ایسا ہوگا جو اپنا طرفدار نہ ہو۔

شکور: جی یہ مرزا غالب ہی کا مصرع ہے اور مقطع ہے۔

منیر: خیر اب آپ لوگوں کا اصرار ہے تو مان لیتا ہوں ورنہ شعر کی داخلی کیفیت تو سب میری بات کے حق میں ہے۔

نگہت: اور خارجی کیفیت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

شکور: اگر مجھے اجازت دیں تو تھوڑا سا کام کر لوں۔ چند صفحوں کی کتابت باقی ہے۔

نگہت: اچھا! لیکن دفتر ہی میں رہیئے گا ابھی ادارہ یہ لکھنا ہے۔

شکور: (اٹھ کر پچھلے دروازے کی جانب بڑھتا ہے) جی بہتر۔

(پچھلے دروازے سے چلا جاتا ہے)

منیر: تو آپ کاتب ہیں۔

نگہت: جی ہاں

منیر: بہت خوب۔ خیر آپ نے بڑی خوبصورتی سے شکور صاحب کو باہر نکالا

نگہت: (ذرا حیرت سے) جی؟

منیر: جی ہاں۔ جیسے ہی آپ نے خارجی کیفیت کہا میں سمجھ گیا کہ آپ اشارۃً شکور صاحب کو خارج ہونے کو کہہ رہی ہیں اور شکور صاحب اٹھ کر چل دیئے

نگہت: جی نہیں میرا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا اور نہ ہی شکور صاحب سے اشارۃً کچھ کہنے کی مجھے ضرورت ہے،

منیر: خیر وضعداری کے تقاضے نباہیئے۔ ورنہ کیا ہم نہیں جانتے کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔

نگہت: (ذرا پریشان ہو کر) کیا فرما رہے ہیں آپ؟

منیر: نگہت صاحبہ آپ کا ایک ایک خط میں نے کئی کئی بار پڑھا ہے اور آپ کا طرزِ تکلم پہچاننے لگا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ لفظاً معصوم سی بات کے پردے میں کیا کیا کہہ جاتی ہیں۔

نگہت: (ذرا بگڑ کر) مثلاً؟

منیر: مثلاً؟ مثلاً آپ کے ایک خط میں یہ جملہ تھا کہ اپنے کلام میں جذباتی رنگ قائم رکھیئے۔ اب ہم اتنے بھولے بھی نہیں ہیں کہ اس کا مطلب بھی نہ سمجھ سکیں

(بائیں جانب سے دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے)

نگہت: کون ہے؟

(باہر سے معین بزمی کی آواز سنائی دیتی ہے)

معین: میں حاضر ہو سکتا ہوں؟

نگہت: جی ہاں تشریف لائیے

(بائیں جانب کے دروازے سے معین بزمی داخل ہوتے ہیں)

معین: آداب عرض (منیر سے) آداب عرض۔

منیر: (غور کرنا پسندیدگی سے) آداب عرض (پھر بیٹھ جاتا ہے)

نگہت: (تعارف کراتے ہوئے) یہ معین بزمی صاحب ہیں اور یہ منیر نگینوی صاحب ہیں۔

(دونوں دوبارہ آداب بجا لاتے ہیں)

معین: میں مخل تو نہیں ہوا؟

منیر: جی ہاں ہم کچھ مصروف ہی تھے

نگہت: (جلدی سے) جی نہیں قطعی نہیں۔ منیر صاحب ہمارے پرچے کے لئے لکھتے ہیں اور آج یوں ہی آگئے تھے۔

معین: (منیر کی موجودگی سے ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے) اگر آپ مصروف ہوں تو میں تھوڑی دیر میں دوبارہ آ جاؤں گا۔

منیر: اگر ایسا ہو تو بہت اچھا ہے (معین ٹھٹھکتا ہے)

نگہت: (منیر سے ڈانٹ کر) منیر صاحب آپ ہمارے مہمانوں سے اس طرح بات نہیں کر سکتے اور چونکہ آپ اشارے سمجھتے ہیں اس لئے میں عرض کروں گی کہ آپ کے لئے خارجی کیفیت بہتر رہے گی۔

منیر: (کرسی پر یوں بیٹھے ہیں کہ برسوں نہیں اٹھیں گے) خارجی کیفیت تو یہ ہے کہ ہماری گفتگو ابھی نامکمل ہے اور میری داخلی کیفیت تو آپ جانتی ہی ہیں۔

معین: (ذرا پریشان ہو کر) میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے . . . .

نگہت: (بزمی سے) بزمی صاحب آپ تشریف رکھیے (منیر سے) مجھے بزمی صاحب سے ایک ضروری بات کرنا ہے

منیر: نگہت صاحبہ آخر ہمارا بھی آپ پر کچھ حق ہے۔ آپ نے خطوط میں اتنی حوصلہ افزائی فرمائی تو ہم حاضر ہوئے۔

نگہت: (غصے سے) آپ اب تشریف لے جائیے۔

منیر: بزمی صاحب آپ کے آنے سے پہلے حالات بہت اچھے جا رہے تھے۔

بزمی: (غصے سے تڑپ کر منیر صاحب) میں نگہت صاحبہ کو بہت عرصے سے جانتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے آپ شریف آدمی نہیں ہیں۔ آپ تشریف لے جائیے۔

منیر: (اٹھ کر) بہت اچھا۔ تو ہم تشریف لے جاتے ہیں۔ لیکن یہ عرض کر دوں کہ ہمارے قلم میں ابھی زور ہے۔ جو بھی ہو سکتی ہے۔

(بزمی دھکیلتا ہوا اسے دروازے سے باہر نکال دیتا ہے — نگہت سر پکڑ کر بیٹھ جاتی ہے)

نگہت: یہ ادیب ہیں یا غنڈے؟ عجیب مصیبت ہے!

بزمی: کوئی بات نہیں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔

نگہت : (ایک کاغذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) میں استعفیٰ دے رہی ہوں۔

بزمی : یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ میں خود بھی کہنے والا تھا کہ آپ اس پرچے کو چھوڑ دیجیے۔

نگہت : (دیکھتے ہوئے رک رک کر) اچھا! کیوں؟

بزمی : مجھے اپنا پرچہ نکالنے کی اجازت مل گئی ہے۔ اور میں آپ سے درخواست کرنے ہی والا تھا۔

(بائیں جانب سے رفیعہ جھانکتی ہے)

رفیعہ : ہیلو نگہت۔ (بزمی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

نگہت : آئیے رفیعہ بہن۔ آپ بہت اچھے وقت پر آئیں۔

رفیعہ : (کمرے میں آ کر) کیوں کوئی خوش خبری ہے؟

نگہت : جی ہاں۔

بزمی : آداب عرض کرتا ہوں۔

رفیعہ : آداب عرض۔ بزمی صاحب نے اشتہارات کے لئے پورا پرچہ لے لیا ہوگا۔

نگہت : (جس کاغذ پر لکھ رہی تھی وہ رفیعہ کو دیتی ہے) جی نہیں خوش خبری یہ ہے

رفیعہ : (پڑھتے ہوئے) استعفیٰ — کیوں کیا ہوا؟

نگہت : بس یکایک فیصلہ کر لیا

رفیعہ : کہیں بزمی صاحب نے تو یہ مشورہ نہیں دیا۔ (کرسی پر بیٹھتی ہے)

نگہت : نہیں۔ لیکن یہ سن کر خوش بہت ہوئے ہیں۔

بزمی : (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) آپ کو اگر یاد ہو تو آپ نے مجھے اپنا پرچہ شروع کرنے کو کہا تھا۔ وہ آپ کی دعا سے نگار کے نام سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

رفیعہ : مبارک ہو اور نگہت اس کی مدیرہ ہوں گی۔

بزمی : زہے نصیب۔

نگہت : یہ ان کا حسنِ ظن ہے ایمانداری کی بات یہ ہے کہ مجھ سے پرچے کا کام نہیں ہوتا۔

رفیعہ : تو کیا گھرداری کا ارادہ ہے؟

بزمی : زہے نصیب۔

رفیعہ : (ایک قہقہہ لگا کر) بہت خوب تو یہ ارادے ہیں۔

نگہت : بزمی صاحب آپ یہ کیا فرما رہے ہیں؟

بزمی : (گھبرا کر) جی — جی میں نے کچھ عرض نہیں کیا۔

رفیعہ : لیکن آخر حرج ہی کیا ہے؟

نگہت: بیٹھ جائیے رفیعہ بہن (بزمی سے) بزمی صاحب آپ کہاں جائیے گا۔

بزمی: جہاں آپ فرمائیں۔

رفیعہ: ہائیں تو تم جارہی ہو کیا؟

نگہت: جی قطعی!

رفیعہ: اور ناظر صاحب سے بات نہیں کرو گی۔

نگہت: جی نہیں

رفیعہ: لیکن ہوا کیا ہے۔ آخر ایسی بھی کیا ناراضگی ہے کہ ان سے بات بھی نہیں ہو گی۔

نگہت: (اُٹھ کر) بزمی صاحب آپ کار دکھا کر لائیے۔ میں اپنی چیزیں سمیٹ لوں اتنے میں۔

بزمی: (بائیں جانب لپکتے ہوئے) جی ابھی لیجئے۔ (بائیں جانب سے نکل جاتا ہے)

(نگہت میز پر سے چند کاغذ اُٹھا کر اپنے پرس میں ڈالتی ہے)

نگہت: میں اپنے آپ کو دھوکا دیتی رہی کہ میں پرچے کو کامیابی سے چلا رہی ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر بزمی صاحب اشتہارات کی تعداد میں اضافہ نہ کرتے تو پرچہ بالکل بیٹھ گیا تھا۔ اور تعریفی خطوط سوائے دو تین سر پھروں کے اور کسی کی طرف سے آنہیں رہے تھے۔

رفیعہ: تو اب کیا ارادہ ہے؟

نگہت: کچھ نہیں اگر آپ اجازت دیں گی تو آپ کے پرچے کے لئے خاکے لکھ دیا کروں گی۔

رفیعہ: میں اجازت دوں؟ اور میرا پرچہ! میرا اس پرچے سے کیا واسطہ۔

نگہت: میرا مشورہ مانیئے آپ دوبارہ آجائیے۔

رفیعہ: بہت خوب — کیوں؟

نگہت: تو کون سا ایسا ضروری کام کر رہی ہیں آپ!

رفیعہ: آرام سے زیادہ ضروری کام کیا ہو سکتا ہے؟

نگہت: رفیعہ بہن اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ کے "وہ" پرچے کے علاوہ کسی اور سے بھی دلچسپی لے سکتے ہیں تو یہ غلط ہے۔

رفیعہ: میں کیسے مان لوں کہ تمہارے ہوتے ہوئے اس ویرانے میں کچھ فرق نہیں پڑا۔

نگہت: تسلی مان لیجئے کہ میں نے اس میں کوئی گل نہیں کھلائے۔

رفیعہ: تو اس ویرانے کو ویرانہ چھوڑ کر جا رہی ہو تم۔

نگہت: شاید اب وہ ویرانہ نہ رہا ہو —

رفیعہ: اچھا؟

نگہت: مکان تو ہے اور باہر جا کر کون سا باغ مل گیا یا بہار مل گئی آپ کو۔

رفیعہ: اچھا میرا ذکر چھوڑو تم اپنا بتاؤ، خاکے لکھنے کے علاوہ اور کیا ہو گا۔۔۔ بزمی کیسے ہیں۔

نکہت: (سوچتے ہوئے) شریف اور بدھو ہیں۔

رفیعہ: یعنی ان میں میاں بننے کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔

(نکہت اور رفیعہ ہنستی ہیں۔ بائیں جانب سے ناظر داخل ہوتا ہے)

ناظر: ہیلو — ہیلو رفیعہ — کیسے آنا ہوا؟

رفیعہ: (اٹھتی ہے) یوں ہی گذر رہی تھی۔ سوچا نکہت سے ملتی چلوں

ناظر: ہوں — تو آپ لوگ کھڑے کیوں ہیں بیٹھئے نا — وہ تم نے چائے بنانے کا اچھا سلسلہ شروع کیا تھا۔ نکہت نے نہیں چلایا چنانچہ اب چائے باہر سے منگوانا ہوگی۔

نکہت: میں نے رفیعہ بہن سے درخواست کی ہے کہ وہ چائے کا سلسلہ پھر شروع کر دیں۔

(استعفےٰ ناظر کے حوالے کرتی ہے)

ناظر: (ایکدم چونک کر) ہیں؟ یہ کیوں؟ ناراضگی کی وجہ؟

(بزمی بائیں جانب سے بڑی تیزی سے داخل ہوتا ہے)

بزمی: آئیے میں گاڑی گھما لایا ہوں (ناظر کی طرف دیکھ کر) آداب عرض ناظر صاحب۔

ناظر: ہیلو بزمی صاحب آئیے تشریف لائیے

بزمی: میں پھر کسی وقت حاضر ہوں گا۔ اس وقت نکہت صاحبہ کو جلدی ہے۔

نکہت: اچھا ناظر صاحب خدا حافظ۔ غلطی معاف فرمائیے۔ (بائیں جانب چلتی ہے)

بزمی: اچھا جی خدا حافظ۔

(نکہت اور بزمی دونوں بائیں جانب سے نکل جاتے ہیں)

(تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا جاتی ہے۔ پچھلے دروازے سے شکور داخل ہوتا ہے)

شکور: وہ جی پریس سے آدمی آیا ہے۔ کہتا ہے۔ ساری کاپیاں لگا دی ہیں۔ اداریئے کے لئے کام رکا ہوا ہے وہ جلدی سے بھجوا دیجئے
(رفیعہ سے) آداب عرض۔

رفیعہ: کیسے ہو شکور؟

ناظر: میں ذرا پریشان ہوں رفیعہ۔ تم لکھوا دوگی اداریہ؟

رفیعہ: لیکن میں —

ناظر: وقت نہیں ہے تو مسطر ہی پر لکھوا دو۔ شکور مسطر لیتے آؤ۔

شکور: بہت بہتر (پچھلے دروازے سے باہر نکل جاتا ہے)

ناظر: مجھے ایسا لگتا ہے کہ اب بزمی کی طرف سے پرچے کو اشتہارات نہیں ملیں گے۔ بہت دوڑ دھوپ کرنی پڑے گی ہم دونوں کو۔ شکریہ کہ تم آگئیں۔

(پردہ گرتا ہے)

محمد خالد اختر

سواتی مہم

۳

باٹا خیل کی سرائے

لاری باٹا خیل کے بڑے گاؤں میں کوئی ایک بجے داخل ہوئی۔ یہ ان دیہات میں سے ہے جنہیں قصبہ کہنا چاہیئے۔ اس کا بازار لمبا اور لڑکھڑاتا ہوا ہے۔ دوکانیں اچھی خاصی ہیں اور ہر قسم کا سامان وہاں بک سکتا ہے۔ باٹا خیل ملاکنڈ ایجنسی میں ہے۔ لاری ایک لمبے چوڑے برآمدوں والے ہوٹل کے سامنے رکی۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہاں لاری بہت دیر ٹھیرے گی اور ہم کھانا کھا اور ستا سکتے ہیں۔

ہوٹل کے برآمدے میں ایک لمبی میز تھی۔ اس پر ایک ستھرا میزپوش بچھا تھا اور میز کے چوگرد تین کی کرسیاں تھیں، اس لئے یہ ممکن تھا کہ تم وہاں کھانا بھی کھاتے جاؤ اور بازار کے منظر کی سیر بھی کرتے رہو۔ اس لحاظ سے یہ ہوٹل کسی قدر پیرسی وضع کا تھا

ہوٹل کے ملازموں نے ہمارا خیر مقدم خوش اخلاق میزبانوں کی مانند کیا۔ یہ وہ چیز ہے جسے تم پنجاب کے ہوٹلوں میں بیکار ڈھونڈو گے۔ ہم پنجابی ایسا معلوم ہوتا ہے کبھی مسافر نوازی کی روایات سے بیگانہ رہیں۔ ہمارے ہوٹلوں میں ایک غیر شخصی سی، معاندانہ سی فضا ہوتی ہے، سرحد میں ایسا نہیں۔ یہاں کے ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے تم ایسا محسوس کرتے ہو جیسے تم اپنے گھر میں اپنے کنبے کے افراد اور احباب کے ساتھ کھا رہے ہو اور تمہارے اپنے گھر کے ملازم تمہاری ضروریات پوری کر رہے ہوں۔ بلاشبہ تمہیں اپنے کھانے کے دام ادا کرنا پڑتے ہیں لیکن یہ ایک محض رسمی تکلف ہے اور اتنی ستھری اور صحت بخش خوراک اور خوش اخلاقی کے صلے میں کچھ بھی نہیں۔

ان اچھے لوگوں نے ہمیں یہ محسوس کرایا جیسے ہم کوئی شہزادے ہوں اور ہماری آمد اس ہوٹل کے ہر فرد کے لئے ایک بڑی اور طرفہ عزت افزائی کی موجب ہو۔ انھوں نے ہمیں بٹھا کر آفتابے اور چلمچی سے ہمارے ہاتھ دھلائے (یہ چیز کو پنجاب میں قطعاً ناممکن ہوگی)، ایک بوڑھا کھلے چہرہ والا شخص —— وہ شاید صاحب خانہ تھا —— خود ہی ہمیں ان چیزوں کی تفصیل بتانے آیا جو اس وقت تیار تھیں۔ کھانا جس وقت آیا سادہ اور گھر کا سا تھا، بڑے خمیری نان اور آلو گوشت —— یہ صحت بخش تھا اور تمہارے پنجاب کے ہوٹلوں کے کھانے کی طرح مصالحے اور بناسپتی کی خوفناک لیپ نہیں تھا۔ خمیری نان سے زیادہ اچھی، زیادہ ایماندار روٹی دنیا بھر میں نہیں ہے۔

اور ان کا یہ سلوک صرف ہمیں سے نہیں تھا، بلکہ ہر غریب سے غریب مسافر جو اس دسترخوان پر بیٹھا تھا، ان کے لئے ایک ممتاز اور قابل قدر مہمان تھا۔ ایک مسافر کو میں نے دیکھا —— اٹھارہ سالہ بدحال جوان —— وہ بڑا ہی غریب ہوگا کیونکہ وہ ایک روٹی کو کاغذ میں لپیٹ کر اپنے کوٹ کی جیب میں ڈالے ہوئے تھا۔ اس نے بیٹھ کر اپنی روٹی کو کھولا اور سالن کی بجائے ملازم کو چائے کی صرف ایک پیالی لانے کے لئے کہا۔ کسی کو اس پر تعجب نہ ہوا کیونکہ ان لوگوں میں افلاس عام ہے۔ اس جوان سے اس کی تنگدستی کی وجہ سے کسی نے تحقیر کا سلوک نہ کیا۔

اگر کسی کے ساتھ دوسرے مسافروں سے زیادہ لحاظ اور خاطر برتی گئی تو وہ لاری کا ڈرائیور تھا۔ یہ شخص بلاشبہ ہم سب عام مسافروں سے کہیں زیادہ معزز اور باوقار تھا اور ان عنایات اور مراعات کا ہر طرح مستحق جو ہوٹل والے اس پر نچھاور کر رہے تھے۔ اپنی بڑی بھوری مونچھوں اور تیکھے سرخ چہرے کے ساتھ وہ ایک شاندار مرد تھا — اپنے جوتوں سمیت کوئی چھ فیٹ کا، تیر سا سیدھا، چوڑے مضبوط کندھوں کے ساتھ! البتہ اس قدرے بہتر سلوک کی اصل وجہ اس کی یہ مرعوب کن شخصیت نہ تھی۔ اس سے ایک خاص مہمان کا سا سلوک اس لئے کیا گیا کہ وہ اس ہوٹل کے لئے گاہک لاتا تھا اس کی خوشامد اور رضا جوئی ان لوگوں کے لئے ضروری تھی، کیونکہ لاری کا ناخدا ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی لاری کو کچھ آگے اگلے ہوٹل کے سامنے بھی تو ٹھیرا سکتا تھا پھر سب مسافر اس ہوٹل میں جاتے اور ان لوگوں کا بزنس بالکل سونا ہو جاتا — اس ڈرائیور کو ہوٹل کے کمرے میں ایک الگ میز پر کھانا کھلایا گیا۔ کونسے خاص کھانے اس کے سامنے چنے گئے — میں نہیں بتا سکتا۔ ہاں میں نے ایک تازہ چاندی کے نیچے کا حقہ (شاید صاحب خانہ کا اپنا!) اس بڑے آدمی کے لئے اندر جاتا دیکھا۔

کھانے کے بعد دو آدمیوں نے ہم سب کے ہاتھ چلمچی میں دھلائے۔ بڑی میٹھی چائے کے پیالے سرو کئے گئے۔ اور ہم ایک لذیذ کاہلی کے احساس سے سگرٹ پینے لگے — اب ہوٹل کا گراموفون مہمانوں کی تفریح اور دل جوئی کے لئے بجنے لگا۔ یہ تو ایک مانی ہوئی بات ہے کہ موسیقی ہاضمے میں مددگار ہوتی ہے۔ مگر یہ موسیقی سے زیادہ جھنجھناتا ہوا خوش آیند شور تھا۔ ایک ریکارڈ کا گانا مجھے یاد ہے — اس کی نے عرصے سے میری چہیتی ہے — "ایلو۔ میں ہاری بالم اے — اس جانی پہچانی پیاری لے کو، اتنی دور، پاڑا خیل میں سننا ایک نادر مسرت تھی۔

ہمارے ساتھ ایک کھچڑی لمبی داڑھی اور کھانڈے کے سے تیز چہرے والا آدمی بیٹھا تھا۔ اس کی ٹمٹماتی آنکھوں میں عمر کی شفقت اور خوش طبعی آ گئی تھی (جوانی میں وہ مختلف ہوگا)، وہ ایک شگفتہ مزاج اور خوش صحبت بوڑھا آدمی تھا۔ ہم جلد ہی گفتگو میں مشغول ہو گئے۔ وہ چٹکلوں کی پوٹ تھا اور سوات کے متعلق ہر قسم کی دلچسپ اور عجیب معلومات کا خوبینہ۔ بلاشبہ اسے ان لوگوں میں ایک دینی عالم ہونے کی سند حاصل تھی (یہ ہمیں بعد میں پتہ چلا) مگر اس کے شاداں قہقہے اور اس کے کسی قدر پھکڑ مزاج کی حس ثابت کرتے تھے کہ وہ نرا زاہد خشک نہیں تھا — اپنے زمانے میں بوڑھے آدمی نے زندگی کے سب ذائقے چکھے تھے۔

اس نے ہم سے پوچھا کہ آیا ہم اس ملک میں بیوپار کے لئے جا رہے تھے اور آیا یہاں ہماری یہ پہلی آمد تھی۔ ہم نے اسے بتایا کہ ہم بیوپاری نہ تھے اور صرف سوات دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ اس پر وہ کچھ حیران معلوم ہونے لگا اور پھر اس نے ہمیں ایسی مشفقانہ شرارت آمیز نظروں سے دیکھا کہ ہم دوست بن گئے۔

سوات بڑا اچھا ملک ہے" بوڑھے آدمی نے کہا" اس کی وادی بڑی زرخیز ہے اور لوگ خوشحال اور پرامن اور شگفتہ ہیں۔ اب ہر گاؤں میں ایک مڈل سکول ہے۔ چوری اور قتل کا نام نہیں۔ بادشاہ صاحب کا زمانہ نہ ہوتا تو تم اس طرح ادھر نہ آ سکتے، راستہ میں تم قتل ہو جاتا۔ بادشاہ صاحب سے کے زمانے سے پہلے لوگ بڑے خراب تھے۔ قتل ایک کھیل تھا۔ کسی کا جان، مال یا عزت محفوظ نہ تھے۔ بادشاہ صاحب نے آ کر یہاں انصاف اور قانون بحال کیا۔"

"بادشاہ صاحب اب بہت بوڑھا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"بوڑھا آدمی کڑکڑاتا ہوا ہنسا" بادشاہ صاحب اب پچاسی برس کا ہے مگر بوڑھا؟ وہ تو کئی جوانوں سے اب بھی اچھا ہے۔ اس کی صحت رشک کے قابل ہے۔ اس عمر میں وہ ہر صبح روزانہ پانچ میل پہاڑ پر چڑھتا ہے۔ بعض وقت وہ اپنے افسروں کو اپنے ساتھ ان سیروں پر لے جاتا ہے۔ جس افسر کا چڑھتے ہوئے دم پھول جائے یا جو تھک جائے اس کی شامت آ جاتی ہے۔ کبھی کبھی وہ اس کو نوکری سے بھی برطرف کر دیتا ہے۔"

"کیا یہ بے جا سختی نہیں ہے؟"

"نہیں۔ بادشاہ صاحب کہتا ہے کہ آرام طلب اور موٹا آدمی ماسوا اپنے دسترخوان کے بیکار ہوتا ہے۔ وہ عام لوگوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔ ہی

دوسروں کے لئے مصیبت برداشت کرسکتا ہے۔ بادشاہ صاحب ایسے افسروں سے نفرت کرتا ہے۔"

ہمیں بادشاہ صاحب کی زیرکی اور اچھی سمجھ کی داد دینا پڑی۔ ایک آدمی جو اونچے پہاڑ پر چڑھنے کا دم رکھتا ہے یقیناً ایک صالح اور تندرست جسم کا مالک ہوگا۔ صالح جسم کا مطلب ہے صالح دماغ اور مطمئن ضمیر۔ پہاڑوں سے محبت کرنے والا شخص طامع اور غاصب نہیں ہوسکتا اور بڑھے والی کا یہ اپنے افسروں کی اہلیت یا نااہلی کے امتحان کا طریقہ بڑی عمدگی سے سارے ملک میں رائج کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے مدبروں اور ریاست دانوں اور بڑے عہدیداروں میں سے کتنے ہیں جنہیں پہاڑوں سے محبت ہے۔ ان میں سے کتنے ہیں جو کبھی کسی پہاڑ پر چڑھے ہیں؟ پھر کوئی تعجب کہ ان کے جسم اور دماغ اس درجہ بیمار ہیں۔

باثا خیل کی اس مہمان سرائے میں (ہوٹل کا نام ایسی صحت بخش جگہ کے لئے نہیں جچتا) ہم ایک گھنٹے تک سستاتے رہے — زندہ دل بوڑھے سے خوشگوار باتیں کرتے ہوئے اور ریڈیو میں ہادی بام کو بار بار سنتے ہوئے۔ سرائے میں لے دے کے چار پانچ ریکارڈ تھے۔ وہاں ہم نے کچھ عرصے کے سچی طمانیت محسوس کی۔ اس نعمت کو ڈھونڈ لینا اتنا مشکل نہیں جتنا ہر کوئی سمجھتا ہے مصیبت یہ ہے کہ ہم اسے غلط جگہوں میں تلاش کرتے ہیں — بڑے اچھے سجے ہوئے مکانوں میں یا کسی بڑے ہوٹل کے لاؤنج میں — سچی طمانیت مل سکتی تو ایسی سراؤں میں جیسی یہ باثا خیل کی سرائے تھی۔ یا پھر ایک خانہ بدوش کے کلبے میں۔

اس اچھی سرائے سے جاتے ہوئے ہم نے وہاں کے لڑکوں اور خدمتگاروں میں چاندی کے سکے تقسیم کئے — شکرانے کے طور پر۔

قلعوں کی سرزمین

باثا خیل سے چند میل آگے تک میٹلڈ روڈ اوپر چڑھتی ہے اور پھر ایک اور وادی میں اترتی ہے جسے "ارمغانِ سوات" کا قابلِ قدر مصنف اپر سوات کی وادی کا نام دیتا ہے۔ اس ہستی اور اس کی کتاب کے بارے میں آگے اپنی مناسب جگہ پر کچھ کہنے کی کوشش کروں گا۔ یہاں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اس نے اپنی کتاب میں وادیاں کے ضمن میں یہ درج کیا ہے: ریاست سوات میں دو وادیاں ہیں (۱) اپر سوات کی وادی (۲) لوئر سوات کی وادی۔ (ممکن ہے یہ نئی وادی اپر سوات کی وادی ہی ہو)

اس وادی میں اترتے ہوئے میٹلڈ سڑک یکلخت ختم ہو جاتی ہے اور ایک عام روڑی کوٹی ہوئی پختہ سڑک میٹلڈ روڈ سے قدرے تنگ مگر اچھی حالت میں) اس کی جگہ لے لیتی ہے — ایک میدان جو تقریباً ہموار تھا اور جس کے حاشیوں پر سفید مجنوں کے درخت تھے۔ ہمارے بائیں کو وادی ایک فراخ گاڑھا سبز بھشت تھی اور درختاں دھند پرے پہاڑوں کے فاصلے کو طویل کرتی تھی۔ صنوبر، دیودار اور چنار کا دکا یا ننھے چینوں میں بہار کے اُجلے اُجلے پیراہن اوڑھے وادی میں اور پہاڑ کی ڈھلانوں پر نمودار ہونے لگے تھے اور بے مثال بکائن کے اودے پھول آنکھوں کے لئے ایک نادر مسرت تھے۔ ایچی کیمورس جھیل دیکھنے کا بیحد مشتاق تھا اور بڑی مدت تک ہم نے جھیل نہ دیکھی کیونکہ جھیل پانچ ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر اگتا ہے — پھر ایچی کیمورس نے اپنا جھیل دیکھ لیا۔ اکیلے تحل میں یہ ایک اونچی پہاڑی کی چوٹی پر کھڑا تھا۔ ایچی کیمورس نے بڑی خوشی اور فخر سے اس کی طرف اشارہ کیا — دریائے سوات اپنے جنگلی پھولوں اور زمردیں دوب کے بستر میں ایک بلوریں فیتہ تھا۔

تقریباً یہیں ہم نے دور شمال کے پہاڑوں پر برف چمکتی دیکھی۔ بوڑھے سرفراز گل نے ہمیں بتایا کہ یہ پہاڑ ننگا ہگار کہلاتا ہے — بے شک ایک پہاڑ کے لئے یہ ایک عجیب نام ہے مگر اس کے پیچھے ایک روایت ضرور ہوگی۔ اس انکشاف نے ایچی کیمورس کو قدرے مایوس کر دیا۔ اس نے ایک بے لگام رومانی تخیل سے کام لے کر امید ظاہر کی تھی کہ یہ نانگا پربت کی برفیں ہیں — وہ قاتل پہاڑ جس پر جرمن بوہل چڑھا تھا اور جہاں عجیب عجیب آوازوں نے اسے اندھیرے میں پکارا تھا اور جس پر سے وہ گرتا پڑتا اور نیم پاگل اپنے دوستوں کے پاس لوٹا تھا — بعض لوگوں پر چاند کا سایہ پڑ جاتا ہے۔ ایچی کیمورس کے لئے

برف بھی کچھ اسی قسم کا اثر کرتی ہے۔ وہ اتنا مضطرب تھا اور اتنی دفعہ برف پوش پہاڑیوں کی طرف وجد کی حالت میں اشارے کرتا تھا کہ بوڑھے آدمی نے سچ مچ اسے اس طرح دیکھا جیسے وہ باؤلا ہو۔

بوڑھا سرفراز گل ہم سے پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا چٹکلے بیان کرتا تھا اور مذاق کرتا تھا۔ اس کی زبان بھی نہیں رکتی تھی۔ کوئی انوکھی اور نئی چیز آتی تھی۔ تو وہ ہمیں اس کے متعلق بتاتا۔ وادی کا آدمی ہونے کی وجہ سے وہ اس کے چپے چپے کو جانتا تھا اور چونکہ وہ ایک دنیا دار عالم بھی تھا اس لئے ٹوٹی پھوٹی اردو میں وہ احساسات دوسروں تک منتقل کر سکتا تھا۔

بعض وقت دریا پلٹتا اور دوڑتا سڑک کی بغل میں آجاتا۔ کیسا عجیب دریا، بلور بھی اس سے زیادہ صاف اور شفاف نہ تھا۔ ایک ایسی جگہ میں نے ایک خوبصورت پہاڑی عورت کو مشکیزوں کی بنی ہوئی ڈونگی میں کھڑے دیکھا۔ سورج کا سونا اس کے بالوں اور آنکھوں میں تھا اور وہ ایک لمبے بانس سے ڈونگی کو پیر کر دریا کے دوسرے کنارے پر جا رہی تھی۔ یہ تصویر میرے ذہن میں محفوظ ہے اور لاتعداد دوسری تصویریں —— خانہ بدوشوں کے قافلے اپنے گدھوں اور خچروں پر گذرتے ہوئے —— ایک گاؤں میں چند بچے ایک آڑے تختے کے سروں پر بیٹھ کر جھولتے ہوئے —— وہ دنیا کی ہر جگہ کے بچوں کی طرح تھے۔ غور کرنے والے دماغ کے لئے ایک ملک کے انسانوں اور دوسرے ملک کے انسانوں کی بنیادی خواہشات اور امنگوں میں چنداں فرق نہیں۔ تبت کے ایک بچے کو مغرب کے مہذب ترین ملک میں لے جاؤ تو وہ مشکل ہی سے وہاں اجنبیت محسوس کرے گا۔ وہ وہاں کے بچوں سے اس طرح گھل مل جائے گا جیسے وہ اس کے اپنے گاؤں کے دوست ہوں۔ انسان جب بڑے ہو جاتے ہیں تو پھر نہ جانے انھیں کیا ہو جاتا ہے؟

ہم ایک چٹان پر تختوں میں بنے ہوئے پتھریلے قصبے کے بیچوں بیچ گذرے۔ حاجی سرفراز گل نے سوٹ اور سواتی ٹوپی میں ایک لمبے گٹھے جسم کے شخص کی طرف ہمیں متوجہ کیا۔ وہ اپنے معمولی مکان کے چھوٹے پھاٹک کے باہر گلی میں کھڑا تھا۔ "یہ" اس نے بتایا "والی کے ضلع کے حاکموں میں سے ہے —— ایک عہدیدار جو ہمارے ہاں کے ڈپٹی کمشنر کے برابر تھا۔ سرفراز گل کو یا تو پتہ نہ تھا یا حب الوطنی کی وجہ سے وہ بتانا نہ چاہتا تھا مگر جب ہم نے اس سے ڈپٹی کمشنر کی تنخواہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے اپنے چوڑے کندھے ہلا دیئے۔

اس سارے عرصے میں ہم شمالی یا شمال مشرقی سمت میں سفر کرتے رہے۔ اب ہم نے ایک چکر کاٹا اور ایک اور وادی میں داخل ہوئے چٹان اب ہمارے بائیں کو تھی۔ وادی دائیں کو اور ہم جانے بغیر ۱۸۰ درجے کے زاویے میں سے گھوم گئے تھے (ایک تجربہ جو پہاڑی سفر میں کافی عام ہے) اور سیدھے جنوب کو جا رہے تھے —— دریا اب ایک بل کھاتے ہوئے سیمیں اژدہے کی طرح ہمارے ساتھ ساتھ لہراتا جاتا تھا —— کبھی پلٹ کر آتا ہوا کبھی ہٹ کر بہتا ہوا اور کبھی مست خرام اور کبھی اس کے ایک بازو کا پانی دوسرے میں دھارے سے بہتا ہوا۔ یہ ایک شاداب وادی میں شاداں دریا تھا

پھر ہم رک گئے۔ سامنے ایک پھاٹک تھا۔ ہم سواتی معمول کی چوکی پر تھے۔ ہم نے اتر کر ایک چھوٹی چائے کی دوکان میں چائے پی۔ سہ پہر میں وادی کے جادو کا نظارہ کیا۔ ہم تعجب کرتے رہے کہ کوئی دوسری جگہ بھی اتنی خوبصورت ہو سکتی ہے۔ چوکی کے محصولئے ہماری لاری کی چھت پر چڑھ کر اسباب کی جانچ پڑتال کرنے لگے۔ بیشتر مسافروں کو اپنے ٹرنک یا بستر کھول کر معائنہ کرانا پڑا مگر انھوں نے ہم سے کچھ پوچھ گچھ نہ کی۔ سامنے پھاٹک کے پاس تین سائن بورڈ تھے —— سیدو کے ہوٹلوں کے اشتہار —— ایک بس سیدو کی سمت سے آئی اور پھاٹک کی پرلی طرف رک گئی۔ اس کے مسافر باہر نکلے۔ ان میں ایک اٹھارہ سالہ امریکن لڑکا تھا —— چلتے خاکی میں ایک قدرے پلپلا پھولا ہوا لڑکا —— تیز بین شیشوں کی عینک لگائے اور کندھوں سے ایک کیمرہ لٹکائے —— اس کے ساتھ اس کا ایک پاکستانی ہم عمر دوست تھا اپنے انداز میں کسی قدر تحریلا اور رفاپی۔ وہ چائے کی دوکان پر آئے۔ امریکن لڑکا پاس پڑی کھاٹ پر لیٹ گیا۔ اس کا دوست کہیں سے بوڑھے سرفراز گل کو پکڑ کر

سے آیا۔ بوڑھا لڑکے کے ساتھ کھاٹ پر بیٹھ گیا اور وہ آپس میں فارسی میں باتیں کرنے لگے۔

بعد میں جب ہم اپنی لاری میں سوار ہوئے تو سرفراز گل نے ہمیں بتایا کہ لڑکا امریکی تھا اور اکیلا بخارا سے آ رہا تھا۔ وہ فارسی اپنی مادری زبان کی طرح بولتا تھا۔

یہ امریکی لڑکا کون تھا؟ ہم نے تعجب کیا! وہ بخارا سے کیوں آ رہا تھا؛ وہ بخارا کیوں گیا تھا؟ کیا وہ امریکی جاسوس تھا؟ یا کیا وہ مانس اور سفر کی تلاش میں ہم سا آوارہ گرد؟ جو کوئی بھی ہو وہ تھا بہرحال ایک لڑکا جو بخارا سے آ رہا ہو۔ اس سے زیادہ قابل رشک اور کون ہو سکتا ہے؟ وہ اپنے کئی ہم عمروں سے کتنا خوش قسمت تھا جو کلاس روموں میں خشک لیکچر سن رہے ہوں گے یا کسی فیکٹری میں کوئی پرزہ ڈھالنے میں لگے ہوں گے۔

چونگی سے گذر کر سڑک پر وادی کے گرد وسیع دو میل کے سے نیم دائرے میں گھومی اور جب ہم نیم دائرے کے دوسرے سرے پر پہنچے تو وادی ہمارے بائیں کو تھی اور ہم شمالی سمت کو جا رہے تھے۔ سب مسافروں کے لئے شمالی سمت اصل سمت ہے۔ دوسری سمتیں مسافروں کے لئے نہیں بلکہ دکیلوں، بیوپاریوں اور کارخانوں کے مالکوں کے لئے ہیں (میں جانتا ہوں یہ محض بکواس ہے۔ تاہم اس میں کافی صداقت کی رمق ہے)

ہم ایک گاؤں کے پاس سے گذرے۔ یہاں ایک سبزہ زار میں ایک چھوٹا سا قلعہ ایستادہ تھا۔ یہ ایک دوستانہ چھوٹا قلعہ تھا —— شکل میں ایک مکعب —— اس کی دندانے دار فصیل کے چاروں کونوں پر برج تھے۔ برج شطرنج کے رخ تھے۔ پتھریلی دیواروں کی چنائی تھموں میں ہوئی تھی۔ لکڑی کی کھپچیاں تھموں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں اور یہ سب کچھ سنہری بید کاری کا تاثر دیتا تھا —— سرفراز گل نے بتایا کہ یہ تھانہ ہے۔ اب ایک تھانے سے اس کا مطلب پولیس اسٹیشن سے تھا یا فوجی چوکی سے یا محض غلہ جمع کرنے کی جگہ سے —— ہمیں معلوم نہ ہو سکا —— ہر نفصے گاؤں میں یہ برج نما قلعہ موجود تھا۔ یہ ہمیں پتہ لگا، ایک طرح سے سوات کا قومی نشان ہے جس طرح شیر ببر اہل انگلستان کا اور جھپٹتا ہوا عقاب المانیہ کا۔

سڑک کے ساتھ ساتھ صنوبروں اور لمبے سروں کی چار دیواری میں محفوظ لوکاٹ اور اخروٹ اور سیب کے باغات تھے —— اور دور دور تک پوست کے خرم سپید پھول ہوا میں ناچتے تھے۔ میں نے سرفراز گل سے پوچھا: "تمہارے ملک میں لوگ پوست تو بہت پیتے ہوں گے؟"

اس کی آنکھیں تمتا اٹھیں "یہ خدا کا تحفہ ہے۔ لوگ پیتے نہیں۔ بس کاشت کرتے ہیں!"

یہ کیسے ہو سکتا ہے، میں نے سوچا، پوست کے ملک کے لوگ پوست کے ذائقے اور نشے سے محروم رہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے انگوروں کے ملک میں لوگ انگوروں کی شراب کشید نہ کریں۔ آدمی کی زندگی میں ایسی منزلیں آتی ہیں جب نشیلی چیزیں ضروری ہوتی ہیں۔ اس کے پاس زندگی کی تلخی کے مداوے کے لئے کچھ تو ہونا چاہیے۔ وہ لوگ جو نفع نقصان کی دنیا میں رہتے ہیں نشیلی چیزوں کو مطعون کرتے ہیں کہ یہ صحت اور روپے کو برباد کرتی ہیں اور مذہب اور اخلاق کے خلاف ہیں —— درست —— مگر یہ آدمی کو وقتی طور پر دیوتاؤں کے ساتھ اولمپیا پر بھی بٹھا دیتی ہیں —— اسے لافانی خواب دیکھنے کی قوت عطا کرتی ہیں اور خدائی کا ایک لمحہ پچھتر سال کی باعزت بے حصول خود غرضانہ زندگی سے کہیں زیادہ بیش قیمت ہے —— اور کہیں زیادہ طویل۔

حاجی سرفراز گل سیدو سے ایک دو میل ادھر ایک مسافر خانے کے سامنے اترا۔ "میں یہاں اتر جاؤں گا۔" اس نے کہا "میرا دل تو چاہتا تھا کہ تمہارے ساتھ چل کر تمہیں سیدو کی سیر کراتا لیکن میرا کام ضروری ہے۔"

ہمیں اس کے جانے کا افسوس ہوا۔ وہ ایک بے مثال بوڑھا آدمی تھا —— ان خوش باش بوڑھوں میں سے ایک جو زندگی کی شام میں ڈھلان سے نیچے اترتے ہوئے اپنے دل کی استقامت نہیں کھوتے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے۔ وہ زیادہ رسیلے اور روادار ہو جاتے ہیں۔

شہرِ طلسمات

نیلی آنکھوں والے ایک خوش شکل، خوش اعضا نوجوان نے جس کے سرخ تیکھے چہرے میں دن کی تاب اور پہاڑوں کی شادمانی تھی، میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ایسا نوجوان تم میدانوں میں بھی نہیں دیکھ سکتے۔

"یہ" اس نے کہا "سیدو شریف ہے — والی صاحب اِدھر رہتا ہے" اور اس نے بائیں طرف پہاڑی پر بنے ہوئے ایک شہر کی طرف اشارہ کیا۔ ڈھلتی ہوئی سہ پہر میں سیدو واقعی فنتاسک لگتا تھا — اور جدید — ایک کوہستانی قصبہ نہیں، جیسا کہ ہم امید کر رہے تھے۔ رنگین روشنی میں بنگلے اور حویلیاں ایک اونچی پہاڑی کے گرد اکٹھی ہو رہی تھیں۔ ایک نیلی دھند سی شہر کے اوپر معلق تھی اور سیدو کہانیوں کی کتاب کا شہر لگتا تھا۔

یکلخت سڑک میٹلڈ ہو گئی اور چوڑی بھی۔ بجلی کے پول سڑک پر نمودار ہونے لگے۔ ہم ایک چوڑے گلابی پینٹ کی دوکان کے بازار میں سے گذر رہے تھے۔ چوک پر طیفیا میں ایک پولیس مین بجلی کے پول کے اوپر تنی ہوئی چھتری کے نیچے کھڑا تھا۔ ستعدی سے اس نے ہمیں ہاتھ دیا۔ ہم آگے گذر گئے اور لاری کے اڈے پر جا رکے۔

خوش شکل پٹھان نے کہا "یہ منگورا ہے۔ نہیں بس سیدو نہیں جاتی۔ تم سیدو سیر کے لئے جا سکتا ہے، وہاں ٹانگہ جاتا ہے۔ تم ٹھہرے گا منگورا ہی میں سیدو میں ہوٹل نہیں ہے"۔

ہمارے اترتے ہی گویا منگورا کے سارے نقیر چھوکروں نے ہم اور ہمارے سامان پر ہلہ بول دیا۔ یہ وہی جوہرآباد کا قصہ پھر دہرایا گیا۔ اور اس سے پیشتر کہ ہم جانتے کہ ہم کہاں تھے، ایچی کیوریس اور میں کوئی بیس مزدور لونڈوں کی ہمراہی میں سڑک کے پیچھے مارچ کر رہے تھے ——— اور سارے بازار کے لئے ہنسی کا نشانہ — میں نے ایچی کیوریس کو اتنے مزدوروں کو اجرت دینے کی حقیقت سے بیکار آگاہ کیا۔ میں نے اس ان لونڈوں پر نگاہ رکھنے کے لئے بیکار بار بار کہا۔ وہ ہمارے سامان کے ساتھ غائب ہونے کے اہل تھے۔ ایچی کیوریس محض مسکرایا۔ وہ نقیر چھوکروں سے محبت کرنے کے موڈ میں تھا۔

ان بچوں کا سرغنہ ایک چالاک چھٹا ہوا لڑکا تھا۔ وہ ہمیں گلی کے آخر میں ایک محراب دار پھاٹک کے ہوٹل میں لے گیا۔ یہ جگہ ہوٹل سے زیادہ ایک بھٹیار خانہ تھی مگر چالاک لڑکے نے مجھے یقین دلایا کہ اس سے بہتر رہائش اور کہاں ہمیں منگورا میں اور کہیں نہیں ملے گا۔ ایچی کیوریس سامنے کے ہوٹل کو دیکھنے چلا گیا تھا جو دو منزلہ تھا اور ایک چھوٹی سڑک کے اوپر دیکھنے والی بالکنی رکھتا تھا۔ موٹے چالاک لڑکے نے میرے احتجاجوں کے باوجود ہمارا سامان اس بھٹیار خانے کے ایک کمرے میں اتروا دیا۔ یہ کمرہ بڑا اور نہایت غلیظ تھا۔

"ہم یہاں نہیں ٹھہریں گے" میں نے مزدور لڑکوں کو حکم دیا کہ سامان اٹھا کر سامنے کے ہوٹل میں لے جائیں۔ سامنے کے ہوٹل کا نام نشاط ہوٹل تھا۔

چالاک لڑکے نے شور مچانا شروع کر دیا "وہ نشاط ہوٹل والا چور ہے۔ اُدھر پانچ روپیہ روز کرایہ لیتا ہے۔ اِدھر کل ڈیڑھ روپیہ۔ دیکھو اچھا کمرہ ہے"۔

"ہم یہاں نہیں ٹھہریں گے" میں نے غصے میں کہا اور سامان اٹھوا کر باہر سڑک پر نکل آیا۔ ایچی کیوریس نشاط ہوٹل کی بالکنی میں ایک شریر مطمئن گورِ یلے کی طرح کھڑا مجھے اوپر بلا رہا تھا۔ مایوس اور گستاخ لڑکا اپنے ہوٹل کے باہر آ کر چلا رہا تھا "بابو! وہ ہوٹل گندہ ہے۔ وہ چور ہے"۔

میں ہوٹل میں داخل ہوا۔ ڈائننگ روم صاف ستھرا اور خوبصورت تھا۔ اس میں پتھر کی میزیں تھیں۔ کاؤنٹر پر ایک چھوٹا سا شخص کھڑا تھا ——— اتنا معصوم کہ وہ مجھے ایک نورانی فرشتہ معلوم ہوا۔ اس نے دلآویز مسکراہٹ سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کورنش میں میری خیریت پوچھی اور مجھے سیڑھیوں کی راہ دکھائی۔

بالکنی کے کمرے میں سامان رکھوانے کے بعد میں بالکنی میں آیا تو وہی موٹا چھوکرا چلانے لگا: "اُدھر ابو دال بھات ملے گا۔ اِدھر بھنا ہوا گوشت ہے۔" میں نے چاہا کہ نیچے جا کر اس کی ٹھکائی کروں۔ مگر میں بزدل آدمی ہوں۔ آخر اپی کیورس اور میں نے کمرے کا دروازہ ہی بند کر دیا۔

مجھ میں (اس کا اقرار کرنے کی غالباً ضرورت نہیں) ذرہ برابر بھی خود داعی کا مادہ نہیں۔ اپی کیورس میں خوش قسمتی سے یہ شے بدرجہ اتم موجود ہے۔ ہمارے ورود نے نشاط ہوٹل کے عملے کو (وہ دو چینی ناکوں والے مسٹنڈے لڑکے تھے پیٹر گل اور گل نواز نامی) بھگا ناد وڑانا شروع کر دیا۔ ایسے معزز اور اہم مہمانوں نے، ایسا لگتا تھا، نشاط ہوٹل کو کبھی پہلے عزت نہ بخشی تھی۔ انھوں نے بلاشبہ ہوٹل کا سب سے اچھا کمرہ ہمیں دیا تھا۔ صرف اسی کمرے کے آگے بالکنی تھی) ہم نے بستر کھولے، سامان ٹھیک ٹھاک کیا۔ نہا دھو کر تازہ دم ہوئے۔ ہم نے اجلے کپڑے پہنے اور نئے آدمیوں کی طرح محسوس کیا۔ چائے پینے کے بعد جب ہم سید کا چکر لگانے کے لئے نیچے آئے تو گہری نیلی شام پڑ چکی تھی اور بجلی کے لیمپ روشن تھے۔ ہم سید و شریف جانے والی سڑک پر چلنے لگے۔ یہ کسی بڑے جدید شہر کی سڑک سے کسی طرح کم نہ تھی ——— بڑی چوڑی اور پوری طرح میل کی ہوئی اس کے دورویہ بید مجنوں اور صنوبر لہلہا رہے تھے اور جنگلی پھولوں کی خوشبو ہوا میں رچی ہوئی تھی۔ آسمان تاریک مخمل تھا اور نکھرے ہوئے چمکدار تارے جھرمٹوں میں اوپر سید و پر گر رہے تھے ——— سید و کی سب پبلک اور سٹیٹ عمارتیں اسی سڑک پر تھیں۔ شہد کی مکھیوں کا ایک فارم تھا۔ اس سے آگے بائیں کو اسٹیٹ کالج کی عمارت تھی ——— حرف ب کی شکل کی جس کے سامنے کے کونوں پر سانپ کی چھتری کے پودے کی شکل کے دو برج تھے۔ وہ اس جھٹپٹے میں ایک عجیب پر اسرار تاثر دیتے تھے۔ سڑک آگے بتدریج بڑھتی گئی۔ سٹیٹ ہسپتال اور سوات ہوٹل کی عمارتیں آئیں۔ اندھیرے میں ہم عمارتوں کو اچھی طرح اُبھار نہ پاتے اور کھڑے ہو کر ان کے نام کے بورڈوں کو پڑھنے کی کوشش کرتے۔ ہم اسی طرح چلتے چلتے ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں سے سڑک دو شاخوں میں بٹ جاتی تھی۔ بجلی کے پول کے نیچے اس نقطے پر ایک راہ نما تختہ تھا ——— زاویہ قائمہ بناتے ہوئے دو بازوؤں کے ساتھ ایک بازو پر لکھا تھا "ولیعہد صاحب"۔ دوسرے پر "والی صاحب"۔ اس سے ہم خوب محظوظ ہوئے۔ جگہوں اور سڑکوں کے نام دینے کی بجائے فنگر پوسٹ پر ان ہستیوں کے نام دینا جو غالباً ان سمتوں میں رہتی تھیں، ایک عجیب اور غیر معمولی اختراع تھی ——— والی صاحب اور ولیعہد صاحب دونوں معزز ہستیاں شہر کے دو متقابل سروں پر فروکش تھیں۔

"اب فیصلہ کرو۔" میں نے اپی کیورس سے پوچھا "ولیعہد صاحب یا والی صاحب"

"ولیعہد صاحب" اپی کیورس نے جھٹ جواب دیا۔ جیسا کہ اس کے بارے میں کوئی شک نہ ہو سکتا تھا۔

اور ہم ولیعہد صاحب کی سڑک پر ہو لئے۔ مگر (اندھیرے میں یہ جادو کی سڑک تھی اور یہ کسی طرح) ہمیں سید و شریف کی خوش کن پیچدار گلیوں میں لے گئی۔ شہر الجیرز کے "قصبہ" کی طرح گلیوں اور کوچوں کا جنتر منتر ہے ——— گلیاں جو نیچے اترتی ہوئی سیڑھیاں ہیں اور زمین کی انتڑیوں میں جاتی معلوم ہوتی ہیں۔ اور پھر اچانک پر اسرار نالاوں کے پاس آ نکلتی ہیں ——— سید و شریف کا مزار ہر جگہ چھایا ہوا ہے۔ سب کوچے آخر کار یہیں مزار پر پہنچتے ہیں۔ تم کوئی بھی گلی پکڑو، ہر پھر کر تم مزار پر پہنچو گے۔ یہ ایک بڑی عمارت ہے اور دیکھنے کے قابل۔ اس کا ایک عیب یہ ہے کہ یہ نقیر چھوکروں سے پٹی ہوئی ہے ——— اپی کیورس اور میں، جوتیاں ہاتھ میں پکڑے اس کے ٹھنڈے صحنوں میں گھومتے رہے۔ نقیر بچوں کی فوج ہمارے جلو میں تھی۔ ہم ایک حجرے کے دار اونچے ایوان میں گئے۔ جہاں مزار ایک قیمتی غلاف میں منڈھا ہوا تھا۔ ایک سیاہ بھورے داڑھی والا آدمی دو زانو بیٹھا گڑگڑاتے لہجے میں پیر سے کوئی منت مانگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عیاری تھی کسی قدر روحانی جھلک اور اس کا چہرہ ایک ایماندار چہرہ نہ تھا ——— تم ان لوگوں کو جانتے ہوگے جن کے دل مذہب کی سچی روح سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ جو اپنے ہمسائے کی کھال اُدھیڑنے سے نہیں چوکیں گے۔ اگر اس سے ان کا کچھ فائدہ ہوتا ہو۔ ایسے لوگ اکثر پیروں سے فیض حاصل کرنے میں سرگرداں رہتے ہیں۔ فیض سے ان کی مراد دولت کی فراوانی ہوتی ہے اور اگر انھیں ایک پیر کے دربار سے فیض

نہیں ملتا تو وہ دوسرے پیر کے دربار پر جائیں گے اور فیض پانے کے لئے کڑی سے کڑی شب بیداریاں اور چلہ کشیاں کریں گے مزار کے پاس ہی ایک وسیع ایوان میں مسجد ہے۔ بڑے فانوس چھت سے لٹک رہے تھے۔ مزار سے باہر ہم نے حاتم طائی بن کر جود و سخا کے دریا بہائے۔ میں نے ایک دوکان سے کیپسٹن کا پیکٹ خرید کر دس کے نوٹ کو چھوٹی ریزگاری میں تبدیل کر لیا تھا اور اب ہم نے اسے فقیر بچوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ ہم سیدو میں تھے اور اس مبارک سانحہ کی خوشیاں منانا چاہتے تھے۔ مگر یہ ہماری غلطی تھی۔ جلد ہی سیدو کے سارے گداگر بچے اور اپاہج ہمارے گرد جمع تھے۔ اتنی سی ریزگاری ان کے لئے کافی نہ ہو سکتی تھی۔ سو ہم وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے....

معطر اور مخملی رات میں ہم واپس ہوٹل میں آئے۔ پیر گل نے ہمیں کھانا کھلایا۔ تھکے ہارے تو ہم تھے ہم آتے ہی مثالی گھوڑے بیچ کر سوئے۔ اچھے اچھے خواب اپنے سروں میں لئے ہوئے۔ ٹھنڈی ہوا بالکنی میں سے اندر آ رہی تھی اور تارے باہر کالی رات میں منگورا اور سیدو پر دمک رہے تھے۔

خوازخیل

دوسرے دن (۲۹ اپریل) چائے اور تلے ہوئے انڈوں کا ناشتہ کر چکنے کے بعد ہم نے پیر گل سے پوچھا "نورین اور بحرین کو لاری کتنے بجے جاتی ہے؟" پیر گل کی اردو پوری سوری تھی۔ جواب دینے سے پہلے اس نے سوچا۔ پھر اس نے کہا: "نورین سے ایک لاری دس بجے جاتا ہے دوسرا چار بجے شام۔ دس بجے کا لاری پھر شام کو منگورا سے واپس آ جاتا ہے۔"

پیر گل 'سے' اور 'کو' کے فرق کے بارے میں پوری طرح واضح نہ تھا۔ وہ فقرے میں ایسی جگہ 'سے' استعمال کرتا، جہاں 'کو' زیادہ موزوں ہوتا۔ اس عادت سے اس کے فقرے اکثر اس کے مطلب سے بالکل الٹ مفہوم دینے لگتے اور سننے والے کے لئے ایک پر لطف الجھن کا سبب ہوتے۔ یہ جاننے میں ہمیں کچھ وقت لگا کہ 'نورین سے ایک لاری' سے اس کا مدعا نورین کو جانے والی لاری سے تھا — وہ بعض دفعہ 'سے' کو ویسے ہی فقرے میں لے آتا جہاں وہ قطعاً غیر ضروری ہوتا۔

ہم نے اس سے پوچھا کہ آیا مدین منگورا سے اچھی جگہ ہے؟ — ہمارا مطلب تھا قدرتی خوبصورتیوں کے معاملے میں۔ اس نے اس پر سنجیدگی سے غور کیا اور اپنے دل میں جواب مکمل کر کے کہا "مدین سے منگورا کا بازار اچھا نہیں ہے۔"

بے چارہ چھوکرا! وہ یہ بتانا چاہتا تھا کہ مدین کا بازار منگورا کے بازار سے اچھا نہیں ہے۔ مگر 'سے' کے بے جا استعمال نے اس کے فقرے کو بالکل مختلف معنی دے دیئے اور اس کے جواب کو معما بنا دیا۔

"تمہارا مطلب ہے مدین کا بازار اچھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مدین کا بازار اچھا نہیں ہے۔ منگورا کا بازار بہت اچھا ہے۔" اس نے وضاحت سے کہا۔

مگر یہ وہ نہ تھا جو ہم جاننا چاہتے تھے یعنی یہ کہ مدین کے پہاڑی نظارے منگورا سے زیادہ پر شوکت ہیں یا نہیں۔ ان باتوں کے متعلق لڑکا بھلا کیا سمجھ سکتا۔ اس نے کبھی ان جگہوں کے اس پہلو کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ ایک جگہ اچھی تھی اگر اس کا بازار اچھا تھا۔ اتنی اچھی نہیں، اگر اس کا بازار چھوٹا تھا۔ قدرت کی رنگینیوں کو اس میں دخل نہ تھا۔ آدمی سوچتا تھا کہ کیا کبھی اس لڑکے کا دل ایک جنگلی گلاب کو دیکھ کر اچھلا ہے ؟ شاید نہیں۔ وہ ہمیں پتہ لگا مدین کے پاس کے ایک چھوٹے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ مر چکا تھا اور لڑکا اپنی چھوٹی عمر میں ہی پہاڑ کی بے فکر آزادی کو چھوڑ کر ایک سخت دنیا میں روزی کمانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ یہ جان اور رزق کو اکٹھا رکھنے کی مستقل تگ و دو ایک لڑکے کو جھرنوں اور سبز پوش پہاڑیوں کی خوبصورتی پر غور کرنے کا

وقت نہیں دیتی۔ تاہم ہیرگل کی بدقسمتی پر رحم کرنا اور اس بات کا ماتم کرنا کہ وہ کبھی غالب کی شاعری کے حسن سے متاثر نہ ہو سکے گا، یا یہ کہ شیوبرٹ کے نغمے اس کی روح کو کبھی نہیں ہلائیں گے، بالکل فضول اور احمقانہ بات ہے۔ ایک اچھی زندگی گذارنے کے لئے آدمی کو ایک سادہ معصوم دل اور مضبوط صحت کی ضرورت ہے۔ تم غالب کا ایک لفظ جانتے یا شیوبرٹ کے نغموں کو سمجھے بغیر بھی خوبصورت زندگی گذار سکتے ہو اور ایک ریوڑ کا چرواہا ہونا، ایک روکھے پھیکے فلسفی ہونے سے کہیں بڑی خوش بختی ہے۔ غالب کی شاعری اور شیوبرٹ کے نغمے ہی دنیا کا سارا حسن نہیں ہے اور اس کو سمجھنے کا اہل ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ تمہارا دل لطیف ہے یا تمہارا ضمیر صاف۔ ایک چرواہا اپنی بکریوں اور ریوڑ کے ساتھ اپنی پہاڑی ڈھلان پر گھنٹوں قدرت کے اسرار پر غور کرتا ہے۔ وہ گنگناتے ہوئے چشموں کے راگ سنتا ہے اور موسم کے بدلتے ہوئے چہرے اور موجیں دیکھتا ہے۔ وہ میز پر جھکے ہوئے تمہارے شاعر یا افسانہ نگار کے مقابلے میں چیزوں کے اصل جوہر سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ وہ چرواہا ان چیزوں کو نثر یا شعر میں بیان نہیں کر سکتا مگر تم اس کے لئے اس پر رحم کیوں کھاؤ؟ ان کہے نغمے کہے ہوئے نغموں سے کہیں میٹھے اور رسیلے ہوتے ہیں۔ ایک پہاڑی آدمی ایک نظارے کو دیکھ کر تم سے یہ نہیں کہے گا "یہ نیلی پہاڑی کتنی خوبصورت ہے" لیکن تم پہاڑی لوگوں کی آزادی اور شادمانی کو ان کی آنکھوں، ان کے سارے وجود میں دیکھو گے ــــ اس سے مجھے خیال آتا ہے کہ ہم قدرتی نظاروں کا ذکر ضرورت سے زیادہ شعر اور نثر میں کرنے کے عادی ہیں۔ آرٹ زندگی کی ایک نامکمل مصنوعی تقلید ہے اور آرٹ کے حسن سے لطف اندوزی کی اہلیت بہت سے لوگوں میں، بیر یا بینگن کی ترکاری کی طرح ایک اکتسابی ذوق ہے۔ یہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک آدمی میں خوبصورت ادبی چیزوں سے لطف اٹھانے کا ملکہ تو ہے مگر مصوری اور موسیقی کے لئے وہ اندھا اور بہرا ہے اور جب وہ دوسرے لوگوں کو بے خودی سے اور مست، کسی راگ پر سر دھنتے دیکھتا ہے تو اسے ان کی بے وقوفی پر جھلاہٹ ہوتی ہے۔ سننے والوں کو راگ وقت اور مکان کی حدود سے باہر لے جا رہا ہے اور ہمارا ادبی آدمی سوچتا ہے کہ آخر اس آ۔آ۔آ ــــ میں لوگوں کو کیا ملتا ہے؟

سو ہیرگل کی زندگی پر رحم یا افسوس کی کیا ضرورت ہے۔ وہ ایک صحت مند گھبرو لڑکا تھا، اپنی آپ خبر رکھ سکتا تھا اور اپنے ہوٹل میں آج اس کا اسکول تھا ہر قسم کے لوگوں کو دیکھنے اور ان سے باتیں کرنے کا موقع پا رہا تھا۔ یہ ایک تندرست دماغ کے لڑکے کے لئے بری زندگی نہیں تھی۔

ہیرگل سے مدین کی بس کے اڈے کا پتہ پوچھ کر ہم نیچے سڑک پر اترے اور دھوپ میں نہاتے ہوئے بازار میں بتائی ہوئی سمت میں چلتے رہے۔ کچھ اوپر جا کر ہم ایک تراہے پر بائیں طرف مڑے۔ عنبر رنگت کی چوڑے فرنٹ کی دوکانیں ہماری دلچسپی کا مرکز تھیں۔ وہ خوبصورت مال سے بھری ہوئی تھیں ــــ ٹلّے کے کام کی سواتی ٹوپیاں، جوتیاں اور رنگین موٹی دھاریوں کے پارچہ جات ــــ وحشی دور دراز پہاڑیوں میں یہ جدید شہر جس میں چوڑی میٹلڈ سڑکیں تھیں۔ ٹریفک پولیس مین اور بجلی کے پول اور ہوٹل تھے حقیقی نہ لگتا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے ہم نے اس سڑک پر یقین کرنا چھوڑ دیا۔ یہ طلسمات کا شہر تھا۔ جیسے کسی جن نے اپنے مالک، شاہزادے کے حکم سے تہذیب کی ساری سہولتوں کے ساتھ ان پہاڑوں کے بیچ بنا دیا تھا۔ تھوڑی دیر اور ــ اور یہ شہر یہاں سے غائب ہو جائے گا ــــ اور اس کے ساتھ ہی اس کے ٹریفک پولیس مین اور بجلی کے پول اور تاجر بھی۔ یہاں کے تاجر یقیناً طلسم کے کرشمے تھے ــ حاجی سرفراز گل نے ہمیں بتایا تھا کہ سیدو ایک فوجی چھاؤنی ہے۔ ہم نے پر رونق بازار میں چست ملبوس میں کئی جوان سواتی دیکھے ــــ بعض کندھوں سے رائفلیں لٹکائے اور بے پروائی سے ٹہلتے ہوئے ــــ اپنی کیورس سوات پر کوئی گائیڈ یا معلوماتی کتاب حاصل کرنے کا مشتاق تھا۔ ہم اسٹیشنری اور کتابوں کی ایک دوکان پر چڑھ گئے۔ پروپرائٹر کاؤنٹر کے پیچھے سے تعظیماً کھڑا ہو گیا ــ نہیں اس کے پاس سوات کا نہ کوئی گائیڈ میپ تھا نہ کوئی کتاب۔ پھر اس نے ہمیں تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرنے کو کہا۔ اپنے ایک جوان اسسٹنٹ کو پاس کی کتابوں کی ایک اور دوکان میں بھیجا۔ وہ گیا اور وہی کتاب لے کر آیا جس کی ہمیں ضرورت تھی۔ اس کا نام "ارمغان سوات" تھا اور یہ شیخ مظفر حسین سی بی۔ ایچ کی تصنیف تھی۔ اس میں چند فوٹوگراف بھی تھے۔ ہم نے اسے

خرید لیا۔ یہ ہمارا شیخ مظفر حسین کی مشہور ہستی سے پہلا غائبانہ تعارف تھا۔ اس سے پہلے اس کا وجود نہ تھا۔ اب وہ نادر آب و تاب سے ایک واحد روشن سیارے کی طرح سوات کے ادبی اور علمی آکاش میں چمکنے لگا۔ ہم شیخ مظفر حسین سے ملنا چاہتے تھے۔ ہم اسے کہاں مل سکتے ہیں؟ سی۔ پی۔ ایچ وہ کیسے تھا۔

مگر کتاب کو حاصل کر کے ہم وہاں سے بھاگے۔ وقت اب نو کا تھا۔ لاری دس بجے جاتی تھی لیکن ایپی کیورس کی رائے تھی کہ ہمیں نشستوں کے متعلق مطمئن ہونے کی خاطر وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے پہنچنا چاہیئے۔ راستے میں ہم تین چار دوا فروشوں کی دوکانوں پر وکس کا پتہ کرنے کے لئے رکے۔ یہ دوکانیں انگریزی دواؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ بے شمار پیٹنٹ دواؤں کے ڈبے خوش اسلوبی سے الماریوں میں سجے تھے۔ "وکس" کے کئی پیکٹ ان میں مجھے نظر آئے لیکن دوکانداروں نے ہمیں یقین دلایا کہ مدت سے مال نہیں آیا۔ یہ سب ڈبے خالی تھے۔ اور محض دوکان کے شو کی خاطر رکھے گئے تھے ــــ اس کے بعد ہمارے دل میں منگورا کے طلسماتی شہر ہونے کے بارے میں کوئی شک نہ رہا۔

بس تقریباً بھر چکی تھی جب ہم وہاں پہنچے۔ ایپی کیورس نے میری "وکس" کی تلاش کو اس "تاخیر" کا موجب گردانا۔ یہ اس کی قطعاً زیادتی تھی۔ ایک آدمی کرسی میز لگائے ٹکٹ بیچ رہا تھا۔ ایپی کیورس کو دیکھ کر وہ تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ ایپی کیورس ویسے بھی بارعب آدمی ہے اور اپنے فیلٹ ہیٹ اور چشموں میں تو وہ بہت ہی بارعب تھا۔ اس اچھے آدمی نے کسی نہ طرح ہمارے لئے دو نشستیں پیدا کر ہی لیں۔ ایک ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر، دوسری اس سے پیچھے۔ فرنٹ سیٹ پر ایک اور آدمی سوٹی ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا ــــ شلوار قمیض میں۔ اور کچھ کچھ ایک احمق سکول ماسٹر کا سا ــــ ہم اسے جانتے تھے۔ وہ مردان سے ہمارے ساتھ ہی سوار ہوا تھا اور ہم نے اسے نشاط ہوٹل میں بھی دیکھا تھا۔ اس نے ہمارے ساتھ واقفیت گانٹھنے کی کوشش کی تھی مگر ایپی کیورس کو وہ اپنی "خود اہم" بھجوری وضع کے سبب پسند نہ آیا تھا۔ اور ہم اس سے زہر کی طرح بچتے رہے تھے ــــ ایپی کیورس نے اس کے ساتھ بیٹھنے پر پیچھے بیٹھنے کو ترجیح دی اور مجھے اس بور اور خالی دماغ شخص کے سامنے بیٹھنا پڑا۔ وہ اپنی ٹانگیں پھیلا کر اور سوٹی پر ٹیک لگا کر زیادہ سے زیادہ جگہ سمیٹے ہوئے تھا۔ میرے آنے کو اس نے پسند نہ کیا اور وہ اپنی سمیٹی ہوئی جگہ سے ذرہ بھر بھی نہ سرکا۔ میں دبک کر ایک غیر آرام دہ طریق سے بیٹھ گیا۔ میں اپنے پاؤں بھی نہیں پھیلا سکتا تھا۔ کیونکہ نیچے گیئر باکس کے پاس اس بے تمیز شخص نے اپنی گٹھڑی اور چمڑے کا ٹیچی رکھا ہوا تھا۔ ایپی کیورس بھی پیچھے دو نسوار کھانے اور تھوکنے والے سواتی بزرگوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا ــ کچھ آگے جھکا ہوا۔

ڈرائیور جب وہ دس بجے اپنے سٹیرنگ پر آ کر بیٹھا تو ہالی وڈ کے سٹیورٹ گرینجر کا ہم صورت نکلا ــــ وہی تیکھا لمبا چہرہ، پتلے حساس ہونٹ، چھوٹا ڈھیلا منہ، وہ تیکھا اور خوبصورت تھا۔ لیکن کسی طرح تم اسے پسند نہیں کرتے تھے ــــ جہاں تک میرا تعلق ہے میں دنیا کے اسٹیورٹ گرینجروں سے نفرت کرتا ہوں بعض عورتوں کے لئے شاید ان میں کشش ہوتی ہو گی۔ مگر میرا خیال ہے کہ کوئی آدمی اتنی جذبیت سے بھری ہوئی ہستیوں کو حقیقی طور پر دل میں جگہ نہیں دے سکتا۔ تم انسانی گرمی کو ان کے سرد، گدھے کے سے چہرے پر منڈلاتے ہوئے نہیں دیکھو گے۔ اگر تم عورت ہو تو وہ تمہیں سیدھے بستر میں لے جانا چاہیں گے۔

منگورا کے نواح سے نکل کر سڑک مرتفع اور جنگل کاٹتی، تدریجی چڑھائی چڑھتی ہے۔ یہاں شروع میں وہی پھلوں کے باغوں، مرغزاروں اور پیلے کھیتوں کی فراوانی تھی۔ مگر ہم اونچے پہاڑوں کی سمت جا رہے تھے۔ پہاڑ قریب آ گئے تھے اور وادی اپنے کو سمیٹتی ہوئی لگتی تھی۔ ایک مقام پر ہم نے خانہ بدوشوں کے ایک پورے "قافلے" کو لاری کی چھت پر بٹھایا۔ وہ اخروٹوں کے ایک چھوٹے سے ذخیرے کے ساتھ پڑاؤ ڈالے پڑے تھے۔ لاری کے آنے پر انھوں نے جلدی سے خیمے اکھاڑے اور اپنے گھر کے سامان سمیت چھت پر بٹھا دیئے گئے۔

ایپی کیورس نے جھیل کا دوسرا رخ دیکھا اور مجھے اس کی خوش خبری دی۔ پوست کے پھول ہوا میں ناچتے تھے اور سوات دریا اب ایک

پہاڑی نالہ جنا ہمیں بلاتا تھا۔ پہاڑوں پر برفیں شاندار تھیں۔ وہ کبھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوتیں۔ ۔۔۔ پھر بید کاری کے وہی قلعے اپنے مرغزاروں میں ایستادہ تھے۔ خانہ بدوش پہاڑی عورتیں سڑک پر سے گزرتیں یونانی ناکوں اور تیکھے نقوش کی عورتیں ۔۔۔ اور قدرے جھکی ہوئی ۔۔۔ سیاہ کپڑوں میں ملبوس اور وحشیانہ زیورات میں لدی پھندی۔ ان کے سروں پر گول ٹوکریاں ہوتیں جن میں کنبے کی کل کائنات ان ٹوکریوں میں ہوتی۔ ہر قسم کے برتن بھانڈے اور ہر رنگ کے چیتھڑے ۔۔۔ ان کے مرد (کاہل بدمعاش!) اپنے گدھوں اور خچروں پر سوار ہوتے۔ ان لوگوں کی زندگی سخت ہے مگر گوناگوں دلچسپی کی۔ وہ خدا کے گھر کی کھلی چھت کے نیچے رہتے ہیں اور ہمیشہ ایک جگہ سے دوسری جگہ راہ پیما رہتے ہیں۔ دنیاوی اسباب میں غریب مگر ہر اور چیز میں امیر ۔۔۔ صحت میں امیر، دماغ کی مستعدی میں امیر، قناعت میں امیر۔ جب تک دنیا کے پاس خانہ بدوش ہیں اسے ناامید نہیں ہونا چاہیئے۔

خمار زنجیل ۔۔۔ ایک قصبہ جہاں ہم ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد پہنچے ۔۔۔ ایک پر رونق پہاڑی قصبہ ہے۔ یہاں پتھر کی دوکانیں ہیں ۔۔۔ بے شمار شگفتہ نفیر بچے، اور ملیشیا میں پولیس کے سپاہی۔ ہم ایک جگہ پر آ کر رکے۔ یہاں سے ایک سڑک نیچے پُراسرار سنہری دھند میں اترتی ہے۔ دوسری اوپر چڑھتی ہے ۔۔۔ خمار زنجیل ہمارے لئے ایک رومینٹک، ہوشربا ناول کا پہلا باب تھا۔ یہاں سے دوسرا باب شروع ہوتا تھا اور ہم یہ جاننے کے لئے تلملا رہے تھے کہ کونسی نئی طرح کے ایڈونچرز ہماری تفریح کے لئے ہمارے انتظار میں تھے۔

ہم یہاں تھوڑی دیر کے لئے بس سے اترے۔ ایچ کیورن نے اپنے جرنل میں اس کے واضح تاثرات رقم کئے۔ بہت سے بچے ہمارے ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ چپکے اور ہر جگہ کے بچوں کی طرح حیرانی سے پُر، وہ ہمیں گول حیرت بھری آنکھوں سے دیکھ رہے تھے (خمار زنجیل کے بچوں کے پاس آٹوگراف بکس نہ تھیں!)

ایک گٹھیلے جسم اور کھلے خوشگوار چہرے والا پولیس کا سپاہی بندوق کندھے سے لگائے ہماری طرف سرکتا ہوا آیا۔ اس شادمان وادی کے ہر ننھے گاؤں اور بستی میں والی نے پولیس کی چوکی بٹھا رکھی ہے اور یہ سپاہی ہر وقت چوکنے اور مستعد اس ننھے گاؤں کے رہنے والوں اور راہ گیروں کی حفاظت کے لئے اس کے کوچوں میں چلتے رہتے ہیں۔ یہ سپاہی دور کھڑا پہلے ہمیں متجسس نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کا تجسس اس کی جھجک پر غالب آ گیا اور اس نے آ کر ہمیں السلام علیکم کہی۔ اس نے ہم سے پوچھا کہ ہم کہاں جا رہے تھے۔ ہم نے کہا "مدین اور بحرین"۔ اچھے آدمی نے ہمیں کسی جنس کا تاجر یا بیوپاری سمجھا۔ وہ یہ خیال نہ کر سکتا تھا کہ کوئی شخص ایسی جگہوں میں ماسوا کسی کاروبار کے محض سیر کے لئے جا سکتا ہے۔ یہ کہ ایک آدمی کسی جگہ صرف سفر کے لئے یا دل کو خوش کرنے کے لئے جائے یا اس کے پاس ایسے بیکار مشغلے کے لئے وقت ہو، ان اچھے پہاڑی لوگوں کی سمجھ سے باہر ہے۔ ہمارے یہ بتانے پر کہ ہم کاروباری آدمی نہ تھے بلکہ صرف مسافر تھے وہ خاصا مایوس ہوا۔ اس کے پوچھنے پر ہم نے اسے اپنے نام اور عہدے بتلائے اور جب ہم نے اسے اپنی ماہوار تنخواہ بتائی تو وہ اس سے کافی مرعوب ہوا۔ اس نے اپنا تعارف کرایا اور اصرار کیا کہ ہم اس کا نام اور پتہ اپنے جرنل میں نوٹ کر لیں اور واپس اپنے دیس میں جا کر اسے خط لکھیں۔ ہم نے اس سے وعدہ کر لیا۔ (مسلسل)

سیّد فیضی

منٹو

زخم گہرے ہوں تو جراحی کا ہوتا ہے عمل
منٹو جراح تھا، زخموں کو کُریدا اُس نے
اندھی آنکھوں میں اُگائے ہیں بصیرت کے کنول
پردہ بے رنگ حقیقت سے اُٹھایا اُس نے

کون جانے یہ اندھیرے میں لپکتی ہوئی آگ
کب سے سیلاب کی مانند بہا کرتی ہے
زندگی ہے کہ حقیقت کا تڑپتا ہوا راگ
جو حقیقت ہے وہ عُریاں ہی رہا کرتی ہے

زندگی نام و نمود، آئینہ حرص و ہوس
زندگی پھُول سے گالوں پہ چمکتے آنسُو
زندگی فصلِ بہاراں کا نچوڑا ہوا رَس
زندگی روندے ہوئے جسم کی مُردہ خوشبُو

ایک نغمہ تھا جسے سینکڑوں عنوان ملے
کب سے مضرابِ طلب زیست کا یہ ساز بھی تھا
اس کے ہر پردے میں افسانے پریشان ملے
منٹو خود وقت بھی تھا، وقت کی آواز بھی تھا

شہزاد احمد

صفیہ بھابی

آغا خلش کاشمیری لاہور والوں کو بے تحاشا گالیاں دے رہے تھے اور وہ بھی گوالمنڈی کے ہوٹل میں بیٹھ کر۔ ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور انہیں لاہور انسانوں کا شہر نظر نہ آتا تھا۔ وہ آزادی سے کئی برس پہلے سے بمبئی میں آباد تھے اور بمبئی ان کے خون میں سرایت کر چکی تھی۔ لاہور سے انہیں خاصی نفرت تھی۔ اگر ان کی والدہ کا انتقال نہ ہوتا تو شاید وہ کبھی لاہور کا رخ نہ کرتے۔ منٹو کی زبوں حالی اور شراب خوری کے قصے ان تک پہنچ چکے تھے۔ وہ خود صوفی آدمی تھے اور منٹو کی شراب نوشی انہیں بمبئی میں بھی پسند نہ تھی مگر لاہور میں منٹو کی شراب اور دوستی دونوں کا معیار گر گیا تھا۔ روایت یہ ہے کہ منٹو کی شراب نوشی کی عادت چھڑوانے کے لئے وہ خود اسے پاگل خانے تک لے گئے تھے۔ جس دن کا میں ذکر کر رہا ہوں اس دن منٹو پاگل خانے میں علاج کروا رہا تھا اور آغا صاحب گوالمنڈی میں دیوانے ہو گئے تھے۔ انہیں منٹو سے عشق تھا، مگر ان سے کہیں زیادہ عشق صفیہ بھابی کو منٹو سے تھا مگر انہوں نے کبھی گالی نہ دی، کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائیں۔ انہیں منٹو کے شرابی دوست بے حد ناپسند تھے مگر انھوں نے اس کا اظہار کبھی نہیں کیا۔

جب منٹو پاگل خانے سے واپس آیا تو اس نے کئی دن تک شراب نہ پی۔ صبح سے رات تک بھابی صفیہ سائے کی طرح اس کے ساتھ رہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر اس کھلنڈرے بچے کو کھلا چھوڑ دیا گیا تو یہ اپنی زندگی خطرے میں ڈال لے گا۔ ان دنوں منٹو اور بیگم منٹو (جو ہمارے لئے صفیہ بھابی ہیں) متعدد بار تانگے میں اکٹھے نظر آئے۔ منٹو حسب عادت اگلی سیٹ پر اور بھابی پچھلی سیٹ پر۔ ان دنوں بھابی صفیہ نے ہر شام باغ جناح جانے کا پروگرام بنایا۔ دو ایک بار مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت ملی۔ انہیں یقین تھا کہ کھلنڈرا منٹو اب سنبھل چکا ہے، مگر ان کے دل میں ایک نامعلوم خوف تھا۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھی منٹو کو آنکھوں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتی تھیں مگر منٹو معلوم نہیں کب دھوکا دے کر یا اجازت لے کر اکیلا اپنے دوستوں کے پاس چلا گیا اور شراب نوشی پھر سے شروع ہو گئی۔ مجھے معلوم نہیں کہ بھابی صفیہ کو جب یہ خبر ملی تو ان کے تاثرات کیا تھے مگر میرا خیال ہے کہ ان کے دل میں مایوسی اور خوف کی لہر اٹھی ہو گی جس کا اظہار انھوں نے کبھی نہیں کیا۔

صفیہ بھابی کو پہلی بار میں نے منٹو کے ساتھ ہی کہیں دیکھا تھا چونکہ ان کی تصویر میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ اس لئے مجھے انہیں پہچاننے میں ذرا بھی مشکل نہ ہوئی ان کی شخصیت میں مجھے کسی غیر معمولی چیز کا احساس نہیں ہوا سوائے اس کے کہ انہیں منٹو سے بے پناہ محبت تھی، ایسی محبت جس کا ذکر افسانوں میں ملتا ہے، مگر منٹو کے افسانوں میں نہیں ملتا۔ میرا خیال ہے کہ منٹو بھی ان سے محبت کرتا ہو گا مگر اس کا اظہار اس نے بھی کبھی نہ کیا۔ مجلس اقبال یا حلقہ ارباب ذوق میں منٹو اور مسز منٹو کئی بار اکٹھے آئے تھے مگر بھابی صفیہ نے کبھی بھی اپنی موجودگی کا احساس نہ ہونے دیا۔ اگر وہ افسانہ پڑھنے کے بعد منٹو کی پنجابی گفتگو اس اعتماد اور خود پسندی کی حامل تھی کہ محفل میں کسی کو اختلاف کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ ممکن ہے بھابی صفیہ منٹو کے اس تحکمانہ رویے پر خوش ہوتی ہوں یا وہ صرف اس لئے ساتھ آ جاتی ہوں کہ ان کا وقت کٹ جائے۔ بہر حال اجلاس کے دوران منٹو کی گفتگو کے ساتھ ساتھ ان کے چہرے کے تاثرات تیزی سے تبدیل ہوتے نظر آتے۔

صرف ایک موقعے پر میں نے صفیہ بھابی کو ناراض دیکھا تھا اور وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے۔ بعد میں ان کے چہرے پر تاسف کی لہر دوڑ گئی تھی۔

واقعہ یوں ہوا کہ مجلسِ اقبال کے بعد ہم گورنمنٹ کالج لاہور کے لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ بھابھی صفیہ کے ساتھ منٹو کی بہن اور کالج کی کچھ طالبات بیٹھی تھیں۔ منٹو کو طالبات سے ملوانے کے لیے خاص طور پر بلوایا گیا تھا۔ شاید اسے یہ حرکت پسند نہ آئی۔ ایک لڑکی کا تعارف کراتے ہوئے کسی نے منٹو سے یہ کہہ دیا کہ یہ لڑکی آپ کی طرح آرٹسٹ ہے۔ منٹو صاحب نے پوچھا، "تم شراب پیتی ہو؟" لڑکی سے کچھ جواب نہ بن پڑا تو منٹو نے کہا، "اگر تم شراب نہیں پیتیں تو آرٹسٹ نہیں ہو سکتیں۔" اس دن میں نے صفیہ بھابھی کو [illegible] منٹو سے ناراض ہوتے دیکھا۔ مجھے ان کے الفاظ یاد نہیں مگر حافظے میں اتنا ضرور محفوظ ہے کہ منٹو باقی لڑکیوں سے ملے بغیر بڑبڑاتا ہوا واپس چلا گیا۔ بھابھی اس قدر شرمندہ تھیں کہ معذرت بھی نہ کر سکیں۔

معاف کیجیے میں نے ایک ایسا واقعہ سنا دیا جس میں منٹو بدتمیز اور اجڈ نظر آتا ہے مگر غالباً یہ تنہا واقعہ ہے۔ عام طور پر خواتین کے اجتماع میں منٹو بے حد مہذب اور پُرتکلف رہتا تھا، خواہ اس نے پی رکھی ہو۔ آداب اس کے ملحوظِ خاطر ضرور رہتے تھے۔ منٹو کے افسانے پڑھنے کے بعد ان کے مصنف کی جو تصویر لوگوں کے ذہن میں عام طور پر اُبھرتی ہے، منٹو اس سے خاصا مختلف تھا۔ اس کا لباس اور گھر دونوں آئینہ تھے۔ اسے بچے بے حد پیارے تھے اور بچوں کے سلسلے میں اس کی یہ محبت اپنی اولاد تک محدود نہ تھی بلکہ وہ بچوں کی عجیب و غریب زبان بے حد غور سے سنتا اور ان کے معنی متعین کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ بچوں کے بنائے ہوئے اوٹ پٹانگ الفاظ بے حد معنی خیز ہوتے ہیں۔ اس قسم کے الفاظ اسے زبانی یاد تھے اور بعض اوقات وہ خود بھی بچوں سے انہی کی زبان میں بات کرتا۔ اس وقت وہ ننھی منی سی روح محسوس ہوتا اور کوئی اندازہ بھی نہ کر سکتا کہ یہ وہ شخص ہے جس پر فحاشی کے مقدمے چل چکے ہیں۔ منٹو کی بیباکی اور عریانی اس کی حقیقت پسندی تھی۔ وہ معصوم بچوں کی طرح جو سوچتا تھا کہہ دیتا تھا۔ یہ فیصلہ کیے بغیر کہ تحریروں کا محاسبہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اپنے افسانے "بو" میں منٹو نے جو منظر بیان کیا ہے وہ سارے کا سارا اس کے بمبئی کے مکان سے متعلق ہے۔ اس افسانے پر مقدمہ بھی چلا۔ منٹو یہ بھی کہتا تھا کہ صفیہ بھابھی اس افسانے کو پڑھ کر بے حد ناراض ہوئی تھیں کیونکہ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ منٹو واقعی کسی عورت کو بھابھی کی عدم موجودگی میں اپنے گھر لے آیا تھا۔ ممکن ہے ایسا ہوا ہو مگر میں نے لاہور میں جس خاتون کو دیکھا تھا وہ ایسا نہیں کر سکتیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ منٹو نے یہ کہانی گھڑی ہو کیونکہ معصوم ذہن اس قسم کی کہانیاں گھڑ کر ان پر خود ہی یقین کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔

لاہور میں منٹو لکشمی مینشن کے ایک مختصر سے فلیٹ میں رہتا تھا۔ اس کا خاندان ایک بیوی اور تین بچوں پر مشتمل تھا۔ بمبئی میں اس کے ہاں عارف میاں پیدا ہوئے تھے مگر ان کا انتقال ہو گیا۔ عارف میاں کی یادگار منٹو کی ایک کہانی ہے جس کا عنوان ہے "خالد میاں"۔ بچے کی موت کے بعد منٹو کی ساری شخصیت میں اولادِ نرینہ نہ ہونے کا دکھ بُری طرح سرایت کر گیا تھا۔ منٹو بڑے دکھ کے ساتھ یہ واقعہ سنایا کرتا تھا کہ عارف کو آخری غسل دینے کے لیے جب غسال نے لائف بوائے صابن مانگا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا کیونکہ عارف میاں کے لیے منٹو نے بڑھیا سے بڑھیا ولایتی صابنوں کا بکس بھر رکھا تھا۔ مگر عارف میاں کی ضرورت منٹو سے کہیں زیادہ صفیہ بھابی کو تھی کیونکہ منٹو کا لاابالی پن جلد رنگ لانے والا تھا اور بیٹیاں پرایا دھن تھیں۔ تاہم سعادت حسن بھی تو ایک بچہ تھا، کھلنڈرا، لاابالی، ضدی اور خود پسند — منٹو کا جی پڑھائی میں کبھی نہ لگا تھا۔ خاندان کے دوسرے افراد کے مقابلے میں منٹو کی تعلیم ادھوری تھی اور اس کے گھر میں ایک انگریزی ڈکشنری اور دیوانِ غالب کے سوا کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ منٹو کا ادب اس کے سینے کے اندر ہی محفوظ تھا۔

لکشمی مینشن کا فلیٹ تین یا چار کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک ڈرائنگ روم جس میں پرانی وضع کا ایک صوفہ سیٹ پڑا تھا اور دروازے کے بالکل سامنے جو صوفہ تھا اس پر اکڑوں بیٹھ کر منٹو کہانیاں لکھا کرتا تھا اور اسی کمرے میں اس کے بچے شور مچاتے رہتے تھے۔ ایک روز میں اور منیر احمد شیخ اس سے ملنے گئے تو منٹو بڑی ہیجانی کیفیت میں تھا۔ اسے کسی کباڑیے کی دوکان سے "حمیدہ کی آپ بیتی" مل گئی تھی۔ یہ کتاب مثنوی کی شکل میں تھی اور اس میں شبِ عروسی کی داستان کو مکمل کر بیان کیا گیا تھا۔ اتفاق سے اس وقت کمرے میں ہم تینوں کے سوا کوئی موجود نہ تھا۔ پہلے تو منٹو نے کتاب کی تشبیہات اور استعاروں

کی بہت تعریف کی، پھر مثنوی کو پڑھنا شروع کیا۔ ابھی اس نے تین چار شعر ہی پڑھے تھے کہ اچانک صفیہ بھابھی کمرے میں داخل ہوئیں۔ منٹو نے جلدی سے کتاب چھپالی اور بڑی گھبراہٹ کے ساتھ میرا حال چال پوچھنے لگا۔ اس دن مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ منٹو کے دل میں اپنی بیوی کے سلسلے میں کتنا تقدس موجود ہے۔ منٹو اس وقت شریر اور شرمیلا لڑکا محسوس ہو رہا تھا۔

گھر کا دوسرا کمرہ جس تک میری رسائی ہو سکی سوٹ کیسوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں بمبئی کی یادگار ایک فرج تھا جو بجلی اور مٹی کے تیل سے چل سکتا تھا۔ انھیں سوٹ کیسوں کی تہوں میں بھابی اپنے پیسے چھپا کر رکھا کرتی تھیں۔ مگر بھابھی کی عدم موجودگی میں منٹو کپڑوں کی تلاشی لیتا اور پیسے چوری کر کے لے جاتا۔ بھابھی کو کئی کئی دن اس چوری کا علم نہ ہوتا۔ انھیں یہ بھی یاد نہ رہتا کہ انھوں نے کس سوٹ کیس میں کتنے پیسے رکھے تھے۔ چوری کا یہ سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے بھابھی جانتی تھیں کہ ان کا چور کون ہے۔ مگر وہ جان بوجھ کر سب کچھ بھول جاتی تھیں۔ اور کبھی شکایت نہ کرتیں۔ شکایت تو وہ اب بھی نہیں کرتیں۔ پہلے ان کا چور منٹو تھا، اب منٹو کے پبلشر ہیں جو ہزاروں کی تعداد میں اس کی کتابوں کے ایڈیشن چھاپتے ہیں اور اس کے بچوں کو کچھ نہیں دیتے۔ اس کا گھر اس قدر سونا ہو گیا ہے کہ منٹو کے پبلشر تو کیا اس کے دوستوں نے بھی کبھی بھول کر اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ عارف میاں کی موت کے بعد بھابھی نے جو اداس زندگی شروع کی تھی وہی زندگی انھیں منٹو کی موت کے بعد پھر سے شروع کرنا پڑی۔

ظہور الحسن ڈار

باغی

اگر میں نے اس کی میت کو اپنے سامنے لحد میں اترتے نہ دیکھا ہوتا تو میں اس خبر پر کبھی یقین نہ کرتا کہ وہ مر چکا ہے، مگر وہ مر چکا تھا۔ وہ جو کئی المیوں کا مصنف تھا، اب خود ایک المیے کا ہیرو بن چکا تھا۔ اس کے افسانوں کی طرح اس کے اپنے خاتمے میں بھی چونکا دینے والا فنشنگ ٹچ موجود تھا۔ تقریباً سال بھر پہلے جب وہ سخت بیمار ہوا اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو وہ اچانک صحتیاب ہو کر تیزی سے افسانے لکھنے لگا اور اب جبکہ اس کے مرنے کا کوئی امکان نہیں تھا، وہ ایکا ایکی موت سے بغل گیر ہو گیا اور اس کا وہ آخری افسانہ بھی نا تمام رہ گیا، جو وہ صرف چند گھنٹے پہلے ایک اخبار کے دفتر میں بیٹھا لکھ رہا تھا۔

معلوم نہیں اس نے اپنے آخری افسانے کے لئے کیا فنشنگ ٹچ سوچ رکھا تھا لیکن اس کی اپنی زندگی کے افسانے کے مقابلے میں اس کے تمام افسانوں کے فنشنگ ٹچ ہیچ ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا منٹو کی موت کی خبر سن کر دوسرے لوگوں پر کیا گزری لیکن مجھے اس کی موت پر کوئی صدمہ نہ ہوا۔ الٹا مجھ پر حیرت اور تعجب کی ایک ملی جلی مگر بھرپور کیفیت طاری ہو گئی۔ ہو سکتا ہے یہ کیفیت ذہن کو صدمہ پہنچنے کا ہی نتیجہ ہو لیکن اس صدمہ کا احساس مجھے بالکل نہیں ہوا۔ اس وقت بھی نہیں ہوا جب میری آنکھوں کے سامنے دو سیاہ فام گورکن اس کی قبر کو آخری ٹچ دے رہے تھے میں اس وقت بھی حیرت زدہ تھا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ منٹو سچ مچ سپرد خاک ہو چکا ہے۔ گورکن اس کی قبر پر مٹی برابر کر رہے تھے اور مجھے ہر لحظہ اس چونکا دینے والے واقعے کا انتظار تھا کہ ابھی منٹو قبر سے باہر نکل کر انہیں پکڑے گا اور کہے گا "تم یہ کیا چکر چلا رہے ہو، تم سمجھتے ہو میں سچ مچ مر گیا ہوں؟" اس کے بعد وہ اپنی قبر کے آس پاس کھڑے لوگوں کو دیکھ کر ہنسے گا۔

"منٹو مر گیا۔ یہ ایک فراڈ ہے لیکن تم اس پر مٹی ڈال رہے ہو۔ یہ اس سے بھی بڑا فراڈ ہے" یہ کہہ کر وہ ہوا میں اوپر اٹھنا شروع کرے گا، تھوڑا اوپر اٹھ کر رکے گا، پھر حاضرین سے مخاطب ہوگا۔

"منٹو کی جگہ نیچے نہیں، نیچے فراڈ ہے اور اوپر دھواں، منٹو نیچے فراڈ تھا اور اوپر دھواں ہے۔"

یہ کہہ کر وہ پھر اوپر اٹھنا شروع کرے گا اور تمام لوگوں کو حیرت زدہ چھوڑ کر آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گا۔

منٹو سے یہ چیز غیر متوقع نہ تھی۔ اپنے افسانوں کی روشنی میں وہ ایک بہت بڑا شعبدہ باز نظر آتا تھا۔ قلم اور زبان دونوں کے زور سے عجیب شعبدے دکھاتا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے آگ پر چلتا تھا، بڑے سکون سے شیشے کی کرچیں پھانک لیتا تھا۔ بڑی بے نیازی سے پیٹ میں خنجر اور چاقو بھونک لیتا تھا۔ اس کے باوجود اس پر کوئی آنچ نہیں آتی تھی۔ وہ بار بار مرتا تھا اور بار بار زندہ ہوتا تھا۔ ابھی اس کی افسانہ نگاری کا آغاز تھا کہ اس پر تپ دق کا حملہ ہوا پہلے پہل تو دق نے منٹو کو پسپا کر دیا لیکن دوسرے ہلے کے بعد وہ خود پسپا ہو گیا۔ اسی طرح اسے چند۔ وہ ایک پاگل خانے میں رہنے کا اتفاق ہوا تو اس نے

باہر آکر پاگلوں کے متعلق بعض ایسے افسانے لکھے کہ پاگلوں کا علاج کرنے والے ڈاکٹر پاگل ہوگئے اور پاگل خانے سے باہر بسنے والی دنیا میں کئی پاگلوں کے دماغ ٹھکانے آگئے۔ اس تجربے کے بعد اسے ایک اور خطرناک مرحلے سے گزرنا پڑا۔ اب کی دفعہ اس کا مقابلہ شراب سے تھا۔ لوگوں کا خیال تھا منٹو کو شراب خراب کر رہی ہے۔ منٹو کہتا تھا میں شراب کو خراب کر رہا ہوں۔ بہرحال اس گڑبڑ میں جب معاملہ بہت ہی خراب ہوگیا، تو منٹو ہسپتال پہنچ گیا۔ اور تین ماہ تک زندگی اور موت کے درمیان لٹکتا رہا۔ اس دوران میں کبھی شراب اس پر غالب آجاتی اور کبھی وہ شراب پر۔ لیکن میدان اسی کے ہاتھ رہا، اور میدان اس وقت بھی اسی کے ہاتھ رہا، جب وہ کچھ عرصہ بعد شراب کا ایک چھوٹا سا جام زہر کے طور پر پی کر اسے ہمیشہ کے لئے شرمسار چھوڑ گیا۔

جان کر من جملۂ خاصانِ میخانہ مجھے حشر تک رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

موت سے منٹو کی بار بار پنجہ آزمائی اور پھر فاتحانہ للکار کے تمام واقعات میرے ذہن میں محفوظ تھے۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ وہ اس سے پہلے کئی بار موت سے فراڈ کرچکا ہے۔ شاید اسی لئے مجھے توقع تھی کہ وہ اس بار بھی موت سے فراڈ کرے گا۔ مگر جب اس کی قبر بالکل تیار ہوگئی۔ اس پر پھول بھی چڑھا دیئے گئے اور وہ قبر سے باہر نہ آیا تو مجھے اچانک اس تلخ اور دردناک حقیقت کا احساس ہوا کہ اب کی بار معاملہ مختلف ہے۔ اس بار خود زندگی منٹو سے فراڈ کر گئی ہے۔

وہ منٹو جس کا نام سعادت حسن تھا۔ جو لکشمی مینشن میں رہتا تھا جو ایک بیوی کا شوہر اور تین بچیوں کا باپ تھا۔ جو زندگی کے آخری دنوں میں ہمہ ما شراب کے نشے میں دھت رہتا تھا۔ جو اس دنیا کو اور اپنے آپ کو ایک فراڈ سمجھتا تھا جس سے زندگی بھی نالاں تھی اور موت بھی —— مرچکا ہے۔ اس لئے کہ اسے ایک نہ ایک روز مرنا ہی تھا۔ لیکن وہ منٹو جو بیسیوں افسانوں، ڈراموں اور خاکوں کا مصنف ہے زندہ ہے۔ جو کسی نہ کسی "خوشیا" کسی نہ کسی "سوگندھی" اور کسی نہ کسی "گوپی ناتھ" کو جنم دیتا رہتا تھا، کیا اسے بھی کوئی موت کسی قبر میں دفن کرکے بے نام و نشان بنا سکتی ہے؟ کیا کوئی اندھیرا بمبئی کے چکلے کی ان پر اسرار روشنیوں کو نگل سکتا ہے۔ جو آج بھی "سوگندھی" کے چہرے کو اجال رہی ہیں؟ کیا کوئی سنار اس سدابہار چمک کو دھندلا سکتا ہے۔ جو صرف زرد روشنی کے پیلے آنسو ہی پیدا کرسکتے ہیں؟ اور جس کی آب و تاب سے "گوپی ناتھ" "سلطانہ" "خوشیا" اور بوڑھی "ممی" کے چہرے روشن ہیں —— !

ابھی تک تو ایسا نہیں ہوا، کل کیا ہوگا، میں نہیں کہہ سکتا۔

میں نے ابھی کہا تھا کہ منٹو سے زندگی بھی نالاں تھی اور موت بھی۔ موت تو اس سے اس لئے نالاں تھی کہ اس کے پے در پے حملوں کے باوجود منٹو اس کا شکار نہیں ہوتا تھا اور زندگی اس سے اس لئے نالاں تھی کہ وہ اس سے کسی طرح بھی سمجھوتا کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں نے یہاں زندگی کا لفظ معاشرے کے معنوں میں استعمال کیا ہے، جس معاشرے میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں، وہ منٹو سے اس لئے نالاں تھا کہ منٹو اس کی تمام فریب کاریوں اور بداعمالیوں کو اچھی طرح جان چکا تھا اور ان کا پردہ چاک کرنے کی ہمت بھی رکھتا تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ ایک گنہگار صرف ایک خوبصورت عمامہ باندھ کر اور منبر پر کھڑا ہو کر کیوں کر نیکو کار واعظ بن سکتا ہے یا کوئی کس طرح اپنے مکروہ چہرے کے مہاسوں اور کیلوں کو غازے کی تہوں میں چھپا کر اپنے منہ سے اپنے حسن و جمال کے قصیدے پڑھ سکتا ہے۔ اس کی فطرت اس ریاکاری کے خلاف بغاوت کرتی تھی اور وہ نوکِ قلم سے پوری بے رحمی کے ساتھ عماموں کی تہیں کھول دیتا تھا، سچائی کے چھینٹوں سے غازے کی تہیں اتار دیتا تھا اور ان کالے چہروں کو ننگا کر دیتا تھا جو اس معاشرے میں بڑے بڑے رشد نشینوں پر بیٹھ کر نیکوکاری اور اخلاق پر وعظ سنا رہے ہیں۔

یہ اس کے فن کا ایک رخ ہے۔ اس کے فن کا دوسرا رخ یہ ہے کہ منٹو نے انتقام کے جوش میں نہیں بلکہ سمجھ بوجھ کر اور نہایت ایمانداری کے ساتھ ان لوگوں کو اپنے سینے سے لگایا جنھیں ہمارا معاشرہ ہمیشہ سے دھتکارتا چلا آیا ہے اور جن کا ذکر چھڑتے ہی معاشرے کے نام نہاد نیکوکار توبہ استغفار

پڑھنے لگتے ہیں۔ منٹو کے افسانوں میں سماج کے ان اچھوتوں کے لئے گہری محبت موجود ہے جو ہمارے ہی گناہوں کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں۔ یہ ایسے بیٹے اور بیٹیاں ہیں جنھیں پیدا کر کے ہمارا معاشرہ بھول ہی نہیں گیا، بلکہ ان پر جرمانے اور سزا بھی نافذ رہتا ہے۔ کیا کوئی بھی ایماندار فن کار ان بدنصیبوں کو اس ریاکار معاشرے کی طرح گنہگار کے نام سے پکار سکتا ہے؟ اگر یہ گنہگار ہیں، تو پھر ہمیں اپنے آپ کو سیاہ کاروں کے نام سے یاد کرنا چاہیے، کیونکہ ان گنہگاروں کو خود ہم نے پیدا کیا ہے۔

منٹو ایک ایماندار فن کار تھا، اس لئے وہ ریاکار نہ بن سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زندگی بھر معاشرے کے قہر و غضب کا شکار رہا۔ اس کی تلخ صاف گوئی اور بیباکی اس کے لئے ہمیشہ بلائے جان بنی رہی۔ اس معاشرے نے جس کا ہمنوا ہو کر وہ عیش کی زندگی بسر کر سکتا تھا، اسے باغی قرار دے کر کبھی قبول نہ کیا اور اپنے ہتھکنڈوں سے بہت جلد موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ منٹو کو شراب لے ڈوبی۔ مجھے یہ سن کر ہمیشہ پنجابی کے مشہور شاعر اُستاد دامن کا ایک شعر یاد آتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے اسی صورت میں برداشت کیا جا سکتا ہے کہ آدمی شراب کے نشے میں چور رہے۔ جو آدمی شراب کے نشے کے بغیر معاشرے کی ریاکاریوں کو برداشت کرتا ہے، وہ یا تو پاگل ہے اور یا پھر بے غیرت ـــــ

منٹو کو معاشرے نے کبھی قبول نہیں کیا، ادب میں بھی بعض دانشوروں نے اسے ہمیشہ کوئی اونچا درجہ دینے سے گریز ہی کیا۔ لیکن ان دونوں چیزوں کا تعلق منٹو کی زندگی سے تھا۔ منٹو کی موت کے ساتھ ہی ان باتوں کی اہمیت ختم ہو گئی۔ اب جو چیز زندہ ہے، وہ منٹو کا فن ہے یا اس کے وہ کردار جنھیں اس نے اپنی فنی ریاضت سے، اپنی گہری محبت اور سچے خلوص سے امر بنا دیا ہے۔ یہ کردار آج بھی زندہ ہیں اور جب تک یہ زندہ رہیں گے انھیں جنم دینے والا فن کار بھی زندہ رہے گا۔

مجھے منٹو کے ان کرداروں کی اپنے خالق سے محبت اور عقیدت کا بخوبی اندازہ ہے۔ مجھے وہ نظارہ خوب یاد ہے جب میں منٹو کی قبر کے قریب کھڑا اس بات پر غمزدہ تھا کہ اس کے جنازے کے ساتھ بہت کم آدمی آئے ہیں اور جو آئے ہیں، وہ اسے منوں مٹی کے نیچے اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ مگر عین اس وقت جب میں بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو رہا تھا، میں نے ایک پل کے لئے ایک عجیب منظر دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ منٹو کی قبر کے ارد گرد ایک پراسرار سی روشنی پھیل گئی ہے اور منٹو کے تمام کردار اس کی قبر کے گرد جمع ہیں۔ ان میں خوشیا بھی ہے اور سوگندھی بھی۔ گوپی ناتھ بھی ہے اور سلطانہ بھی، ممی بھی ہے اور مسز ڈی کوسٹا بھی اور ـــــ اور ان کے درمیان ایک کتا بھی ہے، ٹیٹوال کا کتا، جو بڑی خاموشی کے ساتھ اپنے خالق کی قبر پر کھڑا آنسو بہا رہا ہے۔

آغا بابر

منٹو اور طوائف

طوائف ہمارے کلاسیکی ادب کی ہیروئن تھی اور بہت دیر رہی۔ مرزا سعید کے ناول "خواب ہستی" میں نسیم اور حسن آفرا دونوں اونچے درجے کی طوائفیں تھیں۔ ادیب اپنی ادبی ضرورت کے مطابق طوائف کو جتنا اونچے درجے کا چاہتا بنا دیتا تھا۔ ہماری تہذیبی زنجیر میں طوائف کو اہم کڑی کی حیثیت حاصل تھی۔ پوری نصف صدی کا ادب اور معاشرہ محض طوائف کی ذات سے متحرک نظر آتا ہے۔ طوائف کہیں علامت ہے، کہیں حوالہ۔ منٹو کے ادب میں طوائف حقیقت ہے۔

بنجر زمین سے فصل بڑی محنت اور مشقت سے اترتی ہے اور وہ بھی صرف اس وقت جب آپ کو بنجر زمین پر اعتماد ہو۔ منٹو کو طوائف پر صرف فنی اعتماد ہی نہ تھا بلکہ وہ طوائف کو ایک مذہب کی طرح مانتا تھا۔ مثلاً مرزا غالب پر فلمی کہانی لکھنے کے لئے جس چیز نے منٹو کو سب سے زیادہ اپیل کیا تھا وہ طوائف کا کردار تھا جسے وہ مسکرا کر ڈومنی کہتا تھا۔

منٹو پہلا ادیب ہے جس نے پرانے ادب کی اونچے درجے کی طوائف کو حسب ضرورت سنوارا نہیں بلکہ اس نے ادب کو کمینی سے متعارف کرایا جو اس کی اپنی دریافت تھی۔ سعادت حسن کو طوائف کا کردار کیوں اپیل کرتا تھا؟

جب سعادت حسن نے ہوش سنبھالا، امرتسر میں پانچ ہزار طوائفیں تھیں۔ یہ عجیب شہر تھا۔ بازار حسن کنڈلی مارے سانپ کی طرح ٹیڑھا میڑھا لیٹا پڑا تھا۔ اس بازار کو کئی بازار کاٹتے مگر مختصر سے کٹاؤ کے بعد یہ لمبا طویل بازار پھر شروع ہو جاتا۔ ان ٹھیکروں اور نگینوں کا ایک روپے سے پانچ ہزار تک مول تھا۔ اور اس کے بعد جان کی بازی۔ جو امیروں کبیروں کے نکاح میں تھیں ان کی ایک اپنی دنیا تھی۔

سعادت حسن بچپن میں نہایت نٹ کھٹ نڈر اور دلیر تھا۔ جب اس نے اس ہجوم دلبراں میں آنکھ کھولی ہوگی تو ظاہر ہے کہ اس کے مزاج نے کیا تاثر قبول کیا ہوگا۔

سعادت حسن اپنے عواقب و عواطف کی وجہ سے ذہنی طور پر جلدی بالغ ہو گیا تھا۔

ادیب صداقت کی تلاش اور حقیقت کی جستجو میں حسن کی دنیا میں جھانکتا ہے۔ حسن اور اسرار اس کے موضوع کے لئے بہت بڑی دولت ہوتے ہیں طوائف کی ذات میں حسن بھی ہے اور اسرار بھی اور جو چیز اس موضوع کو زیادہ پرکشش بناتی ہے وہ انسان کی ازلی کمزوری ہے — جنس —

طوائف کی ادا اور دلبری اور عشوہ طرازی کے درمیان بیچارہ افسانہ نگار کھڑا دیکھتا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ یہ بڑا مشکل فن ہے جو افسانہ نگار سنبھال لیتا ہے، کیوں اٹھاتا ہے؟ اسے اپنی اختراعی ذہانت پر بھروسہ ہوتا ہے۔ اسی کے بل پر وہ اس بار ذمہ داری کو اٹھاتا ہے ورنہ حسن اور اسرار حیات کا گھروہ کیوں جھانکے۔

اسی اختراعی ذہانت ہی کے بل پر مصور پیالیوں میں رنگ گھولتا ہے۔ ایک مرتبہ میرے یہ کہنے پر کہ میں نہیں مانتا آپ نے طوائف کو خطوط اور رنگوں میں قید کیا ہو، عبدالرحمن چغتائی نے مجھے چند وہ تصویریں دکھائیں جن کا موضوع محض طوائف تھا۔ مدعا یہ ہے کہ تمام فنون کا خمیر جن بنیادی عناصر سے اٹھتا ہے وہ ایک جیسے ہوتے ہیں خواہ افسانہ نویسی ہو یا مصوری — ڈی ایچ لارنس ایک جگہ کہتا ہے:

If a woman hasn't got a tiny streak of harlot in her, she's a dry stick as a rule. And probably most harlots had somewhere a streak of womanly generosity. Why be so cut & dried? The law is a dreary thing & its judgements have nothing to do with life

اس جملے میں منٹو کے ان الفاظ پر غور کیجئے۔ ایک جگہ کہتا ہے: "چکی پیسنے والی عورت جو دن بھر کام کرتی ہے اور رات کو اطمینان سے سو جاتی ہے میرے افسانوں کی ہیروئن نہیں ہو سکتی۔ میری ہیروئن چکلے کی ایک ٹکھیائی رنڈی ہو سکتی ہے جو رات کو جاگتی ہے اور دن کو سوتے میں کبھی کبھی یہ ڈراؤنا خواب دیکھ کر اٹھ بیٹھتی ہے کہ بڑھاپا اس کے دروازے پر دستک دینے آرہا ہے۔ اس کے بھاری بھاری پپوٹے جن پر برسوں کی اچٹی ہوئی نیندیں منجمد ہو گئی ہیں، میرے افسانوں کا موضوع بن سکتے ہیں، اس کی غلاظت، اس کی بیماریاں، اس کا چڑچڑاپن، اس کی گالیاں یہ سب مجھے بھاتی ہیں۔ میں ان کے متعلق لکھتا ہوں اور گھریلو عورتوں کی شستہ کلامیوں اور ان کی صحت اور ان کی نفاست پسندی کو نظر انداز کر جاتا ہوں۔"

طوائف کے لوازمات زندگی سے فکر کو تحریک دینے والا سعادت حسن منٹو، اس میدان میں بڑی اخلاقی جرأت اور دلیری سے اترتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا جوہر قابل طوائف جیسی بنجر شخصیت میں بھی پھل اور پھول ڈھونڈ نکالتا ہے۔ کرشن چندر، دیوندر ستیارتھی اور راجندر سنگھ بیدی جیسوں نے طوائف کے موضوع کی طرف رجوع کیا مگر منٹو کی خیال انگیزیوں اور ندرتوں کی بلندی کسے نصیب ہو سکی۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ منٹو طوائف کے کردار اور اس کی پہلو دار زندگی کے جملہ آداب سے واقف تھا۔ اس مخلوق سے اسے لکھنے کے لئے خام مواد ملتا تھا۔ یہ مخلوق اسے بھاتی تھی۔

۱۹۴۳ء میں دہلی کو سجایا جا رہا تھا۔ مارچ کے پہلے ہفتے میں حکومت ہند دوسری جنگ عظیم کی فتح کا ہفتہ منا رہی تھی۔ میونسپل کمیٹی کے وہ فلیٹ جو ریلوے گودام کے سامنے تعمیر کئے گئے تھے، جن میں سے ایک فلیٹ میں "کالی شلوار" والی سلطانہ رہتی تھی، ہمارے سامنے تھے۔ میں اور اعجاز حسین بٹالوی کارونیشن ہوٹل سے نکل کر کشمیری گیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ ان فلیٹوں میں رہنے والی طوائفوں نے جنگ میں انگریزی فتح کی خوشی میں رنگدار کاغذوں کی جھنڈیاں اور زنجیریاں لٹکا رکھی تھیں۔ اعجاز نے مجھ سے کہا "منٹو بمبئی چلا گیا۔ ورنہ ان فلیٹوں پر پھیلنے والی یہ جھنڈیاں اس کے لئے بڑا اچھا موضوع تھا۔"

اس وقت منٹو بمبئی میں اپنے خاص صوفے پر اکڑوں بیٹھا زندگی کے کسی اور بھاگتے ہوئے لمحے کو گرفت میں لینے کے لئے مضطرب تھا۔

دو سال بعد لاہور میں منٹو لکشمی مینشن کے ایک فلیٹ میں اکڑوں بیٹھا زندگی کے بھاگتے ہوئے لمحوں کو اپنے جوہر قابل کی گرفت میں لے کر حرارت اور روشنی بخش رہا تھا۔ اس کے افسانوں میں حرارت اور روشنی کہاں سے آتی تھی؟ یہ حرارت اور روشنی اس روحانی تجربے سے آتی تھی جو جان کھپانے اور لہو جلانے سے حاصل ہوتا ہے۔ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کا سا افسانہ روحانی تجربے کے بغیر ضبط تحریر میں نہیں آسکتا۔ اس روحانی تجربے کے لئے فنکار کو ایک ماہ پاگل خانے رہنا پڑا تھا۔ اس جانکاہی کا ثمر یہ افسانہ تھا۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ منٹو کے فن میں طوائف کا موضوع ایک سدا بہار تخلیقی جذبہ بنا رہا مگر المیہ یہ ہے کہ طوائفوں کی باریکیاں بیان کرنے والا، عمر کے آخری حصے میں خود بھی بن گیا۔ اپنے خاص الخاص صوفے پر نہایت اجلا لباس پہنے اکڑوں بیٹھا ہوا سعادت حسن منٹو مجھے بالکل طوائف معلوم ہوتا جس کے سامنے اس کی ذہانت کا قمقمہ جل رہا تھا۔

اس کو ہمیشہ بجھانے والے لاہور کے پبلشر اور ناشر تھے۔ منٹو اپنا جوہر ان تماش بینوں کے سپرد پچاس روپے، چالیس روپے، تیس روپے پر کرتا رہا۔ ان ناشروں نے منٹو کو اکسایا، بڑھاوے دیئے، پھر ہاتھ کھینچ لیا اور اس کی زندگی کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ جب انسان اپنے ماحول اپنی زندگی اور اس کی ترتیب سے مایوس ہو جائے تو باطنی توازن بگڑ جاتا ہے۔ احساس توازن کو بحال کرنے کے لئے انسان ساتوں عیب کرتا ہے ؎

حسن کا گنج گراں مایہ تجھے مل جاتا — تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

افسانے کی سنگلاخ زمین کو پانی کر دینے والا فرہاد مرتے دم تک ویرانۂ دل کھود کھود کر فن کو نذرانۂ عقیدت دیتا رہا اور کوہکن کے تیشے کی آواز دور و نزدیک سب کو سنائی دیتی رہی مگر آج ؎

آواز تیشہ امشب از بیستوں نیامد — شاید بخواب شیریں فرہاد رفتہ باشد

خالد حسن

منٹو اپنی موت کے دس سال بعد

سعادت حسن منٹو کو ہم سے جدا ہوئے ابھی دس سال ہی گذرے ہیں لیکن یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اردو میں مختصر افسانہ نویسی کا دیوالہ ہی نکل گیا ہو۔ منٹو ہم سے جوانی کے عالم میں رخصت ہوا تھا۔ چالیس سال کوئی زیادہ عمر نہیں ہوتی۔ افسوس کہ موت کے ہاتھوں سے وہ محفوظ نہ رہ سکا۔ اُسے کئی سال پہلے ہی اپنے مرجانے کا علم ہو گیا تھا۔ اکثر بیمار رہنے کی وجہ سے اب اُس کے قویٰ بھی جواب دینے لگے لیکن اس اضمحلال سے بھی اُس کو ایک حظ حاصل تھا۔ مصائب سے لطف اندوز ہونا اُس کی عادت تھی اور یہ عادت زندگی بھر اُس کے ساتھ رہی۔

آزادی کے وقت منٹو بمبئی میں تھا۔ یہاں اُسے دولت بھی حاصل تھی اور شہرت بھی۔ اُس کا اپنا ایک حلقۂ احباب تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بمبئی میں اُس کی طبیعت لگی ہوئی تھی۔ اس شہر سے اُس کو اُنس تھا۔ ایک قسم کی جذباتی علاقہ بندی تھی جو منٹو کی ذات سے علیحدہ نہیں ہو سکتی تھی۔ بمبئی کے کوچہ و بازار۔ زندگی کی ہماہمی سے بھرپور رونقیں، مہکتے ہوئے رات دن چلتی رہنے والی بسیں اور ٹرامیں، چوپاٹی اور جوہو کے دل کشا منظر، سربفلک عمارتیں۔ غلیظ قحبہ خانے و رقاصوں کے جمگھٹ، چلتے ہوئے کاروبار، یہ بمبئی تاجروں اور کمپنیوں کا شہر۔ ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی نگری۔ اسی شہر بمبئی کو منٹو نے اپنی کہانیوں میں زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

بمبئی سے منٹو کو اتنا پیار کیوں تھا۔ یہ بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں اسے ہر طبقے کے لوگوں سے میل جول میسر آ سکتا ہو کیونکہ ہر قسم کے لوگ آسانی کے ساتھ یہاں مل جاتے ہیں۔ اچھے، برے، امیر، غریب، جاہل، پڑھے لکھے، قسمت کے دھنی اور مقدر کے راندے ہوئے۔ یہ شہر ہر طبقے کے افراد سے آباد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو کو کوئی کہانی لکھنے کے لئے اسی شہر سے بہترین کردار نصیب ہوئے۔ یہ شہر اُس کے سراج، بابو گوپی ناتھ، موزیل اور ممد بھائی کا شہر تھا۔ یہاں بازارِ حسن کے ٹھاٹ تھے۔ یہ دانشوروں کا مقام تھا۔ ایکٹروں، ایکٹرسوں کی بیٹھک تھی، مارواڑی سیٹھ لوگوں کا دیس تھا۔ ہو سکتا ہے منٹو کے قلم سے زندہ جاوید ہونے پر بمبئی منٹو کی کوئی یادگار قائم کرلے جس سے یہ اعتراف مقصود ہو کہ منٹو اس شہر کے عاشقوں میں سے تھا۔ بہت سے اہلِ قلم نے اپنے اپنے شہروں کے متعلق لکھا ہے لیکن اُن کی تحریروں میں احساس کی شدت نہیں پائی جاتی۔ وہ تحریریں پڑھ کر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی سیاحتی ادارے کے اشتہار ہوں۔ ان میں اطلاعات کا ذخیرہ تو موجود ہے مگر وہ ذوق و شوق نہیں، مشاہدے کی وہ گرمی اور فکر کی وہ بلندی نہیں جو اپنے پسندیدہ شہر کے در و دیوار اور کوچہ و بازار دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔

وہ کسی حال میں بھی بمبئی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن اسے ایسا کرنا پڑا اور اس کے لئے شاید اُس نے اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کیا ہو۔ ۱۹۴۸ء کے بعد اُس نے بمبئی کے بارے میں جو کچھ لکھا اُس میں احساس کی تلخی کے ساتھ ساتھ رومانیت بھی موجود ہے کیونکہ آزادی کے بعد بمبئی کا سہاگ اُجڑ گیا تھا۔ نئے نئے لوگ آباد ہونے لگے تھے۔ جنہوں نے آتے ہی یہاں کی روایات کے شیشے کو چکنا چور کر دیا تھا۔ مسلا اور کالا کے القاب عام طور پر کانوں میں پڑنے لگ گئے تھے۔ عام داستانوں

بھرا چاقو مارنے اور دنگا فساد کے واقعات رونما ہو رہے تھے۔ ان حالات میں منٹو بمبئی چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ نفرت کی یہ آگ اب ہر طرف پھیل چکی تھی اور سارا شہر اس آگ کی لپیٹ میں تھا۔ حد یہ ہے کہ منٹو کو اپنے جگری دوست شیام کی آواز میں بھی نفرت کا دھچل پن محسوس ہونے لگا۔ اسی لئے اُس نے بمبئی چھوڑنے کا پکا ارادہ کر لیا اور شیام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا "شیام سالے! میں تو پاکستان جا رہا ہوں۔"

پھر چند سال بعد منٹو نے پنڈت نہرو کے نام دو ایک کھلے خط لکھے۔ ان میں سے ایک خط کو تو بہت درد بھرے انداز میں ختم کرتے ہوئے لکھا ہے:

"پنڈت جی! میں نے بمبئی چھوڑ دیا تھا، کیا آپ کشمیر نہیں چھوڑ سکتے۔"

پاکستان پہنچ کر منٹو نے اپنے آپ کو بالکل اُکھڑا ہوا پایا۔ یہاں ہر چیز درہم برہم تھی۔ افراتفری کا عالم تھا۔ کسی کو کیا پڑی کہ پوچھتا آپ کون ہیں۔ جسے دیکھو الاٹمنٹوں کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ کسی بات کی پائیداری کا احساس ہی نہیں تھا۔ ابتری میں آپ جو کچھ بھی کر لیں، کم ہے اور منٹو کے سے شخص سے یہ توقع رکھنا عبث تھا کہ وہ اپنے ضمیر کے خلاف ان دھندوں میں پڑ جاتا۔ یہاں اس کے لئے کوئی ملازمت نہیں تھی۔ نہ کسی کے نام وہ کارخانے اور فیکٹریاں الاٹ کرانا چاہتا تھا۔ ایسے اشاعتی ادارے بھی یہاں موجود نہ تھے جن کا مطمح نظر علم و ادب کی اشاعت ہو، اور نہ ہی ایسے ادبی رسائل کا یہاں وجود تھا جو اہلِ قلم کو ان کی نگارشات کا بہتر سے بہتر معاوضہ پیش کرتے۔ منٹو کے لئے یہ کس قدر نامساعد حالات تھے۔ پھر بھی اُس نے حوصلہ نہیں ہارا۔ وہ ہر افتاد کا مقابلہ کرتا رہا اور وہ بھی اپنے ہی طور طریقوں کے ساتھ۔ اُس کی روش سے کسی کو اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن وہ اپنے ہی بنائے ہوئے راستے پر گامزن رہا۔

غربت و افلاس کی حقیقت کو تسلیم کر لینا ایک جینیئس کے لئے آسان بات نہیں۔ اگر وہ اسے تسلیم کر لیتا ہے تو پھر مشکل ہی سے نباہتا ہے۔ تنگ دستی سے اس کی مصالحت اس لئے بھی مشکل ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے تخلیقی شاہکاروں کا معاوضہ بھی لینا چاہتا ہے۔ سماج سے اُس کے چند مطالبات ہوتے ہیں جنہیں پورا کرنا سماج کا کام ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ انسانی سلوک ہوتا رہے۔ ان حالات میں افراد کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ وہ تو اپنے حالات ہی کی پیداوار ہیں۔ اسی لئے وہ اعمال کے جواب دہ بھی نہیں ہو سکتے۔ ظاہر ہے کہ منٹو کے سوا اگر کوئی اور شخص ان حالات سے دوچار ہوتا تو وہ پاگل بن گیا ہوتا یا دنیا سے ہی کنارہ کشی اختیار کر لیتا، مگر منٹو نے کہانی لکھنا نہیں چھوڑا اور اگر سچ پوچھئے تو منٹو کی بہترین کہانیاں اسی دور کی لکھی ہوئی ہیں۔ ان میں محبت ہے، عشق ہے، ایثار و قربانی کا جذبہ ہے اور اپنے مقصد سے وابستگی ہے۔ ان کہانیوں کے کردار وہ مرد اور عورتیں ہیں جو کسی مریض اور پاگل ذہن کی تخلیق نہیں بلکہ ہماری ہی دنیا کے چلتے پھرتے انسان ہیں۔ ایسے انسان جن کے دل میں انسان کے لئے احترام و ہمدردی کا جذبہ موجود رہتا ہے۔

منٹو کے آخری دنوں میں دنیائے ادب کے بھیڑیوں نے اس کی صلاحیتوں اور زندگی کا عرصہ چھینا شروع کر دیا تھا اور اُس کے خون سے جی بھر کے ہاتھ رنگے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ منٹو نے بھی ان لوگوں کو اپنا خون پینے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اُس کا معمول تھا کہ وہ اخبارات و رسائل کے دفتروں میں پہنچ کر کسی ایڈیٹر کے کمرے میں داخل ہوتا۔ دن بھر کے لئے کرائے پر کیا ہوا تانگہ جس میں سے وہ ابھی ابھی اترا تھا اُس کے انتظار میں کھڑا رہتا۔ ایسے میں اُس کے دل و دماغ پر جیسے لگنے کا خیال بری طرح سوار ہوتا تھا۔ وہ پہنچتے ہی بڑے اکھڑ انداز میں ایڈیٹر سے کچھ پیسے مانگتا لیکن ادھر اُدھر کا بہانہ کر کے ایڈیٹر حضرات اُسے ٹال دیا کرتے تھے اور ساتھ ہی کہانی کا تقاضا بھی کر بیٹھتے تھے۔ منٹو ایک لمحے کے لئے کچھ سوچتا، پھر وہیں بیٹھے بیٹھے لکھنا شروع کر دیتا۔ بس کا غذ کی پیشانی پر وہ لکھتا اور مشین کی طرح تیزی سے لکھنے لگتا۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر کہانی ختم کر کے وہ جھپاک سے ایڈیٹر کے سپرد کر دیتا۔ وہ اپنی تحریر پر نظرِ ثانی کرنے کا عادی نہیں تھا۔ ایک ہاتھ سے کہانی حوالے کرتا اور دوسرا ہاتھ نقدی وصول کرنے کے لئے بڑھاتا۔ رقم گننا اس نے کبھی گوارا نہ کیا کیونکہ وہ اسے گھٹیا اور رذیل حرکت خیال کرتا تھا۔

زندہ یا مردہ مصنفوں کے زمرے میں منٹو کے سوا شاید ہی کوئی اور مصنف ہو جس کے ساتھ اتنی بے انصافی ہوئی ہو جتنی منٹو کے ساتھ ہوئی۔ بظاہر نیک نیت اور با اخلاق پبلشر بھی منٹو کی بے نیازی سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں کسی سے پیچھے نہیں رہتے تھے۔ یہاں اُن اشاعتی اداروں کو جو منٹو سے متعلق

، چکے میں کچھ تو ندامت محسوس ہوگی کہ وہ منٹو کے ساتھ اس کی زندگی میں اور اب اُس کے مر جانے کے بعد کیا کیا سلوک روا رکھے ہوئے ہیں۔ منٹو کی تمام تحریروں کا مجموعہ صرف اس لئے اب تک شائع نہیں ہوا کہ اُردو اہلِ قلم کا ایک خاص گروہ اس کی نگارشات پر ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ اُس کی تحریروں کے جملہ حقوق محفوظ کرانا اور ان حقوق کی تفصیل اور میعاد وغیرہ کا مقرر کرنا ایسے مسائل ہیں جن سے نبٹنے کے لئے وکلاء کا رہینِ منت ہونا پڑتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ منٹو لین دین کے معاملات میں بڑا سیدھا آدمی تھا، ہیر پھیر سے ناواقف۔ کسی پبلشر سے دھوکا کھانے کی تو اس میں صلاحیت بھی موجود نہ تھی۔ اس لئے منٹو اور اس کے پبلشروں کے متعلق اب تو آسانی کے ساتھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کون ظالم تھا اور کون مظلوم!

بہرحال دوسری طرف کوئی ایسی امید لگانا کہ حکومت کا کوئی ادب نواز محکمہ منٹو کی تحریریں ایک مجموعے کی شکل میں شائع کرے گا، ابھی قبل از وقت ہے۔ وقت آنے پر اگر ایسا ہو بھی جائے تو یہ کم سے کم خدمت ہوگی جو منٹو کے لئے کی جائے گی لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ منٹو کے متعلق کوئی نہ کوئی نیا شوشہ نکلتا ہی رہتا ہے۔ ابھی چند روز ہوئے اس کی آخری کتاب کی اشاعت اور فروخت پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم نے منٹو کو ابھی تک معاف نہیں کیا حالانکہ اُسے مرے ہوئے بھی دس سال بیت چکے ہیں۔

منٹو کی وفات کے بعد جتنی کتابیں اس کی زندگی اور فن پر لکھی گئیں۔ ان میں ایک کتاب تو ایسی بھی ہے جسے کمائی کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے مصنف کا دعویٰ ہے کہ وہ منٹو کے آخری دنوں میں اس کا قریبی ساتھی رہ چکا ہے لیکن منٹو کے حلقۂ احباب کو پہچاننے والے اس حقیقت سے لاعلم ہیں۔ اسی طرح اور بہت سے حضرات ایسے ہیں جنھوں نے منٹو کے مرنے کے بعد اس کی شخصیت کو ذاتی شہرت حاصل کرنے کا وسیلہ بنایا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے اہلِ قلم نے اور خود منٹو کے فن کو پسند کرنے والوں نے بہت کچھ تحریر کیا ہے۔ افسوس ہے کہ ان مضامین کو اب تک کتابی شکل میں شائع نہیں کیا گیا۔ حالانکہ ایسا اقدام منٹو اور اس کے ادب کی بہت بڑی خدمت سمجھی جاتی۔ ماہنامہ "نقوش" لاہور نے منٹو نمبر شائع کر کے عظیم خدمت سرانجام دی ہے۔ جناب حامد جلال نے (جو منٹو کے عزیزوں میں سے ہیں)، منٹو کی چند کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ کر کے BLACK MILK کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ یہ مجموعہ لاہور کے ایک انگریزی کتابیں چھاپنے والے ادارے کی طرف سے شائع ہوا تھا مگر چند نامعلوم وجوہ کی بنا پر بازار میں نہ آ سکا اور پریس کے گودام میں ہی ڈھیر رہا جہاں منٹو کی یاد کی طرح اس پر بھی گرد و غبار کی تہیں جم چکی ہیں۔ اس ترجمے کی ایک جلد میں نے بھی دیکھی ہے اور مطالعہ کے بعد اندازہ لگایا ہے کہ مترجم نے بڑی جانفشانی سے کام کیا ہے۔ اس مجموعے کی ایک کہانی "اوڈر" کو امریکہ سے شائع ہونے والے ایشیائی کہانیوں کے مجموعے میں بھی شامل کیا گیا ہے جو عام طور پر بک سٹالوں سے مل جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے کسی اور کتاب کا علم نہیں جو منٹو کو زندہ رکھنے کے لئے منظرِ عام پر آئی ہو۔ ممتاز شیریں کا مقالہ ابھی تک حالِ تشنۂ تکمیل ہے۔ اس کا تھوڑا سا حصہ جو میری نظر سے گذرا ہے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں منٹو کے فن، اُس کے ذہن اور اس کی شخصیت کا اتنا جائزہ نہیں لیا گیا جتنا خود مصنفہ نے اپنے مطالعے کی وسعت پر روشنی ڈالی ہے۔ شاید ہی کسی اور ادبی تحریر میں بڑے بڑے نام گنوانے پر اتنا زور دیا گیا ہو جتنا ممتاز شیریں کی اس تحریر میں ہے۔

یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ منٹو کی تصنیفات کتب فروشوں کے ہاں سے غائب ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کے مرنے کے بعد بہت کم کتابیں دوبارہ شائع ہو سکی ہیں۔ منٹو کے جو بہترین شہکار تھے، وہ بھی صرف ایک ہی بار چھپ سکے ہیں۔ ورنہ وہ بھی اس وقت ذاتی یا پبلک کتب خانوں کی زینت بن کر رہ گئے ہیں۔ اس ضمن میں منٹو کی "گنجے فرشتے" قابلِ ذکر ہے۔ پہلی بار یہ مجموعہ منٹو کی زندگی ہی میں شائع ہوا تھا اور اس کے بعد آج تک اسے دوسری بار چھپنا نصیب نہ ہوا۔ آج یہ حالت ہے کہ اگر ہم کراچی، لاہور، پنڈی اور دوسرے بڑے شہروں میں کتب فروشوں اور کتب خانوں کو چھان ڈالیں تو یہ ضروری نہیں کہ منٹو کی چھپی ہوئی ساری کتابوں کی ایک ایک جلد بھی ہمارے ہاتھ لگ جائے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ منٹو کی کتابوں کی مانگ بڑے شہروں کے مقابلے میں چھوٹے شہروں میں زیادہ ہے۔ حالانکہ بڑے بڑے شہر ادب و ثقافت کے مرکز سمجھے جاتے رہے ہیں۔

نئے اور نو مسلم کی تصنیفات میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی۔ انگریزی سکولوں میں تعلیم یافتہ حضرات منٹو کو اس لئے نہیں پڑھتے کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے دیسی زبان میں لکھا ہے۔ وہ کسی ایسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتے جو ان کے اندازِ انگریزیت کو ٹھیس پہنچائے۔ کچھ دن ہوئے میں نے ایک پڑھے لکھے نوجوان سے دریافت کیا: کیا آپ نے دوستو وسکی کا کوئی ناول پڑھا ہے؟ اس پر نوجوان نے بڑے حقارت آمیز لہجے میں جواب دیا کہ "معاف فرمائیے! مجھے اردو کتابیں پڑھنے کا شوق نہیں!"

یہ حال تو انگریزی سکول میں جانے والوں کا تھا لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم میں مشرقیت کے دلدادہ لوگ بھی منٹو کو پڑھنے کی زحمت نہیں کرتے۔ ان لوگوں کے نزدیک منٹو فحاشی اور عریانیت کا ترجمان ہے۔ وہی دیہاتی قسم کے ادیبوں کی طرح۔ یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج کل بھی منٹو کی کتابیں صرف وہی لوگ پڑھتے ہیں جنھیں منٹو سے شغف ہے۔ میرے احباب میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جو منٹو کو پڑھتے پڑھتے اکتا گیا ہو۔ منٹو کے فن میں اب بھی پہلے جیسی تازگی موجود ہے اور وہ اب بھی ذہنوں کے لئے وجہِ تسکین ہے۔ تیرگی کے چہرے سے روشنی کے جن مقدس لبادوں کو نوچ کر منٹو نے پارہ پارہ کر دیا تھا، وہی زرتار نقاب خود ہماری ہی حوصلہ افزائیوں سے اب پہنے جا رہے ہیں۔ ہمارے سماج کے وہ مکروہ بت جن کی منٹو نے اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی، اب نئے سرے سے انھیں پھر معبدوں میں نصب کیا جا رہا ہے تاکہ پھر ان کی پرستش شروع ہو جائے۔ سماج کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کو سنبھالنے کے لئے منٹو نے اپنے خونِ دل کی کشید پیش کی تھی لیکن یہ لوگ آج بھی اسی طرح گندی نالیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ وہ سماجی تصنعات اور ریاکاریاں جن پر منٹو نے کاری ضرب لگائی تھی، آہستہ آہستہ پھر ہمارے معاشرے کا جزو بن کر ظاہر ہو رہی ہیں۔ وہ مکر و فریب جس کی اصلیت کو منٹو نے روزِ روشن کی طرح ہم پر عیاں کر دیا تھا، اسے آج پھر ہمارے معمولاتِ زندگی میں خاصی جگہ مل رہی ہے اور وہ عزت و اخلاق کے راہزن کہ منٹو ساری عمر جن کا مضحکہ اڑاتا رہا، آج پھر اثر و رسوخ کے مالک بن بیٹھے ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ منٹو نے ان سب عناصر کو ختم کر کے سوسائٹی کو پاک صاف بنا دیا تھا لیکن اس بات سے شاید کوئی شخص انکار کر سکے کہ جب تک منٹو زندہ رہا اور اپنے قلم کی طاقت سے کام لیتا رہا، یہ عناصر بھی خوفزدہ اور سہمے سہمے سے دبکے رہتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ منٹو کے دم سے گناہ میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ نیکی کا لبادہ اوڑھ سکے۔ بدقماش اور آوارہ لوگ بھی اتنے بے حیا اور بیباک ہو کر اپنی پاکدامنی کا کم ہی ڈھنڈورا پیٹا کرتے تھے۔ ان کی ناانصافیوں کی راہیں نسبتاً مسدود رہا کرتی تھیں اور ان کی ذاتی شخصیتیں نئی روشنی اور نئے رجحانات کا لباس بدل کر کم ہی منظرِ عام پر آنے کی کوشش کرتی تھیں۔ لیکن — آج منٹو ہم میں موجود نہیں۔ منٹو مر چکا ہے اور ہم نے اس کی موت پر سوگ بھی تو نہیں منایا۔ منٹو کی یاد میں کبھی کبھی جلسے منعقد کر لینے سے ہم اس فریضے سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس تحریک اور جد و جہد کو آگے بڑھاتے رہیں جسے منٹو نے شروع کیا اور جاری رکھا۔ ریاکاری اور رجعت پسندی کے خلاف ہمارا سماج کے بے رحم شکنجے میں پھنسے ہوئے مظلوم انسانوں کی مدد، رسم و رواج اور قانون کے بندھنوں سے استبداد کی روک تھام لیے اقدامات ہیں جن سے معاشرے کو صالح بنایا جا سکتا ہے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے ادیب اور لکھنے والے اب ان نشتروں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے جن سے منٹو نے بیمار معاشرے کے رستے ہوئے ناسوروں کو کریدا تھا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ منٹو کو فحش نگار کی حیثیت سے بے خطا اور بے جرم ثابت کیا جائے۔ میرے نزدیک اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ بے خطا اور بے جرم تو اسے ثابت کیا جاتا ہے جو خطاکار اور مجرم ہو۔ منٹو نے زندگی بھر انسانی ذہن کو تعصبات اور دوسری برائیوں سے پاک کرنے کے لئے جد و جہد کی اور میری دانست میں وہ ایک کامیاب مصلح ثابت ہوا۔ میرے لئے یہ بات بھی موجبِ حیرت ہے کہ منٹو کے ہمنوا اس کے متعلق بات کرتے ہوئے معذرت خواہانہ طرزِ گفتگو کیوں اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ منٹو اور اس کے فن پر کچھ کہتے ہوئے جھجکتے ہیں اور اس طرح ان کو یہ احساس ہوتا رہتا ہے کہ منٹو کے

متعلق کچھ کہنا جنسی بے راہ روی پر اظہارِ خیال کے مترادف ہے۔ وہ کھلے طور پر اپنے آپ کو منٹو سے ملوث نہیں کرتے اور دیکھا جائے تو ان کی یہی جھجک منٹو شناسی میں سب سے زیادہ آڑے آ رہی ہے۔

ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ منٹو ماضی سے تعلق رکھتا ہے۔ گذرے ہوئے دور میں، جو برائیاں گھن کی طرح ہمارے معاشرے کو چاٹ رہی تھیں، منٹو نے ان برائیوں کو ختم کرنے کے لئے براہِ راست ان کی طرف اشارے کئے تھے۔ اب زمانہ بدل چکا ہے اور ان اعمالِ شنیعہ میں کچھ قدرے تخفیف واقع ہو چکی ہے جو منٹو کے زمانے میں عام ہوا کرتے تھے۔ اس طرح منٹو اپنی تحریروں سے ہمیں گذرے وقتوں میں لے جانے کی کوشش کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ تیزی سے بڑھنے والی آج کی دنیا میں منٹو کا مطالعہ بے سود ثابت ہوگا۔ اس نظریے میں کس قدر صداقت ہے، اس کا آپ خود ہی اندازہ کیجئے میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ منٹو نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے وہ تا حال متروک نہیں ہوئے۔ وہ معائب جنھیں منٹو نے عریاں کیا تھا آج بھی ہمارے معاشرے کا جزو بنے ہوئے ہیں۔

ہمارے وہ نوجوان ادیب جنھوں نے منٹو سے اثر قبول کیا ہے، اُن کے متعلق بھی یہ سننے میں آیا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ اُن کی تحریروں کو منٹو کے فن سے ملوث نہ کیا جائے۔ یہ تو وہی بات ہوئی جیسے آج کل کا کوئی نوجوان اپنے نو عمر دوستوں کی محفل میں بیٹھا ہے۔ اتفاق سے اُس کا سنکی چچا اگر وہاں آ جائے تو ان صاحبزادے کی کوشش یہ ہوگی کہ اس کے دوستوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ صاحبزادے انہی کے بھتیجے ہیں۔ اس سے بڑھ کر ہمارے لئے باعثِ شرم اور کیا بات ہے کہ ہم منٹو کو اس لئے درخورِ اعتنا نہ سمجھیں کہ اس میں دورِ حاضر کی کوئی بات نہیں ہے اور وہ ماضی کا ادیب بن کر رہ گیا ہے۔ یوں اس سے پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا کیونکہ منٹو کے نقوش ہمارے دلوں پر مرتسم ہیں۔ اُس کی روح ہمارے سروں پر منڈلاتی رہے گی۔ منٹو کی روح ہیملٹ کے باپ کی شاہانہ روح ہے جس سے عام حیثیت کے آدمی اگر چاہیں بھی تو کنارہ کش نہیں رہ سکتے

پڑھے لکھے آدمیوں میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو منٹو اور اُس سے متعلق ہر معاملے کو غیر اہم سمجھتے ہوئے تمسخر سے ٹال دیتے ہیں حکومت نے منٹو کی کتاب "شکاری عورتیں" کی اشاعت ممنوع قرار دے دی ہے۔ کسی صاحب نے بذریعہ خط اس پر احتجاج کیا تو اس کے جواب میں جو خط شائع ہوا اُس کا نفسِ مضمون یہ تھا کہ منٹو کی حمایت میں شائع ہونے والا یہ خط پوری طرح "پر لطف" نہیں۔ اسی خط میں یہ ذکر بھی کر دیا گیا ہے کہ "شکاری عورتیں" کو ممنوع قرار دینے کا حکم ذرا دیر سے صادر ہوا کیونکہ عصمت فروشی کے ساتھ ساتھ منٹو کو بھی ممنوع قرار دیا جانا چاہیئے تھا۔

میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ منٹو کے سلسلے میں یہ گھٹیا رجحان آخر کس قسم کی ذہنی و علمی فکر کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس سے نہ تو کسی علمیت کا پتہ چلتا ہے اور نہ ہی اچھے مذاق کی ترجمانی ہوتی ہے۔ ہمیں منٹو کی تمام کتابوں کو پھر سے شائع کروانے کے لئے ٹھوس اقدامات کرنے ہوں گے۔ بظاہر یہ کام مشکل ہے لیکن منٹو کو زندہ رکھنے کے لئے اسے سرانجام دینا ہوگا کیونکہ فن کار کا فن ہی مرنے کے بعد اُسے زندہ رکھ سکتا ہے وہ عوام کے دل و دماغ میں ایک غیر مرئی خیال بن کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کی ذہنی تخلیقات کی نشر و اشاعت ہی اُسے دوام بخشتی ہے۔

منٹو جب تک زندہ رہا اُسے اپنی عظمت کا احساس رہا اور اپنے فن کے زندہ جاوید رہنے کا یقین بھی۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اس کے اس دعویٰ کو زندہ رکھیں۔

احمد شریف

منٹو صاحب

منٹو کو میں نے صرف ایک بار دیکھا تھا وہ ایسے حال میں تھے کہ بہت بے حال تھے۔۔ پئے ہوئے تھے۔۔ ریگل سینما کی دوسری منزل کی راہداری میں ایک بوسیدہ میز پر سر ڈالے پڑے تھے اور ایک ادھیڑ عمر کرسچین عورت میز کے دوسری طرف بیٹھی انھیں نمناک آنکھوں سے تک رہی تھی۔

قتیل شفائی اور احمد ظفر میرے ساتھ تھے۔ جب قتیل نے منٹو کا شانہ ہلا کر انھیں جگایا تو کرسچین عورت کو ناگوار گزرا۔۔۔ منٹو نے سر اٹھایا اور آنکھیں سکیڑ کر قتیل کی طرف دیکھا۔ قتیل نے ہمارا تعارف کرایا اور کہنے لگے "منٹو صاحب میرے دوست آپ سے افسانہ لینے پنڈی سے آئے ہیں"

"مل جائے گا" منٹو نے پیشانی پر سے بکھرے لمبے بال ہٹائے "میرے پاس ایک افسانہ ہے۔۔ خالی بوتلیں، خالی ڈبے"

"منٹو صاحب" قتیل چپکے سے "نیا پرچہ ہے۔۔ خالی بوتلیں، خالی ڈبے چھپا تو مقدمہ کھڑا ہو جائے گا"

منٹو آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرائے اور کہنے لگے "چنگا پہلی چوری تے ای پھاہے لگن دے" پھر بولے "کوئی بات نہیں دوسرا لکھ دوں گا۔۔۔ تیس روپے لوں گا"

بس میں فیصلہ ہو گیا۔ احمد ظفر نے دس دس کے دو نوٹ دیے۔ منٹو نے وہ نوٹ کرسچین عورت کی طرف بڑھا کر کہا "میں نے کہا تھا نا اللہ مالک ہے"

نہ منٹو کا افسانہ ملا اور نہ ہم نے پرچہ نکالا۔

خالی بوتلیں، خالی ڈبے کچھ عرصہ بعد غالباً جاوید میں چھپا تھا۔

ایک بار دہلی میں میری ملاقات راجندر سنگھ بیدی سے ہوئی۔ باتوں باتوں میں اس وقت کے افسانہ نگاروں کا ذکر چھڑ گیا۔۔ سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی کی ان دنوں بہت شہرت تھی۔ میں نے بیدی سے پوچھا "منٹو کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

ہنس کر کہنے لگے "منٹو سب بدمعاش ہے!"

میں ان کی بات سمجھ گیا۔۔ اس پر بھی انھوں نے اپنی بات کی وضاحت کرنے کی ضرورت محسوس کی اور سنجیدہ ہو کر بولے "منٹو بڑے پیر تک مخلص ہے۔ لوگ کہتے ہیں منٹو مداری تھے۔ رنگ برنگے کاغذ منہ سے نکال کر لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتے تھے۔۔ اگر دیکھا جائے تو افسانہ نگار۔۔۔۔۔ وہ جو مر گئے، جو زندہ ہیں اور وہ جو آئندہ افسانے لکھیں گے۔۔ سب مداری ہیں اور زندگی کا تماشہ الفاظ کے ذریعے دکھاتے ہیں۔ کامیاب مداری وہ ہے جو تماشائیوں کو سحر زدہ کر دے اور منٹو نے تو بڑے بڑوں کو سحر زدہ کیا ہے کیونکہ وہ بہت بڑے فن کار تھے۔ اگر میں انھیں بڑا افسانہ نگار نہیں مانتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ میں خود بہت بچھوٹا ہوں"

میں افسانہ لکھتے لکھتے جب کسی جگہ پھنس جاتا ہوں اور افسانہ آگے نہیں چلتا تو منٹو کو پڑھتا ہوں۔ وہ بھی افسانہ لکھتے وقت کئی بار ایسی صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں۔ وہ ایسے موقعے پر بڑی صفائی سے کٹتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا یہ بات یوں تھی ——— اور پہلے کہی ہوئی بات کو بلا تکلف دہرا دیتے ہیں۔ تکرار افسانے کے تاثر کے لئے مہلک ہونے کے باوجود منٹو کے ہاں بُری نہیں لگتی ——— وہ بہت اچھے داستان گو تھے۔

میں منٹو کے فن کی خوبیاں نہیں گنوا سکتا۔ البتہ پڑھے لکھے لوگوں کا کہنا ہے کہ منٹو نے کرشن چندر کی طرح نثر میں شاعری نہیں کی ان کے ہاں زبان کا چٹخارہ نہیں ملتا۔ ان کے ہاں بیدی کی سی گہرائی بھی نہیں اور نہ انھوں نے احمد ندیم قاسمی کی طرح یوں بات کی ہے کہ افسانہ پڑھتے وقت الفاظ کے گھنگھرو کانوں میں چھن چھن بجنے لگیں ——— پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ منٹو کے ہاں وہ کون سی خوبی ہے جس کی بدولت منٹو کی کہی ہوئی بات دل کو لگتی ہے۔

منٹو کے ساتھ موپساں اور او ہنری کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تینوں نے اپنے افسانوں میں اکثر ایک سی تکنیک برتی ہے۔ موضوع اور مواد کے لحاظ سے منٹو کا موپساں اور ہنری کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

منٹو ریاکار نہ تھے۔ ان کی زندگی میں بے شمار ایسے واقعات ملتے ہیں جب انھوں نے بڑی بڑی شخصیتوں کے بارے میں بڑی جرأت اور بیباکی سے برملا اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے منٹو بمبئی سے لاہور آئے۔ ان کے بمبئی میں قیام کے دوران، فکر تونسوی خاصا نام پیدا کر چکے تھے۔ ادب لطیف کے دفتر میں کسی نے منٹو اور فکر تونسوی کا تعارف کرایا۔

آپ ہیں سعادت حسن منٹو اور آپ ہیں رام لال فکر تونسوی"

منٹو نے حیران ہو کر فکر تونسوی کو بڑی سی گالی دی اور کہنے لگے "اوے تو ہندو ایں؟"

اور آگے بڑھ کر گلے سے لگا لیا۔

اس واقعے کا ذکر میں نے یہ بتانے کے لئے نہیں کیا کہ منٹو پکے مسلمان تھے ——— وہ جو کچھ بھی تھے مجھے اور آپ کو معلوم ہے ——— لیکن اتنی سی بات ضرور ہے کہ ان کا دل آئینے کی طرح تھا۔

اردو ادب میں بے شمار اچھے افسانہ نگار ہیں لیکن اردو ادب کے منشی پریم چند کے "کفن" سے لے کر اشفاق احمد کے "گڈریا" تک شاہکار افسانے انگلیوں پر شمار کئے جا سکتے ہیں۔ اس میں کسی کو کلام نہیں کہ کرشن چندر، بیدی اور ندیم چوٹی کے افسانہ نگار ہیں ——— لیکن میں جب ان کے ہاں ان کا شاہکار افسانہ تلاش کرتا ہوں تو فوری طور پر کوئی افسانہ میرے ذہن میں ایسا نہیں آتا جس کو شاہکار کہہ کر کرشن، بیدی یا ندیم کے نام سے منسوب کروں ——— اس کے برعکس جب میں منٹو کے ہاں شاہکار افسانہ تلاش کرتا ہوں تو "ممی"، "ہتک"، "موذیل"، "بابو گوپی ناتھ" "نیا قانون"، "ٹھنڈا گوشت"، "ٹوبہ ٹیک سنگھ" اور "کھول دو" قطار باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم میں سے منٹو کا شاہکار افسانہ تلاش کرو ——— اور میں اس کام کو ہمیشہ اگلی فرصت پر ڈال دیتا ہوں۔

ایوب صابر

ایک مقروض کی وصیّت

(جسارت پر علامہ اقبال سے معذرت کے ساتھ)

ہے لازم کہ سب ہوں عداوت میں گُم   زن و مرد ہوں سخت نفرت میں گُم
جواں سب کے سب ہوں رقابت میں گُم   قبائل ہوں قرضے کی لعنت میں گُم
کہ ہو قرض لینے کی ہمت بلند

نہ کالوں سے ہے اور نہ گوروں سے ہے   تعلق مرا سود خوروں سے ہے
محبت مجھے اُن چکوروں سے ہے   اُنہی سنگدل کالے چوروں سے ہے
غریبوں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

وہ کہتے ہیں کمبخت ڈر ہی نہ جائے   وصولی سے پہلے گذر ہی نہ جائے
یہ بے فیض حرکت بھی کر ہی نہ جائے   ہماری رقم کھا کے مر ہی نہ جائے
یہ مقروض یہ بچۂ ارجمند

سناؤں تجھے ہمنشیں دل کی بات   یہ ہے ایک اندوہگیں دل کی بات
دلوں میں رہے جاگزیں دل کی بات   بجز اس کے کچھ بھی نہیں دل کی بات
وہ پوشیدہ مدفن ہے مجھکو پسند

جو مدفن ہو محرومِ شان و شکوہ   مرے مہربانوں کو ہو جس کی ٹوہ
وہ بے نام سی تربتِ ارضِ روہ[1]   اڑا کر نہ لائے جہاں بادِ کوہ
مرے قرض خواہوں کی گردِ سمند

[1] روہ: سابق صوبہ سرحد کا قدیم نام

ارشد میر

موٹاپا

شخصیت سازی کے لئے موٹاپا نسخۂ کیمیا ہے۔ تاریخ کے اوراق اس امر کے شاہد ہیں کہ موٹاپا اکثر خود بخود آتا ہے۔ لایا نہیں جاتا۔ آپ لاکھ جتن کریں، ہزار پاپڑ بیلیں، اگر آپ کے ہاتھوں میں موٹاپے کی ریکھا نہیں تو آپ ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگانے کے باوجود اس خداداد تحفے سے محروم رہیں گے۔ ڈاکٹروں اور طبیبوں نے بڑی چابکدستی سے اپنی اپنی دکانداری چمکانے کے لئے یہ شوشہ چھوڑ رکھا ہے کہ موٹاپا بیماریوں کی آماجگاہ ہے۔ چنانچہ ضعیف العقیدہ، بھاری بھرکم، بید انگشتی، خود ساختہ اور خاندانی موٹے ان کی متعدد رائے سے متاثر ہو کر ڈائٹنگ کرنے اور موٹاپا دور کرنے کی گولیوں کا استعمال کرتے نظر آنے لگے ہیں لیکن ڈاکٹروں، حکیموں کے لاکھ ہاتھ پاؤں مارنے اور ان کے مریدان باوفا کی مکمل پرہیز کے باوجود موٹاپے کا بال تک بیکا نہیں ہو سکا بلکہ موٹوں کے حدود اربعہ یا حدودِ فرہد میں بے پناہ اضافہ ہوتا گیا ہے۔ اکا دکا ڈبل ڈیکر شاعروں اور تھوک ڈیل ڈول کے ادیبوں کو موٹاپے نے کافی سہولتیں مہیا کیں چنانچہ اب یہ لوگ بوقت ضرورت آسانی سے بیٹھے بیٹھے یا لیٹے لیٹے پیٹ کو بطور میز استعمال کر لیتے ہیں۔

دراصل موٹا ہونے میں کئی انمول اور نادر فائدے مضمر ہیں۔ مثال کے طور پر موٹا آدمی آسانی سے اپنے تیار شدہ پیٹ کو علیحدہ حیثیت میں بطور مونڈھا استعمال میں لا سکتا ہے یا فراخ دل ہونے کی صورت میں دوسروں کی خدمت اقدس میں پیش کر کے انہیں صوفہ سیٹ سے بڑھ کر لطف دلا سکتا ہے۔ پھر چادر کی پیٹ بوقت ضرورت غلاف اور گاؤ تکیہ کا اچھا خاصا نعم البدل ثابت ہو سکتا ہے۔ سیلاب کے دنوں میں موٹوں کو دریاؤں کے ٹوٹتے ہوئے بندوں میں کھڑا کر کے عوام کو عظیم نقصان سے اور ڈوبتے کو تنکے کا سہارا جیسے لایعنی اور فرسودہ نظریے کی بجائے موٹے کا سہارا دے کر بچایا جا سکتا ہے کیونکہ یہ عظیم الجثہ مخلوق نہ صرف بند باندھنے میں کافی موثر ہے، بلکہ ان کے چوڑے اور اسفنج نما اجسام میں دس بیس ہزار کیوسک پانی جذب کرنے اور کھپانے کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ اکثر سوشل قسم کے موٹوں کو بازار سے بنیان، جوتے، موزے وغیرہ جیسے درست اسے مفت کے اصول کے تحت دستیاب ہو جاتے ہیں جو پھٹنے پر اہل وعیال کی دریاں اور جوتے بنانے کے کام آ جاتے ہیں۔ رہائش کی قلت اس دور کا سنگین مسئلہ ہے۔ لیکن موٹوں کی آل اولاد آسانی سے اپنے اباجی کے جہازی جوتوں میں خواب خرگوش کے مزے لے سکتی ہے۔ اسی طرح موٹے آدمی کو دیکھ کر بچے لوگ تالیاں پیٹتے، اس کی ناف میں گولیاں کھیلتے، لمبے چوڑے گہرے اور چکیلے پیٹ پر اچھلتے کودتے کھیل تماشے کرتے پائے گئے ہیں۔ کئی تو مندیل ہو یاری اپنی پیٹوں پر بھی کھانے رکھ کر روکڑ ملاتے ہیں۔ نوح ناروی نے شاید کسی موٹے کو دیکھ کر یوں کہا تھا کہ:

ہر بحر میں ساحل ہوتے ہیں اس بحر میں ساحل کوئی نہیں

رہی ان حضرات کی کمر جسے کمرہ کہنا زیادہ برمحل اور مناسب ہے تو اس کے بارے میں ایک زندہ دل شاعر کا یہ بولتا ہوا مصرع نذر ہے:

دھوم ہے ان کی کمر کے ناپ کی

یہ حضرات پیٹوں پر کمربند نہیں باندھتے بلکہ کمربندوں پر پیٹ باندھتے ہیں۔ یوں متعدد مرتبہ کمربند ٹوٹنے کی صورت میں اونٹ کی رسی کا استعمال بھی ہو جاتا ہے۔

غالب نے "نامے" کو رسا باندھ کر شاعرانہ تعلّی نہیں کی بلکہ حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ رسہ کشی کے مقابلوں میں مخالف ٹیمیں آخر میں ایک موٹے سے کھلاڑی کی کمر میں رسہ باندھ کر بٹھا دیتی ہیں اور پھر جس ٹیم کو جتنا موٹا کھلاڑی دستیاب ہوگا عام طور پر وہی ٹیم فتح و کامرانی سے ہمکنار ہوگی۔ ان دیوپیکروں کی اکثریت رنج و الم سے نابلد ہوتی ہے (وضاحتاً عرض ہے کہ ان میں سے اکثر کا طول البلد تو نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے البتہ عرض البلد ہی عرض البلد ہوتا ہے)۔ اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے ایک دفعہ نہ جانے کس ترنگ میں یوں کہا تھا کہ "شیخ جی فربہ تھے ان کی طبع میں جدت کہاں"۔ لیکن صاحب ہمارے محلے کے ایک زندہ دل اور بے حد موٹے نے جدت طرازی دکھا کر فنکارانہ طور پر خود ہی گرد و نواح کے بچوں کی فوج ظفر موج کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ وہ اسکول سے واپسی پر ان کے جسم کو بطور تختی یا سلیٹ استعمال میں لے آئیں۔ چنانچہ اس سہولت کے پیش نظر بچوں کے شیطانی ٹولے میں سے کوئی شوخ و شنگ بچہ قلم دوات لئے ان کے شہتیر نما بازوؤں پر ہندسوں اور پہاڑوں کی مشق کرتا نظر آتا ہے۔ اس عالم میں یہ صاحب بڑے سکون سے مسکراتے رہتے ہیں۔

موٹے آدمی کو "حصہ بقدر جثہ" کے مصداق والد کی بجائے والدین اور بندے کے برعکس بندگان کہنا چاہیے۔ اس برادری کے لوگوں کو لاری یا گاڑی میں مسافر دیکھتے ہی "جل تو جلال تو" کا ورد شروع کر دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ کمانی توڑ سواریاں دورانِ سفر اونگھنے کی صورت میں جس طرف جھک جائیں اسی جانب لاری یا ریل کار کا رُخ بدل جاتا ہے۔ ایسے ہی حضرات کے حسب حال یہ شعر کہا گیا ہے:

تم تو بیٹھے ہوئے پہ آفت ہو — اٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو

چنانچہ اٹھنے کی صورت میں کئی دفعہ بسیں ہچکولے کھاتی اور ڈولتی دیکھی گئی ہیں۔ بعض میونسپل کمیٹیاں موٹوں کے مکانوں میں پانی کے نل کے کنکشن توڑنے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہی ہیں کیونکہ سینکڑوں گیلن پانی ان کے اجسام کو صرف ڈرائی کلین کے لئے درکار ہوتا ہے۔ میونسپل کمیٹیوں کو یہ انتہائی قدم نہیں اٹھانا چاہیئے بلکہ کنکشن توڑنے کی بجائے ضلعی سطح پر موٹوں سے سڑک گھسائی اور فٹ پاتھ دھنسائی کا علیحدہ ٹیکس وصول کرنا چاہیئے۔ پھر ان پر تہہ بازاری لاگو کرنی چاہیئے۔

موٹوں کا ناپ لینا بھی بڑے دل گردے کا کام ہے۔ بڑے بڑے اہل خیاط ان سے پناہ مانگتے ہیں۔ اکثر لطیف الجثہ درزی تو شرمن ٹینک جیسے پیٹنٹ وضع کے موٹوں کا نام لیتے ہوئے پسینے میں تر اور کبھی کبھار نیم بیہوش بھی ہو جاتے ہیں۔ ان گرانڈیل شخصیتوں کا یہ دلچسپ پہلو خوب ہے کہ موسم سرما میں تو ان کے چو بارے ہوتے ہیں مگر موسم گرما ان کے لئے وبال جان بن کے آتا ہے۔ خس کی ٹٹیوں، برف اور پنکھوں سے ایک منٹ چھٹکارا ملا تو پسینے سے شرابور۔ دو چار قدم چلے تو نظام تنفس درہم برہم۔ کم خوابی اس دور کا عام مرض ہے لیکن موٹے آدمی کو یہ مرض لاحق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ شخص قسط وار سونے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اگر کسی وقت سونے کے موڈ میں نہ بھی ہو مگر اس کے جسم کا کوئی حصہ آرام کرنے کے لئے بیتاب ہو تو یہ بلا چون و چرا اپنی آٹومیٹک مشینری کے اس حصے میں لچک پیدا کر کے اسے جمہوری تقاضوں کے پیش نظر اور آزادیٔ رائے کے احترام کے نقطۂ نظر سے سلا دیتا ہے۔ چنانچہ اکثر پلکیں آپ سے بڑے زٹے کی گفتگو میں مصروف ہوں گے مگر ان کی ٹانگیں یا بازو وغیرہ سوئے ہوں گے۔

انگلستان کے مشہور ڈراما نگار برنارڈ شا اپنے ہم عصر معروف موٹے مزاحیہ انشاپرداز چسٹرٹن کو "ہنڈرڈ ٹن" کہا کرتے تھے۔ ٹن کے سلسلے میں مزاحیہ شاعر جناب مجید لاہوری مرحوم کا ایک لطیفہ بھی حاضر خدمت ہے۔ ایک دفعہ انھیں ایک دھان پان سا عقیدت مند ملنے آیا، جو دوران گفتگو انھیں بڑے انکسار اور لجاجت سے جناب من کے خطاب سے نوازتا۔ چند بار اس گردان کو سننے کے بعد مجید لاہوری کی رگ ظرافت پھڑکی اور انھوں نے پان کی جگالی کرتے کرتے بڑی سنجیدگی سے فرمایا: "حضرت انکسار و کسر نفسی و بخل سے کام نہ لیجئے۔ مبالغہ نہیں تو کم از کم صاف گوئی سے کام لے کر میری سو فیصدی خالص تعریف فرماتے ہوئے مجھے جناب ٹن ہی کہہ لیجئے کیونکہ مجھے من کا خطاب دینا تو پہاڑ کو رائی اور ہاتھی کو چیونٹی بنانے کے مترادف ہے۔ ہمارے ہاں تو من چالیس سیر کا ہوتا ہے لیکن ایران میں من تین کیلو یعنی سوا تین سیر کا ہوتا ہے۔ اس حساب سے تو شیر خوار بچے کو بھی جناب من کا خطاب عطا کیا جا سکتا ہے۔"

موٹوں کو دیکھ کر اکثر گھوڑے بھڑکتے دیکھے گئے ہیں۔ چنانچہ موٹی سواریوں کو تجربہ کار اور خرانٹ کوچوان تانگے کے عقب سے سوار کراتے ہیں اور گھوڑے بے خبری میں مارے جاتے ہیں۔ موجودہ ٹیڈی اور بودے موٹوں کے برعکس پرانے زمانے میں ان زود ہیکلوں کا ہاتھی تک بھی وزن برداشت کرنے سے قاصر تھے۔ چنانچہ حالیہ ریسرچ کے مطابق راجہ پورس کی شکست کا واحد سبب بھی اس کے توندیل سپاہی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تاریخی شکست کے بعد برصغیر کی فوج میں توندیلوں کو قانوناً و حکماً بھرتی نہیں کیا جاتا تھا۔ میرے ایک قریبی موٹے دوست جنھیں میں متحرک پہاڑ کہتا ہوں، بڑے خوش خور ہیں۔ ان کی زندگی کا ماٹو یہ ہے:

میں شہید دیگ ہوں ہوٹل میں ہو تربت مری　　　خانساماؤں کے کندھوں پر اُٹھے میت مری

خوش خوراکی کے بعد ان کے افضل الاشغال میں سے ایک یہ ہے کہ وہ خاندانی یا پلے پلائے گھوڑے ٹیسٹ کرتے رہتے ہیں۔ گذشتہ سال ایک یخ بستہ رات کو ایک کوچوان لاہور شہر کے ایک چوراہے میں گلے کی رگیں پھلا پھلا کر نیلا گنبد جانے والی دو سواریوں کو مفت لے جانے کی خوش خبری سنا رہا تھا۔ اس دلچسپ گرنزال آواز پر میں تانگے کے نزدیک گیا تو وہ پر شکوہ شخصیت پچھلی سیٹ پر براجمان تھی اور بے چارا کوچوان کافی دیر سے وزن برابر کرانے کے لئے صلائے عام کی رٹ لگا رہا تھا۔ بچوں قسم کے ایک اور موٹے حضرت کا واسطہ ایک زندہ دل مگر جھکڑ کوچوان سے پڑا۔ انھوں نے ایک دفعہ لاہور ریلوے اسٹیشن پر ایک کوچوان سے پوچھا "کیوں میاں چوک لکشمی کے کتنے پیسے لو گے؟" کوچوان نے ایک آدھ منٹ تک ان کا جائزہ لیا اور پھر بڑے دلربایانہ بلکہ دوکاندارانہ سے کہا "صرف دو آنے من!"

اسی طرح ڈبل عرض کے ایک ایسے ادیب کا بھی ایک واقعہ ہے جس کی توند اس انداز سے تانگے پر ٹکی ہوئی تھی جیسے اس نے توند کو آگے روانہ کر دیا ہے اور خود اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ ادیب نے بڑی شان سے تانگے والے سے پوچھا "کیوں بھئی موچی دروازے کے کتنے پیسے؟" تانگے والے نے کہا "صرف ایک روپیہ!" ادیب درشت لہجے میں بولا "غضب خدا کا دلی دروازہ سے موچی تک کا ایک روپیہ؟ میاں ہوش کے ناخن لو، میں تو صرف آٹھ آنے دوں گا۔" اس پر مرنجاں مرنج کوچوان بولا "منظور ہے حضور، لیکن اس شرط پر کہ دو پھیرے کر لیجئے نصف پہلے چھوڑ آؤں گا اور نصف بعد میں لے جاؤں گا۔"

انگلستان میں حال ہی میں ایک "لارج گرلز کلب" بنائی گئی ہے جس کی جملہ اراکین موٹی اور جسیم عورتیں ہیں۔ یہ کلب تھوڑے ہی عرصے میں اپنی کشش اور انفرادیت کی بنا پر کافی مقبول ہو چکی ہے۔ موٹے مردوں اور پرستاران فن موٹاپا کے لئے یہ لمحۂ فکریہ ہے۔ انھیں بھی پہلی فرصت میں ایک "گرینڈ ٹرنک مینز کلب" یا "ڈبل ڈیکر مینز ایسوسی ایشن" کا اہتمام کرنا چاہیئے۔

مظفر حنفی

وقت کے حمام میں

ٹھیک پندرہ سال بعد
وہ مجھے کل شام اک بھٹیارخانے میں ملا تھا
دیر تک اک دوسرے سے ہم گلے ملتے رہے
اور لنگڑی یاد کو سگرٹ سے سہلاتے رہے
اُس نے کہا:
یاد ہے وہ اُونٹ جو انگلش پڑھاتا تھا ہمیں؟
وہ چنے کے کھیت والا واقعہ؟
رات میں گنّے کی چوری؟
دوپہر میں آم کے باغوں پہ ڈاکے؟
اور لوگوں کا ہمیں ہمزاد کہنا،

یاد ہے؟
مسکرا کر میں نے اپنا سر ہلایا اور پوچھا:
کیا تمہیں بھی یاد ہے
گاؤں کا گندہ سا وہ تالاب؟
ہم ننگے نہاتے تھے جہاں؟
وہ ہنس پڑا
دیر تک اک دوسرے کو دیکھتے
خاموش ہم بیٹھے رہے
ان کہی باتوں کو بھی سنتے رہے
آخرش میں نے کہا:
آؤ تم کو شہر کے کچھ خاص لوگوں سے ملاؤں
اُس کی بوسیدہ قمیص اور "چیتھڑا پتلون" ہکلانے لگے
"یار کل سے پاؤں میں تکلیف ہے!"

جابر علی جابر — خالد احمد — زاہد فارانی

میری رائے میں —

ہوا میں تحلیل ہوتا ہوا شعری تجربہ

تازہ "فنون" میں قاضی عبدالقادر کا مضمون پڑھ کر افسوس بھی ہوا اور حیرانی بھی۔ افسوس اس لئے کہ آپ نے اسے سنجیدگی سے چھاپ دیا اور حیرانی اس لئے کہ آخر صاحب مضمون کا مقصد کیا ہے؟ مضمون کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ شعری تجربے کی اصطلاح کو یک قلم موقوف کر دینا چاہیے کیونکہ یہ منطقی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ عبدالقادر صاحب نے اپنے اعتراضات کی بنیاد کن نقادوں یا نقادوں شاعروں کے "بیانات" پر رکھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ لاہور کے چند شور مچانے والے نوجوانوں کی باتوں سے انھوں نے شعری تجربے کے متعلق کچھ الٹی سیدھی باتیں سن لی ہیں اور ان باتوں کی "جزویت" سے فائدہ اٹھا کر اور منطق کی کسوٹی پر کس کر "شعری تجربے" کو بے معنی قرار دیدیا ہے اور یوں اپنی "فلسفیانہ تحلیل" سے اس اصطلاح کو ہوا میں "تحلیل" کر دیا ہے۔

قاضی صاحب فن شاعری اور فن تنقید سے یکسر بے بہرہ معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، انھوں نے اسی سال فلسفہ میں ایم اے کیا ہے اور نوجوان دانشوروں کی الٹی سیدھی باتیں سن کر "شعری تجربے" پر پل پڑے ہیں۔ انھوں نے فن شاعری یا فن تنقید پر کبھی غور نہیں کیا ورنہ وہ منطق کے ہتھیار لے کر حملہ آور نہ ہوتے اس میں قصور سراسر ان نوجوان نقاد و شاعروں کا ہے جو نئی تحریکیں چلانے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ جب سے سمبلزم، امیجزم، آہنگ پرستی اور ایسی چھوٹی چھوٹی تحریکیں چلی ہیں اور ان کے بانیوں نے ایک دو نظمیں لکھ کر شہرت کمائی ہے اور پھر چند سال کے بعد ہیوم جیسے سربرآوردہ دانشور تاریخ ادب میں اپنا نام لکھوانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ہمارے نوجوان بھی ان کی نقل کرتے ہیں اور گروپ بنا کر اور "انجمن تصنیف باہمی" بنا کر تحریکوں کے بانی اور ارکان بن جاتے ہیں (تفصیل کی ضرورت نہیں) ہماری تنقید میں عجیب و غریب قلا بازیاں لگائی جا رہی ہیں۔ آج سے سو سال پہلے میتھیو آرنلڈ نے انتشار کا رونا رویا تھا۔ آج اگر آرنلڈ آ کر دیکھے تو اسے انتشار کے صحیح معنی سمجھ میں آ جائیں قاضی صاحب نے کسی ادھ مغربے نوجوان شاعر سے سوال کیا ہوگا کہ کیا شاعری اپنا معروض آپ ہے؟ ظاہر ہے جواب دینے والا "اعظم شاعر" کیسے نہ کہے کہ شاعری اپنا معروض آپ ہے چاہے وہ معروض کے مفہوم سے آگاہ ہو نہ ہو۔ منطقی نے اپنی منطق کا وار کر دیا اور "شعری تجربہ" دیوار سے جا لگا۔ دوسرے اعتراضات یعنی شاعری کی جزوی تعریفوں (عضویاتی تبدیلی، تصوریت، وغیرہ) سے فائدہ اٹھا کر کئے گئے ہیں۔ غرض شاعری کو نادان دوستوں نے مروایا اور شعری تجربے جیسی کارآمد اصطلاح کو قاضی صاحب کی منطق کے آگے سرنگوں کر دیا۔ میں نے اوپر چھوٹی چھوٹی تحریکوں کا ذکر کیا تھا۔ ان چھوٹی چھوٹی تحریکوں کے پیچھے دو چیزیں کام کر رہی ہوتی ہیں۔ جلد شہرت پانے کا جنون اور اوریجنل ہونے کا وہم۔ یہ نوجوان بوڑھے پروفیسروں کو بھی نرم کر لیتے ہیں۔ ڈاکٹر اجمل نے میجر اختر احسن کو "عظیم موجد" کہا کیونکہ انھوں نے اردو شاعری کے آہنگ کو ناقص قرار دیا تھا۔ ایسی گندی ذہانت اور جدت آج اکثر دیکھنے میں آتی ہے اور ہم آپ سے سیدھے سادے ادھیڑ عمر دل کو الو بنا رہی ہے۔ شاعری کی جامع تعریف تو ان سے ہو نہیں سکتی۔ جدت کی ادا دکھانے کے لئے لازمی ہو جاتا ہے کہ شاعری کے کسی ایک پہلو کو لے کر اس پر ایک نئی تحریک (ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا اسی کو کہتے ہیں) کی بنیاد رکھی جائے جیسے علامت نگاری، امیجزم، آہنگ پرستی وغیرہ وغیرہ۔ کیا آپ سلیم احمد، ظفر اقبال اور افتخار جالب کے ہتھکنڈے نہیں دیکھ رہے ہیں؟

چائے خانوں میں بیٹھ کر پاگلوں کی طرح شور مچا مچا کر ادبی ماحول کو نئے تصورات کی تیز روشنی سے چندھیانا اس گروہ کا امتیازی کارنامہ ہے۔ یہ گر انھوں نے ایلیٹ سے سیکھا ہے جس نے پہلے ملٹن کو رگڑا۔ پھر شاعری کی ایک جزوی تعریف کر کے اپنی شاعری کو آگے بڑھایا۔ پھر ملٹن سے معافی مانگ لی خیر وہ تو زبردست ذہن رکھتا تھا اور ذمہ داری کا احساس بھی۔ اس نے اپنی شاعری کو تنقید اور علمیت سے منوا لیا ہی گر پروفیسر قسم کے شاعر بھی آزما رہے۔ جیلانی کامران، صدیق کلیم قسم کے لوگ — ابھی چند روز ہوئے جیلانی کامران کو ملتان کے ایک پروفیسر صاحب نے میٹھو آرنلڈ سے مشابہت دیدی ذہیری ایسی طبیعت خراب ہوئی کہ محفل سے باہر نکل آیا۔ دوستیاں استوار کر کے رسالوں پر قبضہ کرنا ایک ایسا طریق کار ہے جو اپنے مقابلے کر کے کامیاب ہوتا ہے۔ کراچی میں یہ وبا زیادہ ہے۔ لاہور میں بھی کافی حد تک موجود ہے۔ "سیپ" اور "تحریک" میں شمس الرحمٰن فاروقی کے مضمون دیکھ لیجئے جرأت رندانہ کس طرح شور مچا مچا کر رسالوں پر قبضہ جا رہی ہے یہ ایسے لوگ ہیں جو اپنی "گونگی" نظموں کی خاموشی کو لمبے لمبے مضامین سے پر کرتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو پڑھے لکھے ہیں مگر بدقسمتی سے اچھے شاعر نہیں ہو سکے۔ اس لئے جرأت رندانہ مضامین کی مدد سے اپنی شاعری کے بازار کو رونق دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

ساقی فاروقی صاحب کی کتاب کے اشتہار کے ساتھ ان کا جو شعر منسلک ہوتا ہے، بالکل بے اثر اور ناکارہ ہے۔ خصوصاً دوسرا مصرع:

تو کالی گھٹا ہے تو برس کیوں نہیں جاتی

استفہامی انداز نے مصرع کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ ساقی فاروقی، اعجاز فاروقی، شمس الرحمٰن فاروقی کے مضامین اور لمبے لمبے خطوط پڑھنے تو توقع ہوتی ہے کہ نظمیں بھی اچھی ہوں گی۔ مگر جب نظمیں پڑھتے ہیں تو ہمیشہ "دوچار ہاتھ لب بام رہ جاتا ہے" نظمیں جانیئے پچھلے فنون (شمارہ ۶) میں فہمیدہ ریاض کی نظموں اور باقی صدیقی کی غزلوں کے سوا مجھے کچھ پسند نہیں آیا (فیض کی نظم بلیک آؤٹ بھی)۔ تازہ شمارے (۷) میں احمد فراز کی نظم صحیح شاعری کا نمونہ ہے یعنی تاثر مکمل اور گہرا ہے۔ نظم "بام" پر پہنچ گئی ہے۔

دیکھا آپ نے جدا اقبال کے اس شعر کو:

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو　　طشت افق سے لے کر لالے کے پھول مارے

تجریدی کہا ہے تو یہ یکسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ یہ تصویر ہے تجرید نہیں ہے۔ اردو غزل کا محبوب بھی تجریدی نہیں ہے۔ اس کا سراپا صاف نظر آ جاتا ہے۔ مرقع چغتائی ہی میں دیکھ لیجئے۔ آپ کی بات ایسی ہے جیسے ہمارے بعض علما اشتراکیت کے غلبے سے متاثر ہو کر کہہ دیا کرتے ہیں کہ اسلام بھی اشتراکیت ہے۔

میں نے مجبور ہو کر یہ سطریں لکھی ہیں۔ ایسے مضامین کے پیچھے کوئی تعمیری خلوص نہیں ہوتا۔ صرف اپنی علمیت اور انفرادیت کا رعب گانٹھنا ہوتا ہے۔ اگر صاحب مضمون نے ایک آدھ بھی تنقید کی کتاب پڑھی ہوتی تو کبھی ایسا "منطقی مضمون" نہ لکھتے۔

سید جابر علی جابر (ملتان)

تمہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

ایک صاحب ایک ادیب کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار نہایت بیباک انداز میں کر رہے تھے کہ ان کے پاس بیٹھے ہوئے ایک اور صاحب نے انھیں ٹہوکا دیا اور اشارہ کیا کہ حضرت تو سامنے ہی تشریف فرما ہیں۔ ان صاحب نے فوراً ان الفاظ میں معذرت طلب کی: "میں بہت شرمندہ ہوں اور بے حد معذرت خواہ۔ مجھے علم نہ تھا کہ آپ یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ اگر مجھے علم ہوتا اور رائے کا اظہار بھی ضروری ہوتا تو میں یقیناً اظہار تو اسی رائے کا کرتا لیکن الفاظ یہ نہ ہوتے!"

شہریار کی کتاب "اسم اعظم" پر حضرت سیف زلفی کا تبصرہ پڑھ کر مجھے یہ واقعہ یاد آ گیا۔ یقیناً تبصرے کی موجودہ شکل ادارتی قطع و برید کے بعد کی ہوگی اصل تبصرہ تو نہ جانے کیا "چیز" ہوگا۔

شہریار ایک ذہین فن کار ہے اور شاید سیف زلفی صاحب کو بھی اس سے انکار نہ ہو، مجھے اعتراف ہے کہ صرف ذہانت کے بل بوتے پر فن کار عظیم فن کار نہیں ہو جاتے۔ اس کے لئے مسلسل محنت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے جو مشقت کی حدود چھونے لگتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جناب سیف زلفی شہریار کی ریاضت فن سے مطمئن نہ ہوں لیکن اس بے اطمینانی کا اظہار ایک ادیب کی زبان میں کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح ہم اسے فن میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں کہہ سکتے، "تبصرے کا آخری فقرہ نہ ہوتا۔ اگر تنقید اور تبصرہ نگاری اسی چیز کا نام ہے تو اس تبصرے پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا جا سکتا ہے "سیف زلفی کے اس تبصرے کی اشاعت اردو کے تنقیدی ادب میں کوئی گراں قدر اضافہ نہیں ہے" لیکن میں کسی حال میں یہ نہیں کہوں گا کیونکہ اس طرح مجھے خود اپنے آپ سے بھی پوچھنا پڑ جائے گا کہ "تمہیں کیوں کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟"

شہریار، جہاں تک میں اسے پا سکا ہوں، ایک ذہین، باشعور اور باصلاحیت فن کار ہے۔ اس کی شخصیت، اس کے فن کے توسط سے، جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں، کافی جاذبیت رکھتی ہے اور اپنے فن کے آئینے میں وہ ہر طرح ایک متوازن شخصیت نظر آتا ہے۔ جو ایک اچھے فن کار اور ایک اچھا مستقبل رکھنے والے فن کار کے لئے بنیادی ضرورت ہے۔

شہریار کی غزل کے بارے میں اچھی رائے رکھنے والا قاری سیف زلفی کا یہ فقرہ پڑھ کر چونک اٹھتا ہے "لیکن غزلوں میں ایک "نئے تغزل کی لے" ہمیں اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی۔ غزل کو شہریار آگے نہیں بڑھا سکے جبکہ ان کے بعض ہمعصر ان سے آگے نظر آتے ہیں" کسی نقاد کا قول ہے کہ "عظیم شاعری روایت سے کم از کم انحراف سے جنم لیتی ہے"۔ انحراف بہر حال ضروری ہے۔ اسی خفیف سے انحراف میں فن کار کو اپنی شخصیت، اپنا مخصوص لہجہ اور اپنا انداز فکر سب کچھ سمو دینا پڑتا ہے اور یہ پل صراط سے بخیر و عافیت گزرنے سے کم مشکل نہیں مجھے معلوم نہیں سیف صاحب غزل کو آگے بڑھانے سے کیا مراد لیتے ہیں۔ غزل کی موجودہ شکل اتنی غیر اطمینان بخش نہیں۔ اگر جدید دور اپنی شاعری کے بنے بنائے سانچوں میں خوبصورت الفاظ ٹھونس ٹھونس کر شعر پر شعر "تیار" کرنا غزل کو آگے بڑھانا ہے تو یقیناً شہریار غزل کو آگے نہیں بڑھا سکا لیکن وہ اردو غزل کی عظیم روایات کو جو اسے درد، میر، غالب، حالی، اقبال، ندیم اور فیض سے ملی ہیں، آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ اس میں کہاں تک کامیاب ہے، اس سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے لیکن یہ فتویٰ صادر کر دینا کہ "شہریار غزل کو آگے نہیں بڑھا سکے" درست نہیں۔

اس بے دلیل فتوے کے ساتھ ایک اور اعلان بھی فرمایا گیا ہے کہ شہریار کے بعض ہم عصر شعرا اس سے آگے نظر آتے ہیں۔ اس کے لئے صرف یہ عرض ہے کہ اردو ادب پوری رفتار سے تخلیق ہو رہا ہے اور شہریار بھی اس میں اپنا حصہ بخوبی ادا کر رہا ہے۔ لیکن موجودہ تخلیقی ادب کا معیار کیا ہے؟ کون آگے ہے اور کون پیچھے؟ اس کا فیصلہ میں یا سیف صاحب نہیں بلکہ وقت کرے گا کیونکہ ہم دونوں فرد ہیں اور وقت افراد کی طرح متعصب نہیں ہوتا۔

خالد احمد (لاہور)

فنون ۵ کا جائزہ

زیر نظر "فنون" (۵) کی سب سے بڑی کشش شفیق الرحمن کا طویل مختصر افسانہ "دجلہ" ہے۔ خود "دجلہ" کا لفظ ہمارے شعر و ادب میں ایک تہذیبی علامت کی حیثیت رکھتا ہے اور ہمارے افسانہ نگار نے مشرق و مغرب کی قدیم و جدید تہذیبوں کے ملاپ اور ارتقا کی طویل داستان اس خوبصورتی سے

سنائی ہے کہ سہ صفحے پڑھ جانے کے بعد بھی قاری کا ذوق و شوق اور تجسس ختم نہیں ہوتا۔ کسی عظیم ناول کے مواد کو ایک مختصر افسانے میں سمیٹ دینا شفیق الرحمن جیسے ذہین فن کار ہی کا کام تھا۔ ان کے لطیف مزاح، روانیٔ طبع اور قوت بیان نے کہانی کو گیسوئے دجلہ کی طرح تابدار بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ منیر احمد شیخ کا افسانہ "لمحے کی بات" ہمارے اُن پڑھے لکھے نوجوانوں کے المیے کا اظہار ہے جو اپنی مغرب زدگی کے باعث حقیقی زندگی سے کٹ چکے ہیں اور اطمینان کی دولت سے محروم ہو چکے ہیں۔ محمد خالد اختر کی مہم جوئی بڑی کامیاب جا رہی ہے۔ تیکھے انگریزی لہجے میں اپنی سرزمین کی باتیں سنانا انہیں خوب آتا ہے۔ رفیعہ نسیم احمد کا انشائیہ بہت پُر لطف اور ذہانت آمیز ہے۔ ان کے انشائیے کے بعد ماہرینِ لسانیات پر کامیاب طنز کرنے کا شاید ہی کوئی پہلو باقی رہا ہو۔ شعری تجربے پر غور و فکر کرنے میں قاضی عبدالقادر کی محنت قابل داد ہے لیکن میری ناقص رائے میں آمدِ آورد کی پہلی اور آخری شہادت خود شعر ہوتا ہے۔

پروفیسر مجیب احمد خاں اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے تجریدی مصوری کے بارے میں آپ کی رائے سے بجا طور پر اتفاق کیا ہے۔ آپ نے ان مصوروں کے ہاں قول و فعل کے جس تضاد کا ذکر فرمایا ہے۔ ہمارے کچھ افسانہ نگار اور شاعر بھی اس تضاد کا شکار ہو چکے ہیں۔ حیرت ہے کہ اپنے معاشرے اور اپنی زندگی سے بے تعلق رہنے کے باوجود یہ لوگ فنکار ہونے کے دعویدار ہیں۔ آپ نے اپنے مضمون میں فنی تجرید کا جو صحیح مفہوم واضح کیا ہے خدا کرے یہ لوگ اسے سمجھ پائیں۔

حصّۂ شعر میں مختار صدیقی نے اپنی نظم "مجابات" میں اور احمد فراز نے اپنی نظم "دو زناجوں نژاد" میں خیال کی جدت اور اظہار و بیان کے حسن کا اچھا امتزاج پیش کیا ہے۔ الیاس عشقی اپنی نظم "کا نزکنٹ برج" اگر رومن رسم الخط میں لکھتے تو قارئین کو پڑھنے میں آسانی ہوتی۔

غزلوں میں شکیب مرحوم کی آخری غزل اُن کی فنی عظمت کا بھرپور اظہار ہے۔ مظفر علی سید، شہزاد احمد اور سیف زلفی کی غزلیں اس بے بنیاد مفروضے کی نفی کرنے کے لئے کافی ہیں کہ صنف غزل میں ہمعصر عہد کے خیالات اور مسائل پیش نہیں کئے جا سکتے۔ آپ کی غزل کا مقطع ؎

اب تو پتھر کے زمانے سے نکل آؤ ندیمؔ
اب تو سوچوں کے تصادم سے شرارہ نکلا

ان لوگوں کو دعوتِ فکر دیتا ہے جو اپنے عہد کی قدروں کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں۔ موتید کے پُر معنی سرورق نے شمارے کا ظاہری حسن دوبالا کر دیا ہے۔

علمی پرچوں کے اس قحط میں "فنون" کا وجود شائقین ادب کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ قارئین کو ہمعصر ادبی اقدار سے ہمہ وقت آگاہ رکھنا ہمیشہ "فنون" کا نصب العین رہا ہے۔ "ہمارے شاعر" کے زیر عنوان آپ نے نئے شعراء کو قارئین سے ایک وسیع تر پس منظر میں متعارف کرانے کا جو سلسلہ شروع کر رکھا تھا وہ اسی نصب العین کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تھا لیکن اس کے بند ہو جانے سے یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ "فنون" کا یہ عظیم نصب العین کہیں فن کاروں کی انا یا زیادہ کھلے لفظوں میں معاصرانہ چشمک کی بھینٹ نہ چڑھ جائے۔ لیکن مجھے یقین ہے آپ سے اس سلسلے کے دوبارہ اجراء کی درخواست کرنے میں تمام وابستگانِ فن میری ہمزبانی کریں گے اور اہلِ فن سے زیادہ وسیع النظر کون ہو سکتا ہے؟

زاہد فارانی (لاہور)

فتح محمد ملک ——— محمد خالد اختر ——— محمد کاظم

آغا سہیل ——— سیف زلفی ——— حسین شاہد

تبصرے

دردِ آشوب[5]

مصنف: احمد فراز

ناشر: کتاب نما، راولپنڈی

صفحات: ۲۴۰

قیمت: پانچ روپے

یہ واقعہ ہماری ادبی اور تہذیبی تاریخ میں یادگار رہے گا کہ سن پچاس کے لگ بھگ ترقی پسند ادب کی تحریک اپنی مقبولیت کی انتہا پر تھی۔ حساس اور بے چین نوجوانوں کے لئے اس میں بے پناہ کشش تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ سانحہ بھی یادگار رہے گا کہ:

ہو گئے اپنے طراروں میں گرفتار آہو

یعنی اسی دور میں انجمن ترقی پسند مصنفین نے تنگ نظر ادبی آمریت کو نظریاتی استقامت کا پر فریب نام دیا اور قرار پایا کہ ترقی پسند رسائل اور جرائد میں نہ تو کسی غیر ترقی پسند شاعر کی ترقی پسند نظم شائع ہوگی اور نہ ہی کسی ترقی پسند ادیب کی کوئی تحریر غیر ترقی پسند رسائل میں بار پاسکے گی۔ آزادیٔ اظہار کی خاطر قابلِ فخر اور بے مثال قربانیاں دینے والوں کی انجمن کی طرف سے آزادیٔ اظہار پر اس پابندی نے جس ادبی سیاست کو جنم دیا وہ بالآخر سیاسی ادب تک کی تخلیق میں حائل ہو کر رہ گئی۔ ہوا یہ کہ بسا اوقات ادب کے تازہ وارد کا استقبال کرتے وقت صرف ترقی پسندی پر قناعت کر لی گئی اور یہ نہ دیکھا گیا کہ موصوف ترقی پسند تو خیر سے ہیں شاعر بھی ہیں یا نہیں ——— اس پر مستزاد نقادوں کی سخت گیری۔ ما و شما تو کس شمار قطار میں ہیں، تحریک کے رہنما تک پرانا منشور والے مابدحسن منٹو ایسے ایسے جرم عائد کرنے لگے کہ "دیس خانہ" میں ندیم نے ترقی پسند موضوع کو ندیم کے انداز میں پیش کیا ہے گورکی کے انداز میں نہیں لہٰذا افسانہ غیر معیاری ہے ———

نتیجہ یہ کہ اس فضا میں فنی سفر کا آغاز کرنے والے نوجوانوں کے شعری مجموعوں کو دیکھئے تو ان کی ترقی پسندی پر تو آپ کوئی حرف نہ رکھ سکیں گے البتہ ان میں سے بیشتر کے شاعر ہونے میں آپ کو کلام ہوگا۔ ان کے موضوعات، لفظیات اور تلازمات رسمی ہیں تو جذبات و تاثرات ساختہ اور مصنوعی۔ یہ نئی روایتی شاعری ہے جو ۱۹۳۶ء کی ترقی پسند شاعری کی روایت میں غیر تخلیقی مشقِ سخن سے آگے نہیں بڑھتی۔ یہ شاعری فرد کی شاعری نہیں تحریک کا منشور ہے۔ یہاں ہمارا واسطہ آدمی سے کم اور امیر شہر اور غریب شہر، سرمایہ دار اور مزدور کے سکہ بند تصورات کے بندھے بندھائے مجموعوں سے زیادہ۔ ان نوجوانوں کے پاس بھی وہی تجربہ عشقیہ ہے، یا وہی موادِ جائیت ہے۔ نائشتی دقت ہے جو سردار جعفری جیسے مکمل اور "دکتر" ترقی پسند بزرگوں کے پاس ہے اور وہ نہیں جو ندیم اور فیض کے پاس ہے یعنی انفرادی نگاہ اور اپنا اندازِ بیان، اور جسے آپ ایک لفظ میں سمیٹنا چاہیں تو شاعری کہہ سکتے ہیں۔

---

[5] پاکستان کونسل کے راولپنڈی مرکز میں "مصنف سے ملئے" کی تقریب میں احمد فراز کی موجودگی میں پڑھا گیا۔ (تبصرہ نگار)

احمد فراز بھی اسی فضا میں انہی نوجوانوں کے ساتھ ترقی پسند تحریک کے صراطِ مستقیم پر گامزن ہوئے اور انجمن سے ہدایت کے طلبگار رہے مگر اپنے بیشتر ہمسفروں کے برعکس احمد فراز دوسری راہوں پر چلنے والوں کے اندازِ خوش سے بھی متاثر ہوتے رہے۔ ان کے پہلے مجموعۂ کلام میں حفیظ جالندھری کا ماتم اور باقی صدیقی سے لے کر ناصر کاظمی تک سے گہرے اثرات قبول کرنے کی شہادتیں بہ آسانی مل سکتی ہیں۔ نظریاتی گھٹن اور پابندی کے مذکورہ بالا ماحول میں کھل کر سانس لینے اور اپنے ذہن سے سوچنے کی جسارت کر سکنے کا کرشمہ یہ ہے کہ "تنہا تنہا" میں جہاں غزل کے ایسے اشعار موجود ہیں:

تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ — لوگ کیا سادہ ہیں سورج کو دکھاتے ہیں چراغ

وہاں "تحقیق" جیسی نظم بھی مل جاتی ہے جہاں فراز کی ترقی پسندی مقامیت سے پھوٹی ہے اور جہاں فراز نے مقبول احمد پوری کی بجائے دورِ اول کے ندیم کی روایت سے منسلک ہو کر وطنِ عزیز کی شمال مغربی سرحد پر بسنے والے گرد و نواح کی پیش کش سے مقامیت سے آفاقیت کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ ثبوت پیش کیا ہے کہ بقول فیض احمد فیض "تنہا تنہا شاعری ہے شعر کی تلاش نہیں ہے۔ ۔ ۔ ۔ (یہاں) ۔ ۔ ۔ ۔ خیال اور جذبے کا قالب اور شعر کا لباس الگ الگ دکھائی نہیں دیتے، آپس میں پیوست ہیں۔"

"درد آشوب" احمد فراز کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس کا آغاز "تنہا تنہا" کی آخری نظم سے ہوتا ہے۔ یہ نظم "تنہا تنہا" کے مقابلے میں نہ صرف اپنی طوالت اور تکمیل کی بنا پر مختلف ہے بلکہ بعض مصرعوں کو فراز نے بدل کر بہتر بنانے کی کوشش بھی کی ہے۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب فراز کا صحیح دوسرا مجموعہ ہے اور اس میں شاعر نے موضوع اور اسلوب دونوں اعتبارات "تنہا تنہا" سے زیادہ خوبصورت تخلیقات پیش کی ہیں۔ "درد آشوب" میں فراز کا احساسِ جمال اور احساسِ لذت پہلے سے زیادہ نکھرا ستھرا بھی ہے اور رنگا رنگ بھی ہے۔ اقتصادی اور سیاسی استحصال کو موضوعِ سخن بناتے وقت بھی ان کی آواز اب اجتماعی سے زیادہ انفرادی لہجہ ڈھونڈتی نظر آتی ہے۔ فتوحات کے ساتھ ساتھ شکستیں بھی نمایاں ہونے لگی ہیں:

وہ پیمان بھی ٹوٹے جن کو — ہم سمجھے تھے پائندہ
وہ شمعیں بھی داغ ہیں جن کو — برسوں رکھا تابندہ

اور وہ ان ناکامیوں پر تخلیقی انداز سے سوچنے میں مصروف ملتے ہیں۔ "شاخِ نہالِ غم" اور "میں اور تو" اس طرزِ احساس کی آئینہ دار ہیں۔

نظم سے ہٹ کر غزل کی طرف آیئے تو بیدل، غالب اور آتش سے اکتسابِ فیض کی دھن میں وہ معاصرین اور ہمعصر مسائل سے اغماض نہیں برتتے۔ ضیا جالندھری نے ان کی کئی ایک نظموں کے بارے میں جو یہ کہا ہے کہ "ان میں کسی دوسرے شاعر کی گونج سنائی دیتی ہے" وہ غزل کے بارے میں بھی سچ ہے، خاص طور پر احمد ندیم قاسمی کا اثر روز بروز گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ مثلاً فراز کے چند شعر سنیے:

جب تلک دور ہے تو تیری پرستش کر لیں — ہم جسے چھو نہ سکیں اس کو خدا کہتے ہیں

اس انتہائے قرب نے دھندلا دیا تجھے — کچھ دور جا کے دیکھ سکوں تیرا بانکپن

ہم نے تجھے دیکھا تو کسی کو بھی نہ دیکھا — اے کاش ترے بعد گزرتے کوئی دن اور

ہم کو اس نام نے مارا کہ جہاں بھی جائیں — خلقتِ شہر نے طوفان اٹھائے رکھنا

ان اشعار پر مجھے قدیم کے بہت سے اشعار یاد آتے ہیں، چند سماعت فرمائیے:

نارسائی کی قسم، اتنا سمجھ میں آیا　　　حسن جب ہاتھ نہ آیا تو خدا کہلایا

دور سے دیکھا تو پلکوں تک کے سائے گن لئے　　　جیسے جیسے تم قریب آئے دھواں بنتے گئے

یا

تو اتنا قریب ہے کہ تجھ سے　　　میں پوچھ رہا ہوں، تو گماں ہے

یوں تو اس جلوہ گہِ حسن میں کیا کیا دیکھا　　　جب تجھے دیکھ چکے، کوئی نہ تجھ سا دیکھا

ساری دنیا ہمیں پہچانتی ہے　　　کوئی ہم سا بھی نہ تنہا ہوگا

اپنے بزرگ معاصرین سے استفادے کا ذکر کرکے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ سلیم احمد کے لفظوں میں ان کی اچھی شاعری اچھی شاعری کو آواز دیتی ہے ورنہ غزل میں تازگیٔ احساس اور رعنائیٔ خیال کی جو کیفیات فراز نے پیدا کی ہیں وہ ان کی فنی انفرادیت کا بہترین ثبوت ہیں:

اس اک چراغ کی لَو بجھ رہی ہے آنکھوں میں　　　تمام شہر ہو روشن تو اپنا گھر دیکھوں

ذکر اس غیرتِ مریم کا جب آتا ہے فراز　　　گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں

وہ خار خار ہے، شاخِ گلاب کی مانند　　　میں زخم زخم ہوں، پھر بھی گلے لگاؤں اسے

ان اشعار میں اُس رنگِ سخن کے ابتدائی نقوش موجود ہیں جسے ہم آگے چل کر رنگِ فراز کہہ سکیں گے بشرطیکہ فراز موجود کامیابیوں پر قناعت کئے بغیر خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رکھ سکیں

فتح محمد ملک

دو پاٹن کے بیچ

تصنیف: رضیہ فصیح احمد　　　اشاعت: مکتبۂ ادبِ جدید، لاہور

صفحات: ۲۱۵　　　قیمت: پانچ روپے

یہ رضیہ فصیح احمد کے سولہ افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں سے دو افسانے "نقوش" کی بعض گزشتہ اشاعتوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ کسی افسانے سے لطف اندوز ہونے کی سب سے اچھی صورت تو یہی ہے کہ اسے علیحدہ کسی رسالے میں پڑھا جائے۔ ایک مجموعے میں شانے کے ساتھ شانہ ملائے ہوئے افسانے ایک پکچر گیلری کا سا تاثر دیتے ہیں جس میں ایک تماشائی تصویروں کے جنگل میں کھو کر رہ جاتا ہے، اور جب وہ کچھ لمحے فن کی اس نمائش کے درمیان بسر کرکے باہر آتا ہے تو اس کے ذہن پر کسی ایک فن پارے کا متعین اور دیرپا تاثر نہیں ہوتا، بلکہ سب فن پاروں کا ایک ملا جلا بیرنگ قسم کا تاثر ہوتا ہے، جو آسمان کی دھنک کی طرح تھوڑی

دیر دہ کر زائل ہو جاتا ہے ـــــــ لیکن جب تک انسانوں کی اس دنیا میں افسانے لکھے جاتے رہیں گے، ان کے مجموعے بھی چھپتے رہیں گے، اور پھر افسانوں کو رسائل کے اوراق میں چھوڑ دینا بھی تو انھیں گویا نسیان کے گھاٹ اتار دینا ہے۔ کتنے ایسے افسانے ہوں گے جن سے ہم نے اپنی زندگی کے کچھ لمحوں کو فروزاں کیا تھا اور جن کی روشنی ہمارے ذہن کے کسی گوشے میں ابھی تک جلتی ہے بلکہ وہ ہم سے ہمارے بچپن کی طرح ہمیشہ کے لئے بچھڑ گئے ہیں۔ ہم ان سے شاید پھر کبھی دوچار نہ ہوں گے ـــــــ

اس صورت حال میں سب سے اچھا طریقہ وہ ہے جو میں نے اس کتاب کے مطالعہ کے لئے اختیار کیا۔ کچھ اوپر دو سو صفحوں کی یہ چھوٹی سی کتاب اگر میں لے کر بیٹھ جاتا تو یہ بمشکل جاڑوں کی ایک لمبی، ٹھٹھری ہوئی رات میں میرا ساتھ دے سکتی لیکن میں نے ایسا نہ کیا، بلکہ اس کتاب کو سات آٹھ روز یا شاید اس سے بھی زیادہ عرصے میں پڑھا۔ میں اس سے ایک افسانہ پڑھ لینے کے بعد کتاب کو بند کر دیتا اور کچھ وقت اس افسانے کی دنیا میں، اس کے کرداروں کے ساتھ گھل مل کر بسر کرتا۔ جیسے کسی میچ کے وقفے کے دوران تماشائی میدان میں آ کر کھلاڑیوں کی پیٹھ تھپکتے اور ان سے ہمدردی جتانے لگتے ہیں ـــــــ میں نے محسوس کیا کہ یہی طریقہ افسانوں کے پڑھنے کا موزوں ترین ہے، اور اس طرح پڑھتے ہوئے افسانوں کے متعلق انسان اگر کوئی بات کرے تو وہ اتنی ہلکی اور سطحی نہیں ہوگی ـــــــ

لیکن کیا آپ یہ طریقہ افسانوں کی ہر کتاب کے ساتھ برت سکتے ہیں؟ ـــــ میرے خیال میں یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ افسانے فی الواقع اتنے اچھے اور کامل مسرت پہنچانے والے نہ ہوں کہ آپ کچھ لمحے ان کی دی ہوئی اس خوشی میں گزارنا پسند کریں! ایک کامل مسرت کا ـــــ چاہے اس کا تعلق انسان کے کسی حاسہ سے ہو ـــــ ہمیشہ ایک 'مابعد' (AFTERMATH) ہوتا ہے، جس میں انسان پر دیر تک ایک ٹھنڈا، دھیما سرور اور ڈھلان پر سے نیچے اترنے کی کیفیت طاری رہتی ہے (ڈاکٹر دین ڈی ویلڈی کے مسرت کے گراف بھی اسی حقیقت کے عکاس ہیں) ـــــ اور مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ "دو پاٹن کے بیچ" کے افسانے واقعی اتنے اچھے اور کامل مسرت پہنچانے والے ہیں!

رضیہ فصیح احمد ہمارے موجودہ ادبی منظر میں اب تک مشاہیر کی دوسری صف کی ممتاز شخصیتوں میں سے تھیں۔ یعنی کسی ادبی مجلے کے پوسٹر پر ان کا نام جلی قلم سے لکھے ہوئے ناموں کی اگر پہلی دہائی میں نہیں تو دوسری دہائی میں ضرور نمایاں ہوتا تھا۔ اب ان کے ناول "آبلہ پا" کے انعام پانے کے بعد مشاہیر کی پہلی صف پر ان کا دعویٰ قائم ہو جانا چاہئے لیکن اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ وہ اب تک سیکنڈ ریٹ تھیں! وہ یقیناً فرسٹ ریٹ تھیں، اور ان کے افسانوں کی اس کتاب کو پڑھ کر کوئی بھی انھیں سیکنڈ ریٹ نہیں کہہ سکتا۔

ان صفحات میں اس سے پہلے بھی افسانوں کی بعض کتابوں کا جائزہ دیا گیا ہے۔ ان کتابوں میں یہ خاص بات یہ دیکھنے میں آئی تھی کہ وہ ہمیں اپنے گردپوش پر، اندر اور باہر اپنے موضوع اور مصنف کے متعلق بہت کچھ بتاتی تھیں۔ ان میں سے کسی کتاب کے فلیپ پر کوئی افسانہ نگار قلعہ توڑ کر افسانے کی قلمرو میں داخل ہوتے ہوئے دکھایا جاتا، اور کسی کے سرورق پر آفتاب و ماہتاب کے طلوع ہونے کا منظر کھینچا جاتا، اور بعض دوسری کتابوں کے آغاز میں ادب کی بزرگ ہستیوں کے پیٹھ ٹھپکنے والے مقدمے ہوتے، جن میں ادب اور اہل ادب کو بہت سہانے مستقبل کی خوش خبری سنائی جاتی ـــــ وہ ہمارے رویے کی ایک صورت تھی، اور ہمارے رویے کی ایک دوسری صورت اس کتاب میں ہمارے سامنے آئی ہے جس میں کوئی مقدمہ یا پیش لفظ نہیں ہے، ادب کے حال یا مستقبل کے بارے میں کوئی اظہار خیال نہیں، اور گردپوش پر اندر یا باہر کوئی تحریر نہیں، جس سے کم از کم اتنا ہی پتہ چل سکتا کہ رضیہ فصیح احمد کون ہیں، کب سے لکھ رہی ہیں، اور کیا لکھ رہی ہیں؟ ان کی اب تک کی تخلیقات کے بارے ادب کی پرکھ رکھنے والوں نے کیا رائے قائم کی ہے! یہ معلومات بہت ضروری اور بنیادی ہیں جنھیں ایک قاری کسی کتاب کے سرورق پر ہمیشہ دیکھنا چاہتا ہے لیکن ہمارے ناشر صاحبان نے خدا جانے کیوں یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ وہ یا تو اپنی کتاب کے سرورق پر کاسناتی اور خلائی کرتبوں کا مظاہرہ کریں گے اور ستائش اور تحسین کی آتش بازیاں چھوڑیں گے، ورنہ پھر پورا سرورق خالی رکھیں گے جس سے کتاب اور اس کے مصنف کے ہر طرف، اور پس منظر میں دور دور تک تاریکی چھائی رہے گی ـــــــ ان دو انتہاؤں کے درمیان ایک اعتدال کی راہ بھی ہے جو کاش ہمارے ناشر حضرات انگریزی مطبوعات میں اور خاص کر پیپر بیک کتابوں کے سلسلوں میں، اندر

کی جانب اور پشت پر ملاحظہ کر سکتے!

اب کچھ باتیں ان افسانوں کے متعلق! ـــــ "دو پاٹن کے بیچ" کے افسانوں میں جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ ہے ان کا تنوع۔ ان کے موضوع عام
روش سے کچھ ہٹ کر ہیں۔ افسانے تو یہ سب آج کے اسی معاشرے سے لئے گئے ہیں جس میں ہم آپ اور رضیہ فصیح احمد رہتے ہیں لیکن ان کی فضا اور کردار
ایک سے نہیں ہیں اور افسانہ نگار کہیں بھی اپنے آپ کو دہراتی ہوئی محسوس نہیں ہوتیں۔ پھر ان کے موضوعات میں ایک نیاپن اور تازگی ہے۔ عورتوں کے افسانوں کا
ماحول عموماً گھریلو ہوتا ہے اور ان کے کرداروں کا عمل زیادہ تر چار دیواری کے اندر ہی واقع ہوتا ہے۔ یا ورچی خانے میں، تخت پوش پر یا ڈرائنگ روم میں! رضیہ
کے افسانوں میں اس کے برخلاف کھلی ہوا اور دھوپ کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ اور ان کے کردار ایک وسیع اور کھلے ہوئے کینوس پر اپنی چلت پھرت دکھاتے
ہیں۔ وہ پہاڑوں پر آتے جاتے ہیں، سینما دیکھتے ہیں، سیر و تفریح کرتے ہیں، کاریں چلاتے ہیں! ـــــ ہمارے یہاں جب اچھی انگریزی فلموں کی نمائش ہوا کرتی تھی تو ہم
یہ دیکھ کر متحیر ہوتے تھے کہ ان میں سے کسی ایک فلم کی تھیم بھی دوسری فلم سے میل نہیں کھاتی تھی (یہ ایجنٹ 007 وغیرہ کے زمانے سے پہلے کی بات ہے!!) اور
ہم سوچتے تھے کہ مغرب میں زندگی کیونکر اتنی ہمہ رنگ اور گوناگوں ہو سکتی ہے! افسانوں کی یہ کتاب ہمیں یاد دلاتی ہے کہ زندگی ہمارے یہاں بھی، باوجود اپنی ظاہری
سادگی اور یکسانی کے، کچھ کم گوناگوں نہیں ہے۔ سوال صرف آنکھیں کھلی رکھنے، اور اس زندگی کو قریب سے دیکھنے کا ہے!

ایک دوسرا وصف ان افسانوں میں ان کی فنی پختگی اور ان میں کہانی کہنے کا وہ سیدھا اور قدرتی اسلوب ہے جو شروع سے آخر تک چلا گیا ہے۔ افسانہ نگار
نے کہیں بھی تکنیک کے کرتب دکھانے کی کوشش نہیں کی، نہ افسانوں کے اسلوب کو خواہ مخواہ گمراہ، پُر اسرار اور شاعرانہ بنانا چاہا ہے۔ اور نہ ان میں کہیں بلا ضرورت
شعور کی رَو (stream of consciousness) دوڑائی ہے۔ ان کے پلاٹ اصلی زندگی کے بہت قریب اور قابلِ تسلیم قسم کے ہیں۔ ان میں کوئی
ڈرامائیت نہیں، کوئی تیزی و تندی نہیں، کوئی melodrama نہیں! اس کے باوجود ان کی کہانیاں دلچسپ اور گرفت کرنے والی ہیں، اور ان میں سارا کمال
رضیہ فصیح احمد کے کہانی کہنے کی اس غیر معمولی صلاحیت کا ہے، جو انہیں قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے اور جس کے بغیر کوئی افسانہ نگار افسانہ نگار نہیں بن سکتا۔

اس کتاب میں بعض افسانے بلاشبہ شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ چاہے کسی زبان میں لکھے جاتے ان کا شمار منتخب افسانوں میں ہی ہونا تھا۔ ان میں
"دو پاٹن کے بیچ"، "پچھوا"، "دکھی مائی"، "کم نصیب"، "کبھی شعلہ کبھی شبنم"، "پائلٹ" اور "ماموں" شامل ہیں۔ کچھ دوسرے افسانے ہیں جو ان سے کمتر ہیں لیکن ان کو
پڑھتے ہوئے بھی آپ کو افسانہ نگار کی خامکاری یا ناپختگی کا کہیں احساس نہیں ہوتا۔ فن کا ایک کم سے کم معیار ان میں بھی قائم ہے۔ کہانی کہنے کے انداز میں
وہی دل کشی ہے، شعور و احساس میں وہی خلوص اور متوازن کیفیت ہے اور اسلوب میں وہی بے ساختگی اور بے ریائی ہے۔ ایسے افسانوں میں اگر
کچھ کمی محسوس ہوتی ہے تو اس پہلو سے کہ ان میں کہانی کی اٹھان اور اس کے نقطۂ عروج، یا اس کے عروج اور اس کے مابعد میں وہ توافق قائم نہیں ہوپاتا
جو ہمارے نزدیک فن کا کم سے کم تقاضا ہے اور جس سے کہانی ایک یونانی مجسمے کی طرح خوش قامت اور متناسب الاعضا دکھائی دیتی ہے کہیں نقطۂ عروج
کچھ زیادہ ہی سیدھا اور سپاٹ ہو کر رہ گیا ہے، جیسے "بدلہ" میں! ـــــ کم از کم میری حسِ انتقام اس بات سے بالکل آسودہ نہ ہوئی کہ میرے رسالے
اور کتابیں دوسرے ڈبے میں اس جھگڑالو مسافر کے سر پر گر گر کر نازل ہو رہے ہیں جس کو چھوڑ کر میں گاڑی کے دوسرے ڈبے میں چلا آیا تھا۔ اور کہیں اس کا
مابعد (anticlimax) ضرورت سے زیادہ مختصر اور تشنہ محسوس ہوتا ہے، جیسے "پچھتاوا" میں! اس کہانی میں آخری پیراگراف یا تو بالکل نہ ہوتا۔
کہانی ـــــ فقرے کے شامل میں ـــــ ختم ہوتی:

"نہیں اصلی ہے ـــــ" عدنان نے اپنی بات کے جواب میں پھول کی ساری پتیاں نوچ کر قالین پر پھیلا دیں اور خود کسی سوچ میں
دور چلا گیا ـــــ!

یا پھر اس کے اندر جذبات میں ہلچل برپا کرنے والی کیفیت کچھ زیادہ ہونی چاہیے تھی۔ اس پیراگراف پر اگر مصنفہ کچھ زیادہ محنت کرتیں تو اس کا عمل انہیں ضرور ملتا، اور ان کی کہانی کا تاثر زیادہ گہرا اور دیرپا ہو جاتا! —— لیکن ایسے افسانے بھی اپنے لطف کے بغیر نہیں، اور رضیہ فصیح احمد کے کہانی لکھنے کا انداز ایسے افسانوں میں بھی قاری کی دلچسپی کو کہیں سست اور خوابیدہ نہیں ہونے دیتا۔

گجرات کے شاہ دولہ کے چوہے ہم سب نے دیکھے ہوں گے۔ چھوٹے چھوٹے سروں والے، اور پنکھے جیسے کانوں اور کھلی ہوئی باچھوں والے یہ بلّے ہمارے خانقاہی ماحول کا ایک ایسا عجیب اور المناک نمونا ہیں جن کے متعلق میں جتنا بھی سوچتا ہوں سوائے دکھ اور گھٹن کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ رضیہ فصیح احمد نے ایک ایسے ہی بلّے کے کردار کا مطالعہ بڑی ہمدردی اور حقیقت پسندی کے ساتھ اپنی کہانی "چوہا" میں کیا ہے۔ اس کہانی کی شہلا کو خاندان کے باہمی تعلقات کی وجہ سے ایک چوہے اجّی کے ساتھ ہمدردی ہو جاتی ہے۔ اور اس عجیب الخلقت لڑکے کا خیال اس کے ذہن میں اس طرح بس جاتا ہے کہ جب وہ آرٹ کی کلاس میں اپنے ہاتھ سے پہلی صورت بنا کر پیش کرتی ہے تو وہ غیر شعوری طور پر اسی چوہے ہی کی ہوتی ہے۔ انس اور ہمدردی دو طرفہ ہوا کرتی ہے چنانچہ اجّی بھی شہلا کی ذات میں دلچسپی لینے لگتا ہے، اور —— شاید اسی واسطے سے —— اس کا جنسی شعور بیدار ہو جاتا ہے، اور وہ بیچارا اس عجیب بے نام جذبے کے ہاتھوں بڑی چوکھوں اٹھانے لگتا ہے:

> جب وہ سکول جانے کے لئے نکلتی تو اجّی رات کے کپڑوں میں سڑک پر کھڑا سکول جانے والی لڑکیوں کو حسرت سے دیکھا کرتا......
>
> جب وہ پاس سے گزرتی تو وہ اسے ہاتھ اٹھا کر اپنی موٹی آواز میں "چھام علیکم" کہتا...... سکول کے اندر کچی سڑک پر چلتی ہوئی وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتی وہیں کھڑا رہتا، پھر لوٹ آتا۔ شروع میں نہ اس کے پروگرام میں اتنی باقاعدگی تھی، نہ شہلا نے اس طرف دھیان دیا، مگر اس کے آٹھویں کلاس میں پہنچتے پہنچتے اجّی کا سڑک پر کھڑے ہو کر "چھام علیکم" کہنا اور پھر گھر میں آ کر آ بیٹھنا اتنا ہی اٹل ہو گیا جتنا سورج کا طلوع ہونا......"

یہاں سے تو ترے ڈیم ڈی پیرس کے اس کوزہ پشت کی کہانی شروع ہوتی ہے جو باوجود اپنے جسمانی عیب اور بدصورتی کے اپنے سینے میں ایک سچا اور اُجلا دل رکھتا تھا، اور اس میں از امیر اللہ کی خانہ بدوش جوانی نے آ کر ڈیرا ڈال دیا تھا —— ایک دن جب ایک عاقبت نااندیش ہمسائی نے اجّی اور شہلا کی موجودگی میں اجّی کی شادی کا ذکر اس کی ماں کے سامنے چھیڑا تو وہ جیسے مسرت سے بے قابو ہو گیا:

> "وہ خوشی کے جنون میں اس کی طرف اشارہ کر کے پاگلوں کی طرح ہنس رہا تھا، اس کا چہرہ اور پنکھے کی طرح کھڑے ہوئے کان مارے خوشی کے سرخ ہو گئے تھے، اور وہ مارے شرم کے گلنار ہو گئی تھی۔ سب کے ہنس پڑنے پر وہ کیسی بے تحاشا اٹھ کر وہاں سے بھاگی تھی!......"

لیکن اس کہانی کی از امیر اللہ کسی ایسے المیے سے دوچار نہیں ہوتی اور نہ اس کی خاطر کوزہ پشت کو جیتے جی اس کی نعش کے پہلو میں خاک ہونا پڑتا ہے۔ اس میں حالات کچھ مختلف رخ پہ چلتے ہیں جب اس چوہے کا یہ آسودہ جنسی جذبہ مرض کے دوروں کی خطرناک صورت اختیار کر جاتا ہے تو شہلا مالی قربانی دے کر، اور ساتھ ہی اپنے خاندان کی نیک نامی کو خطرے میں ڈال کر اس کے لئے ایک کرائے کی عورت کا بندوبست کرتی ہے، اور اس طرح اسے بے موت مرنے سے بچاتی ہے۔

شاہ دولہ کے ان چوہوں میں جنسی جذبہ واقعی اتنا صحتمند اور توانا ہوتا ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق تو ماہرین ہی بہتر جانتے ہوں گے (یا خود شاہ دولہ کے چوہے!) میرے سامنے البتہ ایک مثال ایسی ضرور ہے جس سے افسانہ نگار کے مشاہدے کی تائید ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے شہر میں ایک آوارہ مزاج عورت ایک ایسے دیوانے لڑکے کی طرف مائل ہو گئی جسے نہ اپنے کپڑوں کا ہوش ہوتا تھا اور نہ ستر ڈھانپنے کا، اور رفتہ رفتہ اپنی تدبیروں سے اسے اس قابل بنا دیا کہ جنسی اعتبار سے وہ اسے ایک بالکل نارمل مرد کا سا کام دینے لگ گیا —— یہ قدرت کی نیرنگیاں اور طرفہ کاریاں ہیں! قدرت اپنی باتوں میں بعض اوقات کتنی ناقابلِ فہم لگتی ہے!

رکھی مائی، 'گم نصیب' (غم نصیب)، اور 'ماموں' اس مجموعے میں کرداری کہانیاں ہیں۔ رکھی مائی ایک ایسے بُت کے گرنے اور پاش پاش ہونے کی کہانی ہے جو پارسائی کے چبوترے پر رکھا ہوا تھا۔ دیویوں تو ایک ادھیڑ عمر کی ایک بیوہ تھی بھولی بھالی، لیکن اس کا رنگ روپ ابھی تک قائم تھا۔ اس کا کام گھر کی لڑکیوں کو باہر لانا لے جانا اور ان کی نگرانی کرنا۔ وہ اپنا یہ فریضہ جس تندہی اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ انجام دیتی تھی، اس نے ماؤں اور خالاؤں کو یقین دلا دیا تھا کہ ان کی لڑکیاں اگر محفوظ رہ سکتی ہیں تو صرف مائی رکھی کے ہاتھوں میں!

"کسی کا دوپٹہ سر سے ڈھلک جاتا تو جھٹ ٹوک دیتی۔ ایک طرف بھیڑ دیکھتی تو کئی گز پہلے ہی بڑی صفائی سے دوسری طرف موڑ دیتی۔ راہ چلتے لوگوں کی نظریں ٹٹولتی چلتی کہ کہیں کنواری بالیوں کے چہرے کا بالا تو نہیں کئے دیں۔۔۔۔"

ایک دفعہ گھر میں ریلوے کے چوکیدار کی شوقین مزاج بیٹی زبیدہ کوئی چیز لینے آئی تو اس نے اسے دور ہی سے دیکھ کر سب کو چوکنا کر دیا کہ مشتبہ کردار کی لڑکی ہے، اس سے احتیاط لازم ہے ـــــ لیکن حالات نے جو پلٹا کھایا تو مائی رکھی اچانک کچھ عرصے کے لئے گم ہو گئی۔ لوگوں نے یہی سمجھا کہ وہ اپنی بہو اور بچوں سے لڑ کر کہیں باہر چلی گئی، اور پھر ایک دن خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اسی مشتبہ کردار کی لڑکی زبیدہ نے گھر میں آکر یہ خبر سنائی کہ "مبارک ہو بی بی جی، رکھی کے لڑکا ہوا ہے!" ـــــ سرگرمی کے ان نمونوں کی ہمارے معاشرے میں کوئی کمی نہیں ہے، اور کوئی نہیں جانتا کہ ان کی ظاہر شرافت اور پرہیزگاری کے پیچھے ان کے دل کی دنیا میں کیسے کیسے طوفان اُٹھتے رہتے ہیں۔ لیکن جو المیہ ان میں سے کسی بدنصیب مائی رکھی کے ساتھ ہی پیش آتا ہے کہ وہی خالہ بی جو اس کے متعلق کوئی ایسی ویسی بات سننا گوارا ہی نہیں کرتی تھیں، آخر کو کہنے لگیں "اُف توبہ! مگر ایمان کی بات کہوں گی، اس کی چال بیوہ عورتوں کی سی نہیں تھی"۔

"گم نصیب" کو میں ایک کرداری کہانی اس لحاظ سے کہتا ہوں کہ اس میں افسانہ نگار نے ریستوران کے ایک بیرے کے کردار کی تصویر اس کے ایک طویل اور مسلسل مونولاگ میں اتاری ہے۔ کسی کردار میں زندگی بھرنے کا اس سے زیادہ کارگر اور موثر طریقہ اب تک دریافت نہیں ہوا کہ آپ اس کی اصل گفتگو ٹھیک اسی کے الفاظ و لہجے میں نقل کر دیں۔ اور یہ تو پوری کہانی ہی بیشتر بیرے کی گفتگو پر مشتمل ہے۔ اس لئے اس میں بیرے کا کردار جتنی اصلیت اور وضاحت کے ساتھ سامنے آتا ہے وہ ہمارے اردو ادب میں ایک نادر چیز ہے۔ میں اس کہانی کو رضیہ کی شاہکار کہانیوں میں شمار کروں گا۔ اس لئے کہ اس میں انھوں نے فنِ محاکات MIMICRY کا ایک ٹور دی فورس پیش کیا ہے۔

"بیروں والی بھرتی تو چھوکر نہیں گئی انھیں، کہ منٹ میں اِدھر تو منٹ میں اُدھر۔ ایک کو کھانا دیا، ایک کو پانی دیا، کسی کو کھالی ہوں ہاں میں ٹرکا یا، مگر جبان پہ سوائے جی صاب، آیا صاب، اور ابھی لایا ہجور کے سوا اور کچھ نہیں ـــــ اور یہ بڑھئی لوگ صاب لوگ کی کدر کرنا جانتے ہی نہیں۔ کوئی نیا منیجر آئے گا تو میں یوں دانت کھول کر کھیسی دکھاؤں گا جانو میرا سگا ہو۔ اور اے لوگ ماتھے پر یوں بل ڈالے رہیں گے جو بیس گھنٹے، جیسے سوکھی لکڑی میں بل پڑ گیا۔۔۔۔

۔۔۔۔ اور مجھے اس وخت یوں لگا جیسے میں لکھیراں کو کبر میں اتار کر اس کے اوپر مٹی ڈال کر آیا ہوں۔ رکتے ہی دن مجھے اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ صاب ہی چلتے وخت مجھے اس ہوٹل میں رکھا گیا تھا۔ اُس جمانے میں اس کا مالک ایک بھلا مانس تھا۔ میں نے اس سے چھٹی لی اور گھر میں پڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کرکے ہوٹل جانا سروع کر دیا کہ کسی طریوں وخت تو کٹے۔۔۔۔"

'ماموں' ایک ایسے بخیل اور پیسہ پیسہ جوڑنے والے بزرگ کی داستان ہے جن پر سو روپے کی رقم جمع کرنے کی دھن بُری طرح سوار تھی۔ اس مقصد کے لئے انھیں کیسے کیسے جتن کرنے پڑے اور کتنی ہی محرومیوں میں سے گزرنا پڑا، لیکن جب وہ ہرا نوٹ ان کے ہاتھ میں آیا تو زیادہ دن رہنے کے لئے نہیں، اور وہ انھیں اپنی جدائی کا ایسا داغ دے گیا کہ اس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ماموں کا یہ کردار جس بصیرت اور جذبہ نگاری کے ساتھ کھینچا گیا ہے

وہ ایک اول درجے کی چیز ہے۔ اگر ایسے افسانے آج بھی لکھے جا رہے ہیں تو ہمارے لئے افسانہ نگاری کے حال یا مستقبل کے بارے میں مایوس ہونے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

ٹائیٹل سٹوری کا عنوان بھگت کبیر کے اس شعر سے لیا گیا ہے:

چلتی چکی دیکھ کر دیا کبیرا رو دو پاٹن کے بیچ آ ثابت گیا نہ کو

اور کہانی میں اس انوکھے تجربے کا بیان ہے جس میں انسان اپنے کسی گذرے ہوئے خیال یا ماضی میں دیکھے ہوئے کسی خواب کو ہو بہو حقیقت کی شکل میں اپنے سامنے دیکھتا ہے اور یوں محسوس کرتا ہے جیسے وہ کسی فلم کا دیکھا ہوا منظر دوبارہ دیکھ رہا ہو۔ یہ تجربہ میں نے ایک دفعہ اپنے لڑکپن میں کیا تھا جب شام کو سکول کی گراؤنڈ میں کھیلنے کے لئے ہندو زرگروں کے ایک محلے میں سے گذر کر جاتا تھا۔ ایک دن اس محلے میں سے گذرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک ہندو لالہ اپنے مکان کی ڈیوڑھی سے نکلا۔ اسے دیکھتے ہی معاً میرے جی میں آئی کہ اب یہ باہر نکل کر پہلے اپنے ہاتھ والی پوٹلی نیچے رکھے گا، پھر اپنی پگڑی ٹھیک کر کے باندھے گا، اور پھر کواڑ بند کر کے قفل لگائے گا۔ اس نے باہر نکل کر بعینہٖ یہی کیا اور اسی شکل میں کیا جو میرے ذہن میں پہلے سے تھی — میں نے اُسے ایسا کرتے ہوئے شاید پہلے خواب میں دیکھا تھا — یہ کیا فینامینا ہے؟ اور کیونکر انسان کو پیش آتا ہے؟ میرے پاس اس بارے میں کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ اس معاملے میں شاید مشہور انگریزی مصنف اور ادیب جے۔ بی پریسٹلے کی تازہ کتاب **Man and Time** کوئی رہنمائی کرتی ہو، جس میں اس قسم کے متعدد واقعات مع تصویروں کے تاریخ کے صفحات سے نکال کر پیش کئے گئے ہیں۔ افسوس ہے میں یہ کتاب پوری طرح نہیں پڑھ سکا۔

رضیہ فصیح احمد کا آبائی وطن مراد آباد ہے، اور ان کے خود نوشتہ حالات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا تعلیمی کیریر بہت شاندار رہا ہے۔ بی۔ اے کے امتحان میں وہ یونیورسٹی میں اول آئی تھیں عجیب بات ہے کہ درسی و تعلیمی قسم کی ذہانت ان کے ادبی و تخلیقی عمل میں بھی بدستور قائم رہی۔ ورنہ ان دو قسم کی ذہانتوں میں یہ تسلسل کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ یونیورسٹیوں میں اول آنے والے اور وظیفہ پانے والے طلبہ ادب اور فنون لطیفہ میں اکثر گمنام ثابت ہوتے ہیں — اردو ان کی مادری زبان ہے، اور ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنے مدعا کے اظہار کے لئے زیادہ کاوش نہیں کرنی پڑتی — یا اس کاوش کا اثر ان کی تحریر میں دکھائی نہیں دیتا، جو اس سے بھی زیادہ بڑا کمال ہے۔ ان کے ان افسانوں میں اب میں اپنے آپ کو دہرانے لگا ہوں، کوئی پرشور کیفیت نہیں، جذبات کی کوئی گرما گرمی نہیں، ان کے پلاٹوں میں رونگٹے کھڑے کرنے والی کوئی ڈرامائیت نہیں، اور نہ ان میں جھٹکا پہنچانے والے اچانک موڑ [illegible] ہیں — اس کے باوجود یہ بہت سیدھی سچی، اور دل لبھانے والی کہانیاں ہیں جو بغیر کسی شعوری کوشش اور بناوٹ کے ایک دھیمے، میٹھے لب و لہجے میں سیانے پن کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔

عورتوں کے گروہ میں جو کہ ناول اور افسانے کی صنف میں ان کے اندر ایک اور پختہ اور منجھی ہوئی قلمکار کا اضافہ ہوا ہے، اور وہ دن دور نہیں جب اس میدان میں ان کا پلڑا مردوں کے مقابلے میں بھاری ہوگا — عصمت، خدیجہ، ہاجرہ، جمیلہ ہاشمی، جیلانی بانو، واجدہ، الطاف فاطمہ، بانو قدسیہ، رضیہ فصیح احمد، زخشندہ لودھی، خالدہ اصغر، نذرت الطاف، فہمیدہ ریاض — کہیں یہ صورت آج ہی تو واقع نہیں ہو چکی؟ کون کیا کہہ سکتا ہے!

محمد کاظم

جرمنی نامہ

تصنیف : حکیم محمد سعید دہلوی — اشاعت : مکتبۂ جدید لاہور

صفحات : ۵۸۴ — قیمت : پندرہ روپے

دس برس ہوتے ہیں طب کی دنیا کے دو گرامی قدر بھائی حکیم محمد سعید اور ان کے برادر بزرگ عبدالحمید دہلوی یورپ کی سیاحت پر نکلے۔ یہ سفر جو دو ماہ پچیس دن بیس گھنٹے تیس منٹ میں ختم ہوا تھا ہمارے لئے بے حد مفید ثابت ہوا۔ اس سفر کے مقاصد کی فہرست میں دس امور شامل تھے جن میں سے نو طب اور دوا سازی اور قدرتی اور نفسیاتی علاج کے اداروں سے متعلق تھے۔ دسواں مقصد "اسلامی مطالعے اور تحقیق کے مرکزوں کو جہاں یہ موجود ہیں" دیکھنا تھا۔ اس سفر کی داستان کا لکھنا چھوٹے بھائی کے حصے میں آیا، اور انھوں نے اس کی پہلی جلد "یورپ نامہ" (صفحات ۵۰۰) میں چار ملکوں یعنی ترکی، یوگوسلاویہ، آسٹریا اور سوئٹزرلینڈ کی سیاحت کا قصہ نمبر ۱۔ مغربی جرمنی چونکہ ایک ہمہ گیر ملک تھا جس میں اس سفر کے سب مقاصد کی تکمیل ایک ہی جگہ ہو گئی تھی، اس لئے اس ملک کے لئے انھوں نے ایک الگ جلد مخصوص کی جو جرمنی نامہ (صفحات ۵۸۴) کے نام سے اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اس کے بعد ہالینڈ، برطانیہ فرانس، سپین، یونان، اٹلی اور ایران کے ممالک رہ جاتے ہیں، جن کے بارے میں اگرچہ قطعیت کے ساتھ کوئی اقرار اس کتاب میں نہیں کیا گیا، تاہم یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ ان باقی ملکوں کے سفر کے حالات میں دو مزید کتابیں، کم و بیش اتنے ہی حجم کی، بآسانی شائع ہو کر قارئین کی تسکین کا باعث بن سکتی ہیں۔

"جرمنی نامہ کو عام سفرنامے کی طرح محض تفریح طبع کا ذریعہ نہ سمجھا جائے"، بڑے بھائی اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں "بیانیہ واقعات کے پس منظر میں جو روحِ عمل ایمائی انداز میں کارفرما دکھائی گئی ہے اس سے سبق حاصل کیا جائے۔" تو یہ کتاب گویا عام سفرناموں کی طرح نہیں ہے جن کا مقصد سب سے پہلے مسرت اور تفریح کا پہنچانا ہوتا ہے اور اس کے بعد کچھ اور، بلکہ یہ ایک متین اور عالمانہ چیز ہے جس میں "گذشتہ عالمگیر لڑائی کے اس پٹے ہوئے مہرے" کی حیرت انگیز پیش قدمیوں کا احوال بیان کر کے پسماندہ قوموں کو عبرت دلانا مقصود ہے۔

برطانیہ میں ایک مفکر فرانسس بیکن گذرا ہے جس کا زمانہ سولھویں صدی کا آخر اور سترھویں صدی کا آغاز تھا۔ اس نے جہاں اور موضوعات مثلاً مطالعے، دوستی، کتابیں وغیرہ پر اپنے ناقابل تقلید اسلوب میں مضامین لکھے، وہاں سفر کے موضوع پر بھی اظہار خیال کیا۔ اس مضمون میں وہ لکھتا ہے: "سفر میں جن چیزوں کا مشاہدہ کرنا لازم ہے وہ یہ ہیں ... شہروں کی دیواریں، قلعے فصیلیں، گودیاں، ساحل، آثار قدیمہ، کھنڈرات، کتب خانے، درسگاہیں، مکانات، باغات، بارود خانے وغیرہ ..." آگے چل کر وہ اپنے اس نظریے کی مزید وضاحت کرتا ہے "باقی رہیں ... دعوتیں، شادی بیاہ کی رسوم، ماتم کی تقریبات، اور اس طرح کے دوسرے تماشے ... تو سیاحوں کو ان کی طرف زیادہ دھیان نہیں دینا چاہئے!" ــــ تو سفر کا ایک یہ ڈھنگ ہے جو بیکن نے تحریر کیا ہے۔ اس طرح کے سفر میں جب ایک مسافر کسی اجنبی ملک میں وارد ہوتا ہے تو اس کے مشاہدے کا موضوع اس ملک کی عمارتیں، در و چھت اور کھنڈر اور بارود خانے قرار پاتے ہیں اور ان در و دیوار کے درمیان بسنے والی انسانیت اور اس کی خوشیاں اور محرومیاں اور غم۔ یہ سب کچھ اس کے موضوع سے خارج رہتا ہے۔ خدا جانے اس میں بیکن کی اس رائے کا کہاں تک اثر تھا کہ اس کے بعد بہت عرصہ تقریباً اڑھائی سو سال تک مغرب میں جب بھی سفرنامہ لکھا گیا، اسی انداز میں لکھا گیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں جا کر البتہ سفرناموں کے ایک نئے ڈھنگ کا آغاز ہوتا ہے جس میں بیکنی فلسفہ و حکمت کے بخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ ایک سیاح کے مشاہدے کا مرکز انسان قرار پاتا ہے اور اجنبی ملک کے در و دیوار اور قلعے اور کھنڈر اور بارود خانے اس انسان کی مرکزی کہانی کے پس منظر اور ماحول (SETTING) کا کام دیتے ہیں۔ ایک انگریز چارلس ایم ڈاوٹی نے صحرائے عرب میں بیس مہینے کا طویل عرصہ پرخطر سیاحت اور مہم جوئی میں گذارا، اور عرب کے بدوؤں کی زندگی، ان کے کردار اور

عادات کا مطالعہ ان کے اندر رہ کر کیا۔ اس نے اپنے اس مطالعے کی داستان جب اپنی کتاب "ٹریولز ان عریبیا ڈیزرٹا" میں بیان کی، تو پڑھنے والے سفرنامہ کی ایک انوکھی اور دلچسپ صورت سے آشنا ہوئے۔ اس کتاب نے جو آج بھی سفری ادب میں ایک اونچی ان گھڑ چٹان کی سی عظمت کے ساتھ موجود ہے سفرنامہ لکھنے کی ایک ایسی طرح ڈال دی جس پر لوگ آج تک چل رہے ہیں، اور جس کی مقبولیت روز بروز زمانہ کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اسی زمانے میں مشہور ادیب آر۔ ایل اسٹیونسن نے بھی دو یا تین سفرنامے اپنے سحر کار اسلوب میں لکھے اور یہ ثابت کر دیا کہ مشاہدے کی سچائی اور بیان کا حسن ایک سفرنامے کو بعض اوقات ناول اور افسانے سے بھی زیادہ پُرلطف اور دلآویز بنا دیتا ہے، حالانکہ اس میں حقیقت اور واقعے کا بیان ہوتا ہے — انگریزی ادب میں ان دو پیشروؤں کے بعد ایسے ناموں کی ایک بہت ہی طویل فہرست ہے جنھوں نے اسی انداز میں اپنے سفروں کی کہانیاں لکھیں اور سفری ادب کو مالا مال کر دیا۔ ٹی۔ ای لارنس، ہڈسن، رنا طنسن، نارمن ڈگلس، ڈی ایچ لارنس، آلڈس ہکسلے، فریا سٹارک، ولیم ایمل سمتھ، پیٹر فلیمنگ، ایکلی، مارٹن، لارنز ڈانٹھر پوسٹ، ایلن مورہیڈ، پیٹر میتن اور الفرڈ ڈھیجر! — یہ کچھ نام ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس لڑی کا دوسرا سرا معلوم نہیں، اس زمانے میں وہاں ایک معمول سا بنا ہوا ہے کہ ہر بڑا ادیب، چاہے اس کا اصل میدان ناول ہو، یا افسانہ یا شاعری، ایک یا دو سفرنامے بھی ضرور لکھتا ہے اور اس صنفِ ادب کو پُرمایہ بنانے میں اپنا حصہ ادا کرتا ہے۔ سمرسٹ مام، ایولن واہ، گراہم گرین، ارنسٹ ہیمنگوے، آڈن، ایشروڈ، جے بی پریسٹلے، ان سب نے سفرنامے لکھے ہیں اور ان میں اپنے اپنے خاص فن کا بہت عمدگی سے مظاہرہ کیا ہے — ایسا لگتا ہے کہ سفر و سیاحت کی خواہش انسان کی ایک فطری خواہش ہے۔ اور ہم سب کی جلد کے نیچے ایک مارکوپولو چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس کے تقاضوں کو بروئے کار لانے کے لئے کتنا کچھ بندوبست کر سکتے ہیں۔

سفرنامہ ڈاوٹی اور سٹیونسن سے چل کر زمانہ حال تک پہنچتے پہنچتے ادب کی ایک ایسی موضوعی اور داخلی (subjective) صنف بن چکا ہے جس میں ایک فن کار کو اپنی ذات کے اظہار کے لئے سب سے موثر، راست اور نسبتاً سہل ذریعہ میسر آتا ہے۔ ناول اور افسانے میں وہ اس اظہار کے لئے اپنے تخلیق کئے ہوئے کرداروں کا محتاج ہوتا ہے، شعروں میں اسے قافیہ، وزن اور فنی کمال کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے لیکن سفرنامے میں وہ جب اپنے قارئین کو ساتھ لے کر چلتا ہے تو اپنی نظر کے زاویے میں، واقعات کے انتخاب و ترتیب میں، اور ان پر اپنے ڈھیلے ڈھالے اور بے تکلف انداز کے تبصرے میں، نیز سفر میں ملنے والے انسانوں کے ساتھ اپنے رویّے میں — ان سب باتوں میں وہ اپنی دلچسپیوں اور امنگوں، اپنی حسرتوں اور نارسائیوں اور اپنی حیرت و استعجاب کے ساتھ اس طرح کھل کر سامنے آتا ہے کہ ہم پڑھنے والے اس کے ذہن اور ضمیر کی گہرائیوں میں اتر کر اس کے بالکل قریب ہو جاتے ہیں اور اس کی رفاقت میں ایک اُنس محسوس کرنے لگتے ہیں۔ افسوس ہے میں نے سفرنامے کی اس صنف کا تذکرہ کرتے ہوئے صرف مغربی ادب کے ناموں کے حوالے دیئے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرز کے سفرنامے نے ابھی مشرق کی ادبیات میں رواج نہیں پایا۔ مشرق کی دوسری زبانوں کا معاملہ بھی کچھ مختلف نہیں ہے اور ہماری اردو زبان میں تو حالت یہ ہے کہ اس میں سفرنامہ کو اب تک گویا صنفِ ادب ہی تسلیم نہیں کیا گیا۔ اردو زبان میں سفرنامے یوں بھی کم لکھے گئے ہیں، اور پھر اس جدید طرز کے سفرنامے میں تو یہ زبان بالکل مفلس اور تہی دامن ہے۔ اگر یہاں مجھے کچھ جرأت مندانہ اظہار رائے کی اجازت دی جائے تو میں یہ کہوں گا کہ اردو سفرنامے کی اس طرز کا آغاز کرنے والے محمد خالد اختر ہیں (خدا نہ کرے کہ اس کی انتہا بھی انھیں پر ہو)۔ ان کے دو چھوٹے سفرنامے "کاغانی مہم" اور "سواتی مہم" فنون کے قارئین کی نظر سے ضرور گذرے ہوں گے۔ لیکن میرے خیال میں بہت کم لوگوں نے ان کا اس طرح سے نوٹس لیا ہوگا کہ سفرنامہ لکھنے کا یہی وہ انداز ہے جو آج مغرب کے ادب و فن کی دنیا میں پسندیدہ اور مروج ہے۔ اور جس میں اتنی رفتار کے ساتھ وہاں اضافے ہو رہے ہیں کہ عجب نہیں یہ صنف ایک دن اپنی وسعت اور مقبولیت میں ناول اور افسانے کی حریف ثابت ہو۔ یوں محمد خالد اختر سے پہلے بعض دوسرے لوگوں نے بھی اس طرز میں طبع آزمائی کی ہے جن میں ہمارے نزدیک محمود نظامی کا "نظرنامہ" سب سے کامیاب رہے ہیں لیکن انھوں نے اپنے سفرنامے کے لئے جو زبان اور اسلوب اظہار اختیار کیا ہے وہ اس کے لئے موزوں نہیں ہے۔ دوسرے ان کی کتاب میں اس بے تکلفی اور

لاابالی پن کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے، جو اس صنفِ ادب کی جان ہوتی ہے۔ سفرنامہ دیکھنے میں ایک سہل چیز ضرور ہے، لیکن دراصل یہ ایک بہت ہی نازک صنفِ تخلیق ہے۔ اس میں اگر شعور و خود آگہی اور تکلف و آورد کی تھوڑی سی بھی آمیزش ہو جائے تو اس سے اس کی لطافت اور مہک بُری طرح متاثر ہوتی ہے۔

اختر ریاض الدین کا "سات سمندر پار" بھی یوں ایک سفرنامہ تھا، لیکن اسے مفید اور معلوماتی بنانے کی ایک شعوری کوشش نے بہت نقصان پہنچایا اور وہ ایک ایسی کتاب بن کے رہ گئی جس میں جاپان، روس، مصر وغیرہ ممالک کے متعلق کچھ دلچسپ معلومات تھیں ——— ایک ذہین مسافر کی جمع کی ہوئی معلومات!

تو حکیم محمد سعید صاحب کا یہ سفرنامہ بھی بیکن کے سٹائل میں ہے لیکن اس کا انداز عالمانہ اور سنجیدہ ہے۔ ملک جرمنی کے متعلق ایک قاری کے ذہن میں جتنے سوال پیدا ہو سکتے ہیں ان سب کا شافی جواب اسے اس سفرنامے میں مل جاتا ہے۔ مثلاً پہلے دن کی کہانی کے آغاز میں ہی قاری کو جرمن زبان میں ہفتے کے دنوں کے ناموں اور کچھ گنتی سے آگاہ کر دیا جاتا ہے۔ آگے چل کر جہاں یہ فقرہ آتا ہے کہ "چند منٹ بعد ریل گاڑی چلی اور فراٹے بھرنے لگی" وہاں اس کے فوراً بعد "ریلوے نظام" کے عنوان سے ساڑھے تین صفحوں پر مشتمل ایک پورا مضمون ہے جس میں جرمنی میں ریلوے کے ارتقاء کی ساری تاریخ آ جاتی ہے اور جس سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ "اس ملک میں پہلی ریلوے لائن ۱۸۳۵ء میں تعمیر ہوئی جو نورمبرگ سے لے کر فرتھ تک صرف چھ کلومیٹر لمبی تھی۔" جرمنی کے بڑے بڑے شہر: ہائیڈل برگ، فرینکفرٹ، بون، ڈسلڈورف، برلن اور ہمبرگ، اپنی تاریخی عمارتوں، عجائب گھروں، یونیورسٹیوں، گرم پانی کے چشموں اور شفاخانوں سمیت پوری تفصیل کے ساتھ اس سفرنامے میں بیان ہوئے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ حکیم صاحب اس بارے میں کوئی بھی معلومات اور کوئی بھی تفصیل اپنے قاری سے چھپا کر نہیں رکھنا چاہتے! ہائیڈل کے قیام کے دوران ہمارے سیاحوں کا گذر چند ایسے گرجاگھروں کے پاس سے ہوا جو سب کے سب گوتھک طرز میں بنے ہوئے تھے۔ اس پر حکیم صاحب کا ذہن گوتھک کی طرف منتقل ہوتا ہے اور وہ ہمیں اس طرزِ تعمیر کے بارے میں اپنی معلومات سے بہرہ ور کرتے ہیں۔ گوتھک طرزِ تعمیر وہ ہے جو روم اور بازنطین کے آرائشی طرزِ تعمیر کے ردِعمل کے طور پر وجود میں آیا جس میں اس بات کی کوشش کی جاتی تھی کہ اس میں تصنع بھی نہ ہو اور اس کے ساتھ وہ جاذبِ نظر بھی ہو! یہ گوتھک کیوں کہلایا؟ اس کے متعلق حکیم صاحب کہتے ہیں "میرا خیال ہے کہ اس طرزِ تعمیر کے لئے جو اصطلاحی لفظ گوتھک وضع کیا گیا وہ شاید جرمن زبان کے لفظ گوتھا سے مشتق ہے۔ گوتھا جرمنی کے ایک علاقے تھورنگیا میں ایک چھوٹا سا قصبہ تھا!" اس طرح وہ قاری کی علمی دلچسپی کے لئے کتاب کے شروع میں یہ معلومات بھی بہم پہنچاتے ہیں کہ جرمنی میں ریلوں کے ہفتہ وار اور ماہانہ ٹکٹ جاری کئے جاتے ہیں جنھیں نٹس کا رٹے کہا جاتا ہے۔ اگر آپ وہاں ایک ٹکٹ خرید لیں تو پورا ایک مہینہ یا ایک ہفتہ آپ بلا روک ٹوک جس گاڑی سے چاہیں اور جہاں چاہیں سفر کر سکتے ہیں!

یہ سفرنامہ اگرچہ موضوعی انداز کا نہیں ہے تاہم اس میں ہمیں حکیم محمد سعید صاحب کی شخصیت کی کچھ جھلکیاں یہاں وہاں دکھائی دے جاتی ہیں۔ مثلاً ان کی پابندیٔ نماز، نیز ریستورانوں میں کھانا کھاتے وقت حلال و حرام کے متعلق ان کی بے چینی، ہوٹل کے کمرے میں عورتوں کی تصویریں نہ پا کر ان کی راحت (اپنے کمرے کے ذخیرۂ کتب میں سے صرف معلوماتی کتابوں کا انتخاب (قصے کہانیوں اور ناولوں کی بجائے میں نے تاریخی کتابوں کا جائزہ لیا) مغربی لباس سے طبعاً نفرت، اور حسن و عشق کی باتوں سے نابلد ہونے کا اعتراف (حسن و عشق کے کوچہ و بازار میں اپنا گذر کبھی نہیں ہوا، اپنی زندگی اس منزل سے ناآشنا رہی ہے) ——

یہ ان کی شخصیت کا ایک رخ ہے جس میں حکیم صاحب اپنی شیروانی کے گلے کا بٹن بند کئے اور چہرے پر متانت قائم کئے رکھتے ہیں۔ کتاب میں بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں جہاں حکیم صاحب کی طبیعت کچھ دیر کے لئے بشاش ہو جاتی ہے اور وہ اپنے گلے کا بٹن کھول کر اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے مقامات پر پڑھنے والا چاہتا ہے کہ کاش حکیم صاحب اس موڈ میں باتیں کرتے چلے جائیں لیکن اس کی یہ خواہش عموماً تشنہ رہتی ہے اور حکیم صاحب کی شخصیت کا آفتاب ایک لمحے کے لئے اپنی چمک دمک دکھا کر پھر تکلف اور رکھ رکھاؤ کے بادلوں میں چھپ جاتا ہے۔ ہمارے ان سیاحوں کو ایک دن ایک شفاخانۂ جراحی دیکھنے جانا تھا۔ وہاں ایک خاتون پہلے سے ان کی منتظر تھیں۔ ہمارے سیاح پاکستانی روایت کے مطابق ذرا تاخیر سے پہنچے تو وہاں انھیں کچھ معذرت کرنی پڑی۔ حکیم صاحب لکھتے ہیں کہ "اس کے جواب میں جو جملہ نازک لبوں سے ادا ہوا اس کی کرختگی کو ہم دونوں بھائی اور معنی و مفہوم کو صرف مجبوب سمجھ سکتے تھے۔" آگے انھی استقبال کرنے

والی خاتون کے متعلق لکھتے ہیں "ان کا نام — میں یہ تو ہرگز نہیں کہوں گا کہ بے زباں پہ بارِ خدا یہ کس کا نام آیا — کیونکہ تین دفعہ سننے کے بعد بھی میں اس کا صحیح تلفظ ادا نہیں کر سکا ..... میں نے ان کی آنکھوں کی رعایت سے ان کا نام مس نرگس رکھ دیا۔ ہم نے لفظ زرلین کے استعمال سے سمجھ لیا تھا کہ یہ کوئی چینی مس صاحبہ ہیں ...... اور جب میں نے مطلب بیان کیا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں، اور اس طرح ایک اور قسم کے غیر مرئی پھول برآمدے میں بکھر گئے ......"

——— لیکن اس معاملہ میں زیادہ خوش فہم ہونے کی ضرورت نہیں۔ کتاب میں ایسے مقامات بہت شاذ و نادر ہونے کے برابر ہیں۔ ہمیں حکیم صاحب کو وہی کچھ سمجھنا چاہیئے جو وہ خود چاہتے ہیں کہ ہم انھیں سمجھیں، اور جس کا بیان کتاب میں بیشتر جگہوں پر ملتا ہے:

اس کتاب کے فاضلانہ اور معلوماتی ہونے سے کسی کو یہ گمان نہیں ہونا چاہیئے کہ یہ عالمانہ کتابوں کی طرح خشک اور غیر دلچسپ بھی ہے۔ جرمنی کے متعلق ہر طرح کی جغرافیائی، تاریخی اور معاشرتی معلومات کو جس طرح حکیم صاحب نے ترتیب دیا ہے اور اس کے لئے جو انداز بیان اختیار کیا ہے اس نے اس کتاب کو بہت دلچسپ اور قابل مطالعہ readable بنا دیا ہے۔ حکیم صاحب اہل زبان ہیں، اور ان کی تحریر میں لطافت اور چاشنی ہے، اور یہ ان کے اسلوب بیان کا اعجاز ہے کہ یہ بظاہر ضخیم اور معلوماتی کتاب پڑھنے میں بہت کم وقت لیتی ہے اور قاری کو کہیں بھی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ کتاب میں فاضل مصنف نے کہیں کہیں ظرافت اور طنز کا عنصر بھی شامل کر دیا ہے۔ جہاں ایسے مقامات آتے ہیں وہاں قاری کی مضمحل ہوتی ہوئی دلچسپی پھر سے تازہ دم ہو جاتی ہے۔ جرمنی میں ایک جگہ کا نام "باڈن باڈن" ہے۔ حکیم صاحب لکھتے ہیں:

> "کسی طرح یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس چھوٹے سے شہر کے نام میں ایک ہی لفظ دوبار کیوں استعمال ہوا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ شہر کی داغ بیل ڈالے جانے کے وقت یہ نام کسی ہکلے شخص نے تجویز کیا ہو۔ وہ صرف باڈن کہنا چاہتا تھا لیکن اپنی معذوری کے باعث، جیسا کہ عموماً ہوتا ہے وہ اسے دوبار کہہ گیا۔ اور لوگوں نے جس طرح سنا، اختیار کر لیا۔"

ایک اور جگہ میونک کے عجائب گھر کے تذکرے کے بعد لکھتے ہیں:

> "میرے دل نے دعا کی کہ کبھی پاکستان میں بھی ایک ایسی چیز قائم کی جا سکے۔ بلکہ اسے میونک کے عجائب گھر سے بھی زیادہ مضحکہ خیز انداز میں آراستہ کیا جائے۔ پاکستان میں مضحکات کی کمی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ یہاں کے بعض ارباب اقتدار کو ذرا سجا سنوار کر ایک خاص صورت میں بٹھا دیا جائے تو جرمنی کے مذکورہ عجائب گھر کے نوادر بھی بازی لے جائیں گے۔"

یہ بات انھوں نے غالباً ۱۹۵۸ء میں اپنے روزنامچے میں لکھی ہوگی۔ اس کے بعد حالات کیا سے کیا ہو گئے۔ اب شاید حکیم صاحب اپنی طنز کے اس انداز سے زیادہ خوش ہوں!

اس کتاب کو پڑھ کر میں نے یہ تہیہ کیا ہے کہ میں اگر کبھی جرمنی گیا (جس کا فی الحال دور دور تک کوئی امکان نہیں) تو اپنے سفر میں جرمنی نامہ ضرور اپنے ساتھ رکھوں گا مگر اسے پڑھ لینے اور ہضم کر لینے کے بعد ہی جرمنی کی سرزمین میں قدم رکھوں گا۔ اس وقت مجھے کسی ٹرین میں سفر کرتے وقت یہ تک معلوم ہوگا کہ جس ریلوے لائن پر سے میں اس وقت گزر رہا ہوں اس کی داغ بیل کس سن میں پڑی تھی، اور یہ انجن جو اس گاڑی کو کھینچ رہا ہے کونسی قسم کا ہے اور اس کا رواج جرمنی میں کب پڑا ——— جرمنی نامہ میں وہ سب کچھ یکجا ہے جو گائیڈ کی مختلف کتابوں اور رسالوں اور پمفلٹوں میں الگ الگ دیا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن جو حسن ترتیب اور خوبی بیان جرمنی نامہ میں ہے وہ سیاحت کی ان رہنما کتابوں کو کہاں نصیب ہو سکتی ہے:

کتاب کی طباعت اور گٹ اپ اور سرورق میں مکتبۂ جدید نے ایک دفعہ پھر اپنے اعلیٰ معیار کا مظاہرہ کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک انڈکس بھی شامل ہے، اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم اپنے اشاعتی معیار میں اب مغرب سے زیادہ پیچھے نہیں رہے!

حکیم محمد سعید دہلوی کی شخصیت کے متعلق میں نے کچھ نہیں کہا، اس لئے کہ وہ آج ہماری سوسائٹی کے مشاہیر میں سے ہیں۔ حکومت و اقتدار کے دائرے سے

باہر رہتے ہوئے بھی جو شخصیتیں محترم اور معزز اور نامور ہیں۔ ان میں حکیم صاحب نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ ہوائی اڈے پر کسی وزیر کا استقبال ہوتے ہوئے دیکھا، تو ایک صاحب سے دریافت کیا کہ یہ کون سے وزیر تھے، جواب ملا حکیم محمد سعید دہلوی! حکیم صاحب کو جو لوگ جانتے تھے وہ تو جانتے ہی تھے جو نہیں جانتے تھے وہ انہیں شامِ ہمدرد کی ماہانہ تقریبات کے حوالے سے جان گئے ہیں!

محمد کاظم

اسلامی ریاست (ایک تاریخی جائزہ)

تالیف: ڈاکٹر امیر حسن صدیقی — ترجمہ، اضافہ و حواشی: نثار احمد

اشاعت: جمعیت الفلاح، کراچی — صفحات: ۳۲۰ — قیمت: آٹھ روپے (مجلد)

یہ کتاب اپنی موجودہ شکل میں اسلامی تاریخ کے دو فاضلوں کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر امیر حسن صدیقی نے، جو تاریخ اسلام میں لندن یونیورسٹی کے پی ایچ ڈی ہیں، اصل کتاب انگریزی میں لکھی تھی جسے اب ان کے شاگرد رشید نثار احمد ایم اے نے نہ صرف اردو کا جامہ پہنایا ہے بلکہ اس میں مناسب حذف و اضافہ کرکے اس پر مفصل حواشی بھی لکھے ہیں۔ استاد کے اصل متن اور شاگرد کے حواشی کے ساتھ اب یہ کتاب اسلامی ریاست کی تاسیس اور اس کے عہد بعہد ارتقا کے موضوع پر ایک مفید اور اہم دستاویز بن گئی ہے۔ زمانۂ حال کے تاریخی ذہن میں اسلامی ریاست کے بارے میں جو سوالات اُبھرتے ہیں، ان سے ہماری تاریخ کی قدیم کتابیں اول تو بہت کم تعرض کرتی ہیں اور اگر ان کے اندر ان سوالات کے بارے کچھ مواد ملتا بھی ہے تو وہ اتنا بکھرا ہوا اور غیر مرتب ہوتا ہے کہ اس کو جمع کرنے کے لئے ہزاروں صفحات کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے۔ تین سو سے کچھ اوپر صفحوں کی اس مختصر سی کتاب میں "اسلامی ریاست" کے بارے میں تقریباً سب اہم سوالات کا جواب آ گیا ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ کتاب ہمارے نزدیک اسلامی تاریخ کے موضوع پر ایک ایسی ٹکسٹ بک کا درجہ رکھتی ہے جس کا مطالعہ طلبہ کے لئے ناگزیر ہے۔

اسلام کے ظہور سے قبل عرب کی سیاسی حالت کیا تھی؟ اس کا ایک بنا بنایا جواب ہمارے نیم تاریخ داں اساتذہ طلبہ کو یہ دیتے چلے آ رہے ہیں کہ بس ہر طرف افراتفری تھی۔ انارکی کا بازار گرم تھا، نظم و اجتماع کا تصور سرے سے غائب تھا، ہر چھوٹا بڑا کسی کے امر و اقتدار کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے —— حالانکہ یہ نری مبالغہ آمیزی ہے۔ اسلام سے پہلے جاہل عربوں کا ایک پورا قبائلی نظام تھا جس کے قواعد و ضوابط تھے، روایات تھیں، حقوق اور فرائض تھے۔ پھر عرب میں بعض مجامع کا رواج تھا یعنی مختلف مقامات پر مختلف تقریبوں سے میلے لگتے تھے جن میں تجارت بھی ہوتی تھی، قبائل کے باہمی جھگڑوں کا تصفیہ بھی ہوتا تھا، شعر و سخن کی محفلیں بھی جمتی تھیں اور ان میں اشعر العرب (عرب کے سب سے بڑے شاعر) کا انتخاب بھی ہوتا تھا۔ اسی طرح عربوں کی اپنی چھوٹی چھوٹی شہری مملکتیں موجود تھیں جن میں سے مکہ کی شہری مملکت نے قصیٔ کے عہد میں ایک ایسی ارتقائی شکل اختیار کر لی تھی کہ اس کی تفاصیل پڑھ کر ہمیں آج بھی حیرت ہوتی ہے۔ اس مملکت میں اکیس عہدے تھے: حجابہ (کعبۃ اللہ کی نگرانی)، سقایہ (حجاج کے لئے پانی کی رسد کا انتظام)، رفادہ (خدمت اور اعانت کے متفرق کام)، ندوہ (اسمبلی)، مشورہ، قیادہ، سفارہ وغیرہ..... جن میں ندوہ یعنی اسمبلی کے محکمے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی کہ اس میں قریش کے تمام معاملات باہمی مشورے سے طے ہوتے تھے!

اس طرح کی معلومات جو تاریخ کو اپنے صحیح رنگ میں پیش کرتی ہیں، اس کتاب کی خصوصیت ہیں۔ کتاب کا اسلوب عالمانہ اور محققانہ ہے اور حقائق کو زیادہ تر معروضی انداز ہی میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسلامی ریاست کا سنگِ بنیاد کب اور کہاں پڑا؟ اس ریاست کی خصوصیات کیا تھیں؟ اس کے ذرائع آمدنی کیا تھے؟ اس کا ڈھانچہ کس طرح کا تھا؟ پھر اس ڈھانچے نے عہد نبوی سے چل کر عباسی خلفا کے دور تک پہنچتے پہنچتے کیا کیا تغیرات دیکھے اور اس کی بنیادی خصوصیات میں کس طرح سے رد و بدل ہوتا چلا گیا؟ ——

اس طرح کے تمام سوالوں کا جواب اس کتاب میں واقعات و حقائق کی روشنی میں ملے گا۔ اور چونکہ اس کتاب میں کوئی بات بھی سند اور تحقیق کے بغیر نہیں کہی گئی اس لئے اس کے مندرجات کے بارے میں ہر طرح سے اعتماد کیا جا سکتا ہے!

بس ایک سوال قاری کے ذہن میں ایسا رہ جاتا ہے جس کا جواب شاید اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔ وہ یہ کہ ایسی اسلامی ریاست جو اپنی اصل خصوصیات کے ساتھ صرف پہلی صدی ہجری کے کچھ حصے تک قائم رہ سکی۔ اب اس زمانے میں اس کے قائم ہونے کے امکانات کس قدر ہیں؟ — اس سوال کا جواب آج سے پندرہ بیس برس پہلے اتنا واضح اور غیر یقینی دکھائی نہیں دیتا تھا جتنا اب دکھائی دیتا ہے۔ اسلامی ریاست کو پھر سے بروئے کار لانے کے لئے جو تنظیمیں عالم اسلام کے اطراف میں اٹھی تھیں وہ اس زمانے میں اپنے عروج پر تھیں اور حالات کافی امید افزا تھے۔ لیکن افسوس کہ وہ تنظیمیں قبل اس کے کہ وہ اپنی حریف طاقتوں کے ساتھ کسی فیصلہ کن مرحلے میں زور آزمائی کر سکتیں داخلی انتشار اور خود شکستگی کے ایک ایسے عمل سے دوچار ہو گئیں جس کے بعد کوئی تنظیم مشکل ہی سے اپنے آپ کو سنبھال سکتی ہے — ایسی حالت میں یہ جذبہ تو اپنی جگہ قابل تحسین ہے کہ اسلامی ریاست کے اس مطالعے سے قوم کے اندر اس ریاست کو پھر سے قائم کرنے کا عزم و ارادہ پیدا ہو، لیکن اس کی صورت کیا ہو گی اور اس منزل کی طرف پیش قدمی اب تک کیوں اتنی دشوار اور لاحاصل ثابت ہوئی ہے؟ اس کے جواب کے لئے افسوس ہے کہ محض یہ جذبہ کوئی کام نہیں دیتا۔ ہمارے خیال میں اب وقت آ گیا ہے کہ ہمارے اہل بصیرت اور مومنین محققین اس امر کی تحقیقات کریں کہ اسلامی ریاست کے احیا کی خاطر اٹھنے والی تنظیموں کو یہ کیا عارضہ لاحق ہو گیا تقریباً ہر جگہ ان کے اندر تفرقہ و اختلاف کی ہوا چل پڑی، ان کے دو دو گروپ بن گئے اور ان کے کارکنوں کا جذبہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سرد پڑتا چلا گیا۔ یہ تنظیمیں کہنے کو آج بھی موجود ہیں اور کم و بیش شاید ان کے ممبروں کی تعداد پہلے سے کہیں زیادہ ہو اور وہ بظاہر پھلتی پھولتی ہوئی دکھائی دیں لیکن ورم اور موٹاپے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ان کا اگر آپ قریب سے جائزہ لے کر دیکھیں تو محسوس ہو گا کہ وہ اب اپنے anticlimax میں سے گزر رہی ہیں اور خون کی کمی کا شکار ہیں:

یہ بہرحال ایک سوال ہے جو اسلامی ریاست کے موضوع پر یہ مفید اور جامع تصنیف پڑھ کر میرے ذہن میں پیدا ہوا۔ یہی سوال دوسرے پڑھنے والوں کے ذہنوں میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر اس پہلو سے بھی کتاب میں۔ اس کے کسی اگلے ایڈیشن میں تھوڑی سی بحث ہو جائے تو میرے خیال میں کتاب کا یہ پہلو جو اس وقت تشنہ محسوس ہوتا ہے مکمل ہو جائے گا۔

اصل کتاب کا ترجمہ کافی اچھا ہے، اور اس پر ترجمے کا گمان کم ہی ہوتا ہے۔ کتاب میں البتہ کہیں کہیں بعض جملے ایسے بھی نظر آ جاتے ہیں جن میں زبان اس معیار کی نہیں جو تاریخ کی ایک اچھے پائے کی کتاب کے لئے ضروری ہے۔ مثلاً

"یہ تو دنیا کے سب سے بڑے سیاست دان محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم تھے جنھوں نے حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے۔"

یہ جملہ کسی سکول کے طالب علم کا لکھا ہوا لگتا ہے نہ کہ اسلامی تاریخ کے کسی فاضل کا! پھر کئی جگہوں پر "نہ ہی" کا استعمال دیکھ کر ہمیں مولانا ماہر القادری کی ہے بسی کا خیال آیا۔ زبان کو صحیح اور آمیزش سے پاک رکھنے کے لئے "فاران" کے صفحات پر وہ جو جہاد ایک عرصے سے کر رہے ہیں، اس کا اثر کم از کم کراچی کے اسلام پسند حلقوں پر تو ہونا چاہیئے تھا۔ اسی طرح شروع کے مقدمے میں ایک جملہ ہے: "جنھوں نے ترجمے کے ابتدائی مسودہ کو تیار کیا۔" مجھے یقین ہے کہ مولانا اس ترکیب سے بھی خوش نہیں ہوں گے لیکن حیرت کی بات ہے کہ ان کے شہر میں، اور شاید ان کے حلقے کے اندر لوگ اس طرح کی عبارتیں بھی لکھ جاتے ہیں۔

لفظ خلافت کی بحث میں (ص ۱۰۷) ایک جگہ حاشیہ میں لکھا ہے کہ خلف عموماً برے معنی میں آتا ہے یعنی ناخلف (برے جانشین) جیسا کہ قرآن میں ہے فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ — عربی زبان سے کچھ مس رکھنے والے جانتے ہیں کہ عربی میں خلف اچھے اور برے دونوں معنوں میں آتا ہے اور کسی معنی کو رجحان یا عمومیت حاصل نہیں ہے۔ ناخلف کی ترکیب بھی عربی نہیں عجمی ہے۔ عربی میں کہتے ہیں: وَخَلَفَهُ عَلَىٰ أَهْلِهِ فَأَحْسَنَ الْخِلَافَةَ (اس نے اپنے اہل و عیال پر اسے اپنا جانشین مقرر کیا، اور اس نے اپنی جانشینی کو بہت عمدگی سے نبھایا) اسی طرح ایک دوسرے موقعہ پر کہتے ہیں وَهُوَ خَلَفُ صِدْقٍ من أبيه

وہ اپنے باپ کا صحیح جانشین ہے (یعنی جو صفات باپ میں تھیں وہ بیٹے میں بھی آ گئیں) ——— علمی اور تحقیقی کتابوں میں کوئی ایسی بات کہنے سے احتراز ہی کرنا چاہیئے جس کے بارے میں پوری تحقیق نہ ہو! امید ہے کتاب میں زبان و بیان کی یہ چھوٹی چھوٹی فروگذاشتیں اگلے ایڈیشن میں دور کر دی جائیں گی۔

کتاب کی طباعت اور گٹ اپ بہت اچھا ہے، اور ایک معیاری کتاب کے لائق؛ اسلامی ریاست کے موضوع پر اس کتاب کو ایسے نوٹس (NOTES) کا مجموعہ سمجھنا چاہیئے جو اس کے مصنف اور حاشیہ نگار نے برسوں کے مطالعۂ تاریخ سے اکٹھے کئے ہوں گے۔ علم کے صحیح قدر دان جانتے ہیں کہ ایسے نوٹس کتنے قیمتی اور لائق تحفظ ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس کتاب کی قیمت پانچ سات روپے ہو یا آٹھ روپے در حقیقت کچھ بھی نہیں ہے!

محمد کاظم

ناولوں کی کھیپ

ناول	مصنف	ناشر
۱۔ دو چراغ محفل	اکرام الرحمٰن	؍
۲۔ کیا وہ ناچ رہی تھی	عثمان علیم	کتاب منزل لاہور
۳۔ قربانی	مہدی علی صدیقی	؍ ؍ ؍
۴۔ دیدۂ تر	عابدی جعفر	؍ ؍ ؍
۵۔ انکار	عابدی جعفر	؍ ؍ ؍
۶۔ نوشاد۔ ایک معاشرتی ناول	انجم پرواز	چودھری اکادمی لاہور
۷۔ داغوں کی بہار	اختر سلیمی	حسن کار اشاعت گھر لاہور

اور بہت سے دوسرے ناول جو چھپ چکے یا چھپنے والے ہیں

ہمارے نوجوان اولوالعزم ناول نگاروں میں کیا خرابی ہے؟ آخر اتنے بُرے ناول ——— فراق کے الفاظ میں ——— لکڑی کے ناول کیوں لکھے جاتے ہیں؟ کیا یہ عجیب نہیں کہ اردو میں پچھلے پندرہ بیس برس میں صرف ایک دو ناول ایسے لکھے گئے ہیں جنہیں صحیح معنی میں ناول کہا جا سکتا ہے اور جن کے کردار جیتے جاگتے اور قابل یقین لگتے ہیں۔ کسی نے لکھا ہے کہ ہر شخص میں ایک ناول ہے لیکن ہر کوئی ناول نہیں لکھ سکتا۔ ناول لکھنے کے لئے زندگی کا وسیع اور گوناگوں تجربہ، اور خیز اور گہری قوت تخیل، فراوان تخلیقی جودت اور کہانی کہنے کی قدرتی صلاحیت ضروری ہیں اور بہت تھوڑے لوگ ان صفات کو حاصل کر پاتے ہیں۔ کوئی صرف خواہش کرنے سے موپساں، طالسطائی یا ہارڈی نہیں بن سکتا۔ ہم سب البتہ اپنے نام کو جلی حروف میں ایک کتاب کے سرورق پر چھپا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم سب ابدی حیات پر اپنی کمند ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ ہم سے بعد میں آنے والے یہ جان سکیں کہ ہم بھی کبھی اس راستے پر سے گذرے ہیں۔ ہمارے ناولسٹوں کے ساتھ یہی مصیبت ہے، وہ ادبی آسمان پر تارے بن کر بکھرنا چاہتے ہیں اور اس خواہش سے تلملائے جاتے ہیں کہ ادب کے شاہسواروں میں ان کا شمار ہو۔ مجھے اس خواہش سے پوری ہمدردی ہے۔ میں نے بھی اپنی خوابوں میں موپساں سے "دوئلیں" لڑی ہیں اور اسے گھائل کیا ہے۔ میں نے بھی اپنا نام کئی شاہکاروں کی جلدوں پر سونے کے حروف میں دمکتا ہوا دیکھا ہے۔ مگر خواہش سے مراد تکمیل نہیں۔ سالوں کی اذیت کوشی کے بعد میں حقیقت کی اس کڑوی گولی کو نگل سکا کہ میں ناولسٹ نہیں بن سکتا کہ میری قسمت میں روشنیوں کے پیچھے سٹیج پر ظاہر ہونا نہیں لکھا، بلکہ یہ کہ میں ان گیلری میں بیٹھے ہوئے ہزاروں تماشائیوں میں سے ہوں جو تالیاں پیٹتے اور واہ واہ کر کے تماشے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کو جاننے کے بعد میں اپنے تماشائی کے رول پر قانع ہو گیا اور مزے کی نیند سونے لگا۔

مگر یہ سچ ہے کہ ترتیب کے بغیر کوئی منزل پر پہنچ بھی نہیں سکتا۔ اس لئے میں ان ناولسٹوں کے ورود کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ ان کی امنگ کی میرے دل میں قدر ہے۔ ان کے ناول خاصے بڑے اور چھوٹے اور بناوٹی ہیں مگر اس میں ہرج ہی کیا ہے ناول لکھنا ایک معصوم بے ضرر شغل ہے اور اس سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اگر ناول بُرا یا غیر دلچسپ ہے تو تم اسے مخصب کر سکتے ہو اور اپنے آپ کو بہلانے کے لئے کچھ اور کر سکتے ہو۔ ایسا کرنے سے ناول لکھنے والے کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا بھی کوئی خدشہ نہیں۔ اسے یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ سیکڑوں میل دور ایک پڑھنے والے نے اس کے عظیم الشان ناول کو لائق توجہ نہیں جانا۔ اور اگر اسے کسی طرح یہ پتہ بھی لگ جائے تو وہ یقیناً تمہاری کور ذوقی پر دستِ تاسف ملے گا اسے یہ گمان بھی نہ ہوگا کہ اس نے بُرا ناول لکھا ہے۔ سب ناول ان کے لکھنے والوں کے نزدیک شاہکار ہوتے ہیں۔ اس طرح ناول نویس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس کا نام ناول کے سرورق پر سرخی میں اپنی آب و تاب دکھاتا ہے اور وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ میرا خیال ہے ہگ والپول نے کہا ہے کہ ناول لکھنا، خواہ برا ناول لکھنا اعصابی تشنج کے لئے مفید ہے اور پانچ چھ فل سکیپ صفحے لکھنے کے بعد آدمی ایک مطمئن ضمیر کے ساتھ سو سکتا ہے۔

میرا ان ناولسٹوں سے جھگڑا یہ ہے کہ اگر انہیں ناول لکھنا ہی تھے تو وہ مختلف قسم کے ناول لکھتے، انہوں نے وہی رومانی، سماجی اور جنسی زمین روندی ہے جو ہزار بار پہلے روندی جا چکی ہے۔ میں نہیں سمجھتا ایسا کرنے میں انہیں کیا لطف ملا ہوگا اور جب کسی چیز میں کوئی لطف نہ ہو تو آدمی اسے کیوں کرے۔ انہیں پٹے ہوئے تاریک راستے سے ہٹ کر ارد گرد سبز جنگلوں میں بھٹکنا چاہئے تھا جہاں وہ درختوں میں پرندوں کو گاتے اور گلہریوں کو پھدکتے دیکھتے ..... اور اس میں بھی کوئی ہرج نہ تھا اگر وہ اپنے کرداروں کو عام نارمل انسانوں کی طرح چلنے پھرنے دیتے۔ اور بڑے "ادبی" ہونے کی مریضانہ کوشش نہ کرتے۔ اگر تمہیں ایک کہانی کہنی ہے تو اسے سادگی سے صفائی سے اور قدرتی طریق سے کہو جیسا کہ بوڑھا ہیرا من کہتا ہے۔ اگر کہانی کہے جانے کے لائق ہے تو پھر وہ پڑھنے والے کو گرفت میں لے لے گی مگر اس میں شاعرانہ ادھوانی ٹکڑے ٹانکنا، دور دراز کی تشبیہیں ڈھونڈ کر جڑنا اور فلسفیانہ موشگافیاں بگھارنا اسے ناقابل برداشت اور بھونڈا بنا دے گا۔

ذکاء الرحمٰن کے ناول کو لو۔ یہ بڑے دیدہ زیب ٹائپ میں چھپا ہے اور مجھے اس کی جلد کافی پسند آئی۔ جلد کے اندر جو کچھ ہے وہ بتدیانہ بافت سازی ہے —— ایک ناقابل یقین کہانی، کردار سب الٹ پلٹ۔ اور کوئی فقرہ ایسا نہیں جس سے کھرے ہونے کی کھنک آئے۔ اس ناول سے متعلق ہر چیز جھوٹی ہے۔ میں نے اسے بڑی جھنجلاہٹ سے پڑھا اور ذکاء الرحمٰن کو اچھے خاصے کوسنے دیئے۔ مجھے امید ہے کہ اگلی بار وہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرے گا۔ اس ماحول کے بارے میں لکھے گا جس میں وہ پلا بڑھا ہے اور جسے وہ جانتا ہے اور اپنے بیان کو لفظی کرب اور سستے جذبات سے بوجھل نہیں کرے گا۔ اس کی خواہش تو نا گتی ہے لیکن اپنے نام کو سرورق پر دیکھ لینے کے بعد اسے اب ادبی شہرت پیدا کرنے کے لئے بیتابی سے کام نہ لینا چاہئے۔ اسے ابھی کافی دور چلنا ہے۔ اگر وہ حقیقی چیز لکھنا چاہتا ہے تو اسے اس فن کی ابجد ایک طالب علمانہ لگن سے سیکھنی ہوگی اور مغربی کلاسیکی اور جدید ناولوں کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ لکھنا اتنا آسان نہیں جتنا ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہے۔ جیسا کہ اسٹیونسن نے کہا ہے، یہ ایک ڈھلانی پہاڑی پر چڑھنے کی طرح ہے۔ بے حد صبر آزما اور مشقت طلب کام۔ اور لکھنے والے کے لئے اتنی ٹھوکریں اور گڑھے جابجا آتے ہیں جس میں اس کا اوندھے منہ گر پڑنے کا ہمیشہ خطرہ رہتا ہے۔

دوسری کتابوں کے متعلق میں کچھ نہیں کہوں گا۔ مگر چونکہ میں نے اسٹیونسن کا ذکر کیا ہے سو میں اس بڑے اور ناقابل تقلید کہانی کہنے والے کی لازوال رومانس کے آغاز کے باب کا ترجمہ دینا چاہوں گا۔ اس نمونے سے کہانی لکھنے کے فن کے بارے میں بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے اور مجھے سارے انگریزی ادب میں اس باب سے بہتر کسی ناول کا آغاز نہیں ملا۔ کاش سماجی اور جنسی خرافات کے بجائے ہمارے نئے ناولسٹ ہمیں KIDNAPPED جیسے ناول دیں۔ ہمیں ہوا کے تازہ جھونکوں اور چمکیلی دھوپ کی ضرورت ہے اور قطبی روشنیوں کی۔ ہم ایسی کتابیں چاہتے ہیں جو پہلے فقرے سے ہمیں اپنے دام میں لے لیں۔ جن پر ہم شدید پن سے ٹوٹ پڑیں جو ہمیں اپنے آپ سے باہر لے جائیں۔ حقیقتاً کوئی بھی ناول کی شکل میں ناپختہ فلسفہ، فرائڈ کی تحلیل نفسی یا اخلاقی و معاشی پند و نصائح نہیں چاہتا اور جو ناول پڑھنے

والے کو یہ بتانے کے لئے لکھے جاتے ہیں کہ مصنف کے سوشلزم، تمدنی اور سیاسی مسائل جنسی محبت اور فن کے تقاضوں کے بارے میں کیا خیالات ہیں۔ لفظ کے اصل معنی میں ناول ہوتے ہی نہیں۔ آلڈس ہکسلے نے ایسے ناول اپنی پوری ذہانت اور طبیعت کی براقی کو بروئے کار لا کر گئے اور گوان کے خیالات نے ایک وقت میں ایک پوری نسل کے طرز فکر اور اخلاقی نظریے کو متاثر کیا۔ مگر وہ اب بطور ناول مر چکے ہیں۔ ممکن ہے وہ کچھ مدت اور ذہنیانہ یا سماجی رسائل کی حیثیت میں پڑھے جاتے ہیں مگر وہ ناول نہیں ہیں کیونکہ ان کے لوگ عام لوگوں کی بجائے مخصوص رنگ کے ذہنی اور فکری اندازوں کے علامتی اجسام ہیں۔ بوڑھے میرامن کی چہار درویش یا سٹیونسن کی کڈنیپڈ، اس وقت تک زندہ رہیں گی اور ہمارے دلوں کو لبھاتی رہیں گی، جب کئی موٹے نصیح وبلیغ اور بھر کدار فنی شاہکار کبھی کے بھلائے جا چکے ہوں گے۔

اور یہ ہے کڈنیپڈ کا پہلا باب:

کڈنیپڈ

پہلا باب

میں شاز کی حویلی کو اپنے سفر پر روانہ ہوتا ہوں:

میں اپنی قسمت آزمائیوں کی کہانی کا آغاز ۱۷۵۱ء کے بابرکت سال کے ماہ جون کی ایک خاص صبح سے کرتا ہوں جب میں نے آخری بار اپنے باپ کے دروازے میں سے چابی نکالی۔ میں سڑک پر تھوڑی دیر ہی چلا ہوں گا کہ سورج پہاڑیوں کی چوٹیوں پر دمکنے لگا اور میرے پادری کے مکان تک پہنچتے پہنچتے بلیک برڈ پرندے باغیچے کے بنفشی پودوں میں سیٹیاں بھر رہے تھے اور کہرہ، جو پو پھٹنے کے وقت وادی کے گرد تیرتا تھا، اٹھنا اور بکھرنا شروع ہو گیا تھا۔

مسٹر کیمبل، ایسنڈین کا پادری، باغ کے پھاٹک پر کھڑا میرے انتظار میں تھا۔ اچھا آدمی! اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے کچھ کھایا پیا ہے اور یہ سننے کے بعد کہ میں سب انتظام کر کے چلا ہوں۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اسے شفقت سے اپنے بازو کے نیچے دبا دیا۔

"اچھا تو ڈیوی لڑکے" اس نے کہا "میں تمہیں رستے پر لگانے کے لئے تمہارے ساتھ فورڈ تک چلوں گا"

اور ہم خاموشی سے آگے چلنے لگے۔

"کیا تمہیں ایسنڈین چھوڑنے کا افسوس ہے؟" اس نے تھوڑے وقفے کے بعد کہا۔

جناب سچ یہ ہے" میں نے کہا "کہ اگر میں یہ جانتا ہوتا کہ میں کہاں جا رہا ہوں اور میرا کیا بنے گا، تو میں آپ کو صاف صاف بتا دیتا۔ ایسنڈین بلاشبہ ایک اچھی جگہ ہے اور میں یہاں بڑا خوش رہا ہوں لیکن پھر یہ بات بھی تو ہے کہ میں اب تک کہیں اور نہیں گیا۔ چونکہ میرے باپ اور میری ماں دونوں مر چکے ہیں، میں ان سے ایسنڈین میں اس سے زیادہ نزدیک نہیں ہوں گا جتنا ہنگری کی سلطنت میں، اور سچ کہوں کہ اگر مجھے یہ پتہ ہوتا کہ جہاں میں جا رہا ہوں، وہاں مجھے اپنے حالات کو بہتر کرنے کا موقع ملے گا تو میں عیش و مسرت سے جاتا۔"

"ہاں!" مسٹر ایسنڈین نے کہا "بہت اچھا ڈیوی لڑکے! اور اب یہ میرے لئے مناسب ہے کہ تمہیں تمہاری قسمت پر مطلع کر دوں۔ یعنی اس حد تک جتنا میں کر سکتا ہوں۔ جب تمہاری ماں اٹھ گئی اور تمہارا باپ (وہ رحم دل، پارسا آدمی) اپنی آخری بیماری میں مبتلا ہو گیا اس نے مجھے ایک خاص خط سونپا جس کے بارے میں اس نے کہا کہ تمہارا ورثہ ہے" "جونہی" اس نے کہا "میں رخصت ہو جاؤں اور گھر صاف ہو چکے اور اسباب وغیرہ ٹھکانے لگ جائے (اور ڈیوی یہ سب کچھ ہو چکا ہے) اس خط کو میرے لڑکے کے ہاتھ میں دے دو اور اسے شاز کی حویلی کی طرف روانہ کر دو جو کرمانڈ سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہی جگہ ہے" اس نے کہا "جہاں سے میں آیا تھا اور مناسب یہی ہے کہ میرا لڑکا وہیں لوٹ جائے۔ وہ ایک مستقل مزاج لڑکا ہے" تمہارے باپ نے کہا "اور ایک ہوشیار راہرو اور مجھے یقین ہے کہ وہ سلامت رہے گا اور جہاں

کہیں بھی جائے گا لوگ اسے پسند کریں گے۔"

"شاز کی حویلی" میں چلایا "میرے غریب باپ کا بھلا شاز کی حویلی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"نہیں" مسٹر کیمبل نے کہا "اس کے بارے میں کوئی یقینی سے کیا کہہ سکتا ہے؛ لیکن اس کنبے کا نام ڈیوی لڑکے وہی ہے، جو تمہارا ہے — شاز کے بالفور — ایک قدیم ایماندار، باعزت گھرانا، جو شاید ان بعد کے دنوں میں تنزل پذیر ہو گیا ہے۔ تمہارا باپ بھی ایک صاحب علم آدمی تھا، جیسا کہ اس کے مرتبے کے آدمی کے شایان شان تھا کوئی شخص اس سے زیادہ لیاقت سے مدرسہ نہیں پڑھاتا تھا؛ اس کی وضع اور بات چیت بھی عام آدمی کی سی نہیں تھی لیکن (جیسا کہ تمہیں خوب یاد ہو گا) میں اسے اپنے مکان میں بڑی خوشی سے معزز لوگوں کو ملنے کے لئے بلایا کرتا، اور وہ جو میرے اپنے گھرانے کے تھے، کلرمینٹ کے کیمبل، [illegible] کا کیمبل اور منچ کا کیمبل اور دوسرے سارے اچھے جانے پہچانے معزز آدمی اس کی صحبت میں لطف اٹھاتے۔ اب آخر میں میں اس سارے معاملے کے اجزا، کو تمہارے سامنے رکھتے ہوئے، یہ اس کی وصیت کا خط ہے اور جس پہ تمہارے جنتی بھائی نے خود اپنے ہاتھ سے بند کر کے پتہ لکھا ہے۔"

اس نے خط مجھ کو دیا جس پر پتہ ان لفظوں میں لکھا ہوا تھا: "شاز کی حویلی کے ایبنیزر بالفور اسکوائر کے ہاتھوں میں یہ دستاویز گیا میرا لڑکا ڈیوڈ بالفور پہنچائے گا۔" میرا دل اس بڑے امکان ترقی پر زور زور سے دھڑک رہا تھا جو ایک سترہ سالہ لڑکے کے سامنے یوں اچانک ظاہر ہو گیا تھا، اٹرک کے جنگل میں ایک غریب دیہاتی استاد کے بیٹے کے لئے یہ درخشاں مستقبل!

"مسٹر کیمبل" میں لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں بولا "اگر آپ میری جگہ ہوتے تو کیا جاتے؟"

"یقینی طور پر" پادری نے کہا "ضرور میں جاتا۔ تمہارے جیسے ہوشیار بنا کہ لڑکے کو دو دن کے سفر میں کرمنڈ پہنچ جانا چاہیے (جو اڈنبرگ کے پاس ہے)، اگر بری سے بری بات بھی واقع ہو جائے اور تمہارے یہ اونچے قرابت دار (کیوں میں یہ خیال کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ تمہارے خون سے ہیں) تمہیں دروازہ دکھا دیں تو تم دو دن اور چلتے چلتے پھر واپس آ کر منس کے دروازے پہ دستک دے سکتے ہو۔ لیکن میں یہ امید کرتا ہوں کہ وہ لوگ تم سے تپاک سے پیش آئیں گے (جیسا کہ تمہارے بے چارے باپ نے تمہارے لئے پیش گوئی کی تھی) اور کیا پتہ ہے کہ تم کبھی بڑے آدمی بن جاؤ۔ اور یہ ڈیوی لڑکے، میرے ضمیر پر یہ بات پڑی ہے کہ میں اس جدائی کو بہتر بناؤں اور تجھے اس دنیا کے خطروں سے خبردار کر دوں۔"

یہاں اس نے آس پاس بیٹھنے کی ایک آرام دہ جگہ ڈھونڈنے کے لئے دیکھا، آخر سڑک کے کنارے ایک برچ اور صنوبر کے درخت کے نیچے پڑے ہوئے پتھر پر اس کی نظر انتخاب پڑی، وہ اس پر ایک بڑے پر متانت ہونٹ کے ساتھ بیٹھ گیا اور سورج سے بچنے کی خاطر جو اب ہم پر دو چوٹیوں کے درمیان سے چمک رہا تھا اس نے اپنی جیبی رومال کو اپنے کلغی دار ہیٹ کے اوپر ڈال لیا، وہاں بیٹھے ہوئے اٹھی ہوئی انگلی سے اس نے سب سے پہلے مختلف قسم کی بدعقیدگیوں کے خلاف خبردار کیا جن کے لئے میرے دل میں پہلے ہی کوئی کشش نہ تھی اور پھر اس نے مجھے تاکید کی کہ اپنی نمازوں اور انجیل کے پڑھنے میں کوتاہی نہ کروں۔ یہ ہو چکا تو اس حویلی کا جہاں مجھے جانا تھا لفظوں میں ایک نقشہ کھینچا اور مجھے سمجھایا کہ اس میں رہنے والوں کے ساتھ میرا طور طریقہ کیا ہونا چاہیے۔

"عام باتوں میں ڈیوی، نرم مزاجی دکھاؤ" اس نے کہا "یہ تم ہر دم ذہن میں رکھنا کہ اگرچہ تم اچھے گھرانے کے ہو، تمہاری تربیت ایک گاؤں میں ہوئی ہے ہمیں شرمندہ نہ کرنا۔ اس بڑے عالیشان گھر میں جہاں بہت سے نوکر ہوں گے، خود کو اتنا اچھا، اتنا چوکس، سمجھنے میں اتنا تیز اور بات کرنے میں اتنا کم گو ظاہر کرنا جتنا کہ کوئی اور۔ باقی رہا لیرڈ — تو یہ کبھی نہ بھولنا کہ وہ لیرڈ ہے — زیادہ میں کچھ نہیں کہتا سوائے کہ عزت جس کا حق ہے اس کی عزت کرنا واجب ہے۔ ایک لیرڈ کی اطاعت و فرماں برداری کرنے سے دلی خوشی ملتی ہے یا کم از کم تمہارے جیسے کو ملنی چاہیے۔"

"اچھا جناب" میں نے کہا "میں نے آپ کی باتیں پلّے باندھ لی ہیں اور میں ان پہ عمل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔"

خوب کہا، بہت خوب: مسٹر کیمبل نے جان و دل سے کہا "اور اب کام کی باتوں سے معمولی باتوں کی طرف آتے ہوئے، میں تمہارے لئے یہ پیکٹ لایا ہوں جس میں چار چیزیں ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اسے بڑی دقت سے اپنے کوٹ کی حاشیہ کی جیب سے کھینچ کھانچ کر کچھ برآمد کیا۔ ان چار چیزوں میں سے پہلی چیز تو وہ ہے جس پر قانونی طور سے تمہارا حق ہے۔ تھوڑی سی نقدی تمہارے باپ کی کتابوں اور فرنیچر کی فروخت کی جنھیں میں نے (اور میں نے یہ تمہیں پہلے ہی سمجھا دیا تھا) اس ارادے سے خرید لیا ہے کہ انھیں اگلے آنے والے استاد کو کچھ منافع پر بیچ دوں۔ باقی تین چھوٹی چھوٹی تحفیاں ہیں جنھیں اگر تم قبول کر لوگے تو مسز کیمبل اور مجھے مسرت ہوگی۔ پہلی جو گول ہے تمہیں پہلی ملازمت میں غالباً سب سے زیادہ خوش کرے گی لیکن ڈیوی لڑکے یہ سمندر میں ایک قطرے کے مصداق ہے۔ یہ بس ایک قدم تک ہی تمہارے کام آئے گی اور صبح کی طرح شام کے دم میں اُڑ جائے گی۔ دوسری جو چپٹی شکل میں مربع ہے اور جس پر لکھا ہوا ہے، جو سڑک کے لیے ایک مضبوط لاٹھی کی طرح۔ اور بیماری میں تمہارے سر کے لئے ایک اچھے تکیے کی مانند زندگی بھر میں تمہارا آسرا ثابت ہوگی۔ اور اب آخری چیز یہ مکعب نما آخری چیز میری تو یہ تمنا ہے کہ یہ تمہیں ایک بہتر سرزمین میں دیکھے گی

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا، اپنے ہیٹ کو اُتارا۔ وہ تھوڑی دیر اونچی آواز میں دعا پڑھتا رہا اور اس کے الفاظ ایک ایسے نوجوان کے لئے جو پہلی بار دنیا میں قدم رکھنے لگا تھا بڑے پُر رقت تھے۔ پھر اچانک اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اور مجھے اپنے سینے کے ساتھ لگا کر خوب زور سے بھینچا۔ پھر اس نے مجھے ایک بازو کے فاصلے پر الگ کر کے پکڑے رکھا مجھے اپنے چہرے سے دیکھتے ہوئے جس پر رنج و غم کی علامات ثبت تھیں اور پھر وہ گھوڑے کی سی تیزی کے ساتھ گھوما اور روہانسی آواز میں الوداع پکارتا ہوا اس راستے پر واپس چلنے لگا جس پر سے ہم آدھے دوڑتے ہوئے آئے تھے۔ کسی دوسرے کے لئے شاید یہ منظر ہنسنے کی بات ہوتی۔ لیکن میرا دل ہنسی سے بہت دور تھا۔ میں اسے اس وقت تک دیکھتا رہا جس وقت تک وہ نظر میں رہا اور اس نے اپنے پورے قدم نہ روکے اور نہ ہی ایک بار پلٹ کر دیکھا۔ تب میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ میرے جانے پر یہ اس کے رنج کا اظہار ہے اور میرے ضمیر نے مجھے سخت چوٹ کی کیونکہ میں دل ہی دل میں اس خاموش بستی سے باہر نکلنے، اپنے ہی نام اور خون والے امیر اور باعزت لوگوں کے درمیان بڑے معروف گھر کو جانے پر غایت درجہ خوش تھا۔

ڈیوی ڈیوی! میں نے اپنے آپ سے کہا "کیا اتنی ناشکری بھی کبھی کسی نے کی ہوگی۔ تم ایک نام کی چمک کے لئے سب پچھلی شفقتوں اور پرانے دوستوں کو بھول گئے —— یہ کتنی شرم کی بات ہے۔"

اور میں اس پتھر پر بیٹھ گیا جسے اس اچھے آدمی نے ابھی ابھی خالی کیا تھا اور پارسل کو کھول لیا تاکہ دیکھوں کہ میرے تحفے کس قسم کے ہیں۔ وہ جسے اس نے مکعبی کہا تھا اس کے بارے تو میرے دل میں شک نہ تھا۔ یقیناً یہ ایک خانے کے جزدان میں رکھنے کی ایک انجیل تھی۔ وہ جسے اس نے گول بتایا تھا شلنگ کا ایک سکہ تھا اور تیسری چیز جسے زندگی بھر صحت اور بیماری دونوں حالتوں میں میرا آسرا بننا تھا، کھردرے بھورے کاغذ کا پرزہ تھا جس پر سرخ سیاہی سے یہ لکھا ہوا تھا۔

وادی کے پانی کی گل سوسن بنانے کی ترکیب: وادی کے سوسن کے چند پھول لو اور انھیں ایک بوتلی میں رکھ کر نتھار لو، اور جب ضرورت پڑے ایک دو چمچے اس کے پیو۔ زبان کے لقوہ سے جن کی طاقت گویائی جاتی رہی ہو یہ اسے بحال کر دیتی ہے۔ گنٹھیا میں اس کا استعمال مفید ہے۔ یہ دل کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے اور حافظے کو تیز کرتی ہے۔ اور پھولوں کو ایک مرتبان میں ڈالو جو اوپر سے خوب بند ہو اور اسے چیونٹیوں کی ایک پہاڑی میں پورا ایک مہینہ رکھو پھر اُسے باہر نکالو اور تم ایک شربت مرتبان میں پاؤ گے جو پھولوں سے پیدا ہوتا ہے۔ اسے ایک چھوٹی بوتل میں رکھو۔ یہ ایک اچھی چیز ہے۔ خواہ اسے تندرستی میں استعمال کرے یا حالت بیماری میں۔ خواہ مرد ہو یا عورت۔

اور پھر پادری کے اپنے ہاتھ سے یہ فقرہ بڑھایا گیا تھا۔

اسی طرح اگر موچ آجائے تو اس کی مالش کرو اور پیٹ کے درد کے لئے گھنٹے میں ایک چمچہ پینا ہر مرض دور کرتا ہے۔

اور یقیناً میں اس پر خوب ہی ہنسا لیکن میری ہنسی کچھ کپکپاتی ہوئی ہنسی تھی۔ اور میں نے خوشی سے اپنے بنڈل کو اپنی لاٹھی کے سرے پر لٹکایا اور فورڈ کے اوپر

اوپر کی طرف کی پہاڑی کے ساتھ ساتھ روانہ ہو گیا۔ جب میں اس بڑی روڈوں کی سڑک پر آنکلا جو سرخ ہیڈر میں سے پھیلی ہوتی جاتی ہے تو میں نے اینڈیرن کے چھوٹے گرجے، پادری کے مکان کے درختوں اور گرجے کی قبرستان میں بڑے پہاڑی کونوں کو آخری بار نظر بھر کر دیکھا، جہاں میرا باپ اور میری ماں سوئے پڑے تھے۔

ایک ناول کو کتنا دل بھانے والا، اور گرفت میں لے لینے والا انداز یہ ہے کہ وہ آسانی سے اور دلچسپی سے پڑھی جانے والی تحریر مشکل سے لکھی جاتی ہے، اور یہ سٹیونسن کے بارے میں بے حد سچ ہے۔ وہ ایک ایک فقرہ بے انداز کاوش اور محنت سے لکھتا تھا لیکن اسے پڑھتے ہوئے کبھی اس چیز کا احساس نہیں ہوتا۔ اسلوب کی سادگی اور اس کا بہاؤ ہمیں اپنے ساتھ بہائے جاتا ہے اور کہانی کی دلچسپی ہمیں نہ صرف اپنی مٹھی میں لے لیتی ہے بلکہ ہمارے تخیل کو بھی دھکا دیتی ہے۔ اس کڈنیپڈ کے آغاز میں ایک بھی بناوٹی اور جھوٹا فقرہ نہیں۔

ہمارے اُمنگ رکھنے والے ناولسٹ اگر ادبیت اور فن بگھارنے کی بجائے سیدھے سادے اور صاف لہجے میں اپنی بات کہتے تو ان کے یہ ناول یقیناً بہتر اور زیادہ پڑھنے کے لائق ہوتے۔

ہر کوئی اسٹیونسن نہیں بن سکتا۔ لیکن اگر میں اور ذکار الرحمٰن (اینڈ کمپنی) کبھی زندگی بھر میں اس سے آدھی کتاب بھی کہہ سکے جیسی کہ کڈنیپڈ ہے تو ہم فی الواقع خوش نصیب ہوں گے اور شادماں موت مر سکیں گے۔

محمد خالد اختر

الف (مجموعۂ کلام)

مصنف: رئیس امروہوی
ناشر: ادارہ ذہن جدید کراچی
قیمت ۳ روپے

رئیس امروہوی کو ابھی تک میں نے قطعہ کے فریم میں فٹ دیکھا تھا اور وہ قطعہ بھی ہنگامی اور اخباری۔ بایں ہمہ میں رئیس کی زود گوئی، قادر الکلامی، فنی پختگی، ذہانت اور جدتِ اظہار کا ہمیشہ سے قائل تھا۔

الف کی اشاعت نے رئیس کو قطعہ کے فریم سے نکال کر کائناتِ سخن کے اُفق پر جلوہ گر کر دیا ہے۔ اب رئیس ایک آفاقی اقدار کا شاعر نظر آتا ہے۔ میں نے رئیس کو فرصت کے لمحات میں پورے خلوص اور احتیاط سے پڑھا ہے۔ اس ضمن میں میں جو بھی کہوں گا قاری کے اعتماد کو کسی قسم کی جانبداری کے اندھیرے میں رکھنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ اس دور کی سب سے بڑی صداقت یہی ہے کہ مخاطب کو تصویر کا سچا رخ دکھا دیا جائے۔

الف کو آپ پورے انہماک اور لگاؤ کے ساتھ پڑھتے تو آپ یہ تاثر ضرور قائم کریں گے کہ رئیس بھی اس دور کے چیدہ شعراء جوش، ندیم، فیض، فراق کی طرح اپنا الگ مقام رکھتے ہیں اور آئندہ اردو ادب کی تاریخ میں ان کا نام زندہ رہنے والا ہے۔ رئیس نے چودہ سال کی عمر سے شاعری کا آغاز کیا۔ اس مدت میں ان کا قلم غمِ جاناں سے لے کر غمِ دوراں تک اور عقل کے کرب سے وجدان کی خلش تک! دامن میں بغیر تھکے ہوئے چلتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رئیس صاحب کے اپنے ایک بیان کے مطابق آج تک وہ کم و بیش چھ ہزار قطعات ..... تین سو غزلیں ..... ایک ہزار نظمیں ..... ایک سو چھ مثنویاں ..... اور متعدد مرثیے، سہرے، رباعیات وغیرہ وغیرہ سلکِ نظم میں پرو چکے ہیں۔ جس شاعر نے اتنا کچھ کہا ہو اس کا فن کس نہج پر ہوگا، یہ آپ خود اندازہ لگائیے۔

مجھے اس دور میں دو شخصیتیں ایسی نظر آتی ہیں جو بیک وقت غزل، نظم، قطعہ، مضامین اور دیگر اصنافِ سخن میں گراں قدر اضافہ کرتی کرتی چلی جا رہی ہیں۔ گذشتہ تیس سال سے احمد ندیم قاسمی اور رئیس امروہوی اس منزل کو قدم بہ قدم سر کرتے ہیں۔

رئیس کی بسیار گوئی کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ کمال تو یہ ہے کہ وہ اتنی تیزی سے لکھنے کے باوجود فکر کی گہرائی و گیرائی، فن کی

عظمت اور جدت وندرت ان کے قلم سے ٹپکتی ہے۔

الف کے دو حصے نمایاں ہیں: غزل ....اور........ نظم

غزل جیسی نیم وحشی صنف سخن (جو ہر چند نیم وحشی صنف سخن نہیں ہے) کے بارے میں آپ خوب جانتے ہیں کہ اس کا قرار دانے اچھے اچھوں سے توبہ کرالی ہے اور بڑے بڑے سورما اس کے سامنے سپر انداز ہوگئے ہیں۔ اس دو مصرعوں کے ہلکے پھلکے ربط۔ کی وسعت کو دائرہ تسخیر میں مقید کرنا ہر چند ناممکن ہے مگر اس دور میں غالب کے بعد چند ایسے ذہن ابھرتے ہیں جنھوں نے نہ صرف تسخیر کی منزل کو پالیا ہے بلکہ اس میں نئی راہوں کا اضافہ بھی کیا ہے

رئیس کی الگ آواز ہے ہر چند اس کی بڑی خصوصیت فلسفیانہ سوچ اور نفسیاتی طرز احساس ہے اور رئیس کے قارئین اپنی عادت کے مطابق رئیس کو انہی نظریات کی روشنی میں دیکھتے ہیں مگر یہ رئیس کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ شاعری میں صرف فلسفہ و نفسیات ہی ایک شاعر کا طرۂ امتیاز نہیں ہو سکتا۔ ہمارے پاس "ارسطو" سے "فرائڈ" تک اور "رومی" سے "غالب" تک ایسی بہت سی باتیں موجود ہیں۔ یہ سارا کھیلا رئیس صاحب کے فلسفیانہ مضامین اور نفسیاتی تحریروں نے پیدا کر دیا ہے۔ "الف" میں یہ دونوں عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں اور اسی لئے میں اشعار بطور سند پیش نہیں کرتا لیکن رئیس کی دوسری خصوصیات جو ان کی تصویر میں شاعرانہ رنگ بھرتی ہیں اور ان کی شخصیت میں ایک جاذبیت اور کشش پیدا کرتی ہیں سامنے لانا ضروری ہیں۔

"الف" کا مطالعہ یہ بات روشن کر دیتا ہے کہ رئیس کی غزل اس دور کا پورا پورا شعور رکھتی ہے جس میں روایت کی چاشنی بھی ہے، حال کی مصوری بھی اور مستقبل کی جھلک بھی۔ یوں کہیے کہ رئیس نے "روح عصر" کو اپنی غزل میں بکمال احسن سمو لیا ہے۔

رئیس کے کلام میں جو سب سے زیادہ منفرد چیز مجھے نظر آئی ہے وہ "خوف کا عنصر" ہے۔ یہی خوف جب کالرج کی شاعری میں نمایاں ہوا تو اسے ماورائیت کا نام دیا گیا۔ انگریزی ادب میں یہی "ازم" کالرج کی حیات کا باعث ہے ورنہ آج کالرج کا کوئی نام لیوا نہ ہوتا۔

اردو ادب میں خوف کا یہ عنصر شاعروں کے ہاں "خال خال" نظر آتا ہے۔ خدا جانے رئیس کے ہاں یہ جذبہ شعوری ہے یا لاشعوری مگر اتنا نمایاں ہو کر آیا ہے کہ اردو ادب میں ایک مستقل قدر بنتا معلوم ہوتا ہے۔ اگر کالرج اور رئیس کی ماورائیت کا موازنہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوگی کہ کالرج نے خوف کی جو فضا بنائی ہے وہ تصوراتی ہے اور بیان کی حد تک محدود ہے مگر رئیس نے خوف کے نفسیات کی مدد سے کچھ ایسے دائرے بنے ہیں کہ قاری اپنے آپ کو ان دائروں میں محبوس پاتا ہے۔

اردو غزل یا نظم میں اگر ماورائیت کی کوئی قدر متعین ہوتی ہے تو رئیس پہلا اور منفرد شاعر ہے جسے اس قدر کی علمبرداری کا اعزاز حاصل ہوگا۔ مثال کے طور پر چند شعر لکھتا ہوں:

یہ فقط شورش ہوا تو نہیں — کوئی مجھ کو پکارتا تو نہیں

میں تنہا جا رہا ہوں سوئے منزل — یہ پرچھائیں کہاں سے آ رہی ہے
یہ شام اور روشنی کی یہ قطاریں — اداسی اور گہری ہو گئی ہے
عروج ماہ ہے اور مقبروں پر — ابد کی چاندنی چٹکی ہوئی ہے
گرا ہے شاخ گل سے ایک پتہ — کسی نے کیا مجھے آواز دی ہے

بھوت بن کر مجھے ڈراتی ہیں — میری ناآفریدہ تخیلات

کون آیا مرے تعاقب میں — دبی فکر و خیال کے جنات
دفعتاً کس نے قہقہہ مارا — یہ اندھیرے میں کون ہیں ہے ہات

دیوار پہ دائرے ہیں کیسے — یہ کون ہے کس سے ڈر رہا ہوں

پیڑوں کے گھنے مہیب سائے — یہ کون ہے مجھ پہ حملہ آور

پتوں میں جھپک رہی ہیں آنکھیں — شاخوں پہ چمک رہے ہیں خنجر

اک حور سے ہوتی ہے ملاقات سرِ شام — اک روح ڈراتی ہے مجھے آخرِ شب میں

"غم" ایک ابدی قدر ہے۔ اس کی کیفیت ہمہ گیر ہے۔ شاعری میں غم کی روایت کے دو راستے ہیں: "غمِ جاناں اور غمِ دوراں"۔ رئیس کا غم جو شدید ہے ان دو راستوں کے علاوہ ایک تیسرے راستے پر بھی گامزن نظر آتا ہے اور یہ تیسرا راستہ کرب کی کیفیت اختیار کرتے ہوئے عقل کی گہرائیوں سے اترتا ہے۔ وہ کرب جو عقل و خرد سے جسم و جان تک سرایت کر جاتا ہو۔ اس کی شدت محسوس کر لینا بجلی کے ننگے تاروں کو چھو لینے کے مترادف ہے۔ رئیس نے اپنے کرب کا اظہار اس انداز سے کیا ہے:

ذہن پر ایک کھردری سی لکیر — کنکھجورے کا راستہ تو نہیں

شگفتگی کو ٹٹولا فسردگی پائی — مسرتوں کو نچوڑا ٹپک پڑے آنسو

چیونٹیاں جیسے ذہن پر رینگیں — اُف یہ میرے لطیف احساسات

میرے قریب ڈالنے بخشے بے خبری — خود آگہی کے جہنم میں جل رہا ہوں میں

شاید اسے عشق بھی نہ سمجھے — جس کرب میں عقل مبتلا ہے

مری تخلیق نغمے سے ہوئی تھی — مگر فریاد ہو کر رہ گیا ہوں

اور یہ

عقل کا زخم ہے بہت کاری

"غم اور کرب جب سوچ کے سانچے میں ڈھلتے ہیں تو تخلیق کے جوہر نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ غم ہر چند کہ جانگسل ہوتا ہے مگر شاعر کے لئے یہ زہر تریاق کا کام کرتا ہے۔

گہرے سمندروں میں سفر کرنے والا رئیس جہانِ نو کی تلاش میں "سوادِ اعظمِ نینوا" سے اس خرابے میں آیا ہے۔ وہ ہر حادثے کے ساتھ کائنات دگر کی تخلیق پر سوچتا ہے۔ ترقی پسند شعرا نے ایک نئے بشر کی بشارت دی۔ حضرت جوش ملیح آبادی سے جب نئے بشر کی تعریف معلوم کی گئی تو انھوں نے اسے ہمہ صفت موصوف بتایا جب اُن سے سوال کیا گیا کہ اگر انسان کے اعداد و شمار یونہی بڑھتے رہے تو دنیا تنگ ہو کر رہ جائے گی اور پھر غذا کا مسئلہ یوں پیدا ہوگا کہ اس کے اگانے کے لئے جگہ نہ مل سکے گی تو حضرت جوش نے بڑے اعتماد سے فرمایا کہ نیا انسان ہواؤں میں غلہ اُگائے گا۔ سائنس کی روز افزوں ترقی سے یہ بات کچھ بعید نہیں ہے کہ وہ ہواؤں میں وہ کیمیاوی عناصر پیدا کرلے کہ جوش صاحب کے بیان کی تصدیق ہو جائے۔ رئیس کے ہاں بھی تخلیق اور تلاش کا یہ کرب "مطرب فردا" کا روپ دھارتا ہے اور اس کا بیان کچھ اس انداز میں ملتا ہے ؎

جو نئی تخلیق کی دنیا ابھی منزل میں ہے   اس کا کرب آفرینش بھی ہمارے دل میں ہے

رئیس صاحب اس گفتگو کے دوران نئے آدمی کی بڑی بڑی توجیہات پیش کرتے ہیں۔ یہ فیصلہ مستقبل میں ہوگا کہ ان شعرا کی فکر کہاں تک صحیح ثابت ہوتی ہے

انسان بنیادی طور پر اپنی ذات کے متعلق بہت کچھ سوچتا ہے۔ یہ سوچ کبھی کبھی اسے بے خبری کے صحرا میں گم کر دیتی ہے کبھی کبھی جنون کی کیفیت اختیار کر جاتی ہے کبھی وہ اپنی ذات میں گم ہو جاتا ہے اور کبھی آفاق اس کی ذات میں گم!

میں اپنی سعی طلب کی تلاش میں گم ہوں   یہ وہ مقام نظر ہے جہاں خرد نہ جنوں

اپنے کو تلاش کر رہا ہوں   میں اپنی طلب سے ڈر رہا ہوں

میں خود اپنی ہی خاکستر جاں میں مدفون   جس طرح دفن خرابہ میں کوئی سرمایہ

کائنات میں گم ہو کر رئیس کہتا ہے ؎

یہ معجزہ کہ ہر اک عہد کی ہوئی تکمیل   یہ سانحہ کہ ہر اک داستاں ادھوری ہے

خود شاید خاک کہ اس خاک پہ سو دس جانے   خدا کے ساتھ نہیں آدمی کے ساتھ آئی

رئیس کی قادرالکلامی کے چند اور نمونے ملاحظہ فرمایئے:

یوں لگا جیسے کہ بل کھا کے دھنک ٹوٹ گئی   اس نے وقفہ جو لیا نازسے انگڑائی میں

اک شخص سے تلخ کام ہو کر   ہر شخص سے پیار کر رہا ہوں
ہیں اور شکایتِ زمانہ   اک شخص کا ذکر چھڑ گیا ہے

دل جو لرزاں ہے شاخِ گل کی طرح   دفعتاً کون کر گیا پرواز

جس پہ الزام تھا پاکیزگیٔ دامن کا   اس حسینہ کو بھنور تو نہ ساحل پایا

"الف" میں نظموں کی ضخامت غزلوں سے دوگنی ہے۔ اس مجموعے کی نظمیں آفاقی فلسفہ محبت، انسانیت کے تاثر کے تحت تخلیق ہوئی ہیں۔ "عفریت اور دیوتا، تضاد بشر، خلوت نامہ، عالم تا آزیدہ، صحیفہ کے سوال، قصیدہ مریخ و عروج ماہ، جوہری عہد، مرزا غالب، آفرینش نامہ، ایسی نظمیں ہیں جن میں شاعرانہ عظمتیں اور فلسفیانہ توجیہات کی روشنی میں "ذات اور کائنات" "انسان اور خدا" معاشرہ اور معاشرہ کی نفسیات کو اجاگر کیا گیا ہے۔

یہ نظمیں زیادہ تر طویل ہیں۔ ان کا اندازِ نگارش نظیر اکبر آبادی اور جوش ملیح آبادی کے انداز سے ملتا ہے۔ رئیس کی قادر الکلامی نے یہاں بھی اپنے کمالات دکھائے ہیں۔ صرف ایک مثال عرض کروں گا "عفریت اور دیوتا" میں شاعر یہ امنگ لے کر شہر میں گھومنا چاہتا ہے کہ کوئی اسے پہچان بھی نہ سکے اور وہ ایک جہاں پیما کی طرح یہاں کے ذرے سے کر آفتاب تک ایک گہری نظر ڈالتا چلا جائے۔ وہ اپنے آپ کو اتنا پر اسرار بنانا چاہتا ہے کہ :

خوف و حیرت سے لوگ دہرائیں	میری جادوگری کے افسانے
یوں مرے جسم و جاں ہوں پُر اسرار	یوں مرے خال و خد ہوں انجانے
جیسے میرے وجود میں مدفون	گم شدہ مقبروں کے تہ خانے
جیسے میرے غبار میں ملبوس	موت کی وادیوں کے ویرانے
بجا میں آماسہ شہر میں گھوموں	اور کوئی مجھے نہ پہچانے

وہ شہر میں گھومتے گھومتے شخصیتوں کے بتوں کی توڑ پھوڑ کرتا ہوا، داناؤں اور نادانوں سے الجھتا ہوا، داستانوں کے ڈھیر لگاتا ہوا، صبح کے گورستان اور شام کے مے خانوں کی سیر کرتا ہوا شہریار و وزیر و امیر و فقیر سے بے نیاز مسجدوں، مدرسوں اور صنم خانوں سے گریزاں، ہر ایک شے کا تجزیہ کرتا ہوا اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یہ سارا شہر و دنیا، تاریخ عقل کا عفریت اور اہل دانش اس کے دیوانے ہیں، پھر اس کے دل میں یہ خواہش اٹھتی ہے کہ یہ عفریت دوزخ اے کاش وہ شاعر کو معصوم دیوتا ماننے لگے۔

"الف" کو نہایت سادگی سے چھاپا گیا ہے۔ کاش یہ مجموعہ دورِ جدید کی طباعت کے معیاروں کے مطابق ہوتا۔ جو مجموعہ میرے پاس ہے اس کی اشاعت دوسری مرتبہ ہوئی ہے اگر بار سوم چھپنے کی نوبت آئے تو رئیس صاحب کو چاہیے کہ وہ اس کتاب کو عمدہ کاغذ پر جدید ٹائپ میں چھپوا کر خوبصورت گرد پوش کے ساتھ بازار میں لائیں۔

اردو شعر کے قاری کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے :

سیف زلفی

مثنویاتِ حالی

مصنف: خواجہ الطاف حسین حالی
مقدمہ: مولانا مرتضیٰ احسین فاضل
صفحات: ۲۰۶
قیمت: چھ روپے
ناشر: شیخ مبارک علی، اندرون لوہاری دروازہ لاہور

مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کا ان ادیبوں اور نقادوں میں شمار ہوتا ہے جنھوں نے غالب اور غالبیات کا بطور خاص مطالعہ کیا ہے۔ لکھنؤ میں انجمن معارف نے جو ادبی خدمات کئے وہ اظہر من الشمس ہیں۔ کام کی باتیں تو بہت ہیں۔ ایک یہی کیا کم ہے کہ مولانا موصوف کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس انجمن کے باقیات الصالحات سے انھوں نے استفادہ کیا ہے۔ لکھنؤ میں مُقاصد کرہ ابوتراب خاں اور رنقات فرنگی محل زبان کے متنازعہ معاملات پر حکم بنتے اور قضیے نپٹاتے تھے، مولانا موصوف کا کرہ ابوتراب خاں سے بھی تعلق ہے اور رنقات کرہ سے بالواسطہ اور بلا واسطہ دونوں طرح آپ کو نکتہ بھی حاصل رہا ہے۔ حکیم صاحب عالم[1] مرحوم کا مطب

---

[1] ان ہی کی نسبت جوش ملیح آبادی نے کہا ہے ؎ جوش میرا صاحب عالم ہے جانِ لکھنؤ (آغا سہیل)

قیام پاکستان کے بعد بھی عرصہ دراز تک صاحبان علم و ارباب دانش کا مرجع تھا۔ مولانا موصوف بھی اس اڈے پر آتے جاتے قیام فرما ہوتے اور یہ ممکن نہ تھا کہ زبان ادبی چٹکلے ہوں اور مولانا تشریف فرما نہ ہوں۔ اور اسی طرح یہ بات بھی طے ہے کہ اس چمنستان ادب کی خوشبوؤں کو مولانا نے اپنے قلب و نظر کے دامن میں خوب سمویا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواجہ الطاف حسین حالی کی مثنویات پر جو مقدمہ موصوف نے سپرد قلم فرمایا ہے۔ ہر اعتبار سے مکمل، متوازن اور جامع ہے۔
خواجہ الطاف حسین حالی کی مثنویات کے باب میں اب کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے کیونکہ ان کو کلاسیک کا درجہ مل چکا ہے (اور ان میں ہر مثنوی بجائے خود ہمارے دیدۂ دل کے لئے روشنی کا سامان بن چکی ہے) مولانا موصوف نے مثنویات پر تحقیق کرنے والوں کے لئے مواد فراہم کیا ہے اور حالی کے باب میں تحقیقی کام کرنے والوں کی رہنمائی کے لئے دائرہ وغیرہ بھی مہیا کر دیا ہے۔

مولانا موصوف کے طرز نگارش میں ادبی ثقاہت، تحقیقی شان، زور بیان کا کمال اور بڑی دل نشیں شگفتگی موجود ہے۔ اگرچہ مولانا عربی زبان و ادب پر حاوی ہیں اور عربی زبان میں لکھتے بھی ہیں اور بولتے بھی ہیں، بڑی بے تکلفی سے گفتگو بھی فرماتے ہیں لیکن اس نسبت سے بعض لوگوں کو جو معرب زبان استعمال کرنے کا چسکا ہوتا ہے، بحمد اللہ مولانا موصوف کا دامن اس سے پاک ہے اور وہ ژولیدہ بیانی کو ابلاغ و ترسیل کے راستے میں رکاوٹ خیال کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں حسن بیان بھی ہے اور عالمانہ اور منطقیانہ بحث بھی، استدلال کا اچھوتا انداز بھی اور تحقیقی موشگافیوں کا سامان بھی۔

مشمولہ مقدمے میں حالی کی مکمل تحقیق شدہ سوانح موجود ہے۔ ان کے خدمات ادب کا جائزہ ہے۔ حالی کے فن پر عالمانہ اور محققانہ بحث ہے۔ ان تمام مراحل کو مولانا موصوف نے خوب طے کیا ہے اور ہمارے بعض کم سواد پروفیسران اردو ادب اور نام نہاد ادبا کے استفادے کے لئے (جن میں سے اکثریت پی ایچ ڈی مارکہ ادبا و محققین کی ہے) بڑے کام کی باتیں جمع کر دی ہیں۔

آغا سہیل

مغرب کے تنقیدی اصول

مصنف: سید سجاد باقر رضوی — **ناشر:** ادارہ کتابیات لاہور

صفحات: ۳۳۵ — **قیمت:** ۱۲ روپے

یاد بخیر زمانہ طالب علمی میں ایم اے کے درجات میں تنقید جیسا مضمون اور احتشام حسین سا ناقد استاد جس کے تبحر علمی کا اندازہ بقدر ہم بھی طلبہ کو بھی ہوتا اور محافل علم و ادب میں اساتذہ کو بھی نظری اور عملی تنقید دونوں ہی سے واسطہ پڑتا۔ کتابوں کی تعداد یاد نہیں کہ کس قدر پڑھنا پڑتی تھیں۔ سلسلہ بوطیقا ہی سے شروع ہوتا تھا اور موجودہ زمانے کی تنقید پر آن ٹوٹتی تھی۔ اللہ رے انکسار کہ مارکسی دبستان تنقید کے ذیل میں بھی اپنا نام نہیں آنے پاتا تھا۔ بعض لوگ اگر ذکر بھی کرتے تو اس انداز سے اعتراف ہوتا کہ جیسے اس کام کا جائزہ لینا ان کا کام نہیں ہمارا کام ہے۔

سید سجاد باقر رضوی نے "مغرب کے تنقیدی اصول" افلاطون سے لے کر ٹی ایس ایلیٹ تک جمع بھی کر دیئے ہیں اور اردو میں منتقل بھی کر دیئے ہیں۔

کامپٹن رکٹ (Compton Rickett) اور ہڈسن (Hudson) کے حوالوں سے ہم تاریخ ادب انگریزی پڑھا کرتے تھے۔ بوطیقا ڈاکٹر عابد حسین کے حوالے سے ضمناً اور احتشام حسین کے حوالے سے خصوصاً پڑھتے تھے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ استاد محترم اس مشہور و معروف کتاب پر ہر قسم کے نظریات رکھنے والے ناقدین کے آرا بھی سناتے اور اس زبان و ادب کا جائزہ لیتے جس نے اس کو کسی نہ کسی حیثیت سے قبول کیا اور اس کے ردعمل کہاں کہاں اور کن کن صورتوں میں ظاہر ہوئے۔ ڈاکٹر عبدالسلام (گورکھپور یونیورسٹی) نے ہڈسن کی کتاب کا ترجمہ کر کے تنقید کے طلبہ کے لئے جزوی طور پر سہولت پیدا کر دی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی اب سے کوئی بیس بائیس سال قبل "اردو میں تنقیدی ارتقا" کا جائزہ لے چکے تھے۔ سید سجاد باقر رضوی نے مغرب کے جدید جدید

مفکرین اور نقادانِ ادب کے آراء و نظریات کے پیشِ نظر جو تنقیدی اصول یکجا کئے ہیں وہ بے حد وقیع ہیں اور اس بات کا اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ اس کام میں اُن کو کس قدر کاوش اور محنت کرنا پڑی ہوگی۔ اگرچہ یہی مضمون عرصے سے اہلِ علم جانتے ہیں اور بڑے مشاق اور منجھے ہوئے استاد تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن مقالے کی شکل میں ایسے بصیرت افروز موضوع کو ڈھالنا بھی بہرحال ایک کمال ہے اور جس کی داد نہ دینا ادبی بددیانتی ہے۔

اس بات کا اعتراف خود رضوی صاحب نے کیا ہے کہ اردو میں اپنی قسم کی یہ پہلی کتاب نہیں ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ بنیادی طور پر طلبہ کے ضروریات کے لئے اسے لکھا گیا ہے۔ احمد مقصود صاحب جنھوں نے اس مقالے کا دیباچہ لکھا ہے، فرماتے ہیں:

"باقر صاحب کی کتاب مغرب کے تنقیدی اصول پر اردو میں اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے۔"

یہاں میں مقصود صاحب سے بالکل متفق ہوں اور اگر وہ اجازت دیں تو اس قدر اور بھی عرض کرنے کو تیار ہوں کہ ہر کتاب بہت سی کتابوں کے ساتھ اپنے موضوع اور نفسِ مضمون کی یکسانیت کے باوجود اپنی طرز کی پہلی ہی کتاب ہوتی ہے۔ البتہ اُن کا یہ ارشادِ گرامی کہ:

"پچھلے کوئی ساٹھ ستر برسوں سے ہمارے نقادان ہی (انھیں) مغربی تنقید کے اصولوں سے متاثر ہوتے رہے ہیں اور انھوں نے حتی المقدور ان اصولوں کو سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے لیکن محمد حسن عسکری اور فراق کے سوا شاید ہی کوئی اور ان کے صحیح معنوں میں فیض یاب ہو سکا ہے۔"

حقائق سے بہت زیادہ قریب نہیں ہے۔ غالباً اس محل پر بڑے غور و فکر کے بعد ایک متوازن رائے دینے کی ضرورت تھی۔ یوں تو ہم دونوں اپنی اپنی آراء کے سلسلے میں آزاد ہیں، انھیں مجھ سے اور مجھے اُن سے اختلاف کا حق ہے لیکن یہاں معاملہ میرا ان کا نہیں ہے اسی لئے ٹھنڈے دل و دماغ سے سمجھنے اور غور کرنے کا ہے۔

مجھے موضوع اور نفسِ مضمون کے اعتبار سے کتاب اچھی معلوم ہوئی لیکن اندازِ بیان سے تدریسی حیثیت محسوس ہوئی۔ میری ناقص رائے میں سجاد باقر رضوی اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں اور تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔ اس سے زیادہ صاحبِ ادب ہے اور کم از کم باقر صاحب جیسے مخلص دوست کے سلسلے میں ترکِ ادب مجھے منظور نہیں۔

ناشر کو دوسرے اڈیشن کے موقع پر تاپ کے بعض نقائص کی طرف توجہ رکھنا چاہئے۔

آغا سہیل

جب لوہا پگھلتا ہے (ڈراما)

مصنف: ہربنس دوست

ناشر: تاج سعید، مکتبۂ اردو نگ، ٣٠ عنایت منزل، سکندر ٹاؤن، پشاور۔

اردو میں ڈرامے کم لکھے جاتے اور جو لکھے بھی جاتے ہیں تو ان میں خوبیاں گنتی کی اور نقائص بے شمار ہیں۔ اسٹیج یا رنگ منچ کے ضروریات کو ملحوظ رکھ کر ڈرامے کم لکھے گئے ہیں۔ ہربنس کے اس ڈرامے میں یہ خوبی بڑی نمایاں ہے۔ کرداروں کا تعلق ہے تو اسی برصغیر سے لیکن قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے مسائل اور ہندوستان کے مسائل میں زمین و آسمان کا فرق ظاہر ہو گیا ہے اس لئے ہمارے لئے اس ڈرامے کی تفہیم میں کشش کم ہے۔ ہاں جن لوگوں کو دوسرے دیسوں کے مسائل سے اس حد تک دلچسپی ہے اُن کے لئے اس میں تسکین کا سامان ہے۔ بعض کردار منفرد بھی ہیں اور جاندار بھی۔ عیب یہی ہے کہ مصنف کی جینیت پسندی ہر کردار پر حاوی نظر آتی ہے۔ بلراج ساہنی جیسے اداکار دل نے جوگندر جیسے شاعر اور کلاکار کے معروف ادارے شانتی نکیتن سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ میری مذکورہ بالا (خط کشیدہ) رائے کی نفی میں چند باتیں کہی ہیں لیکن ان میں استدلال اور وزن نہیں ہے۔ اس کے باوجود ڈرامہ بُرا نہیں، دلچسپ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ پاکستانی ڈرامے کے مقابلے میں ہندوستان سے پیچھے ہے لیکن مغربی ڈرامے کے تمام نشیب و فراز اور رموز و نکات کو ہمارے ادیب بخوبی سمجھ رہے ہیں اور مغربی ڈرامے اور اس کی تکنیک سے ہم جو اثرات قبول کر رہے ہیں وہ اس اعتبار سے زیادہ صحت مند ہیں کہ ہندوستانی فلموں کا روایتی ملو ڈرامائی انداز اس میں نہیں ہے۔ بدقسمتی سے دوست کے ڈرامے میں یہ بات بھی موجود ہے جو ہمیں بالکل اپیل نہیں کرتی۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بمبئی کے فلمی ماحول سے قریب ہیں۔

مجھے دوست کے ڈرامے میں دوسری خوبی جو نظر آئی وہ بے ساختہ مکالمے ہیں۔ اگر وہ ڈرامے کی صنف پر بھرپور توجہ دے سکیں اور ہمارے مسائل کو بھی اپنے دائرہ عمل میں لا سکیں تو اردو ادب پر احسان ہوگا۔

اس ڈرامے کی تیسری سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا حسن اسٹیج پر ظاہر ہوتا ہے کاغذ پر نہیں۔ آغا سہیل

پاگل پن کے پانچ دورے

"پنجابی یوں تو پاکستان کی کئی ایک علاقائی بولیوں ہی میں سے ایک ہے لیکن چند خصوصیات کے اعتبار سے منفرد زبان بھی ہے۔ وہ خصوصیات کچھ اس طرح کی ہیں:

دونوں قومی زبانوں کے بعد ملک کے سب سے زیادہ لوگوں کا ذریعہ اظہار ہے

قومی اور علاقائی زبانوں میں سب سے زیادہ مظلوم ہے

تجارتی لحاظ سے باقی تمام ملکی زبانوں سے آگے ہے۔ چند ایک تجارتی فوائد یہ ہیں:

حکومت سے گرانٹ لینے کے کام آتی ہے کیونکہ اتفاق سے ایک زبان ہے۔

تعلیم بالغان کی پہلی سیڑھی کے طور پر کم خرچ بالا نشیں ثابت ہوتی ہے

ذومعنی انداز میں لکھ کر گائی جائے تو فلمیں کئی کئی کھڑکی توڑ ہفتے مناتی ہیں۔

ریڈیو والوں کو تبرک کے طور پر کام دیتی ہے جو اسے بکمال کفایت استعمال کرتے ہیں مبادا اس کا ذخیرہ ختم ہو جائے۔

سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انٹیلی جنٹسیا کو تنگ کرنا مقصود ہو تو تیر بہدف نسخے کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

ایسی سونے کی چڑیا سے مفاد عاجلہ حاصل کرنے کی بجائے اگر کوئی اس میں ثقافتی روایات، جمالیاتی اقدار، فنی بلندیوں، معاشرتی اور تہذیبی تاریخ اور علمی و ادبی کارناموں کی تلاش میں چل پڑا ہے تو آپ اس حرکت کو پاگل پن کے سوا اور کیا کہیں گے؟ ایسے پاگلوں میں "مجلس شاہ حسین" بھی ہے کہ ۱۹۶۳ء سے سرگرم جنوں ہے۔ چار برس میں تجارت پیشہ حضرات کو پنجابی کی برکت سے منفعت کی کئی راہیں سجھائی دیں لیکن مجلس ہے کہ ایک ہی رٹ لگائے جا رہی ہے ؎

وہ سوداگر ہوں میں نے نفع دیکھا ہے خسارے میں

یوں تو مجلس کو ۱۹۶۳ء کے بعد ہر سال موسم بہار میں چھوٹا موٹا دورہ پڑتا ہی رہتا ہے لیکن ۱۹۶۶ء میں بقول کسے ؎

نہ پوچھ جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری

والا قصہ ہو گیا۔ ایک مہینہ میں پاگل پن کے پانچ دورے اور پھر سخت جانی کا یہ عالم کہ اس برس تیمار بیزار ہی رہیں۔۔۔ مارچ ۱۹۶۶ء کے آغاز میں مجلس نے پانچ مطبوعات پیش کرنے کا اعلان تو کر دیا لیکن بعد میں جو کچھ ہوا وہ مطبوعات کے دیباچوں سے ظاہر ہے۔ ان مطبوعات پر تبصرہ نہیں محض تعارف ہے۔

پنجابی دے صوفی شاعر: یہ کتاب پنجابی ترجمہ ہے ڈاکٹر لاجونتی رام کرشن کے تھیسس Punjabi Sufi Poets کا جسے لکھ کر انھوں نے ڈاکٹریٹ حاصل کی تھی۔ یہ تقسیم ملک سے پہلے کی بات ہے۔ کتاب کا پہلا اور آخری نسخہ انگریزی زبان میں آج سے کوئی تیس برس پہلے چھپا تھا اگرچہ یہ کتاب اس موضوع پر اہل تحقیق کے لئے محض خام مواد مہیا کرنے کی اہل تھی لیکن آج تک کسی نے اسے بنیاد بنا کر پختہ تر تحقیقی عمارت تعمیر

کرنے کا سوچا تک نہیں ـــــ شاید اس لئے کہ یہ ایک غیر مفید فعل تھا ـــــ یہاں تک کہ کتاب قریب قریب نایاب ہوگئی "مجلس شاہ حسین" نے اسے ایک دفعہ پھر زندہ کر دیا ہے۔ انٹیلی جنٹ کو تنگ کرنے کے لئے؟ کیونکہ کتاب انگریزی کی بجائے پنجابی میں ہے! اب اسے کون پڑھے گا؟ لیکن "مجلس" والے بھی مصر ہیں کہ اس موضوع پر جب بھی تحقیقی کام ہوا بنیاد اسی کو بننا ہوگا اور وہ نہیں چاہتے کہ بنیاد مٹ جائے۔ کتاب "آئینہ ادب" کے تعاون سے چھپی ہے اور اس کی گٹ اپ سے مذکورہ ادارے کا روایتی سلیقہ جھلکتا ہے۔ کاغذ سفید ہے اور ضخامت ۲۰۴ صفحات۔

کافیاں شاہ حسین (پنجابی): بقول ڈاکٹر لاجونتی شاہ حسین نے بزبان شعر جو کچھ بھی کہا اس میں سے باقی صرف کافیاں بزبان پنجابی ہی رہ گئیں ہیں جن کی کل تعداد لوگوں نے الگ الگ بتائی ہے۔ کافیاں منتشر حالت میں تھیں انہیں یکجا کرکے چھاپنے کا کام قیام پاکستان سے پہلے ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے کیا۔ یہ اس ضمن میں پہلی قابل قدر کوشش تھی۔ ایک تو کتاب پرانے طرز پر چھپی، دوسرے اس میں املا کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد چند ایک تدریسی اداروں کی طرف سے کافیوں کو نئے سرے سے چھاپنے کا اہتمام تو ضرور ہوا لیکن مقصد پیش نظر تعلیم بالغان کی پہلی سیڑھی مہیا کرنا تھا کیونکہ حسن اتفاق سے کافیاں فاضل پنجابی کے کورس میں شامل کرلی گئی تھیں۔ اس لئے یہاں بھی کافیوں کی ترتیب، املا اور صحیح تعداد کے تعین کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ ادھر موہن سنگھ والا نسخہ بھی ناپید ہو چلا تھا۔ چنانچہ "مجلس شاہ حسین" کو کافیاں دوبارہ چھاپنے اور ایک دفعہ پھر غیر مفید کام کرنے کا جواز مل گیا۔ موہن سنگھ کے نسخے میں مزید دو کافیوں کا اضافہ شاہ حسین کے کلام میں ایک نئے رجحان کی نشاندہی کرتا ہے جو اب تک نظروں سے پوشیدہ تھا۔ مقام حیرت ہے کہ ان دو کافیوں کا ماخذ بھی موہن سنگھ ہی کی کتاب "پنجابی دی تاریخ" ہے۔ اس کتاب کے چھپنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاہ حسین کا کلام بطریق احسن محفوظ ہو گیا ہے۔ کتاب دبیز کاغذ پر ٹائپ میں چھپی ہے۔ سرورق حنیف رامے کا عطیہ ہے۔ قیمت درج نہیں۔ غالباً "مجلس" کے پیش نظر اس پہلو کی اہمیت کم تھی۔

کافیاں شاہ حسین (انگریزی): "انگریزی انٹیلی جنٹیا! ہوشیار باش!!" وہ بھی شاعروں کی محفل میں جانے کا اتفاق ہو یا امریکہ، برطانیہ یا کسی اور ملک سے کوئی ادیب شہر میں وارد ہو تو موضوع گفتگو اس قسم کا ہی ہوتا ہے کہ فلاں صاحب کی نظم فلاں زبان میں، فلاں صاحب کا افسانہ فلاں زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ غیر ممالک میں یکجہتی کے خیال سے لاہور ہی میں ایک دو اداروں نے ملکی تخلیقات کو انگریزی میں ڈھالنے کا اہتمام کیا ہے۔ اس کاروبار میں بعض اوقات متعدد قسم کی مصلحتوں کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ شاہ حسین کے کلام کا انگریزی نظم میں ترجمہ شائع کرنے کی مصلحت بجز اس کے کوئی نظر نہیں آتی کہ غلام یعقوب انور سے یہ ترجمہ کرنے کی حرکت سرزد ہو گئی ـــــ آپ سوچئے نا! پنجابی شاعر کا انگریزی میں ترجمہ؟! ـــــ انور کے تراجم گلڈ کی طرف سے انگریزی میں چھپنے والی پاکستانی منظومات کے مجموعہ میں شامل تھے اور غالباً اسی غرض سے انہوں نے پنجابی شعرا کا بھی انگریزی نظم میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔ زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جسے "مجلس شاہ حسین" نے اپنے اشاعتی پروگرام کی ایک شق کے طور پر اچانک منتخب کر لیا۔ "اچانک" کا لفظ میں نے دانستہ استعمال کیا ہے۔ وہ اس لئے کہ مجلس نے جو کافیاں پنجابی میں چھاپی ہیں ان کی اور غلام یعقوب انور کے ترجمے کی نمبروار ترتیب ایک نہیں البتہ انگریزی نسخے میں ہر کافی کے نیچے پنجابی نسخے کا نمبر دے دیا گیا ہے۔ لیکن اس اچانک کا اثر یہیں تک محدود رہا۔ طباعت اور گٹ اپ کی خوبصورتی تو "مجلس" کے سر الزام تھوپ رہی ہے کہ کتاب کو بڑے اہتمام اور "زحمت" سے چھاپا گیا ہے۔

"پنجابی ادب" کا شاہ حسین نمبر: چار کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ "مجلس" اور "پنجابی ادب" نے مشترکہ مساعی سے شاہ حسین کی زندگی اور فن کے بارے میں کم و بیش دو سو صفحات بھی پیش کر دیئے ہیں۔ "پنجابی ادب" ایک عرصہ سے زبان و ادب کی خدمت کر رہا ہے لیکن غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ اس کا اتنا ضخیم نمبر اور وہ بھی صرف ایک شاعر کے بارے میں پیش کیا گیا ہے۔ شاید یہ دعویٰ بھی بے جا نہ ہوگا کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار کسی پنجابی رسالے نے کسی ایک شاعر کے لئے اپنا پورا شمارہ وقف کر دیا اور یہ شمارہ بھی عام شماروں سے پانچ گنا ہے۔ اس شمارہ میں محمد آصف خاں نے شاہ حسینؒ کے بارے

بارے میں لکھے گئے مضامین کی فہرست کافی محنت کاوش سے تیار کی ہے۔ تصاویر کے صفحوں پر "حقیقت الفقرا" کے اصلی مسودے کا عکس اور شاہ حسین کے مزار کی تصویریں ہیں۔ لکھنے والوں میں جیلانی کامران، صفدر زبیر، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، غلام یعقوب انور، مسعود اللہ خاں، احمد سعید قریشی اور راحت نسیم ملک کے مضامین قابل ذکر ہیں۔ لیجئے کیسے کیسے لوگ پنجابی لکھتے ہوئے پکڑے گئے۔

حقیقت الفقرا: یہ کتاب فارسی نظم میں شاہ حسین کی سوانح عمری ہے۔ اگر نقرا کی "نمبر مجلس شاہ حسین" کو سمجھا جائے تو بات تب بھی بن جاتی ہے۔ کتاب کا مصنف شیخ محمود المعروف محمد پیر اس وقت تیرہ برس کا تھا جب شاہ حسین کا ورود شاہدرہ سے باغبان پورہ منتقل ہوا۔ اسے شاہ حسین کے یار غار مادھو لال کا برسوں قرب حاصل رہا جو شاہ کے بعد زندہ رہا۔ اس اعتبار سے شیخ محمود کو شاہ حسین ہی کے زمانے کا آدمی کہا جا سکتا ہے۔ مذکورہ کتاب ہمارے پاس شاہ حسین کے سوانح کا ایک اور صرف ایک ماخذ ہے جو کسی کے علم میں ہے لیکن اس کی چھپائی کا تاریخ میں کہیں بھی ثبوت نہیں ملتا۔ ایک آدھ قلمی نسخہ آج تک محفوظ چلا آرہا ہے۔ ۱۹۲۳ء میں اس کا اردو ترجمہ چھپا لیکن آج اس کے چھپنے کا بھی محض ذکر ہی باقی ہے۔ وہ کشمیری بازار میں بطرز کہنہ چھپا اور وہیں کہیں گم ہو گیا۔ "مجلس شاہ حسین" نے پھر پاگل پن کے چھپنے میں ٹانگ اڑائی اور میلے کے موقع پر سامنے پیش کرنے کا اعلان کر دیا لیکن کتاب کے شروع میں وہ حالات درج کر جن میں کتاب کی اشاعت کا انتظام ہوا۔ ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ دیوانگی قابل تعریف حالت ہے یا قابلِ مذمت۔ میرے نزدیک اس کتاب کی اشاعت پاگل پن کا سب سے بڑا دورہ ہے جس میں "نئی مطبوعات" والے بھی برابر کے شریک ہیں ایسی ہوتی ہے حقیقت الفقرا!

کتابیں نقائص سے پاک نہیں ہیں۔ پھر میری تحریر سے قارئین کو یہ یقین بھی ہو گیا ہوگا کہ میں "غالب" کا طرفدار ہوں۔ اس ضمن میں عرض یہ ہے کہ ایک تو ڈھائی صفحات میں پانچ مطبوعات کے بارے میں سخن فہمی بروئے کار نہیں لائی جا سکتی۔ دوسرے آپ سخن فہم ہی بن کر بتائیے کہ کوئی نحیف و نزار آدمی کشتی کے بغیر دریا میں کود پڑے اور آپ کے یقین کے خلاف کسی ڈوبنے والے انسان کو موت کی دہلیز سے واپس گھسیٹ لائے تو آپ ایسی باتوں کی عیاشی کہاں تک کر سکیں گے کہ تم نے ڈوبنے والے کے سلجھے ہوئے بال کیوں الجھا دیئے ہیں یا اس کا لباس بھیگ کر جسم سے یوں چپکا ہوا ہے کہ ہمارے جمالیاتی ذوق کو مجروح کر رہا ہے یا بچانے سے پہلے تم نے یہ کیوں نہیں معلوم کیا کہ ڈوبنے والا کس قسم کا انسان تھا ..... یا وغیرہ وغیرہ!

حسین شاہد

جاوید نامہ

مصنف: محمد اقبال — مترجم: اے، جے، آربری

ناشر: الین اینڈ انوین۔ لندن — قیمت ۲۴۶ شلنگ

ای۔ ایم۔ فاسٹر نے ۱۹۲۶ء میں محمد اقبال کے بارے میں لکھا تھا

"وہ جدید ہندوستان کے دلچسپ ترین مظاہر میں سے ایک ہیں اور ان کے کارناموں سے ہماری غفلت حیرت انگیز ہے۔"

اب پروفیسر آربری نے اقبال کے اہم شعری کارنامہ "جاوید نامہ" کا انگریزی زبان میں بے عیب، رواں دواں اور دلنشیں ترجمہ کر کے ہماری اس علمی کوتاہی کو بڑی حد تک دور کر دیا ہے۔

"جاوید نامہ کی ہیئت قدیم و جدید کے اس حسین امتزاج کا آئینہ دار ہے جو اقبال کے تمام کلام کا نمایاں وصف ہے۔" جاوید نامہ کو فارسی زبان کی قدیم ترین مقبول صنف شعر مثنوی کے قالب میں ڈھالا گیا ہے جہاں یہ کہنا برحق ہے کہ اقبال کا زبان اور ہیئت کا انتخاب بڑی حد تک نظم کی فلسفیانہ اور مقصدی نوعیت کا

مرہون منت ہے۔ وہاں یہ قرار دینا بھی بجا ہے کہ یہ انتخاب قومی اقدار کی مکمل نفی اور عالمگیر اسلامی تہذیب میں اقبال کے گہرے یقین کی غمازی کرتا ہے۔ مزید یہ کہ نظم جدید اور ہیئت کے تجربات سے بے اعتنائی، مغرب کی فضول نقالی سے اقبال کی ناپسندیدگی کی ترجمان ہے۔

ایک رزمیہ کی سی وسعت کی حامل یہ نظم افلاک اور آں سوئے افلاک کے اس سفر کی کہانی بتاتی ہے جو شاعر نے فارسی زبان کے عظیم صوفی شاعر رومی کی معیت میں طے کیا۔ شاعر اور اس کا رہنما اس سفر کے دوران نطشے، ٹالسٹائی اور بجز سمیت مختلف شخصیات سے ملتے اور ہمکلام ہوتے ہیں۔ یوں جو مکالمات ظہور میں آتے ہیں ان کی وساطت سے اقبال اسلامی معاشرے کی تعمیر و تشکیل نو سے متعلق اپنے بنیادی تصورات پیش کرتے ہیں۔

اقبال کے تصورات اپنے معاصر رشید رضا سے بڑی حد تک مماثل ہیں اور ان پر سید جمال الدین افغانی کی دلکش اور پر اسرار شخصیت کی گہری چھاپ ہے۔ اقبال کو اسلام اور مادی ترقی میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا۔ ان کے نزدیک اسلام کے زوال کی ذمہ داری اُن افراد و اداروں پر عاید ہوتی ہے جو اسلام کی حقیقی روح سے خائف ہو کر مقدر پرستی اور جبر مشیت کے تباہ کن صوفیانہ تصورات میں سکون کے متلاشی رہے۔ ان تصورات کے زیر اثر مسلمان زمین پر خدا کے نائب کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہو کر تارک عمل بن گئے اور یوں اسلام میں حرکت و عمل کا اصول اُن کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اقبال اس اصول کو اسلام کی بنیادی خوبی شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ اسرار خودی کی طرح جاوید نامہ میں بھی حرکت و عمل کے تصورات کا اثبات کیا ہے۔ زندگی کی حرکت اور تصادم جاوید نامہ کا مرکزی موضوع ہے:

کیش ما مانند موج تیز گام　　　اختیار جادہ و ترک مقام

جاوید نامہ شاہد ہے کہ اقبال مغرب کی مادی ترقی کا حقیقی راز جان گئے تھے۔ وہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ مغرب سے صرف تکنیک سیکھ لینا ہی کافی نہیں بلکہ مغرب کے مجموعی زاویۂ نگاہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے لیکن اقبال کا اس زاویۂ نگاہ کو روایتی اسلامی اسلوب میں سرگرم کار بنانا اتنا ہی غیر حقیقی تھا، جتنا نئے اور انفرادی خیالات کو قدیم شعری ہیئتوں میں پابند کرنا۔

(دی ٹائمز — لندن —— ضمیمہ علمی و ادبی —— ترجمہ: ادارہ "فنون")

صلیبِ درد (مجموعۂ کلام)

مصنف: سہیل اختر
ناشر: پیرا ماؤنٹ نیوز کارنر۔ ڈیرہ غازی خاں
ضخامت: ۱۳۲ صفحات
قیمت: ۴ روپے

سہیل اختر صاحب کا پہلا مجموعۂ کلام "دھوپ کے دیپ" ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ اس لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ان کا دوسرا مجموعۂ کلام "صلیب درد" پہلے سے کس حد تک مختلف ہے اور انھوں نے اس دوران فنی ریاضت اور نکھار کی کون سی منزلیں طے کی ہیں۔ صلیب درد کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سہیل اختر کے پاس احساس کی وہ دولت بدرجۂ اتم موجود ہے جو اچھی شاعری کے لئے ناگزیر ہے۔ احساس کی اس شدت کی جھلکیاں جگہ جگہ نمایاں ہیں اور اگر سہیل اختر نے سہل انگاری سے کام نہ لیا اور فن شاعری کے مطالبات سے اغماض نہ برتا تو وہ کچھ عرصے کے بعد اردو کے اچھے شاعروں میں شمار ہونے لگیں گے۔ یہ پیش گوئی اس لحاظ سے بڑے اعتماد کے ساتھ کی جا سکتی ہے کہ سہیل اختر زندگی کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کے بارے میں کسی الجھن میں مبتلا نہیں ہیں۔ وہ جبر و ظلم کے دشمن ہیں اور زندگی کو آسودہ، متوازن اور خوشحال دیکھنے کے متمنی ہیں۔ یوں جب شاعر کو معلوم ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کیوں کہہ رہا ہے تو اظہار کی خامیاں یا زبان کی لغزشیں اسے نمایاں ہونے سے تا دیر نہیں روک سکتیں بلکہ یہ امر عام مشاہدے میں آیا ہے کہ شاعر کے فکر کے ساتھ ساتھ اس کے بیان و زبان آپ ہی آپ نکھرتے چلے گئے ہیں۔

سہیل اختر نے اس مجموعے میں بعض آزاد نظمیں بھی شامل کی ہیں مگر ان کا اصل رنگ غزل میں ہے اور غزل کا رنگ نظموں میں بھی نکھرتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے "صلیب درد" کے مقدمے میں بالکل درست کہا ہے کہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ اگر وہ غزل کی طرف زیادہ توجہ دیں تو جدید غزل نگاروں میں ایک مقام حاصل کر سکتے ہیں اس لئے کہ صلیب درد کی غزلیں ان کے روشن مستقبل کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہیں۔

(ح ح)

احمد ندیم قاسمی ایڈیٹر، پبلشر نے اشرف پریس لاہور سے چھپوا کر دفتر "فنون" ۴۷۔ انار کلی لاہور سے شائع کیا۔